

جولائی 2025

مکتبہ امدادی خیر کھانا لاہور
مکتبہ خیر کھانا لاہور

جولائی 2025
قیمت 200 روپے

بانی
معراج محمد

www.pklibrary.net





مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں



احمد سلیم سلیم

علم بغاوت سے لبریز ایک محبت وطن کی
مجرموں کے خلاف دہشت انگیز کارروائی



عکس فاطمہ

لفظوں کی صداقت سے قیامت
ڈھادینے والا سانحہ



بشریٰ امجد

ایک انوکھی واردات
کادچپ تصویری حال



پروفیسر خلیل جبار

زندگی و موت کی سنسنی خیز بازی.....
جوا حسری لمحوں میں الٹ گئی



طاہر جاوید مغل

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات
سے لبریز ایک لہورنگ داستان



مدیر اعلیٰ

صحت و ارسوال



مدیر : لبنی خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر



مارکیٹنگ و

سرکولیشن مینجر

شمس عباس

0334-5498977

0301-2454188



جلد 55 • شماره 07 • جولائی 2025 • زیر سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 200 روپے •

خط و کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com



زراور زمین

عائشہ نصیر

107

زراور زمین کا ازلی تنازع.....
دشمن کا روایتی انداز

دہر

حُسام بٹ

126

زندگی میں زندگی بدل دینے والے
عیار ڈھنوں کی خوش بجا حیلے مازیاں

مضروب

159

ڈاکٹر حامد حسن

سفاک مجسم کی قید سے فرار ہو
جانے والے خور و نو جوان کا معاملہ

طلب کار

147

عمران قریشی

محبوب کے گرد پروانے کے مانند گردش
میں رہنے والے عاشق کا عجیب ماحبرا

میراث

197

زویا صفوان

حالیہ واقعات و حالات کے تناظر
میں لکھی گئی ایک کرب ناک حقیقی کہانی

لہو کا رنگ

168

عبدالوب بھٹی

قتل کی تلاش میں سرگرداں
ایک وکیل کی ہوشیاریاں



عزیزانِ من..... السلام علیکم!

جولائی کا شمار آپ کی نذر ہے۔ ماہِ محرم الحرام سنِ ہجری کا پہلا مہینہ ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہِ محرم ابتداءً زمانہ سے لے کر قیامت تک ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ محرم کے آغاز ہی سے دکھ..... آلام..... اور دردِ غم کی فغاں پورے ماحول کا اپنے حصار میں لے لیتی ہے..... پہلی محرم سے سات محرم تک لشکرِ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہونے والے الم انگیز سانحے کی یادیں صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی تازہ ہیں۔

دہی یاس ہے، دہی دشت ہے، دہی گھرانہ ہے
مفلکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

آج بھی وہ مقصد زندہ ہے جس کی خاطر حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائیوں کا ایک وسیع جال ہمیشہ سے تیار رہتا ہے۔ اسلام کے خلاف مغربی اقوام عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشیں آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہیں۔ پہلے فلسطین کے معصوم شہریوں کو بیدردی سے شہید کیا گیا۔ اب امریکا بزدل کی ایران کے خلاف حملی جارحیت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سفید رچھ بھی مسلمانوں کو اطمینان و سکون سے رہنے نہیں دیں گے۔ ان کی دشمنی کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ گزشتہ دنوں رونما ہونے والے واقعات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ امریکا نے پہلے حملہ کیا..... اپنا کردار ادا کیا اور پھر جنگ بندی کا جھوٹا علم لہرا دیا۔ ایران اسرائیل جنگ تو رک گئی مگر اہم مسائل پائدار امن کے خطر ہیں۔ خاص طور پر انسانی فکر کا سب سے اہم نکتہ مظلوم فلسطینیوں کی حالتِ زار ہے۔ جن کا اسرائیل مسلسل قتل عام کر رہا ہے۔ اور امریکا کی پُر شفقت جھکیاں اس کی پشت پر ہیں۔ عالمِ انسانیت کو فلسطینیوں کی بھائی کے متعلق ترجیحی بنیادوں پر سوچنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں ”جس نے ناحق کسی ایک انسان کا خون بہایا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کر دیا.....“ مظلوم و نہتے فلسطینیوں کے اوپر اس وقت قاتل تک کی گئی جب وہ اپنے حکم کی آگ بجھانے کے لیے غذا کے منظر تھے۔

دکھ اور طرح کے ہیں دعا اور طرح کی اور دامنِ قاتل کی ہوا اور طرح کی

آئیے اس دعا کے ساتھ اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں۔

ممان سے محمد حسنین کے تعریف کے نوکرے آئے ہیں، لہذا یا حلوے کے نہیں..... بیٹھے الفاظ میں لکھتے ہیں ”دل فریب ناسل کے ساتھ جون کا جاسوسی شدید گرمی میں ٹھنڈے ٹھار مشروب کی طرح ملا۔ عید پر ملتا تو زیادہ مزہ آتا لیکن موصوف نے عید کے بعد ہی دید کردائی۔ ناسل غیر متوقع طور پر کافی بہتر تھا۔ نیچے مردانہ کارٹون کوئی خاص سنسنی پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ حسینؑ کو رعایت کے ساتھ دگش کہہ سکتے ہیں بس پکڑے جیسی ناک اگر ستواں ہوتی تو میں قبول صافی صاحب اسے اپنی کسی پرانی محبوبہ کا درجہ بھی دے دیتا۔ فہرست پسندیدہ مصنفین سے بھری ہوئی تھی لیکن پہلی حاضری چینی نکتہ چینی میں دی۔ ادارہ گری، جنگوں اور موجودہ حالات کی بہترین عکاسی کرتا ہوا ملاح اورج کے حوالے سے باتیں سب سے زیادہ پسند آئیں۔ آپ کو بھی گزشتہ عید مبارک۔ اپنی سستی اور کاپلی کو اول نمبر پر دیکھ کر حیرت ہوئی ورنہ اس بار تو لگا تھا کہ لیٹ ہونے پر ردی کی نوکری میں جگہ ملے گی۔ آپ کے شکفتہ و بے ساختہ جوابات کی شدت سے کی محسوس ہوئی۔ (جی نہیں، آپ کی دیری نے ہماری بنی بجمادی تھی) لگتا ہے کراچی میں گرمی زیادہ ہو گئی ہے اور اس کا اثر آپ پر بھی پڑ گیا۔ محمد اقبال صاحب اس بار اداس کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بھانجے اور خواہر سستی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ احمد فراز صافی کا ساہدہ موجود تبصرہ ایک ساتھ پڑھا جو بہتر ساہدہ تبصرے پر ہی مشتمل رہا۔ لگتا ہے پہلوانِ حبشت کی عدم موجودگی میں یہ خود پورا تبصرہ نہیں لکھ پارہے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی دس نمبری، دو نمبری سے تبدیلی نہیں ہوگی۔ سکھر سے سونالی صاحب کی پہلی آمد خوش گوار محسوس ہوئی۔ (جی، جی موسم خوشگوار لگ رہا ہے) امید ہے یہ ریگولر حاضری سے محفل میں ”دنا من شی“ کی کی کو دور کریں گی۔ احسن زمان کی پرانے شمارے پڑنی باتیں بھی اچھی لگیں۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس ہوں تو پھر تحریر کو پس پشت ڈال کر اسے پڑھنا ہی واجب ہو جاتا ہے۔ آتش سوزاں، خلافتِ توحیح کہانی حصوں کے بجائے محفل میں تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ فارسی تہنیتات اور شاعرانہ نثر میں کلا رک،

صوفیہ اور ڈیٹیل کی محبت کی نگوں کو بے حد خوب صورتی سے بیان کیا گیا۔ شوہر کھارک اور محبوب ڈیٹیل کے دورا ہے پر کھڑی صوفیہ کے جذبات بہتر بیان کیے جاسکتے تھے لیکن کہانی کی روانی نے اس جانب توجہ دینے کا موقع ہی نہ دیا۔ ایکشن بھی لا جواب تھا۔ آخر تک یہی محسوس ہوا کہ کھارک یا ڈیٹیل میں سے کوئی ایک قربان ہو جائے گا لیکن رائٹر نے ٹوٹ ڈال کر کہانی کو ختم کر دیا۔ بہت مزہ آیا، بڑے عرصے بعد جنگ عظیم کے پس منظر میں کوئی اتنی شاعرانہ کہانی پڑھنے کو ملی۔ ابراہیم عبدالہادی کی کاوش پہلے پر دہلا مناسب سی گئی۔ دراصل یہ بکلی چوری ہمارے ارد گرد معاشرے میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب ایسے واقعات میں کسی نئے پن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کہانی کا سبق اچھا تھا۔ عبدالرب بھٹی کی مات بھی مناسب تحریر تھی جس کی طوالت ڈرامہ ہوتی تو زیادہ لطف آتا۔ ماہ نور نے اس بار مایوس کیا۔ آوارہ گولی پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے پہلے بھی پڑھی ہو۔ ان کی کہانیوں میں جو چوکا دینے والا عنصر ہوتا ہے وہ بھی اس بار مفقود تھا۔ طاہر جاوید مغل کی سرکف کی بات ہی الگ ہے۔ صرف تین اقساط ہوئی ہیں اور اس نے پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ تابش کی یادداشت واپس آئی گئی اور یادداشت جانے سے پہلے کے واقعات بھی پتا چل گئے۔ شاہ رخ وین جتا ہے یا نہیں یہ تو اگلی قسط میں ہی معلوم پڑے گا لیکن کہانی کے اینڈ میں شاہ زیب کی اینٹری حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ خوش کن بھی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اب دو دو ہیروز آپس میں ٹکرائیں گے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ عمران قریشی نے گھر کی مرئی لکھی جس کا مرکزی خیال اچھا تھا لیکن اختتامِ جلت بازی میں پیش کیا گیا۔ کہاں نوٹے میاں بالکل اپنی بیوی کو چھپا کر رکھتا تھا اور کہاں وہ کامیابی سے چکر چلاتی رہی، کچھ عجیب سا ہی لگا۔ نکس فاطمہ کی جرات پورا نہ ایک زبردست ترجمہ تھی۔ کہانی کا آغاز اپنے انجام سے بالکل ہی مختلف تھا۔ حسام بٹ کی دہر کامیابی سے اپنی منازل طے کر رہی ہے لیکن کہانی کی سستی بڑا پرکرتی ہے۔ ایک جانب مغل صاحب نے تین اقساط میں ہی آٹھ دس ماہ گزاردیے ہیں اور یہاں بٹ صاحب چار اقساط میں ایک دن بھی پورا نہیں کر پائے ہیں۔ مرزا کے باب کا ریسک مشن کامیابی سے مکمل کیا گیا جسے پڑھ کر مزہ آیا۔ اسرائیلیوں کی سازشیں بھی بھرپور طریقے سے عیاں کی گئیں۔ کہانی کی رفتار کے علاوہ اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ تحلیل جبار کی انتقام کی آگ سیدھی سادی سی گئی۔ کہانی میں کوئی ٹوٹ نہیں تھا۔ ذیشان اختر کی جلی کرنی نے یہ ٹوٹ والی کی دور کردی۔ کہانی نے اتنے موڑ لیے اور اتنے چکر کھائے کہ مجھے خود بھی چکر آ گئے۔ باقی سارے ٹوٹ تو قائل قبول تھے لیکن آخر میں رخصتی سے نکل کر ایجنٹ بن کر نکلی تو سر پیٹ لینے کو دل کیا۔ کہانی بہر حال ان سب شکایتوں کے باوجود پسند آئی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اس بار لا جواب تھیں۔ مظہر سلیم ہاشمی کی آپریشن فائلس ٹیک تازہ ترین حالات کی بہترین عکاس تھی۔ انڈیا کی سازشوں کے پس منظر میں یہ سرورق ایکشن اور قہر کا بہترین احتراز تھا۔ سرچاری اور نارنگ کے کردار بہترین لکھے گئے تھے اور آخری لڑائی میں انتقام ہی رہا کہ کون دوسرے کا خاتمہ کرے گا لیکن غیر متوقع انجام نے حیران کر دیا۔ ایسی مزید کہانیاں پیش کرنے کی درخواست ہے۔ (ہم تو رائٹر سے کہتے ہیں مگر ان کی ایک مجبوری ہے کہ وہ..... کچھوے کی طرح ست ہیں) علی عباس اپنے پرانے کردار میر حسن صحابی کی نئی کہانی بکھرتے خواب کی صورت میں لے کر آئے۔ پندرہ بیس سال پہلے کے واقعات کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا۔ کہانی میں ایکشن تو کم ہی تھا لیکن انداز تحریر نے جکڑے رکھا اور ایک ہی نشست میں مکمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ ویلڈن علی عباس صاحب۔ جون کا شمار زبردست رہا۔ اب دیکھتے ہیں آپ جولائی میں کیا سوغاتیں پیش کرتے ہیں؟“ (انشاء اللہ..... بہترین)

راولپنڈی سے سہانا شیخ لکھتی ہیں ”جاسوسی ڈائجسٹ اس بار عید پر ملا اور عید پر مزے ہو گئے۔ سر پر اسکارف اور پیاری پیاری آنکھوں والی لڑکی بہت پیاری لگی۔ تھوڑی سی بلی اور تھوڑی سی کیوٹ اور زبردست اتر رنکز باقی کچھ خاص نہیں لگا۔ ٹیڑھی میڑھی بلڈنگ اور لڑتے جھگڑتے مرد۔ میں نے اپنے فیس بک کے جاسوسی فینز آفیشل گروپ میں پرانے ٹاکسل دیکھے ہیں، وہ بہت خوب صورت ہوتے تھے۔ اس میں پھوٹن بھی بہت اچھی ہوتی تھیں۔ کاش ایسے ٹاکسل اب بھی بنائے جائیں۔ چینی نکتہ چینی میں کئی مہینے بعد چکر لگ رہا ہے اس لیے کچھ نئے اور کچھ پرانے نام دیکھنے کو ملے۔ (غائب کہاں تھیں؟) حسنین صاحب تو ہر بار ہی ہوتے ہیں۔ اقبال صاحب کے بھانجے کی وفات کا پڑھ کر آنسو ہوا۔ احمد فراز نے تو جھپٹے سینے والا لیٹر پھر بھیج دیا۔ سونالی شیکھر کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جاسوسی کی دنیا میں دیکم بہناں۔ جاسوسی میں اس بار بہت اچھی کہانیاں تھیں لیکن میں پہلے بڑی کہانیوں کی ہی بات کر دوں گی۔ امجد رئیس نے نوا ستوری لکھی جسے پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ یہ جب بھی لکھتے ہیں کچھ خاص لکھتے ہیں جو دل پر اثر کرتا ہے۔ صوفیہ بے وفا تھی اور شوہر کو دھوکا دیتی رہی لیکن پھر بھی اس کہانی میں دل لگا رہا۔ ڈیٹیل پائلٹ اور کھارک جاسوس کی جوڑی نے بڑا اچھا ایڈ وچر کیا۔ بہت اچھا ناول تھا۔ طاہر جاوید مغل کی سرکف تو جب سے شروع ہوئی ہے، جاسوسی پڑھنے کا مزہ دو بالا ہو گیا ہے۔ ہر قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اس قسط میں تو بہت تھوڑی جھلک دکھائی دی ہے۔ عمران بھی کم ہے، امید ہے وہ بھی اگلی قسط میں مل جائے گا۔ اچھا ایک مزے کی بات بتاؤں یہ کہانی اتنی زیادہ پسند کی جا رہی ہے اور لوگ اس کا اتنا انتظار کر رہے ہیں کہ ابھی صرف تین قسطیں آئی ہیں اور گروپ میں چوتھی قسط مانگ رہے ہوتے ہیں۔ میں تو سب سے پہلی کہتی ہوں کہ اگر اتنا ہی شوق ہے تو ڈائجسٹ خرید کر پڑھ لو۔ (بالکل) قدرت اللہ نیازی بھائی کہتے ہیں کہ ان

لوگوں سے کچھ بھی ایکسیکٹ کیا جاسکتا ہے۔ کل کو یہ لوگ پورا ناول بھی ڈیمانڈ کر سکتے ہیں چاہے ابھی ہیش بھی نہ ہوا ہو۔ دہر کی یہ قسط بھی بہت اچھی تھی۔ یہودیوں کو فلسطین پر ظلم کرتے دیکھ کر دل کڑھتا ہے لیکن شکر ہے جاسم ان سے کچھ نہ کچھ بدلہ تو لے رہا ہے۔ منظر سلیم ہاشمی کی آپریشن ٹالس فلک تو اس بار سپر فاسٹ رولر کو ستر تھی۔ پورے ڈائجسٹ کی بیسٹ کہانی تھی۔ ہالی ووڈ مودی وغیرہ دیکھ کر ہمارے دل نرم ہو چکے لیکن انڈیا ہمارا کتنا بڑا دشمن ہے حالیہ جنگ نے سب ثابت کر دیا ہے۔ کہانی میں فائنل سین بہت اچھے لکھے ہوئے تھے۔ سرد دل تھا لیکن اس کے مرنے کا انوس ہوا۔ کاش اس کی جگہ بشام مر جاتا۔ کہانی فکشن سے زیادہ حقیقت محسوس ہوئی۔ ایسی کہانیاں وقت کی ضرورت ہیں تاکہ دشمن کی سازشوں سے ہم آگاہ رہیں۔ علی عباس کی بکھرتے خواب بھی ایک بہت اچھی کہانی تھی۔ ملک مشہود پر مجھے حلق تو ہوا تھا لیکن انڈیا میں پتا چلا، وہ اکیلا مجرم نہیں تھا بلکہ راکشمن، راکشمن، راکشمن بھی شامل تھے۔ صفری بھی دلن ہی تھی۔ اپنے ہی شہر کے ایسے حالات پڑھ کر انوس ہوا لیکن بلڈر مافیا نے ہمارے پیارے اسلام آباد کا بہت برا حشر کر رکھا ہے۔ ایسی ایسی کالونیز بھی ہیں۔ جو گھوسٹ کالونیز کہلاتی ہیں کیونکہ۔۔۔ ایسی سازشوں کے ذریعے وہاں کے کمینوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں آوارہ گولی اور گھر کی مرئی بہت پسند آئیں۔ فنی فنی سی لگیں۔ ذیشان اختر کی جلی کرئی بھی بہت اچھی لکھی ہوئی تھی۔ نیلے پردہ ہلا پسند نہیں آئی۔ بات بھی ایک اچھی کہانی تھی۔“

کراچی سے محمد اقبال کی ادھوری باتیں ”ماہ جون کا شمار وقت مقررہ سے کچھ لیٹ ملا اس میں ہماری اپنی ہی کوتاہی تھی۔ بہر حال مختلف کلرز کے ساتھ ناکل اچھا لگ رہا ہے۔ خوب صورت حسینہ بے نیازی سے جانے کس کی راہ تک رہی ہے۔ نیچے دو سوئٹ ہوٹل آدی اپنے لباس کے بالکل برعکس ہاتھ پائی میں مصروف ہیں۔ سب سے اوپر عید الاضحیٰ مبارک خوب صورت لگ رہا ہے۔ فہرست عمدہ ہے۔ امجد رئیس کے نام نے تو سونے پر سہاگا کر دیا ہے۔ عید الاضحیٰ پر یعقوب بھٹی کی آمد کی امید تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ ہمیشہ کی طرح ادارہ عمدہ تھا۔ محفل میں محمد حسین اپنے عمدہ تہرے کے ساتھ اول نمبر پر موجود تھے۔ احمد فراز صافی نے اپنے طویل تہرے کے ساتھ جگہ بنائی۔ سکھر سے سونالی شکھر کی پہلی حاضری اچھی لگی۔ مستقل آنے کی کوشش کیجیے گا۔ (جی اچھی طرح سن لیں) آخر میں احسن زمان کا مارچ کے شمارے پر تہرہ موجود تھا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سرکف سے شروعات کی۔ بد نصیب غیر ملکی لڑکی کے انکشاف نے تابش اور عمران کو حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا۔ کہانی میں چافٹی کے نام نے چونکا دیا۔ چافٹی کے مقام پر ہی پاکستان نے انہی دھماکا کر کے دنیا بھر میں دھماکا کر دیا تھا۔ بہر حال کہانی میں تابش کی یادداشت واپس آنے کے بعد زیادہ مزہ آرہا ہے۔ تابش، عمران وغیرہ سے کن حالات میں بچھڑا تھا، یہ بڑی سنسنی خیز اسٹوری ہے۔ اب تابش، عمران، وقاص، انوش کی بازیابی کے لیے تیزی سے سرگرم ہے اور ہر رکاوٹ سے نکرانے کے لیے تیار ہے۔ کہانی بھر پور انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر کردار اپنی جگہ فٹ ہے۔ عمران قریشی گھر کی مرئی کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت عمدگی سے کہانی ترتیب دی گئی، مزہ آیا۔ ذیشان اختر کی جلی کرئی لے کر حاضر تھے۔ بہت زیادہ اچھی نہیں لگی۔ کہانی کے حساب سے رخشی کا کردار کمزور لگا۔ بس مناسب تحریر تھی۔ علی عباس بکھرتے خواب کے ساتھ موجود تھے۔ سادہ سے انداز میں تحریر کی گئی کہانی اچھی لگی۔ امجد رئیس، آتش سوزاں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی کہانی منسلک اور سکون سے پڑھنے والی ہوتی ہے جو اپنے سحر میں ایسے جکڑ لیتی ہے کہ پڑھنے والا اختتام پر جا کر رہتا ہے۔ کہانی میں سب کچھ موجود ہوتا ہے پڑھنے والے کے لیے۔ رومانس، ایکشن، سسٹنس۔ رومانوی ڈائلاگ ایسے ہوتے ہیں کہ بس۔۔۔ ایکشن بھر پور ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو، ایسی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے سارے کردار اپنی جگہ بھر پور تھے۔ ویلڈن امجد رئیس صاحب۔ حسام بٹ کی دہراپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ موجودہ حالات میں تو اس کہانی نے جلی کرئی پر تھل کا کام کیا ہے۔ یہودیوں کی سازشیں اپنے عروج پر ہیں۔ ایران نے ان کو بہت بھرپور طریقے سے ٹھٹھکا دیا ہے۔ اللہ پاک اسے کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ جاسم بھی وقتاً فوقتاً یہودیوں کو ڈک پہنچا رہا ہے۔ کہانی میں نئے کردار بھی شامل ہو رہے ہیں بہر حال نئے بھرپور ایکشن کا انتظار ہے۔ ابراہیم عبدالہادی کی نیلے پردہ ہلا پڑی۔ بہت عمدگی سے کہانی کو ترتیب دیا گیا اور معاشرے میں پھیلے ناسور کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ اچھی لگی کہانی۔ فی الحال اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔“ (اگلی بار پورا پڑھ کے آئیں ورنہ تو مزہ ملے گی۔۔۔)

ضلع بہاولنگر سے احمد فراز صافی کی فرمائشیں ”اپنے خط کے ساتھ گزشتہ تہرے کا دوسرا اور ”حذف سے پاک ایڈیشن“ چپا دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی تاہم یہ ڈر بھی ہے کہ اب مجھے ”احمد فراز صافی“ ہی نہ بلایا جانے لگ جائے۔ ہاں البتہ تحسین بھائی! آپ کے لیے میری فخریہ پیشکش ہے کہ مجھے براہ راست ”قسائی“ بھی کہنا چاہیں تو بعد شوق! کیونکہ اس بار یہ تو واضح ہو گیا کہ ”تہرے کو دیکھ کر تہرہ بریکٹ پکڑتا ہے“ اور یہ آپ کا فیضان نہیں تو اور کیا ہے۔ بھائی اقبال! آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ پاک مرحومین کی بے حساب مغفرت فرمائے اور آپ کے تہرے کو پہلے ہمیں طوالت اور ”عظمت رفتہ“ بخشنے۔ یقین جانے آپ کا مختصر نام۔

پڑھ کر وہی احساس ہوتا ہے جو قربانی کے دن گوشت کے لیے کسی قطار میں لگ کر فقط ایک بوتلی لٹنے پر ہوتا ہے۔ سونالی دیدی! آپ کا سواگت ہے۔ بڑی پرستار ہوئی کہ آپ اس محفل میں پدھاریں اور مبارک ہوا آپ کا "الٹی میٹ ہیر" سربکف میں جلوہ دکھانے آگیا ہے۔ اب آپ کا کر تو یہ ہے کہ ہر مہینے آکر ایک اچھی پنکھی ہونے کا ثبوت دیں۔ جناب احسن زمان صاحب! آپ کا جست جملوں پر مشتمل فکر انگیز تجزیہ دو ماہ بعد بھی بالکل تازہ ہی محسوس ہوا۔ آپ جیسے راہنما سے یہ گزارش ہی کر سکتا ہوں کہ ہر ماہ رونق بخشا کیجیے۔ مدیر جی! آپ نے جو لوڈ شیڈنگ کے ڈیک زدگان کی ترجمانی کی وہ تو آپ کی قوم دوستی کا منہ پھلنا ثبوت ہے ہی۔ اس کے علاوہ جو چیز آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خراج تحسین پیش کرنے پر اکسار ہی ہے وہ اس بار رسالے کی قابل قدر صفحات ہے۔ جی ہاں! ایک ہل کے لیے تو یوں لگا جیسے 258 صفحات کا شمارہ ہاتھ میں آگیا ہے۔ اور اراق کی موٹائی، پائیداری، صاف رنگت اور "کڑک پن" نے مزہ دو بالا بلکہ دو آتشہ کر دیا۔ (ہماری بھی یہی کیفیت تھی) دہری کی حالیہ قسط میں ایک طرف طیاروں کے تعارف اور دوسری طرف "سڑک (پیٹرک)" کی بازیافت نے اشکار کا "مرامت" دیکھنے سے محروم رکھا۔ کہتے ہیں دو چیزوں میں بالکل تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ نمبر ایک..... جب اولاد جوان ہو جائے تو اس کی شادی کرنے میں اور نمبر دو..... جب کوئی مر جائے تو اس کی تکفین و تدفین میں جبکہ یہاں تو کم از کم مہینہ اور لگے کا مرحوم کو آخری آرام گاہ تک پہنچنے میں۔ سربکف کے حوالے سے دو باتیں کروں گا۔ ایک ادارے سے اور دوسری مصنف سے۔ پہلی بات..... کہانی کے "سر" پر آپ نے جو لفظ "حصہ" کا "کفن" باندھ بلکہ "تکوار" لٹکا رکھی ہے اسے "قسط" کے "خود" سے بدل دیجیے کیونکہ مشاہدہ ہے کہ "حصہ والی" کہانی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری بات..... مثل سرا! ڈیوٹی اور زانی کا "جوڑا" بنانے سے پہلے یہ جان لیجیے کہ کہانی "کے باز" ابھی ہم بھولے نہیں ہیں جس میں "جسپ عدیل" بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے "دوچار" ہوا تھا۔ مقصد صرف یاد دہانی ہے ورنہ آپ دن کو رات بھی لکھیں تو بسرو چشم۔ (نہ نہ نہ جی ہماری کیا مجال) اور ہاں اب پرانے کرداروں کو بھی لے آئیے نا! عمران دانش کے قریبی ساتھی، تابش کے خاندان والوں کی جھلک اور خاص طور پر ثروت کی بہن نصرت جو سینے میں عمران کا جگر لیے جانے کہاں جا چھپی ہے۔ اور پھر سلطانہ کا لاڈلہ "بالو" (بس کر دیں) اس کے بارے کیا فیصلہ کر رکھا ہے؟ اودہ..... یہ تو تین باتیں ہو گئیں۔ لیکن بات ہی ایسی تھی کہ باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔ خیر کوئی اسے نہیں، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کی "باتوں" میں۔ لہذا اسے بات برائے بات کے زمرے میں لے کر بات آگے بڑھاتے ہیں تا کہ بات "باتوں گڑھ" نہ بن جائے۔ ابراہیم عبدالہادی نے موجودہ دور کے "سسٹم" کی منصفانہ اور عادلانہ تعریف بیان کی۔ گمر کی مرغی میں ران قسبی نے ہر گمر کی مرغی..... میرا مطلب کہانی دلچسپ ہیرائے میں پیش کی۔ گمر کی خالص دودھ پتی بھی اتنے شوق سے نہیں پی جاتی جتنی "جیل" ہے۔ "جیل" ہے جو شانہ جات" کی نام نہاد جائے پی جاتی ہے۔ ذیشان اختر کی "جعلی کرنسی" مجموعی طور پر عمدہ کاوش تھی مگر رشتی کا مار پیچا ہونا ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اگر کرنسی کا چکر اس کے علم میں تھا تو اس نے پہلے ایکشن کیوں نہ لیا اور اگر علم نہیں تھا تو وہ جاسس کس کی..... کس کے خواب میں میر صاحب کے بے ساختہ جملوں اور قہقہوں کے ساتھ ان کی تفتیش کی گاڑی بلکہ پھٹ پھٹی موٹر سائیکل بہت ران اور دلچسپ ہیرائے میں باپ رے..... پھٹ پھٹی سے یاد آیا۔ مجھے تو موٹر سائیکل مرمت کروا کے لانی تھی اور پھر زوجہ محترمہ کو ان کے گھر چھوڑنے جانا تھا۔ باپ رے باپ اب تو گئے کام سے.....

جہلم سے محمد احسن زمان کی زبانی عوام کے خواب "جون کے شمارے کے بارے میں اُمید تھی کہ عید سے قبل ہی جلوہ افروز ہو جائے گا لیکن اس کا کیا کیجیے کہ شمارہ 12 جون کو ملا، ہندوستان سے نبرد آزما کی کارمان دل ہی میں رہا۔ اب میدان اسرائیل اور ایران کے درمیان گرم ہو چکا ہے۔ ہر دو اطراف سے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے دعوے کیے جا رہے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ جنگ میں سب سے پہلی موت بچ کی ہوتی ہے۔ ہماری ریاست کو اس بات کا ادراک ہے اور اندازہ بھی کہ ہمارا ملک دشمن کی آنکھوں میں بری طرح کھنک رہا ہے۔ اللہ شیطان کے شر اور بری نظریے ہمیں محفوظ فرمائے۔ سرورق میں مجھے کچھ خاص نظر نہیں آیا اس لیے اشتہارات اور فہرست کو پھلانگ کر محفل ہاؤس میں بدولی سے داخل ہوا کیونکہ پچھلے ماہ خط نہیں لکھا تھا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ مارچ کے شمارے کا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ میری تو گویا 29 ویں کی عید ہو گئی۔ پہلے باندان پر حسین صاحب کو رونق افروز پایا، انہوں نے تبصرے لکھنے کا حق ادا کیا۔ اقبال صاحب اختصار بے کے ساتھ تھے لیکن دکھ کی خبر کے ساتھ، اللہ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ احمد صافی کا تبصرہ تھا یا شیطان کی آنت، ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ارے ناراض کیوں ہو رہے ہیں مذاق کر رہا ہوں، بہت مزہ آیا جیسے چائے سے پہلے نمکو پیش کی جاتی ہے ویسے ہی شمارہ شروع کرنے سے پہلے صافی صاحب کا خط مزہ دے گیا۔ سکمر سے سونالی صاحبہ کو خوش آمدید، امید ہے اپنی حاضری تو اتارے لگوائی رہیں گی۔ آتش سوزاں ایک دل موہ لینے والی کھا تھی۔ دل کا معاملہ ہوتا ہی ایسا ہے کہ یہ تالی ایک ہاتھ سے بھی بج اٹھتی ہے جب انسان تجوب کے چشم فسون گرا دیر گیسوئے دراز کے بیچ و

ختم میں اُلجھ جاتا ہے تو پھر کہیں کا نہیں رہتا یہی ڈیٹیل اور صوفیہ کے سچ ہوا۔ ان کی محبت کی چنگ آسمانوں کو چھو رہی تھی کہ قدرت نے رقیبِ رویہ کو ہمراہ کر دیا تو اسے اور اک ہو گیا کہ صوفیہ کی بھی گئی تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا کیونکہ وہ جیسے ساری زندگی کلاک کی یاد میں آنسو بہاتی رہے گی۔ اس نے مشن کے دوران کلاک کی والہانہ محبت کا نظارہ کر لیا تھا پھر وہ قدم اٹھایا اس کے لیے بیڑا جیسا حوصلہ اور سمندر جیسا وسیع دل گرہ چاہیے۔ اردو کی بعض ترکیبات کے استعمال نے داستانِ محبت کا رنگ دوبالا کر دیا، کم از کم دوبار آنکھیں پھٹ گئیں۔ امجد بخش کسی گریٹ ہو۔ پہلے پہلا ہمارے معاشرے کا وہ پہلو ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، ہم میں سے ہر شخص اس وقت تک ایمان دار ہے جب تک بے ایمانی اس کے قریب آجائے۔ یعنی ہم ایمان داری اور بے ایمانی کے کئی سراپا پر گامزن ہیں جیسے ہی پاؤں پھسلا، سارے دھڑ بے معنی ہو جاتے ہیں اور ہم فوراً کہہ اٹھتے ہیں سب ہی تو کر رہے ہیں، میں نے کر لیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ بس اسی سوچ نے بیز افرنی کر رکھا ہے۔ بھٹی صاحب کی مات مجرموں کے لیے ایک سبق تھی۔ انارڈی ہونے کی وجہ سے سارے ہی مجرم اپنے انجام کو پہنچے۔ ماہ نور کی آوارہ گولی مغرب زدہ معاشرے میں محبت کی انہونی داستان تھی، برنارڈ کو اپنے کیے کی سزا مل گئی اور ویزلی کا دماغ ٹھنڈا ہو گیا۔ شاید مغربی معاشرے کا یہی چلن ہوگا۔ مثل صاحب کی سرکف سنسنی خیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور ایسے خوفناک انداز سے بڑھ رہی ہے کہ دل قدم قدم پر دہل جاتا ہے، بلوچستان کے لٹ و دق ویرانوں میں لڑی جانے والی جنگ خونچکاں ہوتی جا رہی ہے، اپنی رعایا کو، جی ہاں رعایا کو جدید تعلیم سے محروم رکھنا ایک ایسا مشن کہ ایجنڈا ہے جس پر ہر ڈیرا، ہر سردار، ہر خان، ہر چوہدری مشغول ہے اور حکومتوں کی جیسا نکلیاں ہونے کی وجہ سے ہر آنے والے وقت کے ساتھ مزید طاقتور ہو کر سفاک ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کا اندازہ دیکھی علاقوں کی مفلوک الہالی اور تعلیم کی سہولتوں کے فقدان کو دیکھ کر بخوبی ہوتا ہے۔ انوش جٹ اور مصطفیٰ نے اس ساری جدوجہد میں اپنی مقدور بھر کوشش کی کہ مغویان سے ملاقات ہوئی جائے گی لیکن آخر میں پٹاری سے کچھ اور نکل آیا۔ عمران قریشی گھر کی مرغی کے ساتھ حاضر تھے، ہلکے پھلکے انداز میں ہمارے معاشرے کا ایک تاریک پہلو، روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے معاشرے کی بہت بگڑتی جا رہی ہے کیونکہ ہم نے اپنے پاؤں چاروں سے زیادہ پیلا لیے ہیں۔ بد نظری کا سیلاب سب کچھ بہا کر ساتھ لے جا رہا ہے اور ہم خوابِ خرگوش کے حُرے لے رہے ہیں۔ جبری اور پوری کو جنم دہاں کر کے جوزف نے قانون کے لیے کافی آسانی پیدا کر دی کیونکہ ہر معاشرے میں جس کی لاشی اس کی بھینس کا قانون چلا ہے۔ دہراب مکمل یکسانیت کا شکار ہو چکی ہے، وہی مارکنائی اور پھر آخر میں ٹائم ٹریل۔ حسام بٹ سے گزارش ہے کہ کچھ نیالائیں۔ انتقام کی آگ نے سب کچھ بھسم کر دیا، چارلس شخص جلد بازی اور ناٹائی ہونے کی وجہ سے قانون کے شکنجے میں آ گیا وہ نہ تو وہ اپنا کام مکمل کر چکا تھا لیکن ہونی بہر حال ہو کر رہتی ہے۔ جھلی کر کسی ایک روا جی سی کہانی تھی، گوکرا وجھے کا سہ اتار چڑھاؤ ہوئے لیکن جرم کی داستان چلتی رہی اور انجام وہی جو کہ ان لوگوں کا مقدر ہوتا ہے، اچانک کسی سمت سے آنے والی نامعلوم گولی کا شکار اور معاملہ ٹائیں ٹائیں نش لیکن تمام تر رکاوٹوں کے باوجود یہ دھندا جاری رہے گا۔ ملک کے سلامتی کے ادارے چونکہ تو ہوتے ہیں لیکن چور کہیں نہ کہیں سے راستہ نکال ہی لیتے ہیں۔ آپریشن فالس فلیگ بمسایہ ملک کے مقبوضہ علاقے میں ہوئے ایک جھوٹے واقعے کی کھانسی جس کو بنیاد بنا کر اس نے ہمارے ملک کو تہہ بالا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مظہر سلیم صاحب نے اس کے تانے بانے ملانے کی مقدور بھر کوشش کی، یہ تو اب روز روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ پہلے کام کا سانحہ آج کیا ہوا ڈراما تھا جس کی آڑ لے کر دشمن نے ہمیں دنیا میں ایک دہشت گردور پاست قرار دلوانا تھا لیکن جس کا کوئی نہیں، اس کا تو خدا ہے یارو..... ایسے سانحات ہمیشہ تب رونما ہوتے ہیں جب اندر سے کچھ غدار دشمن کے ساتھ مل جاتے ہیں، بہر حال کہانی میں بھی اور حقیقت میں بھی ابھی یہ آپریشن جاری ہے، ان شاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ علی عباس کی بکھرے خواب ایک ایسے مافیاء و مفریت کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی سعی تھی جس کا اصل چہرہ ہم جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اندر خانے نہ جانے کیا کچھ چل رہا ہوتا ہے اور ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ ایک صفائی اچھا خاصا سراغ رساں ہوتا ہے اگر وہ اپنے پیٹے کے ساتھ قلمس ہوا اور اپنا کام بھی جانتا ہو۔ جو کام قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کرنے والے تھے وہ ایک صفائی کر رہا تھا اور کافی خوبی سے کر رہا تھا۔ سوسائٹی مافیاء نے ملک کو تہہ نقصان پہنچایا ہے۔ ایک تو قابل کاشت زمین پر کنکریٹ کا جنگل کھڑا کر دیا جس سے موسمیاتی تبدیلی نے جنم لیا اور سارا نظام قدرت ہی ٹپٹ ہو گیا اور پھر پلانٹوں کے نام پر بے گھر لوگوں کے خوابوں کے ساتھ کھلوڑ۔ ملک کے طاقتور لوگ ہمارے خواب ہماری جمع پونجی کے عوض ہم سے خرید لیتے ہیں اور پھر قسمت والے ہی مکان دار بن پاتے ہیں، انجامِ گلستاں کیا ہوگا، یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

آفاق احمد، کوٹری۔ خداد احمد، کراچی۔ فہمیدہ آفتاب، حیدرآباد۔ شفیق اللہ، پشاور۔

انتقام کے شعلے

احمد سلیم سلیمی

اصولوں اور انصاف کے تقاضوں پر چلنے والے افراد کی اکثریت سے ہی ایک مذہب معاشرہ تشکیل پاتا ہے... اگر انصاف کرنے والے ہی قانون کو طاق پر سجادیں تو پھر ارد گرد جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے... وہ انسان کو مکین و آشتی سے جینے نہیں دیتا... ظلم و استبداد... قتل و خون ریزی... حرص و ریاکاری... کمینگی اور خیانت یہ سب عناصر معاشرے اور اس کے مکینوں کے لیے زہر قاتل ہیں... لا قانونیت میں گھرے ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... جو نیک نیتی اور سچائی سے اپنا فرض نبھاتا تھا... مگر اس کے افسران کو اس کی سچائی اور قانون پسندی قابلِ مصلحت نہیں... ظالم اور جبر سے اس کا رشتہ جڑ گیا... قدم قدم پر... درد بڑھتے گئے... جبر و تناؤ نے اس کے اندر بغاوت... احتجاج اور انصاف کے شعلوں کو بھڑکا دیا... انہی شعلوں میں گھری ایک آتش فشاں کہانی کے سنسنی خیز اثار چڑھائو...

علم بغاوت سے لبریز ایک محب وطن کی مجرموں کے خلاف شہت الخیر کارروائی.....

انسپکٹر کرم شاہ ویسے تو روایتی تھانیدار تھا۔ بدو ماغ، اکھڑ مزاج، گالی باز، انکاؤنٹر اسپیشلسٹ وغیرہ مگر ایک خونی اس میں ایسی تھی جو اس کی شخصی اور پیشہ ورانہ خامیوں پر بھاری تھی۔ جو بہت کم کسی تھانے کے انچارج میں پائی جاتی ہے۔ وہ تھی اس کی اصول پسندی اور بے باکی۔

اس کے دماغ میں صاف گوئی اور اصول پسندی کا کیڑا گھسا ہوا تھا۔ یہ کیڑا اکثر و بیشتر کھلاتا تھا اور اس سے ایسے افعال سرزد ہوتے تھے کہ پولیس محکمے میں اوپر سے نیچے تک تھرھکی مچ جاتی تھی۔ آئی جی کو سیاسی اور مذہبی لوگوں کے فون آتے تھے۔

آئی جی ایس بی کونون کرتا تھا۔ وہ انسپکٹر کرم شاہ کا مواخذہ کرتا۔ انسپکٹر کرم شاہ کہتا۔ ”سرا میں نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ قانون کے مطابق ان کو گرفتار کیا ہے۔ یہ بندے مقامی سطح پر ڈرگرسپلائی کرتے تھے۔ ان کو مال سمیٹ پکڑا ہے۔“

مذہبی جماعت کے بندوں کی چارج شیٹ پیش کرتے ہوئے کہتا۔ ”سرا آپ تو جانتے ہیں یہ مذہبی جماعتوں کے لوگ ٹائم بم کی طرح ہوتے ہیں۔ بس شن دبانے کی دیر ہے۔ ان کے پھٹنے کی دیر نہیں۔ یہ مزمان مخالف فرقے والوں

کی عبادت گاہ کے سامنے جا کر اشتعال انگیز نعروں کا رہے تھے۔ ان کے عقائد کو جراثیم بھلا کہہ رہے تھے۔ جب مخالف فرقے والوں نے منع کیا تو الٹا دنگ فساد پر اتر آئے تھے۔“

ایس پی اے بھی اور اس کے کام کو بھی جانتا اور مانتا تھا لیکن بڑی کرسی کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر دباؤ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قانون اور ضابطے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ مصلحت اور سمجھوتے کا بول بالا ہوتا ہے۔

وہ قانون اور اصول کی بات کرتا۔ جبکہ ایس پی اے آئی جی کا حوالہ دے کر سیاسی اور مذہبی دباؤ کی مجبوریوں بیان کرتا۔ ہمیں سے اس کا محکمے کے بڑوں سے ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اس کے دماغ سے صاف گوئی اور اصول پسندی کا کیڑا کن سمجھوتے کی طرح چٹ جاتا۔ انجام کار سارا نزلہ اسی پر گر جاتا۔ افسران بالا کی حکم عدولی کا نتیجہ سمجھتا اس کی قسمت بن جاتا۔

اسی لیے اپنی پچیس سالہ سروس کے دوران متعدد بار وہ معطل ہوا تھا۔ دور دراز اسٹیشنوں میں پوسٹنگ تو اتنی مرتبہ ہوئی تھی کہ اسے گنتی بھی یاد نہیں تھی۔

انسپیکٹر کرم شاہ اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا۔ اس کے ہم عصر اس وقت ڈی ایس بی ریگ تک پہنچ گئے تھے مگر وہ افسران بالا سے اپنے بے چلک رویے کی بدولت انسپیکٹر کے عہدے پر آ کر رک گیا تھا۔ ان دنوں اس کی ڈیوٹی لاہور کے باہر شاہدرہ کے ایک پولیس اسٹیشن میں تھی۔ یہ علاقہ بڑا بدنام تھا۔ منشیات فروشوں کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔

انسپیکٹر کرم شاہ کو اس تھانے کا چارج سنبھالے ابھی ایک مہینہ ہوا تھا۔ اپنے تھانے کی حدود میں ہونے والے جرائم کی تفصیلات جان کے وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اس کی سروس کا سب سے مشکل اسٹیشن ہے۔

وہ مشکل پسند تھا۔ بے خوف بھی تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کے اڈوں پہ سینتھان کے جاتا تھا۔ گالی اور گولی کا بے دھڑک استعمال کرتا تھا۔ کئی بار غنڈوں، بد معاشوں اور پیشہ ور قاتلوں کے ہاتھوں مرنے سے بال بال بچا تھا۔

شاہدرہ کے اس پولیس اسٹیشن میں اسے کئی طرح کے چیلنجز درپیش تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ منشیات فروشوں سے منٹنے کا تھا۔ تھانے کے اسٹاف اور پرانے ریکارڈ سے وہ جان گیا تھا کہ متعدد گینگ یہاں موجود تھے۔

اس کے لیے دوسرا بڑا چیلنج قمار بازی کے اڈے تھے۔ شہر کی بااثر اور طاقت ور شخصیات ان جوئے کے اڈوں کی سرپرستی کرتی تھیں۔ اسے یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے کسی تھانیدار نے قمار بازی کے ان اڈوں پر چھاپا

مارنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

تھانے کا عملہ نا کافی تھا۔ اس علاقے کے مخصوص مجرمانہ ماحول کی وجہ سے ان کی ہوا پہلے ہی اکھڑی ہوئی تھی۔ انسپیکٹر کرم شاہ کے پیش رو تھانیدار چونکہ کم ہمت اور مصلحت پسند تھے۔ اس لیے باقی عملہ بھی سست، کامل اور غفلت شعار ہو گئے تھے۔ ایک ہی مہینے میں انسپیکٹر کرم شاہ کے تیور اور عزائم جب ان پر کھلے تو حیران کم پریشان زیادہ ہوئے تھے۔ انہیں خوف محسوس ہوا تھا کہ یہ نیا مہم جو افسر اپنے ساتھ ان کو بھی مروادے گا۔

انسپیکٹر کرم شاہ کے سامنے جرائم پیشہ افراد سے ٹکر لینے سے زیادہ اپنے اسٹاف کی کم ہمتی اور سستی ختم کرنے کا چیلنج بھی درپیش تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسے اپنا ہدف بنالیا۔ کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے، کبھی افسرانہ رعب داب سے اور کبھی انعام کی ترغیب سے ان کے اندر سے خوف اور بے عملی بہت حد تک کم کر دی۔

شاہدرہ تھانے میں اس کا دوسرا مہینہ شروع ہوا تھا۔ منشیات کے اڈوں کے خلاف کسی ایکشن کے لیے ابھی اس کی تیاری مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خیر پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی معلومات کی روشنی میں وہ منشیات کے اڈوں کی ایک فہرست بنا رہا تھا۔ ان پر چھاپا مارنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس کے لیے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوا کہ پلاننگ کے بغیر ہی اس کی منشیات فروشوں کے ایک خطرناک گینگ سے ٹکراؤ ہو گئی۔

اس دن بازار میں تاجروں کے مابین ایک چھوٹا سا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس جھگڑے کو نمٹا کر واپس تھانے کی سمت آ رہا تھا۔ تھانے کی پرانے ماڈل کی ڈائن کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک اے ایس آئی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پیچھے دو سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی تڑ تڑا تڑ قاترنگ کی آواز گونجی۔

اے ایس آئی نے ایک دم ڈائن روک دی۔ قاترنگ اسی گلی میں آگے کہیں ہو رہی تھی۔ قاترنگ سے وہ سمجھ گئے تھے کہ ایک سے زیادہ ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔

اے ایس آئی متوحش آواز میں بولا۔ ”سرا صورت حال مڑ رہی ہے۔ کیا آگے جانا مناسب ہوگا؟“

اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”صورت حال مڑ بڑ ہو تو اسے ٹھیک کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟ تم نے جو وردی پہنی ہے کیا یہ صرف بھرم دکھانے کے لیے ہے؟“

وہ فیل سا ہو کر بولا۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا سر! اصل میں ہمارے پاس جو ان کم ہیں۔ اگر یہ کوئی گینگ وار ہے تو ہم انہیں روک تو نہیں سکتے ہیں۔ انہا ان کی گولیوں کی لپیٹ میں آجائیں گے۔“

”کیا اس گلی میں کسی گینگ کا اڈا ہے؟“

”جی سر! آگے جا کر گلی دوسری چھوٹی سڑک سے ملتی ہے۔ اس سڑک کے ساتھ شا کا گینگ کا اڈا ہے۔ مجھے لگتا ہے مخالف گینگ نے اس اڈے پر حملہ کیا ہے؟“

انسپکٹر مکرم شاہ چند لمحوں سوچتا رہا پھر واکی ٹاکی پر تھانے سے رابطہ کیا۔ ڈیوٹی پر موجود سب انسپکٹر کو جگہ کے بارے میں بتا کر ہدایت کی کہ فوری طور پر پولیس جو ان لے کر وہاں پہنچ جائے۔

رابطہ منقطع کر کے اس نے دو ٹوک لہجے میں اے ایس آئی سے کہا۔ ”صنذر علی! گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اس کا سائرن اونچی آواز میں بجانا شروع کرو۔ ساتھ ہی ہوٹر بھی آن کرو۔ ان بد معاشوں سے نمٹنے کا وقت ہوا ہے۔“

اے ایس آئی صنذر علی نے بادل ناخواستہ اس کے حکم کی تعمیل کی۔

گلی میں چلنے والے لوگ سب سے اور بوکھلائے سے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر انہیں لڑائی کے مناظر دکھائی دیے۔ ایک دو منزلہ مکان کے باہر کچھ حملہ آور نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی کسی دیوار کے پیچھے تھا۔ کوئی کسی درخت کی اوٹ میں تھا۔ دوسری طرف مکان کے اندر سے ان پر فائرنگ ہو رہی تھی۔

پولیس ڈانس کے سائرن اور ہوٹر کی آوازیں گونجیں تو وہ لڑنے والے ٹھٹک گئے۔ ان کی فائرنگ میں کمی آئی۔ اسی وقت انسپکٹر مکرم شاہ نے میکانفون کے ذریعے اعلان کیا۔

”خبردار! فائرنگ بند کرو۔ پولیس کی بھاری نفری نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اپنے ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کرو۔“

یہ بات واضح تھی کہ اس اعلان سے وہ جرائم پیشہ لوگ فائرنگ تو بند کر سکتے تھے مگر ہتھیار پھینک کر سرنڈر نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے اعلان کا اتنا اثر ہوا کہ شدید فائرنگ کم ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ پولیس کا تاثر کتنا ہی بگڑ گیا ہو۔ اس کی فعالیت اور فرض شناسی میں کتنی ہی کمی واقع ہوئی ہو۔ جرائم پیشہ لوگ اب بھی پولیس سے خوف کھاتے ہیں۔

فائرنگ کرنے والے وہ بد معاش بھی پولیس موبائل کو

دیکھ کر وہاں سے کھٹکنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں گولیوں سے گرجتی برستی گلی خاموش ہو گئی۔ جس مکان کو ٹارگٹ بنایا گیا تھا، وہاں سے بھی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔

انسپکٹر مکرم شاہ نے کہا۔ ”صنذر علی! اس مکان میں کون رہتا ہے؟“

”سر! یہ مشہور ہے کہ اس مکان میں شا کا گینگ کے آدمی رہتے ہیں۔“

”ہوں۔ شہر کے بچوں سچ ایسے جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ ان سے نکلے والے بھی نکلے ہوں گے۔ تم یہ سب جانتے تھے۔ کبھی ان پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا تھا؟“ اس نے نفی سے پوچھا۔

صنذر علی ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”سر! شا کا گینگ کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔ آپ سے پہلے دو تھانیداروں کے ساتھ میں نے ڈیوٹی کی ہے۔ کسی نے بھی اس پر ریڈ کرنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ اس علاقے کا ایم پی اے صوبائی وزیر ہے۔ الیکشن کے دنوں میں بھی اور ضرورت کے موقع پر بھی شا کا گینگ اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کے عوض وزیر صاحب انہیں پالتے پوتے اور قانون کے شکنجے سے بچاتے ہیں۔“

”اپنی پچیس سالہ سروس کے دوران ایسے گٹھ جوڑ میں نے بہت دیکھے ہیں۔ صرف سیاست دان نہیں۔ بہت سے دوسرے حلقوں کے لوگ ان بد معاشوں اور غنڈوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ خود پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھی ایسی کالی بھیڑیں ہیں جو جرائم پیشہ عناصر کو سپورٹ کرتی ہیں۔ اور مجھے ایسے ہی حالات میں کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔ اب تیار ہو جاؤ۔ اس مکان میں داخل ہونا ہے۔“

اے ایس آئی کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے ہٹکا کر کہا۔ ”سبس..... سر! ہماری تو کوئی تیاری بھی نہیں۔ تھانے سے ملک بھی نہیں آئی ہے۔ کیا ہم ان کو سنبھال سکیں گے؟“ انسپکٹر مکرم شاہ نے سخت نظروں سے اسے گھور کر دیکھا پھر واکی ٹاکی پر سب انسپکٹر سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ گلی کے اندر آگئے ہیں۔ دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔

اس نے اے ایس آئی سے کہا۔ ”باقی جو ان بھی پہنچ گئے ہیں۔ چلو ہمت دکھاؤ۔ اپنے پولیس افسر ہونے کا ثبوت دو۔“

اس دو منزلہ مکان کے قریب جا کر وہ رک گئے۔ اس دوران پیچھے سے سب انسپکٹر اور دوسرے جو ان پہنچ گئے۔ انسپکٹر مکرم شاہ نے انہیں ضروری ہدایات دیں۔ وہ سب اس مکان کی طرف بڑھے۔ اتنا وہ سمجھ گئے تھے کہ مکان میں موجود لوگ گلی میں پولیس کی موجودگی سے بے خبر نہیں تھے۔

انسپکٹر کرم شاہ کا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ میکا کی انداز میں اٹھا اور چٹاخ سے طمانچہ اس جوان کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ مضروب گال ہاتھ سے تمام کرز ہر آلود نظروں سے اسے گھورتے لگا۔

انسپکٹر کرم شاہ نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”اے سڑ کے بچے! تم کون سے آسمان سے اترے ہو؟ جرم بھی کیا ہے اور بھرم بھی دکھا رہے ہو۔ شرافت سے تھانے چلو۔ پتا چل جائے گا کہ میری وردی اترتی ہے یا پھر تمہارے گلے سڑے دماغ سے گری اترتی ہے۔“

وہ نو جوان اچانک ہی پلٹ کر پیچھے کی جانب دوڑ پڑا۔ انسپکٹر کرم شاہ نے گالی دے کر اپنے جوانوں کو اس کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ چند قدم بعد ہی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ موبائل نکال کے فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے موبائل بھی چھین لیا۔ انسپکٹر کرم شاہ نے حکم دیا کہ باقی ملزموں سے بھی موبائل ضبط کیا جائے۔

ذرا ہی دیر میں اس نے سب انسپکٹر کے ساتھ ان چاروں کو تھانے بھجوا دیا۔ اپنے ساتھ صفدر علی اور دو جوانوں کو روکے رکھا۔ ان کے ساتھ مل کر اس دو منزلہ مکان کی تلاشی لی۔ بند کمروں کے تالے توڑ دیے۔ اس دوران بڑی تعداد میں ممنوعہ اسلحہ ہاتھ آیا۔ اس کے علاوہ اچھی خاصی مقدار میں چرس اور آئس جیسی منشیات بھی مل گئی۔ اس نے یہ سب اپنے قبضے میں لے لیا۔ مکان کا مرکزی دروازہ سل کر دیا۔ سپاہیوں کو پیہرے پہنھا دیا۔ اے ایس آئی صفدر علی کو ساتھ لے کر تھانے روانہ ہو گیا۔

اس نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ”صفدر علی ادو لے بالوں والا ہیرو کون تھا؟ بہت گرج برس رہا تھا۔ وہ کس کے برتے پر ایسی مستی دکھا رہا تھا؟“

”سر! آپ نے ٹھیک دادا کا نام سنا ہوگا۔ لاہور کی انڈر ورلڈ مافیا کا بڑا نام ہے۔ زمینوں پر ناجائز قبضے سے لے کر ڈرگز ڈیجنگ تک اس کا دھندا پھیلا ہوا ہے۔ شا کا گینگ بھی اسی کی سرپرستی میں چلتا ہے۔ یہ جوان ٹھیک دادا کا بیٹا ہے۔ اس کو سب بابا کہتے ہیں۔ ویسے اس کا نام طفیل ہے۔“ اے ایس آئی کے لہجے میں تردد بھرا ہوا تھا۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے بڑی مچھلی ہاتھ آئی ہے۔ اب مزہ آئے گا۔ شاہد رو سے لے کر لاہور تک ایک پچھلے بجائے گی۔ بڑی ہی توپ قسم کی شخصیات فون کھڑکا دیں گی۔ مجھے لالچ بھی دھمکی بھی دی جائے گی۔“ انسپکٹر کرم شاہ لطف لیتے ہوئے بولا۔

ایک جوان نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ ذرا دیر بعد کسی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہو؟ کیا کام ہے؟“ ”اُدے، دروازہ کھول دو۔ پولیس آئی ہے۔“ جوان نے درشت آواز میں کہا۔

مکان کے اندر سے کچھ کھسک پھسکی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کسی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کے جوان تیزی سے دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر کرم شاہ ان کے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔

سامنے چھوٹا سا گھر تھا۔ تین چار جوان آدمی وہاں کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غم و غصہ بھی تھا۔ اضطراب بھی تھا۔

ایک قد آور جوان آگے بڑھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ جو پونی ٹیل کی شکل میں پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ کسرتی جسم پر قیمتی جینز اور شرٹ تھی۔ اوپر اس نے لیڈر کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا حلیہ عام سڑک چھاپ بد معاشوں سے الگ تھا۔ اس جوان نے دنگ لہجے میں کہا۔

”اس طرح مکان میں زبردستی گھسنے کی اجازت کس نے دی ہے؟ کیا وارنٹ ہے تمہارے پاس؟“

انسپکٹر کرم شاہ سامنے آیا اور غرا کر کہا۔ ”اُدے ہیرو! اتنی دیر سے پوری گلی کو میدان جنگ بنا رکھا تھا۔ اس کی اجازت تجھے کس نے دی تھی؟“

”ہم اپنا دفاع کر رہے تھے۔ دشمنوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے؟“ اس جوان نے تیز لہجے میں کہا۔

”کون ہیں تمہارے دشمن؟ تم نے جو اسلحہ استعمال کیا تھا، اس کا لائسنس موجود ہے؟“

اس جوان نے گھور کر اسے دیکھا پھر جھنجھلائے انداز میں کہا۔ ”دیکھو تمہارا صاحب! میں جانتا ہوں تم یہاں نئے آئے ہو۔ بہتر ہوگا ہمارے اس جھگڑے میں مت پڑو۔ ورنہ بات دور تک چلی جائے گی۔“

انسپکٹر کرم شاہ کے دماغ کا کیڑا کھلبلیا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ ”اُدے سڑک چھاپ بد معاش! مجھے مت سمجھاؤ کہ کیا کرتا ہے۔ اب تو جھگڑے میں پڑ گیا ہوں۔ اسے انجام تک پہنچا کر دم لوں گا۔ سن لو۔ تم سب زیر حراست ہو۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ باقی کارروائی وہیں پر ہوگی۔“

اس جوان نے چلا کر کہا۔ ”تم غلط کر رہے ہو انسپکٹر کرم شاہ! میں تمہاری وردی اتروا دوں گا۔“

”س..... سرا یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ کیا آپ ان کا دباؤ برداشت کر سکیں گے؟“ اے ایس آئی سبے انداز میں بولا۔

”اپنی پچیس سالہ سروس میں بڑے بڑے بد معاشوں اور ان کے سر پرستوں کو جیلا ہے۔ ان کے دباؤ میں آکر اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ بے شک مجھے اس کے خطرناک نتائج بھگتنے پڑے ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکا کر کہا۔ ”اس معاملے میں بھی دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے؟ کچھ ہچکل بچ جانے سے پہلے ذرا اس کھیل دادا کے بد مزاج بیٹے کی طبیعت صاف کرانا ہوں۔“

تھانے پہنچ کر اس نے طفیل بابا کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ سپاہی اسے حوالات سے نکال کر اس کے سامنے لے آئے۔ اس نے سپاہیوں کو کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا۔ طفیل بابا قہقہے سے چلا کر بولا۔ ”سن بے انپکٹر! تم بہت لفظ کر رہے ہو۔ میرا فون مجھے واپس کر دو۔ ایک فون کال پر اس تھانے میں زلزلہ آ جائے گا۔“

انپکٹر کرم شاہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ میز کے پیچھے سے گھوم کر اس کے سامنے گیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا۔ ”اپنی آواز نیچی رکھو یہ تھانہ ہے۔ شا کا گینگ کا اڈا نہیں۔ موبائل کو بھول جاؤ۔ اس سے تمہارے جرائم کے ثبوت اکٹھا کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دوں گا۔“

”تم مجھے نہیں جانتے ہو شاید۔“ اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”تمہارے جیسے تھانیدار میرے بابا کے ایک اشارے پر گتے کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔“

انپکٹر کرم شاہ نے زور سے اسے طمانچہ مارا پھر گرجے ہوئے کہا۔ ”کتے کے بچے! چلاؤ مت۔ غنڈوں، بد معاشوں سے ڈرنے والے تھانیدار اور ہوں گے۔ مجھ پر کسی کھیل دادا کا رعب مت جماؤ۔“

طفیل کو دوسری بار اس نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ شدید نفرت اور حسرت سے اپنا گال تھامے اسے گھور رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا ایک پولیس اسٹیشن کا انچارج اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ پولیس محکمے کے بڑے بڑے افسران اس کے بابا کھیل دادا کے آگے ہچکلی ملی بنے رہتے تھے۔ اس تھانیدار کی جرات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

اس نے چیخ کر گالی دیتے ہوئے انپکٹر کرم شاہ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں اوپر تلے میز سے ٹکرائے اور لڑھکتے ہوئے فرش پر آ کرے۔ انپکٹر کرم شاہ کو اس سے ایسے رد عمل کی توقع نہیں تھی اس لیے سنبھل نہ سکا۔ اس کی عمر پچاس سال

سے زیادہ تھی۔ جسمانی ساخت بھی مضبوط نہیں تھی۔ جبکہ طفیل بابا چوبیس پچیس سال کا قد آور جوان تھا اس لیے انپکٹر کرم شاہ مار کھا گیا۔

طفیل بابا اس کے اوپر سوار ہو کر اسے کتے مارنے لگا۔ اپنے گھٹنے سے اس کے پیٹ پر زوردار ضرب بھی لگائی تھی۔

ان کے چلانے اور لڑنے کی آوازیں کمرے سے باہر گئیں۔ اے ایس آئی مندر علی اور سپاہی نزدیک ہی موجود تھے۔ وہ تیزی سے اندر آئے۔ اپنے آفیسر کو مار کھاتے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے لپک جھپک طفیل بابا کو پکڑ کر الگ کر دیا۔ اس کے منہ سے ابھی تک مفلطات جاری تھے۔

دوسری طرف انپکٹر کرم شاہ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی ناک اور باجھیں لمبے سرخ ہو گئی تھیں۔ پلیسوں میں بھی شدید درد محسوس کر رہا تھا۔

ایک جوان نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔ ایک رومال سے اس کے منہ کا خون بھی صاف کیا۔ وہ چند ثانیے شعلہ بار نظروں سے طفیل بابا کی جانب دیکھتا رہا۔ جسے اے ایس آئی اور دوسرے سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔

اس نے کھٹیلی آواز میں ایک ایک لفظ چباتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا۔ ”مندر علی! اس حرام کے کتے کو لے جا کے مار چرسیل میں الٹا لٹکا دو۔ میں اسے یاد دلاؤں گا کہ پولیس انپکٹر پر ہاتھ اٹھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔“

اے ایس آئی کی آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرائے۔ وہ طویل عرصے سے اس تھانے میں تعینات تھا۔ وہ طفیل بابا اور اس کی پشت پر موجود طاقت ور لوگوں سے واقف تھا۔ جبکہ انپکٹر کرم شاہ ایک مہینہ پہلے ملتان سے یہاں آیا تھا۔ اسے یہاں کے حالات کا درست ادراک نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں میں ہچکچاہٹ دیکھ کر وہ گرجا۔ ”مندر علی! کیا تمہیں سنائی نہیں دیا، میں نے کیا حکم دیا ہے؟ لے جاؤ اس خنزیر کو، اسے ایسا سبق سکھا دوں گا کہ اپنے بد معاش باپ کا حوالہ دینا تو کیا اسے بھی بھول جائے گا۔“

طفیل بابا ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ابے دو کتے کے تھانیدار! میں اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں۔ مجھ پر اپنا اختیار چلاؤ۔ بس ایک بات یاد رکھو۔ میں تمہارے ہر سلوک کا کن کن کر بدلہ لوں گا۔ اس لیے اتنا ہی ظلم کرو جتنا بعد میں برداشت کر سکو گے۔“

انپکٹر کرم شاہ کا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ اس کا قصہ پہلے ہی آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ وہ ایک دم پھٹ گیا۔ ایک جھگڑے اپنی پلٹ باہر نکالی اور اسے گالی دیتے ہوئے پلٹ سے مارنے

لگا۔ شراب۔ شراب۔ چڑے کی بیلٹ بڑے زور سے
طفیل بابا کی پشت پر قیامت پھا کر رہی تھی۔ ہر ہر ضرب پر وہ
درد کی شدت سے چلا رہا تھا۔ اسپیکٹر کرم شاہ کونگی گالیاں دے
رہا تھا۔ پولیس کے جوانوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا
اس لیے بیلٹ کی ضربوں سے خود کو بچا بھی نہیں سکتا تھا۔

اس دوران سب اسپیکٹر بھی کمرے میں آ گیا تھا۔ اس
نے صدر علی کے ساتھ مل کر اسپیکٹر کرم شاہ کو بڑی مشکل سے
روکا۔ اس وقت تک طفیل بابا کی پشت عبرت کا نشان پیش کر رہی
تھی۔ اس کی چڑے کی جیکٹ پہلے ہی اتار لی گئی تھی۔ شرٹ
پھٹ گئی تھی۔ پیٹھ کی کھال ادھر گئی تھی۔ خون کے ساتھ پیپ بھی
نکل رہی تھی۔ اس کی چیخیں اب کراہوں میں بدل گئی تھیں۔ وہ
بے دم سا ہو کر فرش پر پہلو کے بل لیٹ گیا تھا۔

سب اسپیکٹر نے اسپیکٹر کرم شاہ کو کھینچ کر کمرے سے باہر
ٹکالا اور متوحش لہجے میں کہا۔ ”سر! یہ آپ نے کیا کیا؟ ایک تو یہ
بڑے بااثر باپ کا بیٹا ہے۔ دوسرا جسمانی ریمانڈ لیے بغیر ہی
اس پر تشدد کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے اس کی گرفتاری اور پھر تشدد
کی خبر پھیل گئی تو تھانے کی چوٹی کی عمارت میں بھونچال اُٹ جائے
گا۔ پتا نہیں ہم میں سے کس کس کی نوکری داؤ پر لگے گی؟“

اسپیکٹر کرم شاہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”یہ حرام زادہ
دھمکیاں کچھ کم نہیں دے رہا تھا، اوپر سے مجھ پر حملہ بھی کیا تو
میں خود پر قابو نہیں پاسکا۔ تم فکرمٹ کرو۔ کسی نے مواخذہ کیا تو
اس کی ذمے داری میں قبول کروں گا۔“

طفیل بابا کی گرفتاری سے جس بھونچال کا خدشہ پیش کیا
جا رہا تھا، اس کے آنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

☆☆☆

ماہین جدید سوچ کی ایک شوخ لڑکی تھی۔ آج کی نوجوان
نسل سوشل میڈیا کی بدولت وقت سے پہلے جوان ہو گئی ہے۔
زندگی گزارنے کا اس کا ایک اپنا فلسفہ ہے اپنا نقطہ نظر ہے۔
کوئی انہیں ٹو کے تو جدت اور جدیدیت کا راگ الاپ کر اپنی
سوچ اور اپنی بات بڑے بڑے رہنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔

نوجوان نسل کی فکری بے راہ روی میں تعلیمی ادارے بھی
برابر کے ذمے دار ہیں۔ یہ ادارے علم، شعور اور دانش کے
گہوارے کم، تعلیم، گریڈ اور ڈگری کی فیکٹریاں زیادہ ہیں۔

ماہین سال اول کی طالبہ تھی۔ شہر کے ایک مینے
پرائیویٹ کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے
پڑھتے تھے۔

ماہین کے والد نہیں تھے۔ مگر میں اس کی والدہ اور ایک
بڑا بھائی تھا۔ بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے تعلیمی

اخراجات اور دیگر ضروریات کا کفیل اس کا بھائی ندیم تھا۔ وہ
موٹر مکینک تھا۔ ایک آٹو ورکشاپ میں۔ کام کرتا تھا۔ جس
طرح ماہین اور اس کی امی شٹاٹ سے رہتے تھے۔ عیاشیاں
کرتے تھے۔ اس سے لگتا تھا بھائی اچھا غاسا کھاتا تھا۔ ندیم
بھی یہی کہتا تھا کہ وہ شہر کا مانا ہوا موٹر مکینک ہے۔ بڑے
بڑے لوگ اپنی مہنگی گاڑیوں کی مرمت اس سے کراتے ہیں۔
منہ ٹانگا معاوضہ دیتے ہیں۔

وہ ماں بیٹی اس پر اعتبار کرتے تھے۔ انہیں ندیم کی
زیادہ کمائی کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ ندیم دکھاوے کے لیے موٹر مکینک
تھا۔ اپنے کام میں اس کی مہارت بھی بس واجبی تھی۔ ایک آٹو
ورکشاپ میں معمولی سا مکینک تھا۔ اس کا اصل دھندا منشیات
فروشی تھا۔ وہ شا کا گینگ کے لیے کام کرتا تھا۔ شہر کے چھٹے آٹو
ورکشاپ تھے۔ ان میں جس اور آٹو سٹلائی کرتا تھا۔

ماہین اچھے پرائیڈ کے کپڑے پہنتی تھی۔ بڑا اور قیمتی
موبائل استعمال کرتی تھی۔ اس کے پرس میں ہر وقت بھائی کے
دیے ہوئے خاصے پیسے ہوتے تھے۔

انٹرمیڈیٹ میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں عمر کے جس
مرحلے میں ہوتے ہیں، وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ شعور اور
سنجیدگی کم ہوتی ہے۔ جوش اور شوخیاں زیادہ۔ عقل کی عمل داری
کی نسبت دل کی جنون خیزی کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے میں
فطری طور پر جنس مخالف کی قربت اور صحبت جذبات کے نئے
جہانوں سے متعارف کراتی ہے۔

ماہین کے کالج میں بھی اکثر لڑکے لڑکیاں دل و نظر کے
جہان خوش رنگ کی سیر کرتے رہتے تھے۔ تعلیمی کیریئر کے
بجائے جنس مخالف کا دل جیتنے پر توجہ زیادہ دیتے تھے۔

ماہین کے دل و دماغ میں بھی ایک کلکش رہتی تھی۔ اس کا
دماغ تعلیمی کیریئر اور اپنے مقصد کا احساس دلاتا تھا۔ لیکن دل
پر جنوں کا غلبہ رہتا تھا۔ اس کی سہیلیاں جس طرح زندگی کی
روایتوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ لڑکوں سے دوستیاں کر
کے زندگی کو جوش اور جذبے سے بھر دیتی تھیں، وہ بھی ان سے
اثر لیتی تھی۔ ان کی طرح رنگ و روپ کی ایک سرت آمیز
زندگی گزارنے کے لیے دل ہی دل میں تمنا کرتی تھی۔

کالج میں اس کا تیسرا مہینہ تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس کی
سہیلیاں تھیں۔ کسی لڑکے سے ابھی تک دوستی کا کوئی تعلق قائم
نہیں ہوا تھا۔ وہ خوش حال تھی۔ سڈول جسامت کی مالک تھی۔

اچھے اور جدید تراش خراش کے کپڑے پہنتی تھی۔ وہ اکثر اپنے
گلاس فیلو لڑکوں کی آنکھوں میں اپنے لیے سٹاکش اور پسندیدگی

کے جذبات دیکھتی تھی۔ بہت سے لڑکے اس سے دوستی کے لیے کوشش کرتے تھے۔ وہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ کوئی لڑکا اک ذرا بے باکی دکھاتا تھا۔ اس کا راستہ روک کر کوئی شوخ فقرہ کتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی اور اس کی مسکراہٹ کی تعریف کرتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک شان بے نیازی سے ان کو نظر انداز کرتی تھی۔ اس کی ایک وجہ ان لڑکوں کا کم زور خاندانی پس منظر ہوتا تھا۔

وہ خود ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے تحت الشعور میں یہ بات تھی کہ بے شک بھائی اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے لیکن بے توجہ ہوں ایک موٹر مکینک۔ سماج میں اس کی حیثیت باوقار نہیں تھی۔ ایسے میں کسی اور غریب لڑکے سے تعلق جوڑنا اسے قبول نہیں تھا۔ وہ محبت کے معاملات میں دل کی نہیں، سماجی اور مالی حیثیت کی قائل تھی۔

تین مہینے بعد اس کی زندگی میں شاہد رضا آگیا۔ اس کی وجہ سے ماہین کی زندگی کی پرسکون جھیل میں جیسے تلاطم برپا ہو گیا۔ ایک طرف وہ پیار کے ذائقے سے آشنا ہوئی۔ دوسری طرف زندگی ایسے ہنگاموں سے دوچار ہوئی کہ عزت کے ساتھ جان کے بھی لالے پڑ گئے۔

شاہد رضا سے اس کی پہلی ملاقات کسی فلمی سچویشن کی طرح ہوئی تھی۔

ایک دوپہر وہ کالج سے نکل کر بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔ چلچلاتی دھوپ چاروں طرف گویا آگ لگا رہی تھی۔ اس کی حدت سے سب ہی کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس کے روٹ کی بس بہت دیر سے نہیں آئی تھی۔ انتظار لمحہ لمحہ باعث آزار بن رہا تھا۔ کچھ اور طلباء طالبات بھی بس کے انتظار میں سخت گرمی کی مشقت جھیل رہے تھے۔

اچانک ہی ایک سرخ رنگ کی ہونڈا سوک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ اس کے شیشے کھڑے تھے۔ ڈرائیور کی طرف کا شیشہ نیچے ہوا۔ ایک اسمارٹ سائنو جوان ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آیا۔ نوجوان کا چمکتا ہوا چہرہ اس کی صحت اور امارت کا اعلان کرتا تھا۔ ماہین نے سرسری سے انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ اسی وقت اس کی نظر نوجوان کے کندھے کے اوپر سے ساتھ والی سیٹ پر پڑی۔ سیٹ پر اس کی ایک کلاس فیلو بیٹھی تھی۔ اس لڑکی سے ماہین کا تعلق دوستی کا نہیں تھا۔ بس بھی کبھار ہیلو ہائے ہوتی تھی۔ لڑکی کا نام فرح تھا۔

وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ اس کی دوستی لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں سے تھی۔ وہ دھڑلے سے سگریٹ پیتی تھی۔ کفن میریا میں یا کالج کے لان میں لڑکوں کے جھرمٹ میں زندگی

سے بھرپور تقبہ لگاتی تھی۔ ہنسی مذاق کرتے ہوئے بڑی بے باکی سے لڑکوں کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے تالی بجاتی تھی۔ ہونڈا سوک کار چلانے والے اسمارٹ اور ونڈسم نوجوان نے سرگھما کے ماہین کی طرف دیکھا اور نرم سے لہجے میں کہا۔ ”بہت گرمی ہے۔ ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ تمہیں گھر ڈراپ کر دیں گے۔“

ماہین نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ قریب کوئی نہیں تھا۔ لفٹ کی پیشکش اسے ہی ہوئی تھی۔ وہ اک ذرا ہچکچائی۔ جھجکتی ہوئی کلاس فیلو لڑکی فرح کی جانب دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”ڈرومٹ یا راتھارے ساتھ آ جاؤ۔ ہم اسی راستے پر جا رہے ہیں۔“

ماہین نے ایک لمحے کو سوچا۔ سخت گرمی سے بچنے کے اس موقع کو غنیمت جانا پھر لپک کر ہونڈا سوک کا پچھلا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گئی۔ یوڈی ٹکون کی بے خود کردینے والی مہک نے اس کی سانسوں کو معطر کر دیا۔ ساتھ ہی باہر کی جھلسا دینے والی لو کے بجائے اسے سی کی فرحت بخش ٹھنڈک اس کے روم روم میں اتر گئی۔ اس نے بے اختیار سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر ایک طمانیت بھری سانس لی۔ دوسرے لمحے ٹھنڈک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یاد آیا وہ کسی اجنبی لڑکے کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے بیک ویو مرر پر پڑیں۔ اجنبی نوجوان کی گرم گرم نگاہیں خود پر مرکوز دیکھ کر وہ گڑبڑا سی گئی۔ پھر دیر سے غیر محسوس طریقے سے کھڑکی کی طرف یوں سرک گئی جیسے باہر کا منظر دیکھ رہی ہو۔

کار کی محدود فضا میں چند منیوں کے لیے خاموشی چھا گئی پھر اچانک ہی وہ اچھل پڑی۔ نوجوان لڑکا اسے مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے سرگھما کے دیکھا۔ وہ نوجوان ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے ہوئے تھا۔

وہ بولا۔ ”یہ پانی لے لو۔ ٹھنڈا ہے۔ تمہارے پاس موجود پانی گرم ہو گیا ہوگا۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ ماہین نے کالج سے نکلے ہوئے واٹر کولر سے بوتل میں پانی بھرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پانی گرم ہو کر پینے کے قابل نہیں رہا تھا۔

لڑکے کی پیشکش پر وہ اک ذرا ہچکچائی۔ لڑکا ہنستے ہوئے بولا۔ ”فکر مت کرو۔ بوتل ابھی تک نہیں کھولی ہے۔ پانی جودا نہیں۔“

جیسی ماہین نے دیکھا۔ ڈرائیور اور پینجر سیٹ کے درمیان ایک چھوٹا سا کیبنٹ تھا۔ اس میں فریڈر نصب تھا۔

اسے تعجب ہوا۔ اس کے گھر میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی فریج آیا تھا۔ جبکہ نوجوان کی کار میں بھی یہ سہولت موجود تھی۔

اس نے اک ذرا تال کے بعد وہ پانی کی بوتل لے لی۔ ہاتھ میں پکڑتے ہی بوتل کی ٹھنڈک رگوں میں اتر آئی۔ اس نے ڈھکن کھول کے منہ سے لگا یا اور غٹ پینا شروع کیا۔

اسی وقت اس کی کلاس فیلو فرح نے پلٹ کر کہا۔ ”کالج میں ہم دونوں کو تین مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے لیکن کبھی ہم نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی ہے۔ اب اتفاق سے ایک ہی کار میں بیٹھ کر میں حیران ہوں کہ تم سے کیا بات کروں؟“

وہ دھیرے سے بولی۔ ”بات چیت کے لیے تعلق اہم نہیں۔ انسان کا رویہ اہم ہوتا ہے۔ اس قیامت کی گرمی سے بچا کے اتنی آرام دہ کار میں مجھے لفٹ دینے والی سے تعلق نہ جوڑنے کا مجھے افسوس رہے گا۔“

”اس مہربانی کے لیے میرا نہیں، شاید کا احسان مانو۔“ اس نے ڈرائیونگ کرنے والے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے خود تمہیں دیکھ کر کار روک دی تھی اور لفٹ کی پیشکش کی تھی۔“

ماہین کی نظریں بے اختیار سامنے آئینے کی طرف گئیں۔ وہ نوجوان جس کا نام شاید بتایا تھا، وہ بڑی نرم گرم نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ نظریں ملیں تو ماہین کے بدن میں برقی روسی دوڑ گئی۔ دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے نگاہیں پھیر کر سر ہچکا کر ایک ڈرائیونگ آواز میں کہا۔ ”آ..... آپ کا بھی شکریہ۔ میں اجنبی تھی اس کے باوجود آپ نے مجھ پر مہربانی کی۔“

شاید نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کچھ چہرے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور اپنوں کی مدد کی جائے تو شکریہ کے الفاظ معنوی لگتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”ضروری نہیں ہر بار شکریے کے پیچھے بناوٹ ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل خوشی سے بے اختیار شکر یہ ادا کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے احسان کرنے والے کی بھلائی اور بڑائی کا اعتراف ہوتا ہے۔“

”یعنی تم اعتراف کرتی ہو کہ میں ایک قابل تعریف لڑکا ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”مجھے شدید گرمی سے اور بس میں دھکے کھاتے ہوئے گھر پہنچنے سے نجات دلا کے یقیناً آپ نے قابل تعریف کام کیا ہے۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

ماہین کی جھک اور شرم اب کافی حد تک دور ہوئی تھی۔ نوجوان کے حسن سلوک اور حسن کلام نے اجنبیت کی برف بہت حد تک پگھلا دی تھی پھر اپنی کلاس فیلو فرح کی موجودگی نے

رہی سہی کسر دور کر دی تھی۔

فرح ہاتھ بچاتے ہوئے بولی۔ ”اے گاڑا یہ تم دونوں کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہے ہو؟ چلو شکر ہے اس بہانے تم دونوں ایک دوسرے پر کھل گئے۔ اب اس خوشی میں ایک ایک سگریٹ ہو جائے۔“

اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھولا۔ ایک سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلایا اور شاہد کو تھما دیا۔ اس کے بعد پیکٹ ماہین کی طرف بڑھایا۔

”سوری فرح! میں نہیں جیتی۔“ وہ بولی۔

”نہ کر بابا! ایک آدھ سگریٹ پیئے میں کیا برائی ہے؟ لو شاباش!“

”نہیں فرح! مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ میں دھواں خارج ہی نہیں کر سکتی۔ اپنی فرینڈز کے زور دینے پر ایک آدھ بار کوشش کی تھی۔ دھواں ناک اور گلے میں پھنس گیا اور میں کھانسی رہ گئی تھی۔ اس لیے سوسوری۔“

فرح نے ایک سگریٹ نکالا۔ ادائے خاص سے اسے جلایا اور نرم و نازک ہونٹوں سے لگا کر گہرا کش لیا۔ اس کا دھواں کار میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”پتا ہے ماہین! ہم جو آج کی نوجوان نسل ہیں۔ ہم کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہے ہیں۔ ہمیں ویسے تو ہر طرح کی سہولت میسر ہے۔ ہر آسائش سے لفٹ اندوز ہوتے ہیں۔

زندگی کے رنگ و روپ اور رونقوں کو انجوائے کرتے ہیں پھر بھی دل کی بے رونقی نہیں جاتی۔ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ خالی خالی لگتا ہے۔ ہم لڑکیاں ہوں، بڑے ہوں، ہم بہ ظاہر تاج گاکے اور فنی مذاق کر کے خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حقیقت میں اندر سے ٹوٹے پھوٹے ہیں۔ کھوکھلے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بہت سی دلیلیں دی جاسکتی ہیں۔ اس کے باوجود اطمینان کہیں نہیں۔ بے سکونی ہر طرف ہے۔ بس یہی وجہ ہے آج کی نوجوان نسل سگریٹ، چرس، آئس اور شراب میں ڈوب کر غم غلط کرنے کے جتن کرتی ہے۔ یہ کوئی معقول justification نہیں۔

بس ایک خود فریبی ہے پھر بھی اس میں پتاو لے رہے ہیں۔“

ماہین ایک حیرت کے عالم میں اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اسے ایک شوخ اور لالچالی لڑکی کے طور پر جانتی تھی۔ جو کلاس روم میں پروفیسرز کے پیچھے بھی شوق سے نہیں سنتی تھی۔ بے فکرے اور آزاد خیال لڑکے لڑکیوں کے ساتھ فنی مذاق میں ہی اکثر وقت گزارتی تھی۔ اس کی زبان سے سماج کے ایسے حساس رویے اور نوجوان نسل کی بے راہ روی اور منتشر دماغی

کے ایسے بے باک حوالے سن کر ماہین کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”دیکھو فرح! تمہاری باتیں کسی حد تک درست ہیں لیکن اس بنیاد پر جواز فراہم کرنا کہ دکھوں اور پریشانیوں سے فرار کے لیے منشیات سہارے کا کام کرتی ہے، یہ درست نہیں۔ اگر منشیات میں ایسی خصوصیات ہوتیں تو ماہرین نفسیات اس کے استعمال کو قانونی شکل دینے کی کوشش کرتے۔ ڈاکٹر حضرات اپنے نسخوں میں اسے تجویز کرتے۔“

شاہد رضا نے سامنے لگے آئینے میں اسے نظر بھر دیکھتے ہوئے شوخ سے لہجے میں کہا۔ ”یار ماہین! تمہاری باتیں نصابی سی لگتی ہیں۔ لگتا ہے صرف کورس کی کتابیں پڑھتی ہو۔ ارے بابا! ذرا سوسائٹی میں بھی جھانک کر دیکھ لو۔ اپنی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے جذبات اور محسوسات بھی سمجھ لیا کرو۔“

اس نے پہلی بار ماہین کو اس کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ ساتھ ہی ایک عام سا مگر دل میں اترتا لفظ ”یار“ بھی استعمال کیا تھا۔ ماہین کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ وہ دل کی شور کرتی دھڑکنوں کو سنبھال کر آہستہ سے بولی۔ ”نصاب کی باتیں غلط بھی تو نہیں ہوتی ہیں۔“

شاہد رضا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ ایک مخصوص سانچے میں یہ درست ہو سکتی ہیں مگر ہم ذرا دوسری ٹائپ کے لوگ ہیں۔ زندگی گزارنے کا ہمارا ایک اپنا فلسفہ ہے۔ وعظ، نصیحت، اچھائی برائی کا بھاشن اور جائز ناجائز کے فتوے ہماری زندگی کے نصاب سے یکسر خارج ہیں۔ ذرا سوچو ماہین! یہ مختصر سی لائف ہے۔ اسے باندیوں میں جکڑ کر نہیں، آزاد یوں میں اڑ کر جیتا ہے۔ ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔ تم سے بھی توقع رکھتے ہیں۔ آجاء ہماری زندگی میں..... ہر باندی سے نکل کر لائف انجوائے کرو۔ تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ زندگی اصل میں کیا ہے؟ اس کا حسن اور رنگ روپ کیسا ہے؟“

ماہین کے دماغ میں بہت سی دلیلیں گردش کر رہی تھیں۔ ان دونوں کے نقطہ نظر کی مخالفت میں وہ بحث کرنا چاہتی تھی مگر دل چھکی دے کر خاموش کر رہا تھا۔ ان دونوں سے پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔ اسے دھوپ کی گرمی سے بچا کر بھلائی کا ثبوت دیا تھا بلکہ اس سے دوستی کا عندیہ بھی دیا تھا۔ ایسے میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ سماجی رویوں کی بنیاد پر تکرار کر کے اس نئے تعلق میں تنخیاں پیدا کرے۔

اس نے بھی انداز میں کہا۔ ”آپ دونوں کی بات میں وزن ہے۔ آج کی نوجوان نسل بہت گھٹن کا شکار ہے۔ اسے اپنے انداز میں زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کا موقع ملنا چاہیے۔“

فرح پلٹ کر اپنے مخصوص انداز میں اس کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے بولی۔ ”ہم تو لطف اٹھاتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں۔ پارٹیاں کرتے ہیں۔ سگریٹ پیٹے ہیں۔ نشہ کرتے ہیں۔ اندر کا سارا غبار باہر نکالتے ہیں۔ اگر تمہیں بھی یہ سب چاہیے تو ہم سے دوستی کر لو۔ لائف انجوائے کرو گی۔“

شاہد رضا آئینے میں اسے گہری نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس مختصر ملاقات میں ہی مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ مجھے امید ہے تم آئندہ بھی ملتی رہو گی۔“

وہ اس کی گرم نگاہی سے جھپکتے ہوئے بولی۔ ”جج..... جی ہاں۔ مجھے بھی آپ دونوں سے باتیں کرتے ہوئے اچھا لگ رہا ہے۔ چلو اچھا ہے۔ فرح میری کلاس فیلو ہے۔ اسی بہانے آج کی یہ ملاقات ہوئی ختم نہیں ہو گی۔ میں اس سے کالج میں ملتی رہوں گی تو آپ سے بھی کبھی نہ کبھی ملاقات ہو جائے گی۔“

فرح جو شیلے لہجے میں بولی۔ ”کبھی نہ کبھی کو کوئی مارو۔ اس ویک اینڈ پر ہم نے ایک شاندار پارٹی رکھی ہے۔ اس میں تم بھی ضرور آؤ گی۔ دیکھو اب منع نہیں کرنا۔ ہماری نئی دوستی کی شروعات کا اسے تحفہ سمجھ کر آ جاؤ۔“

”کک..... کدھر ہے پارٹی؟ کیا رات کو ہو گی؟“ فرح نے دھپ سے اپنا ہاتھ شاہد رضا کے کندھے پر مارا پھر زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تو شاہد! یہ کتنی نادان ہے؟ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ پارٹیاں رات کو ہی رکھی جاتی ہیں۔ جب اند میرے اُجالے کی آنکھ مجھولی ہوتی ہے۔ دیکتے چہرے، ہنکتے قدم، چمکتے جام اور دھواں دھواں ماحول، راتوں کے سکوت میں ہی مزہ دیتے ہیں۔“

ماہین کو امید نہیں تھی کہ اس کی امی اسے رات کے وقت کسی پارٹی میں شرکت کی اجازت دیں گی۔ اس نے شکستہ سی آواز میں کہا۔ ”میری امی بڑے سخت مزاج کی ہیں۔ وہ مجھے ایسی پارٹی میں شرکت کی اجازت نہیں دیں گی۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں تمہاری امی سے بات کروں گی۔ ضروری نہیں انہیں وہ سب بتا دیں جو ہم پارٹی میں کرتے ہیں۔ میں اللہ میاں کی گائے بن کے اپنے گھر میں صرف سہیلیوں کی دعوت کی بات کروں گی۔ کیا تب بھی منع کریں گی؟“

”ایسی صورت میں شاید نہیں۔ ویسے پارٹی کدھر ہے؟ میرے گھر سے دور ہے تو مجبوری ہے۔ میرے پاس تو کوئی سواری بھی نہیں۔“ اس نے عذر پیش کیا۔

”شہر سے باہر شاہد رضا کی ٹیلی کا فارم ہاؤس ہے۔ بہت پُر فضا مقام ہے۔ ہماری پارٹیاں اس فارم ہاؤس میں ہوتی

ہیں۔ سواری کی فینش مت لو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

گفتگو کے دوران وہ اس سڑک سے گزر رہے تھے۔ جہاں سے ایک گلی ماہین کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ گلی تنگ تھی۔ کار کے گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنی گلی کے سامنے پہنچ کر شاہد رضا سے کار روکنے کو کہا پھر فرج سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم ایک شاندار لڑکی ہو فرج! کالج میں دور دور سے دیکھ کر تمہارے بارے میں غلط گمان رکھتی تھی۔ لیکن اس ذرا سی ملاقات میں تمہیں جس حد تک جان سکی ہوں، مجھے اپنی پہلی والی سوچ پر افسوس ہو رہا ہے۔“

فرج پلٹ کر اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”مجھے خوشی ہے ماہین! تمہیں ہماری باتیں بھی ہماری بکڑی عادتیں بھی اچھی لگی ہیں۔ امید ہے اب یہ تعلق قائم رہے گا۔ کل کالج میں پارٹی کے بارے تفصیلات بتا دوں گی۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو گی تو تمہاری امی سے بھی بات کروں گی۔“

ماہین کی نگاہیں بہ ظاہر جھکی جھکی سی تھیں مگر وہ سمجھ رہی تھی سامنے لگے آئینے میں سے جھانکتی دو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ پلکیں اٹھائے بغیر بھی وہ ان نگاہوں کی حدت محسوس کر رہی تھی۔

وہ نظریں چڑائے ہوئے کار کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ پھر جھجکتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر جھپکتے ہوئے بولی۔ ”تیز دھوپ سے بچا کے مجھے یہاں تک لانے کا شکریہ! میں نہیں جانتی آئندہ آپ سے تعلق رہے گا یا نہیں مگر آپ کا یہ احسان مجھے یاد رہے گا۔“

یہ کہہ کر وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور اس کا جواب سننے بغیر ہی جھٹکے سے مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی گلی میں داخل ہو گئی۔

اس رات بستر پر سونے کے لیے لیٹی تو بہت دیر تک شاہد رضا کا تصور اسے بے کل کرتا رہا۔ وہ کون تھا؟ کیا کرتا تھا؟ اس کا فرج سے کیا تعلق تھا؟ یہ باتیں وہ نہیں جانتی تھی لیکن اپنے حلیے اور چمکتی دھمکتی کار سے اندازہ ہوتا تھا وہ کسی امیر کبیر باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی پہلی کا اپنا قارم ہاؤس بھی تھا۔

ماہین کے تصور میں کوئی ایسا ہی لڑکا ایسا کرتا تھا جس میں دجاہت بھی ہو خاندانی امارت بھی۔ اپنے کالج کے بہت سے خوب مُرد اور ذہین لڑکوں کو محض اس وجہ سے اس نے ٹھکرایا تھا کہ ان کا خاندانی پس منظر غریبی کا تھا۔

محبت کے معاملات میں وہ حقیقت پسند تھی۔ اپنی عمر کی

جذباتی لڑکیوں کی طرح نادان نہیں تھی کہ صرف جسمانی کشش کی بنیاد پر کسی کو دل کا مکین بنائے۔ اس کی محبت میں جذباتیت نہیں، مادیت کا عنصر غالب تھا۔ وہ خود جس طرح محرومیوں اور شکستہ آرزوؤں کے ساتھ زندگی گزارتی آئی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا محبوب بھی ایسی زندگی کا حامل ہو۔

شاہد رضا بہ ظاہر اس کے آئیڈیل محبوب کی خوبیاں لیے ہوئے تھا۔ شکل اور حلیہ بھی اچھا تھا۔ کار اور کپڑوں سے خاندانی پس منظر بھی شاندار لگتا تھا۔

اس رات نیند کی دایوں میں اترنے سے پہلے ماہین کے دل میں شاہد رضا محبت کا مہمان بن کے اتر چکا تھا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ہی ڈی ایس پی ہیڈ کوارٹر کا فون آیا۔ ”شاہ جی! طفیل بابا تمہاری قید میں ہے۔ اوپر سے بہت دباؤ ہے۔ اس لیے ایس پی صاحب کے اسٹیشنل آرڈر ہیں کہ مل بیٹھ کر معاملہ رفع دفع کرو اور اُسے چھوڑ دو۔“

”سر! کہنے کا جرم آپ نہیں پوچھیں گے؟“ انسپٹر مکرم شاہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”چھوڑو نا شاہ جی! کون نہیں جانتا ہے وہ ایک کیٹکسٹر کا بیٹا ہے۔ فشیات بیچتا ہے اور ہتھیار چلاتا ہے۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا ہے۔ تم ایسا کرو اس کے دوسرے ساتھیوں پر سارا کیس تھوپ دو۔ وہ بڑی خوشی سے قربانی کے بکرے بننے کے لیے تیار ہوں گے۔“

”سر! بات صرف یہ نہیں کہ وہ کیوں پکڑا گیا ہے؟ وہ ایسا گھمنڈی اور بدتمیز ہے کہ نہ صرف مجھے گالیاں دیتا رہا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا بلکہ مجھ پر حملہ بھی کیا ہے۔ میرے جوان اگر بروقت نہ آتے تو مجھے بُری طرح زخمی کر دیتا۔ پھر میں نے بھی اسے اچھا سبق سکھایا ہے۔“

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے معاملہ بگڑ چکا ہے۔“ ڈی ایس پی سمیر آواز میں بولا۔ اس کے لہجے میں تردید بھی تھا ہندی بھی۔ ”شاہ جی! تمہارا سروس ریکارڈ ایسی حماقتوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں آئے ایک مہینہ۔۔۔ ہوا ہے اور مسائل پیدا کرنا شروع کر دیا ہے، سنو، اس معاملے کو خطرناک ہونے سے پہلے سنبھالنا ہے۔ میں بھی آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔“

ڈی ایس پی آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں آندھی طوفان کی طرح تھانے پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر برہمی بھی تھی، پریشانی بھی۔ انسپٹر مکرم شاہ کے آفس میں داخل ہوتے ہی سرد لہجے میں کہا۔ ”شاہ جی! یہاں آتے ہوئے راستے میں، میں نے ساری معلومات حاصل کی ہیں۔ تم نے شاداب پور

محلے کے ایک دو منزلہ مکان پر ریڈ کیا ہے۔ وہاں موجود بندوں کو پکڑ کر تھانے لے آئے ہو۔ یہ بتاؤ اس مکان پر چھاپا مارنے کا وارنٹ تمہارے پاس تھا؟

انسپکٹر کرم شاہ کے دماغ کا کیڑا کلبلانے لگا۔ ڈی ایس پی بجائے اس کے اقدام کو سراہنے کے جواب طلب کر رہا تھا۔ وہ چند ثانیے اپنے افسر کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”سر! آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا اس مکان پر میں نے چھاپا کیوں مارا تھا؟ میری موجودگی میں وہاں دو گروہ آپس میں فائرنگ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک گروہ کے بندے بھاگ گئے۔ دوسرے گروہ والے اس مکان میں مورچا بند ہو کر فائرنگ کر رہے تھے۔ اس صورت میں ہم نے وہی کیا جو امن و امان برقرار رکھنے کے لیے پولیس کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جب اس مکان کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے ممنوعہ بور کی رائفوں کے علاوہ منشیات بھی برآمد ہوئی ہے۔“

”کیا یہ بات کل عدالت میں ثابت کر سکو گے کہ یہ رائفیں اور منشیات اس مکان سے برآمد ہوئی ہیں، انہیں تم نے نہیں رکھوایا ہے؟“ ڈی ایس پی اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”سر! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ ہماری اس مکان والوں سے کون سی ذاتی دشمنی ہے کہ انہیں پھانسنے کے لیے کوئی سازش کریں گے؟“

ڈی ایس پی نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا پھر بھٹا کر کہا۔ ”مجھے مت سمجھاؤ کہ تمہاری ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ اپنے عمل کو عدالت میں ثابت کرنا ہے۔ خاص کر اس صورت میں جب ملزم ایک بااثر اور طاقت ور فیملی کا فرد ہے۔ ان کا وکیل چٹکیوں میں تمہارے الزامات کو اڑا دے گا۔ سرچ وارنٹ کے بغیر تلاشی لے کر تم نے پہلے ہی کیس کو کم زور بنا دیا ہے۔“

”سر! وہ مکان کسی شریف فیملی کا نہیں تھا۔ شا کا گینگ کا اڈا تھا۔ محلے کے لوگ بھی اس کی گواہی دیں گے۔“

”یہی تو اصل مسئلہ ہے شاہ جی! تم یہاں نئے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ محلے کے لوگ شا کا گینگ کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں تم جاؤ۔ پورے محلے میں کسی ایک بندے کو بھی شا کا گینگ کے خلاف گواہی دینے کے لیے راضی کراؤ۔ کوئی نہیں مانے گا۔ کیونکہ شا کا گینگ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ محلے والوں کے لیے مہربان اور مددگار ہے۔ محلے کے اکثر گھروں میں راشن پہنچا دیتا ہے۔ ضرورت کے وقت مالی مدد کرتا ہے۔ محلے میں پانی، بجلی اور گیس کا مسئلہ ہو تو گینگ کے بندے اسے ٹھیک کراتے ہیں۔ ایسے میں لوگ کبھی بھی ان کے خلاف گواہی نہیں

دیں گے۔“

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں بند رکھتا کیا پولیس کی کمزوری نہیں ہے سر!“ اس نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”شا کا گینگ والے نوجوان نسل کو منشیات کا ذہر پلاتے ہیں۔ ان کا مستقبل تباہ کرتے ہیں۔ اب یہ سوچ کر کہ وہ بہ ظاہر چند فلاحی کام کرتے ہیں، ان کے جرائم سے چشم پوشی برت لیں کیا؟“

digest library.com

ڈی ایس پی استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”بس کرو شاہ جی! مقابلے کا امتحان پاس کر کے پولیس سروس جوائن کرنے والے تازہ کاراے ایس پی افسر ایسی انتہائی اور جذباتی باتیں کرتے ہیں۔ تم نے تو درجنوں اسٹیشنوں میں فرائض سرانجام دیے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ اس کے باوجود نہایت بچکانہ باتیں کرتے ہو۔ اب یہ بحث بند کرو۔ طفیل بابا کو یہاں لے آؤ۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”سر! میں نے بتایا تھا اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ مجھ پر حملہ کیا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں میرا منہ ابھی تک سو جا ہوا ہے۔ میں خود پر قابو نہیں پاسکا اور اس کی تھوڑی سی پٹائی کی ہے۔ وہ حالات میں نہیں بلکہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ آپ ادھر ہی جا کر مل لیں۔“

ڈی ایس پی ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔ وہ متحوش بھی مشتعل بھی نظر آ رہا تھا۔ ”وہ ٹھیک ہے نا؟ اگر اس کے ساتھ کچھ جبراً ہوا ہے تو ایک تم ہی نہیں ہم سب کی درویاں اتر جائیں گی۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“

انسپکٹر کرم شاہ اسے لے کر دوسرے کمرے میں آیا۔ وہاں طفیل بابا ایک چار پائی پر پہلو کے مل لیٹا ہوا تھا۔ بیٹ نے اس کی پشت کو جبری طرح مجروح کیا تھا۔ وہ سیدھا حالت بھی نہیں سکتا تھا۔

ڈی ایس پی اس کی حالت دیکھ کر شگ کیا۔ پلٹ کر سلگتی نظروں سے انسپکٹر کرم شاہ کی جانب دیکھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی نگاہوں میں ملامت اور خشنون کی بجلیاں کڑک رہی تھیں۔

طفیل بابا نے جب ڈی ایس پی کو دیکھا تو چلا کر کہا۔ ”میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس ظلم کا حساب لوں گا۔ خاص کر اس کینے انسپکٹر کا تو حشر نشر کر دوں گا۔“

ڈی ایس پی ملامت سے بولا۔ ”طفیل بابا! جانے دو۔ یہ سب کسی غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے اسے سنائیں گے۔“

”میں کیسے جانے دوں ڈپٹی!“ اس نے جھج کر کہا۔

”آج تک کسی کی مجال نہیں ہوئی تھی مجھ کو خالی ہاتھ سے مارے۔ اس گتے کے بچے تھانیدار نے میرا کیا حال کر دیا ہے دیکھو۔ میں سیدھا لٹ بھی نہیں سکتا ہوں۔“

”میں یقین دلاتا ہوں تھانیدار کے خلاف حکمانہ کارروائی ہوگی۔ اگر قصور وار ہوا تو اسے قرار واقعی سزا ملے گی۔“

انسپیکٹر بکرم شاہ شدید حیرت اور افسوس سے اپنے سینٹر افسر کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک کینکٹر کے سامنے وہ اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ اس کے اقدام کو غلط قرار دے رہا تھا۔

اس نے احتجاج کیا۔ ”سرایہ غنڈا اور بد معاش ٹائپ جوان پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر اس کے انچارج کو گالیاں اور خطرناک دھمکیاں دے رہا ہے۔ آپ اس کا منہ بند کرانے کے بجائے مجھے ہی بے عزت کر رہے ہیں۔“

”تم چپ کرو شاہ جی!“ ڈی ایس پی ڈپٹ کر بولا۔ ”مجھے مت سمجھاؤ کہ کس سے کیا بات کرنی ہے۔ تم اپنی خیر مناد۔ جسمانی ریمانڈ حاصل کیے بغیر ملزم پر ایسے وحشیانہ تشدد کی تم کیا وضاحت پیش کرو گے؟ تو مجھے معلوم نہیں۔ ہاں میں اتنا جانتا ہوں۔ تم بہت مشکلوں میں گھرنے والے ہو۔ فی الحال طفیل بابا کو یہاں سے باہر نکالنا ہے۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرانی ہے۔ ورنہ ایم پی اے شہباز علی خان اور شکیل دادا کا غصہ ہم پر بجلی بن کر گرے گا۔“

طفیل بابا چلا کر بولا۔ ”مجھے اسی طرح بابا کے سامنے لے کر جاؤ ڈپٹی! تاکہ میرے اندر جو آگ لگی ہے، بابا کو بھی اس کا احسان ہو جائے۔“

”پلیز طفیل بابا! ہماری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ڈی ایس پی عاجزانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ معاملہ تھانے کے اندر ہی نمٹا لیتے ہیں۔ باہر کسی طرح میڈیا کے شیطانی کانوں اور چادوئی آنگموں تک یہ پہنچ گیا تو ہم ہر طرف سے پس کر رہ جائیں گے۔ پھر بغیر ثرائل کے آپ کی رہائی پر بھی سوال اٹھایا جائے گا۔ پولیس کا پہلے سے خراب امیج مزید بگڑ جائے گا۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ آئندہ بھی ہم ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔“

اس کے بعد ڈی ایس پی نے سارا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

☆☆☆

اگلے دن کالج جاتے ہوئے ماہین کے دل میں ایک طرف فرح سے ملاقات کرنے اور دوستی کے تعلق کو پختہ کرنے کی خواہش چل رہی تھی۔ دوسری طرف وہ یہ جانتا بھی چاہتی تھی کہ شاہد رضا کون تھا؟ فرح سے اس کے تعلق کی نوعیت کیسی تھی؟

خود پر جبر کر کے ابتدائی دو کلاسیں لینے کے بعد وہ بے تاب نظروں سے فرح کو تلاش کرتی رہی۔ بہت دیر بعد وہ کیفی ٹیریا کی بالائی منزل پر ملی۔ یہ کیفی ٹیریا کا الگ تھلک حصہ تھا۔ فرح اپنے گروپ کے مخصوص لڑکے لڑکیوں کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ فضا میں سگریٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ماہین جھجکتی ہوئی ان کی میز کے پاس گئی اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

فرح مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”ہے گاڑا! اچھی خبر سن لو۔ ماہین سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ آئندہ یہ بھی ہمارے گروپ میں شامل ہوگی۔“

وہ سارے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

ایک لڑکی حیرت سے بولی۔ ”میں ماہین کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ کوئی نشہ نہیں کرتی۔ سگریٹ تک نہیں چیتی۔ ایسے میں ہمارے گروپ کی موج مستیاں کیا یہ برداشت کر سکے گی؟“

فرح نے سخت لہجے میں کہا۔ ”واٹ اے نان سنس! ماہین کوئی بچی نہیں۔ نہ ہی ہماری پابند ہے۔ ہمارے گروپ میں شامل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ جو ہم کرتے ہیں، یہ بھی وہی کام کرے۔ یہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔“

ماہین کو گروپ کے باقی لڑکے لڑکیوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ فرح سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتی تھی۔ ویک اینڈ میں جو پارٹی ہونے والی تھی اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔

وہ بہت دیر تک اُن کے ساتھ بیٹھی رہی لیکن فرح باقی گروپ سے الگ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ماہین نے اس امید میں ایک اہم لیکچر بھی ضائع کیا تھا۔ اس کے باوجود بھی فرح سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تو مجبور ہو کر اس نے سرگوشی کی۔

”فرح! تم نے پارٹی کا ذکر کیا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ جانتا چاہتی ہوں۔“

فرح نے چونک کر اسے دیکھا پھر یک بارگی ہنسنے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں اپنا ہاتھ دھپ سے اس کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا۔ ”اودہ سوری ماہین! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔“

آج سے چار دن بعد اتوار ہے۔ اس رات ہم سب شاہد رضا کے فارم ہاؤس جائیں گے۔ موج مستی کریں گے۔“

وہ فرح سے پارٹی کے علاوہ بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر سب کے سامنے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کسی اور موقع پر شاہد رضا

یقین دلانے گا۔ وہ تو دیے بھی غصے کا تیز ہے۔ رات دیر تک تمہارا گھر سے باہر رہنے کی بات اسے منکوح نہیں ہوگی۔
”پلیز امی! آپ بھائی کو سمجھا دیں۔ میں کہاں بار بار پارٹیوں میں جاتی ہوں۔ زندگی میں پہلی دفعہ جانے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔“

تاج النساء نے اس کی شدت متنازعہ کر اجازت دے دی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس کی بیٹی اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے ایسی دنیا میں جانے والی تھی جو بہ ظاہر رنگ و روپ کی اور چمک دمک کی تھی مگر کچھ الم نصیب حالات، مگر مجھ کی طرح منہ کھولے راہ دکھ رہے تھے۔

مقررہ دن فرح نے اسے فون کر کے بتا دیا کہ تیار رہے۔ شام سے ذرا پہلے وہ پارٹی کے لیے جا کیں گے۔ ماہین کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شاہد رضا نے ڈرائیور کے ساتھ کار بیچ دی ہے۔ پارٹی کے بعد واپس بھی اسی کار میں آئیں گے۔

ماہین مطمئن ہو گئی۔ اپنی امی کو بھی اطمینان دلادیا۔ شام کے وقت فرح کار لے کر آ گئی۔ اس کے ساتھ تین مزید لڑکیاں تھیں۔ ماہین ان سب کو پہلے سے جانتی تھی۔

شاہد رضا کا فارم ہاؤس لاہور کے مضافات میں ایک نہر کنارے تھا۔ تقریباً سو کنال رقبے پر پھیلے اس فارم ہاؤس میں عیاشیوں اور مروجہ مستیوں کی ہر سہولت موجود تھی۔

ان کی کار جب فارم ہاؤس کے گیٹ کے پاس پہنچی تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ گیٹ کے پاس بھینسی لگی ہوئی تھی۔ چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ نوجوان وہاں کھڑے ہو کر زور و شور سے باتیں کر رہے تھے۔ بادی انکسٹر میں ان کے تھور جارحانہ لگ رہے تھے۔ جیسے وہ کسی بات پر غم و غصے کا اظہار کر رہے ہوں۔

فرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے شاہد رضا کے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے؟ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“

ڈرائیور نے کار تقریباً بیس گز دور روک دی تھی۔ وہیں سے گھور کر گیٹ کے پاس موجود نوجوانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں تشویش اور پریشانی کے سائے لہرانے لگے۔

اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”لگتا ہے طفیل بابا اپنے بد معاش ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔ میں قریب جا کے پتا کرتا ہوں۔“

ڈرائیور کار سے اترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ کی

کے بارے میں جاننے کا سوچ کر اس سے رخصت ہو کر اگلے لیکچر کے لیے کلاس روم کی طرف چلی گئی۔

تین چار دن گزر گئے۔ اس دوران ماہین اور فرح کی دوستی کا چرچا پورے کالج میں ہونے لگا۔ بہت سے لڑکے لڑکیوں کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ کیونکہ وہ دونوں یکسر متضاد مزاج کی حامل تھیں۔ ماہین میں ٹھنڈا تھا۔ تعلیم سے لگاؤ تھا۔ کسی بھی لڑکے سے کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا۔

فرح میں شوخی تھی۔ کالج میں پڑھائی کی نسبت غیر نصالی سرگرمیوں سے لگاؤ زیادہ تھا۔ ہر وقت لڑکوں میں گھری رہتی تھی۔ ایسے میں ماہین جب اس گروپ میں شامل ہوئی تو دیکھنے اور سننے والوں کے لیے حیرت بجا تھی۔

اس اثنا میں ماہین کو شاہد رضا کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ وہ شہر کے ایک بڑے بزنس گروپ کے جونیئر مین عارف رضا کا بیٹا تھا۔ ایک بڑی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھا۔ کاروباری معاملات میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا مگر من موچی تھا۔ یار دوستوں کے ساتھ مروجہ مستیاں زیادہ کرتا تھا۔

ماہین کو یہ جاننے کی بھی بے تابی تھی کہ فرح سے اس کا تعلق کس نوعیت کا تھا؟ فرح کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ صرف دوستی کی حد تک ان کا تعلق تھا۔

ادھر سے معلومات حاصل کر کے ماہین نے ڈرتے ڈرتے اپنی امی سے بات کی۔ ”امی! کالج کی میری سہیلیوں نے اتوار کی رات ایک پارٹی رکھی ہے۔ مجھے اجازت دیں گی نا؟“

”کیا رات بھر وہاں رہو گی؟“ تاج النساء نے پوچھا۔
”نہیں امی! رات کو جب بھی پارٹی ختم ہوئی تو میں آ جاؤں گی۔“

”رات گئے کیسے آؤ گی؟ کون تمہیں یہاں چھوڑ جائے گا؟“

”مم..... میری سہیلیاں ہیں نا امی! وہ مجھے واپس گھر چھوڑنے آئیں گی۔ پلیز منع نہ کریں۔“ اس کے لہجے میں فریاد بھی تھی، پارٹی میں شرکت کی تڑپ بھی۔

تاج النساء بولی۔ ”میرا دل گھبراتا ہے ماہین! زمانہ بہت خراب ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ خدا نخواستہ کچھ بُرا ہو جائے تو مفت میں تماشا بن جائیں گے۔“

”امی! مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں کسی غلط جگہ نہیں جا رہی ہوں۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”میں تو بھروسہ کروں گی۔ تمہارے بھائی ندیم کو کون

طرف گیا۔ تین چار منٹ بعد وہ واپس آیا اور شکر لہجے میں کہا۔
 ”میرا اندازہ درست تھا! بد بخت طفیل بابا نے پھڑا ڈالا ہے۔“
 ”وہ کمینہ کیا چاہتا ہے؟ جھگڑا کرنے کی وجہ کیا ہے؟“
 فرح غصے سے بولی۔

”وہ زبردستی اندر گھستا چاہتا ہے۔ جبکہ دربان بغیر پاس
 کے کسی کو فارم ہاؤس میں جانے نہیں دے رہا ہے۔“
 ”یہ کیسی بدمعاشی ہے۔ جب اسے بلایا نہیں گیا ہے تو
 زبردستی کیسے پارٹی میں شریک ہو سکتا ہے؟“
 ڈرائیور نفرت سے بولا۔ ”بدمعاش باب کا بگڑا بیٹا
 ہے۔ زور زبردستی کا عادی ہے۔ یہاں بھی اپنی مرضی کرنا چاہتا
 ہے۔“

”شاہد رضا کدھر ہے؟ کیا اسے خبر نہیں کی گئی ہے؟“
 فرح نے پوچھا۔

”گیٹ پر موجود ہمارے جوان کہہ رہے تھے کہ شاہد
 صاحب کو جھگڑے کی اطلاع دی گئی ہے۔ وہ بس آنے والے
 ہیں۔“

ڈرائیور داہن گیٹ کی طرف چلا گیا۔

ماہین نے پوچھا۔ ”فرح! یہ طفیل بابا کون ہے؟ کیا اتنا
 بڑا بدمعاش ہے کہ بہن بلائے اندر گھستا چاہتا ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ خود بھی بدمعاش ہے۔ اس کا باپ تو
 بدمعاشوں کا بدمعاش ہے۔ طفیل دادا کا نام سنا ہوگا۔ بدنام
 زمانہ ڈرگ ڈیلر ہے۔ غنڈے مولیوں کی ایک فوج اس کے
 ساتھ ہوتی ہے۔ یہ طفیل بابا پہلے بھی کئی دفعہ پارٹی میں ٹانگ اڑا
 چکا ہے۔ ایک بار شاہد رضا نے اسے اجازت دی تھی۔ پارٹی
 کے دوران اس نے اپنے غنڈے ساتھیوں کے ساتھ شراب
 کے نشے میں دھت ہو کر ایسی ہڑ بولیں کہ پارٹی درہم برہم
 ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھی انتہائی بدتمیز اور بد اخلاق لو جو ان
 ہیں۔ شاہد رضا نے شرافت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ
 ہتھے سے اکھڑ گئے۔ لڑنے مرنے پر اتر آئے۔ ہوائی فائرنگ
 بھی کی۔ شاہد رضا کے پاس بھی سکیورٹی گارڈز کی کمی نہیں۔ اس
 نے اپنے سکیورٹی گارڈز کے ذریعے ان سب کو فارم ہاؤس سے
 باہر نکال دیا۔ اس وقت تک رات بہت گزر چکی تھی۔ ساری
 پارٹی بدظمی اور ہنگامے کی نذر ہوئی تھی۔ اس دن کے بعد سے
 شاہد رضا نے طفیل بابا اور اس کے غنڈوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔
 کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد یہ بد بخت آج پھر وارد ہو گیا
 ہے۔“

”اسے تو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔“ ایک لڑکی نے

کہا۔

”پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“ فرح بولی۔ ”طفیل
 دادا ایسا بااثر اور طاقت ور شخص ہے کہ اس کے بل بوتے پر طفیل
 بابا بھی ہر ایک کی پگڑیاں اچھالتا پھرتا ہے۔ سرعام لڑکیوں کو
 چھیڑتا ہے۔ مگر مجال ہے پولیس اس کے خلاف کوئی ایکشن
 کرے۔“

اسی وقت فارم ہاؤس کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کے
 شاہد رضا باہر آیا۔ وہ کافی فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود اس کے
 چہرے پر تناؤ اور غصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر
 فرح جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور گیٹ کی طرف بڑھی۔
 ماہین نے پیچھے سے آواز دی۔ ”فرح! رک جاؤ۔ میں
 بھی تمہارے ساتھ آ رہی ہوں۔“

دوسری لڑکیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ تیزی
 سے باہر نکل کر فرح کے قریب گئی اور دونوں تیز چلتی ہوئی
 گیٹ کی سمت جانے لگی۔

اسی وقت گیٹ کے پاس سے تڑتڑا تڑ فائرنگ کی ہول
 ناک آواز گونج اٹھی۔

☆☆☆

انسپکٹر کرم شاہ کی موجودگی میں ڈی ایس پی نے سارا
 کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

اس نے ایس پی سے فون پر بات کی۔ ساری صورت
 حال سے اسے آگاہ کیا۔ پھر اس نے ایس پی کی ہدایات کی
 روشنی میں فیصلہ کیا کہ طفیل بابا کو ڈی ایس اپنی گاڑی میں چھپا کر
 باہر لے جائے گا۔ اس کے تین ساتھیوں پر کم مقدار میں چرس
 برآمدگی کا کیس دائر کیا جائے گا۔ جبکہ اسلئے کی بات ظاہر نہیں کی
 جائے گی۔

انسپکٹر کرم شاہ کے بارے میں اس نے فیصلہ سنایا کہ
 اختیارات کے ناجائز استعمال پر اس کے خلاف تحقیقات ہوں
 گی۔ فیصلہ آنے تک وہ پولیس اسٹیشن میں ڈیوٹی سرانجام نہیں
 دے گا۔ ایس پی آفس میں بحیثیت ادا ایس ڈی (آفیسر آن
 ایڈیٹل ڈیوٹی) رپورٹ کرے گا۔

غصہ، ملال اور بے بسی سے وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس
 کی نظروں کے سامنے طفیل بابا کا تھانہ انداز میں سر اٹھائے باہر
 چلا گیا۔ انسپکٹر کرم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں
 میں تسخیر اور اپنی جیت کا غرور بھی تھا۔

ڈی ایس پی اور طفیل بابا کے جانے کے بعد تھانے کا
 عملہ اس کے پاس آ کر ہمدردی اور بے بسی کا اظہار کرنے لگا۔ وہ
 چپ چاپ کئی بارے ہوئے جواری کی طرح انہیں دیکھتا رہا
 اور پھر خاموشی سے اٹھ کر تھانے سے باہر آیا۔

پولیس اسٹیشن کے ساتھ ہی سرکاری مکان تھا۔ مکان میں اس کی بیوی اکیلی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ تین سال ہوئے جب وہ رحیم یار خان میں تعینات تھا، وہاں ایک شریف لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کی گئی۔

اس کی بیوی اللہ لوک عورت تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت کچن میں گزرتا تھا یا پھر مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی مزاج آشنا تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے دل کے موسم کا پتا لگاتی تھی۔

اس دن اپنے شوہر کو معمول سے بہت پہلے افسردہ اور شکستہ سامکان میں داخل ہوتا دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ اپنے اصولوں اور بے چلک روٹیوں کے طمانچے کھا کے آیا ہے۔

”کیا ہوا؟ بہت مایوس اور اداس لگ رہے ہیں۔“ اس نے حجت تمام کرنے کے لیے پوچھا۔

”وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں نے ایک بااثر مجرم پر ہاتھ ڈالا تو اسے بچانے کے لیے خود میرے ٹکے کے بڑے میرے خلاف ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح میرے اصول اور میری صاف گوئی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔“

”اپنے خود ساختہ اصولوں کی وجہ سے کب تک ذلیل و خوار ہوتے رہیں گے؟“ بیگم نے حلقی سے کہا۔ ”بس بہت ہو گیا۔ سسٹم کے ساتھ سمجھوتا کریں یا پھر یہ نوکری چھوڑ دیں۔“ اس نے سلگتی نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا پھر بکھری بکھری آواز میں کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو نیک بخت! اب مجھے کسی ایک آپشن پر غور کرنا پڑے گا۔“

اگلے دن وہ بڑوں کے حکم کے موجب ایس بی آفس جا کر پیش ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ ایس بی صاحب نے حکم دیا ہے انتظار کرے۔ وہ جب فارغ ہوں گے۔ ان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

صبح سے شام ہوئی۔ ایس بی صاحب اس کی نگاہوں کے سامنے کئی بار آفس سے باہر نکلے پھر واپس آئے۔ بہت سے لوگ ان سے ملنے گئے لیکن اس سے بات کرنے کی انہیں فرصت نہ ملی۔ انسپٹر کرم شاہ کبھی کبھی پر بیٹھے کبھی لان میں ٹپکتے وقت گزارتا رہا۔

تین دن مسلسل وہ ایس بی آفس جاتا رہا۔ کوئی اس سے سپرے منہ بات نہ کرتا۔ ایس بی صاحب کا حکم سنا کے آفس سے باہر جانے کی بھی اجازت نہ دی جاتی۔ وہ معطل نہیں ہوا تھا، او ایس ڈی بنایا گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے... آفس میں بیٹھنے کے لیے کبھی بھی نہیں ملی تھی۔

افسردگی، مایوسی اور بے بسی کی کیفیات ایک ساتھ اس پر طاری ہو رہی تھیں۔ جس ٹکے میں اس نے پچیس سال خدمات سرانجام دی تھیں، اس کے بڑوں کا رویہ ایسا بدل چکا تھا کہ ٹکے سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

چوتھے دن اس نے بہت غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ جو ٹکے مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا، اس میں مزید خوار ہونے سے بہتر ہے تعلق ہی توڑ دے۔

اس نے اپنی پچیس سالہ سروس کی بنیاد پر ریٹائرمنٹ کی درخواست لکھی اور ایس بی کے پی اے کو تھادی۔

دو دن بعد ہی اسے بتایا گیا کہ ریٹائرمنٹ کی اس کی درخواست منظور ہوئی ہے۔ اسے خوشی سے زیادہ دکھ ہوا کہ ٹکے والے اس سے کتنے تنگ آئے ہوئے تھے کہ اس کی ریٹائرمنٹ کی درخواست پر اتنی جلدی عمل درآمد کیا جا رہا تھا۔

اس کی سروس کے مطابق پنشن کی فائل بننے والی تھی۔ اس کے لیے ایس بی آفس سے لے کر اے جی پی آر آفس تک مختلف مراحل سے گزر کر کاغذات مکمل ہونے تھے۔ دیانت داری اور فرض شناسی کی بات کی جائے تو یہ چند دن میں مکمل ہو سکتے تھے مگر سرکاری بابودوں کی روایتی سستی، بے ایمانی اور رشوت ستانی کی بدولت ایک سرکاری ملازم ریٹائر ہونے کے بعد پنشن کی وصولی تک اعصاب شکن مراحل سے گزرتا ہے۔ چند دنوں کا کام کئی ہفتوں تک چلا جاتا ہے۔ قدم قدم پر رشوت خور افسر اور ذیلی عملہ مگر ٹکے کی طرح منہ کھولے سالکوں کا انتظار کرتے ہیں۔ بلاوجہ اعتراضات لگا کے اس بے چارے کو اتنا مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کی جیب گرم کر کے ہی اس کی فائل ایک سے دوسری تک پہنچ پاتی ہے۔

انسپٹر کرم شاہ بھی ایسے رشوت خور دفتری عملے کے چنگل میں کبھی پھنستے کبھی ان سے نیچے اپنی پنشن کے کاغذات مکمل کرا رہا تھا۔

اس کا ارادہ تھا کہ پنشن کے معاملات سے فارغ ہو کر وہ یہ شہر چھوڑ دے گا۔ اس نے ملتان میں بہت عرصہ ملازمت کی تھی۔ وہاں کی آب و ہوا اور ماحول سے بہت مایوس تھا۔ اس کی بیگم بھی اولیاء کے اس شہر سے بہت عقیدت رکھتی تھی۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہاں سے جا کر ملتان میں مستقل رہائش اختیار کریں گے۔ ایک چھوٹے سے گھر میں پُر سکون زندگی گزاریں گے۔

انسان سوچتا ہے۔ فیصلہ کرتا ہے۔ یہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے مقدر میں جو لکھا ہے، وہ اس کی سوچ اور اس کے فیصلوں کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

اس کی پیشین گوئی کے کاغذات ابھی اسے جی پی آر آفس میں گردش کر رہے تھے پھر ایسا واقعہ ہوا کہ اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔

☆☆☆

شاہد رضا کے فارم ہاؤس کے مرکزی گیٹ پر شہر کے بدنام ڈرگ سپلائر ٹیکسٹل دادا کے بگڑے بیٹے طفیل بابا نے اپنے غنڈے ساتھیوں کے ساتھ دھاوا بول دیا تھا۔ وہ زبردستی فارم ہاؤس میں گھسنا چاہتا تھا۔ ماہین، فرح اور دوسری لڑکیاں پارٹی میں شرکت کے لیے گیٹ کے سامنے موجود تھیں۔ ایسے ہی وقت شاہد رضا فارم ہاؤس کے مرکزی گیٹ پر نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر فرح اور ماہین بھی گیٹ کی طرف جانے لگی تھیں کہ فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔

در اصل یہ فائرنگ شاہد رضا کے سیکورٹی گارڈز نے کی تھی۔ اپنے مالک کو باہر نکال دیکھ کر وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ طفیل بابا اور اس کے ساتھیوں کو ڈرانے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ایک لمحے کو وہاں کھلبلی سی جگمگ تھی۔ فریقین نے اپنے اپنے ہتھیاروں پر گرفت مضبوط کر لی تھی۔

اسی وقت شاہد رضا نے سمجھداری سے کام لیا۔ اس نے فائر کرنے والے سیکورٹی گارڈ کو زور سے طمانچہ مارا۔ اس کے ہاتھ سے اسلحہ چھین لیا۔ طفیل بابا اور اس کے غنڈے خطرناک تیوروں کے ساتھ پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔

شاہد رضا نے نرمی سے کہا۔ ”دیکھو طفیل بابا! اپنے ہتھیار نیچے کرو۔ خون خرابا ہوا تو کوئی نہیں بچے گا۔“

”مجھے مت ڈراؤ شاہد رضا! کل دھون ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔“ اس نے بتانا کر کہا۔

”دیکھو، بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ہماری پرائیویٹ پارٹی ہے۔ تم اس طرح دھونس دھکی سے اپنی بات نہیں منوا سکتے۔“ شاہد رضا نے لہجہ میں بولا۔

طفیل بابا نے اکھڑ لہجہ میں کہا۔ ”کس مائی کے لال میں اتنا دم ہے کہ مجھے روک سکے۔ طفیل بابا وہ ماسٹر کی ہے جو بڑے سے بڑے تالے کو بھی کھول دیتا ہے۔ میں تمہیں بھی شرافت سے سمجھا رہا ہوں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو فارم ہاؤس میں داخل ہونے سے مت روکو۔ ورنہ گیٹ توڑ کر اندر داخل ہوں گے۔“

”اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو طفیل بابا!“ شاہد رضا نے ایک دم بگڑ کر غصے سے کہا۔ ”مت بھولو کہ پہلے بھی تمہیں دھکے دے دے کر فارم ہاؤس سے باہر نکالا تھا۔ اب بھی تم اپنی بدتمیزی اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے تو ویسا سلوک دوبارہ

ہوسکتا ہے۔“

”پہلے کی بات مت کرو شاہد رضا! اس وقت میں نے شرافت دکھائی تھی۔ یہ مت سمجھو کہ میں ڈر گیا تھا۔ آج وہ کمر پوری کر کے جاؤں گا۔“ اس نے چلا کر کہا۔

شاہد رضا پھر بھی محل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”طفیل بابا بات کو مت بڑھاؤ۔ بھلائی اسی میں ہے یہاں سے اپنے ساتھیوں کو لے کر چلے جاؤ۔ میں آج کسی بھی صورت تمہیں اندر داخل ہونے نہیں دوں گا۔ یہ ہماری خاص پارٹی ہے۔ تم کسی اور موقع پر آ جاؤ۔ پوری رات یہاں جشن مناؤ۔ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔“

”یہ خیرات کا احسان اپنے پاس رکھو۔ ہم آج رات ہی فارم ہاؤس میں منعقد ہونے والی پارٹی میں شریک ہونے آئے ہیں۔ ہمیں اندر آنے دو ورنہ ہم یہ پارٹی نہیں ہونے دیں گے۔ ٹیکسٹل دادا کا بیٹا یہاں سے نامراد واپس جائے، یہ اس کی توہین ہے۔“

”اپنے باپ کے بل بوتے پر بد معاشی مت دکھاؤ۔“ شاہد رضا نے ترخ کر کہا۔ ”طاقت اور حیثیت میں میرا باپ عارف رضا بھی کسی سے کم نہیں۔ فرق اتنا ہے تمہارے باپ ٹیکسٹل دادا کی طرح جرائم پیشہ لوگوں کو ساتھ ملا کے بد معاش بنا نہیں پھرتا۔“

چور کو چور کہنے سے وہ اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے۔ طفیل بابا کا باپ ٹیکسٹل دادا علاقے کا نامی گرامی بد معاش اور منشیات فروش تھا۔ طفیل بابا میں بھی اپنے باپ کی ساری صفات موجود تھیں۔ اس کے باوجود شاہد رضا نے اس کے باپ کو بد معاش اور منشیات فروش کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔ اچانک ہی اچھل کر شاہد رضا کے سینے پر لات ماری۔ شاہد رضا اس اچانک وار سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے محافظ پیچھے ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے جھپٹ کر اسے تھام لیا اور اپنے بازوؤں کے سہارے اسے گرنے نہیں دیا۔ وہ فوراً سنبھل گیا۔ محافظوں نے ایک دم کھٹا کھٹ اپنے ہاتھوں میں موجود خود کار رائفٹوں کو لوڈ کیا۔ اجازت طلب نظروں سے اپنے مالک کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گیٹ کھل گیا اور پانچ چھ مزید سیکورٹی گارڈز باہر نکلے اور شاہد رضا کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ تھا۔

شاہد رضا نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے محافظوں کو کسی اقدام سے روک لیا پھر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”طفیل بابا! حد پار مت کرو۔ تم اور تمہارے یہ سڑک چھاپ بد معاش میرے سیکورٹی گارڈز سے تعداد میں کم ہو۔ تمہارے پاس شاید عام

سے پتل اور ریوالور ہوں گے۔ ذرا غور سے دیکھو۔ ہماری تعداد بھی زیادہ ہے۔ ہمارے پاس آٹو میک گنز بھی ہیں۔ اب میرا صبر جواب دے گیا ہے۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ دیتا ہوں۔ اپنے ان پالتو گتوں کو لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”ابے او کاغذی ہیرو! تو میرا کچھ نہیں اکھاڑ سکتا۔“ وہ چڑانے کے انداز میں بولا۔ ”میں ابھی واپس جاتا ہوں۔ یاد رکھنا یہ معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ یہ بھی مت سمجھنا کہ تیرے سیکورٹی گارڈ اور ان کی آٹو میک گنز سے ڈر کر جا رہا ہوں۔ مجھے خراش بھی آئی تو قیامت برپا ہوگی۔ شکیل دادا سب کی کھالیں زندہ کھینچوا لیں گے۔“

اتنا کہہ کر اس نے پلٹ کر ماہین اور فرح کی طرف لوہرا نہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھی تھی شہوت بھی۔ فرح اور ماہین اس کے غنڈوں کے پیچھے آٹھ دس قدم دور کھڑی ان کی تکرار سن رہی تھیں۔

طفیل بابا نے ہاتھ سے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہد رضا! آج کی رات یہ حسین تیلیاں تجھے مبارک ہوں۔ شراب اور شباب کا جی بھر کے لطف اٹھاؤ۔ اگلی بار ان پر میرا اور میرے ساتھیوں کا حق ہوگا۔ ہم بھی ان سب سے اپنی راتیں رنگین بنائیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور پلٹ گیا۔ ابھی اس کا قہقہہ ختم نہیں ہوا تھا کہ سچ میں ہی گھٹ کر رہ گیا۔ شاہد رضا نے ایک دم اچھل کر اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ اپنے بازوؤں کے گھیرے میں اس کی گردن جکڑ کر فرمایا۔

”ابے کتے کی دم! تو نے مجھے جڑا کہا۔ مجھے لات ماری۔ میں خاموش رہا لیکن میری مہمان لڑکیوں کے خلاف اپنی گندی زبان استعمال کرنے کی تجھے ہمت کیسے ہوئی؟“

وہ دونوں قد آور جوان تھے مگر شاہد رضا نے پیچھے سے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کے بازو کے شکنجے میں پھنس کر طفیل بابا کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔

اس نے اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلائے۔ خود کو شاہد کی گرفت سے چھڑانے کے جتن کیے۔ اس دوران شاہد رضا کے سیکورٹی گارڈ اپنی گنز طفیل بابا کے بدنوں کی طرف تان کر خطرناک نظروں سے انہیں گھور رہے تھے۔

شاہد نے چند ثانیے اسے جکڑ کر رکھا۔ اسی حالت میں اس کی گردن دبائے ہوئے زمین کے قریب لایا پھر ایک دم اسے جھکے سے سڑک پر دوے مارا۔

سڑک پر منہ کے بل گرنے کے بعد اس نے سنبھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ تیزی سے کھڑا ہوا اور شاہد پر حملہ کرنے

کے لیے چھلانگ لگا دی۔ شاہد رضا ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے جا کر سیکورٹی گارڈ سے ٹکرا گیا۔ تین چار سیکورٹی گارڈز نے اسے پکڑ لیا۔ کچھ نے شاہد کے گرد ایک حفاظتی حصار بنالیا۔ باقیوں نے طفیل بابا کے ساتھیوں کو اپنی گنز کے نشانے پر لے کر انہیں کسی جذباتی رد عمل سے باز رکھا۔ طفیل بابا خطرناک دھمکیاں دیتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاڑیوں کی طرف بڑھا پھر ان میں سوار ہو کر تیزی سے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد ماحول کے ساتھ ساتھ شاہد کے چہرے کا تناؤ بھی ختم ہوا۔ وہ فرح اور ماہین کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اس ناخوش گوار واقعے سے تمہاری طبیعتوں پر بڑا اثر پڑا ہوگا۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے دھیرے سے مسکرا کر کہا اور ان کے ساتھ فارم ہاؤس کا رخ کیا۔

اس وقت شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ماہین ایک خوش گوار حیرت میں ڈوب گئی۔ اس کے دائیں بائیں وسیع سبزہ زار تھے۔ جن کے کناروں پر پھلوریاں تھیں۔ کہیں کہیں خوش نما درخت تھے۔ جگہ جگہ لوہے کے کھمبے تھے۔ جن میں سرخ اور سفید رنگ کے بلبس جل رہے تھے۔ ان کی روشنیاں ایک دل کش تاثر کے ساتھ اس وسیع و عریض احاطے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

فرح اور ماہین کے ساتھ تین مزید لڑکیاں تھیں۔ وہ سب ایک خدمت گار کی رہنمائی میں عمارت میں داخل ہو گئیں۔ ایک کاریڈور سے ہوتی ہوئی بڑے سے ہال میں آ گئیں۔ وہاں رنگ و روپ کا جیسے دریا بہہ رہا تھا۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں زرق برق لباسوں میں نظر آرہے تھے۔ سامنے ایک اسٹیج سا بنا ہوا تھا۔ تیز موسیقی کی دھنوں پر متحدہ لڑکیاں اور لڑکے وہاں تھرک رہے تھے۔

ہال میں سگریٹ، چرس اور کوکین کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں میں نازک اور خوش نما جام تھے۔ وہ جام سے جام گمار رہے تھے۔ منہ سے لگا رہے تھے۔ نشے کی زیادتی سے جھوم رہے تھے۔ بہک رہے تھے اور بے خودی میں ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔

ماہین نے پہلے بھی اس طرح کی پارٹیوں میں شرکت نہیں کی تھی۔ ایسا ماحول اور ایسا رنگ و روپ اس نے محض فلموں میں دیکھا تھا۔ پہلی بار ایسے ماحول میں آکر وہ حیران بھی تھی، پریشان بھی۔ وہ فرح اور دوسری لڑکیوں کے پیچھے پیچھے گھبرائی ہوئی سی چل رہی تھی۔ جدھر نظر اٹھتی جوان لڑکے لڑکیوں کی

جذباتی بے باکی کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ وہ گھبرا کر لگا ہیں پھیر لیتی تھی یا پھر جھکا لیتی تھی۔

فرح اس کی کیفیت سمجھ کر رک گئی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے ہوئے بولی۔ ”ماہین! تمہیں یہ سب عجیب لگ رہا ہوگا۔ شروع میں میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ہم ڈل کلاس کی لڑکیاں ایسے ماحول میں ہائل مٹ فٹ ہیں پھر بھی ہائی سوسائٹی کے ان دوستوں کے احسان مند ہیں کہ ہمیں اپنی پارٹیوں میں بلاتے ہیں۔ ایک دو دفعہ مزید آؤ گی تو ان سب کی عادی ہو جاؤ گی۔“

”یار فرح! کوئی اور جگہ نہیں ہے کیا بیٹھنے کے لیے؟“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرا مطلب ہے جہاں یہ سب نہ ہو۔ تھوڑی دیر وہاں سکون سے بیٹھ کر خود کو اس ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کروں گی۔“

”ہے۔ کیوں نہیں۔ چلو یہاں سے باہر چلتے ہیں۔ ہال کی پچھلی طرف کے نظارے اور وہاں کا ماحول بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ بہت مزے کر دیں گی۔“

وہ ماہین کو لے کر ہال کے ایک چھوٹے سے دروازے سے ہو کر باہر آئی اور ایک راہداری سے ہوتے ہوئے پچھلی جانب آئی۔ فرح جس اعتماد سے اس وسیع و عریض عمارت میں سے گزر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ بہت دفعہ یہاں آئی تھی اور چپے چپے سے واقف تھی۔

اچانک ہی ماہین کے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک کشادہ سبزہ زار تھا۔ خوب صورت رویشیں بنی ہوئی تھیں۔ دیدہ زیب پھول کھلے ہوئے تھے۔ روشنی کے پول جگہ جگہ نصب تھے۔ جن سے پھونکی دو دھیرا روشنی اس پورے ماحول کو چار چاند لگا رہی تھی۔ سبزہ زار میں مناسب فاصلے پہ متعدد میزیں لگی ہوئی تھیں۔ کتنے ہی نوجوان جوڑے سر سے سر جوڑ کر سب سے بے نیاز بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایک منظر نے ماہین کی توجہ خصوصی طور پر اپنی طرف کھینچ لی۔ سبزہ زار کی ایک سمت سونٹنگ پول بنا ہوا تھا۔ مدہم روشنی وہاں پڑ رہی تھی۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں سونٹنگ پول میں تیراکی کر رہے تھے۔ ان کی اٹھیلیوں اور پیار بھری شرارتوں کی آوازیں کھیلوں کی جھنجھٹاؤں کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”اعدر ہال کے شور و غل کی نسبت یہاں قدرے سکون ہے۔ کوئی میرے بارے میں کچھ بھی سوچے۔ میں یہیں بیٹھ جاؤں گی۔ اگر تم میرے ساتھ بیٹھنا

چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ہال میں چلی جاؤ۔ میں تمہارے شوق کو خراب نہیں کروں گی۔“

”تمہارے ساتھ بیٹھ کے ایک سگریٹ پیتی ہوں پھر اعدر ہال میں چلی جاؤں گی۔“ فرح نے کہا۔

اس نے اپنے پرس سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کے سلگایا۔ ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑا۔ ماہین کو محسوس ہوا یہ عام سگریٹ نہیں تھا۔ اس میں چرس بھرا ہوا تھا۔ ماہین نے کئی دفعہ اپنے بھائی ندیم کے کمرے میں ایسی بو محسوس کی تھی۔

اب فرح نے یہ سگریٹ سلگایا تو وہ ایک دم کچھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”فرح! تم چرس بھی پیتی ہو؟ ویسے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اس پارٹی میں جو ماحول میں نے دیکھا ہے، اس سے لگتا ہے تم شراب بھی پیتی ہو؟“

فرح نے ایک قبچہہ لگایا۔ ”اب مجھے نصیحتیں کرنے مت بیٹھنا۔ مجھے چڑ ہے ایسی باتوں سے۔ تم ہماری دوست بن گئی ہو۔ ہماری بہت سی عادتوں سے واقف ہو جاؤ گی۔ شاہد رضا نے خاص پارٹی میں بلا کر تمہیں عزت دی ہے۔ اب اس کی لاج رکھو اور ہماری طرح لائف انجوائے کرو۔ لو ایک کش تم بھی لے لو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ زندگی کتنی حسین ہے۔“

فرح نے بھرا سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ماہین گھبرا کر ایک قدم دور ہٹ گئی۔ ”نہن..... نہیں فرح! مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔“

”پچھلی بار سب یہی کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ عادی بن جاتے ہیں۔ ابھی بس ایک کش لو۔ میری قسم اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں ذمے دار ہوں۔“

اس نے زبردستی سگریٹ ماہین کے منہ سے لگایا۔ ماہین پر اس ماحول کا اثر ویسے بھی دھیرے دھیرے ہونے لگا تھا۔ وہ جانتے بوجھے اس پارٹی میں آئی تھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی سرمستوں کو دیکھ دیکھ کر دل ان کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ بس دماغ کمزوری رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔ ایسے میں فرح نے بھرا سگریٹ چپے کی ترغیب دی اور اصرار کر کے منہ سے بھی لگایا تو وہ زیادہ دیر خود کو روک نہ سکی۔

ڈرتے ڈرتے ہلکا سا کش لیا۔ دھواں طلق تک گیا۔ ٹھکا لگا۔ اسے فوری باہر نکال دیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک اور کش لیا۔ اس بار ٹھکا نہیں لگا۔ اس نے دھواں کچھ دیر طلق میں روکے رکھا پھر ناک اور منہ سے باہر نکالا۔ اسے چھین سی ہوئی، اچھا بھی لگا۔ تیسری بار کش لگا کے دھواں طلق سے پیچھا اتارا۔ اس دوران آٹھ دس سیکنڈ گزر رہے تھے۔

تجی اچانک اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ پہلی بار جس کا نشہ کیا تھا۔ اثر تو ہونے والا تھا۔ اس نے فرح کا بازو تھام لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا گویا جسم ہوا میں اڑ رہا ہو۔ فرح اس کی کیفیت تاڑ گئی تھی۔ اسے سہارا دے کر قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھایا۔ خود بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

ماہین کا دماغ چکرا رہا تھا۔ نظر کے سامنے ہر شے گویا گردش میں تھی۔ وہ کرسی کی پشت پر سر رکھ کر بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد متحرک چیزیں ساکن ہو گئیں۔ لیکن دل کا عجب عالم ہو رہا تھا۔ مسرت اور محبت کے بادلوں میں اڑ رہا تھا۔ جی میں آ رہا تھا اٹھ کر جھوم جھوم کر ناچنے لگے۔ کسی محبوب ہستی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر گل پوش دادیوں کی سیر کرے یا پھر زور زور سے قہقہے لگائے۔

فرح نے سگریٹ ختم کیا تھا۔ وہ بھی کرسی کی پشت پر سر رکھے آنکھیں بند کیے کچھ گنگنا رہی تھی۔ وہ جیسے مدہوشی کے کسی جہان میں پہنچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی مدہوشی دور ہو گئی۔ حواس بحال ہو گئے۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ ”ماہین! ات۔۔۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟ کیا ادھر ہی بیٹھے رہنا ہے۔ چلو ہال میں چلتے ہیں۔ کچھ کھاتے پیتے ہیں۔“

ماہین اس کے ساتھ کرسی سے اٹھی۔ اس کے قدم اب تک لڑکھڑاہے تھے۔ دماغ بھی ہلکا ہلکا گھوم رہا تھا مگر یہ کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنا ہوش کھودیتی۔ اس کے حواس بحال تھے۔ ایک ہلکا سا سردی دل پر اترا ہوا تھا۔

ہال میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کی سرمستی اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ فرح اسے اپنے ساتھ ہال کے کونے میں لے گئی۔ وہاں کا ڈنٹر سا بنا ہوا تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت کا ڈنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے شیٹے کی بڑی سی الماری بنی ہوئی تھی۔ جس میں طرح طرح کے مشروبات بوتلوں میں سجے ہوئے تھے۔ ماہین انہیں سوفٹ ڈربک ہی سمجھ بیٹھی تھی لیکن فرح نے بتایا کہ ان بوتلوں میں مختلف قسم کی شراب بھری ہوئی ہے۔ اس نے اپنے لیے ایک مشروب کا آرڈر دیا۔ ماہین کو بھی پیش کش کی۔ ترغیب بھی دی مگر اس نے منہج کیا۔

”نہیں فرح! تمہاری بات مان کے میں نے بھر سگریٹ پیا۔ اس کے اثرات ابھی تک ہیں۔ پلیز اب مجھے شراب پینے پر مجبور نہ کرو۔“

فرح نے عادت کے مطابق دھب سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا پھر پتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہاں کا

دستور ہے پہلی بار کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ آئندہ تمہیں اس سب کے لیے تیار ہو کر آنا ہوگا۔ ابھی تم اور نج جوں لے لو۔ اس سے دماغ بھی تروتازہ ہوگا۔“

ماہین نے کا ڈنٹر سے ایک اور نج جوں لے لیا۔ وہاں پیے نہیں دینے پڑتے تھے۔ پارٹی جنجنٹ کی طرف سے یہ سب مفت تھا۔

ماہین گھونٹ گھونٹ کر کے جوں پینے لگی۔ فرح نے غٹا غٹا جام خالی کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ دوڑتی ہوئی اسٹیج کی طرف لپٹی۔ وہاں آٹھ دس لڑکے لڑکیاں رقص کر رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔

ماہین کو یہ سب اچھا بھی لگ رہا تھا۔ نوجوان نسل کی بے راہ روی پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ فرح نے اور شاہد رضانی جب اسے پارٹی میں شرکت کی دعوت دی تو اس کے وہم و گمان میں یہ نہیں تھا کہ ایسا ماحول دیکھنے کو ملے گا۔ یہ سب اس کے لیے حیران کن بھی تھا، اپنی یکسانیت اور بوریت سے بھرپور زندگی میں ایک خوش کن موڑ بھی تھا۔

اچانک اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ دل ایک خوش گوار احساس سے بے طرح دھڑک اٹھا تھا۔ اس کے نزدیک شاہد رضا کھڑا تھا اور نرم نرم نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ایک اضطرابی رد عمل کے تحت وہ خود میں سینے لگی۔ ایک حیا آلود مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کن آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

شاہد رضانی نرم سے لہجے میں بولا۔ ”مجھے امید ہے تم پارٹی انجوائے کر رہی ہو گی؟“

”نہ۔۔۔۔۔ جی ہاں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے“ اس نے اک ذرا ہٹکا کر کہا۔ ”بس پہلی بار ایسی پارٹی میں شرکت کر رہی ہوں اس لیے عجیب بھی لگ رہا ہے۔“

”تم آئندہ آتی رہو۔ اس سے تمہاری جھجک بھی دور ہو گی۔ تمہاری وجہ سے ہماری پارٹی میں رونق بھی ہو گی۔“ شاہد رضا اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

ماہین اس کی نگاہوں کی تپش سے پگھل سی گئی۔ دل پر پہلے ہی اس کی شخصیت اور مالی حیثیت کا رعب بیٹھا ہوا تھا۔ اب ایسی بات کہہ دی تو وہ اندر سے بالکل ڈھم گئی۔

بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”باہر گیٹ پر تھوڑی دیر پہلے جولا کا جھڑا کر رہا تھا۔ فرح بتا رہی تھی وہ لاہور کے ایک بڑے بد معاش کلکیل دادا کا بیٹا ہے۔ جاتے ہوئے وہ بڑی دھمکیاں دے رہا تھا۔ آئندہ وہ کوئی مسئلہ تو کھڑا نہیں کرے گا نا؟“

شاہد رضا ناگواری سے بولا۔ ”اس کی بد معاشی کم زوروں پر چلتی ہے۔ مجھ پر نہیں۔ اس پر لعنت بھیجو۔ یہ بتاؤ۔ تم کوئی ڈرنک نہیں لیتی ہو؟ صرف اور سچ جیس پی کر پارٹی انجوائے کرو گی؟“

ماہین اس کا مطلب سمجھ گئی۔ سر جھکا کر بولی۔ ”میں نے پہلے کبھی نہیں پی ہے۔ پینے کا حوصلہ بھی نہیں۔ پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ بار کاؤنٹر پر موجود خاتون سے ایک ڈرنک بنانے کو کہا پھر ماہین سے کہا۔ ”پارٹی میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ سب اپنے اپنے شوق کے مطابق مشغل میلہ کرتے ہیں۔ اس لیے بے فکر ہو کر پارٹی انجوائے کرو۔“

ماہین بولی۔ ”پارٹی تک تک چلے گی؟ اصل میں اپنی والدہ سے کہا تھا کہ بارہ بجے تک گھر پہنچ جاؤں گی۔“

وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بارہ۔ بجنے میں ابھی دو گھنٹوں سے زیادہ کا وقت ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگے گا۔ اس کے بعد میوزیکل شو ہے۔ بڑے شہروں سے نامی گرامی فن کار آئے ہیں۔ اس کے بعد پارٹی تو صبح تک چلتی رہے گی۔ تم بے فکر رہو۔ جب چاہو گی میرا ڈرائیور گھر چھوڑ دے گا۔ فرح اور دوسری لڑکیاں تو رات بھر موج مستی کرتی رہیں گی۔“

”فرح تو بہت دیر سے اسٹیج پر رقص کر رہی ہے۔ اس میں بڑا جوش ہے۔ تھکتی ہی نہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”تم کچھ بچتی نہیں ہو۔ کیا ڈانس بھی نہیں کرتی ہو؟ دیکھو تو فرح اور دوسری لڑکیاں کتنے مزے کر رہی ہیں۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ..... اصل میں پہلی بار آنے کی وجہ سے ہمت نہیں ہو رہی۔ اسے آپ شرم کہیں یا گھبراہٹ۔ آج میں بس دیکھ کر مزے کروں گی۔“ اس نے ہنچکاتے ہوئے کہا۔

شاہد رضا نازک سے جام سے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ”تم جس میں خوشی اور آزادی محسوس کر رہی ہو۔ وہی کرو۔ تمہاری شرم اور بے ہمتی کے خاتمے کے لیے ابھی آگے بہت سی پارٹیاں ہوں گی۔ مجھے امید ہے بہت جلد تم بھی دوسری لڑکیوں کی طرح موج مستی کی عادی ہو جاؤ گی۔ ابھی تم نہیں رہو۔ میں ڈنر اور میوزیکل پروگرام کے انتظامات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ ہال سے باہر چلا گیا۔ ماہین قریب ہی ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسٹیج پر اب دوسرا گروپ تھرک رہا تھا۔ فرح ایک کرسی پر بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ ڈرائیور بعد وہ اٹھ کر

ماہین کے پاس آئی اور سگریٹ جلا کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں دیکھ رہی تھی بہت دیر سے شاہد رضا تمہارے پاس کھڑا تھا۔ تم دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ قربت کے کچھ فاصلے طے ہوئے یا پھر صرف خالی خولی باتیں کرتے رہے؟“ فرح نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر ٹوٹتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

ماہین نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”لگ..... کیا مطلب ہے تمہارا فرح! کن فاصلوں کی بات کر رہی ہو؟“

فرح زور زور سے ہنسنے لگی۔ ”اب اتنی بھی نادان نہیں بنو تم۔ شاہد کو دیکھتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو چمک اتر آتی ہے۔ وہ تمہارے اندر کی اٹھل پٹھل صاف بتا دیتی ہے۔ اس لیے مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ جہاں تک بات شاہد رضا کے محسوسات کی ہے۔ میں اس کے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ وہ ایسا بھورا ہے جو کلی کلی منڈلاتا ہے۔ رس چوستا ہے۔ اپنے نقوش چھوڑتا ہے اور پھر سے آؤ کر دوسری کلی پر جا بیٹھتا ہے۔ ویسے وہ حسین لڑکیوں کی قدر بھی کرتا ہے۔ ان کی عزت بھی کرتا ہے۔ چھوڑ کر انہیں دور نہیں پیٹک دیتا۔ اپنی نوازشات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔“

ماہین نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم شاہد رضا کی تعریف کر رہی ہو یا پھر اس کے کردار کی خامی بیان کر رہی ہو؟ اس کا مزاج جیسا بھی ہو۔ مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں کون سی اس کی گرل فرینڈ ہوں۔ ویسے تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“

”تا کہ تم اس حقیقت کو جان سکو کہ ہم ٹڈل کلاس کی لڑکیاں ان ہائی سوسائٹی کے لڑکوں کے لیے محض تفریح طبع کا ذریعہ ہیں۔ پارٹی اور موج مستی تک ہم ان کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ان کی حقیقی زندگی میں ہماری کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے تم اپنی سماجی حیثیت کو سامنے رکھ کر تعلق جوڑنا۔ تصورات کی زمین دنیا میں سدھ بدھ نہ کھودنا۔ ورنہ پچھتاوے کی غلغلہ عمر بھر پچھتاہیں چھوڑے گی۔“

ماہین سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت دل توڑنے والی بات کر رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں کھٹکشی ہونے لگی۔ اگر فرح درست کہہ رہی تھی تو شاہد رضا کے بارے میں اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دینا ہی بہتر ہوگا۔ ابھی اس سے متاثر ہونے کی شروعات تھی۔ دل اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ دماغ اس کے بازے میں سوچنے لگا تھا۔ ایسے میں فرح کی زبانی اس کی شخصیت کا یہ سفاک پہلو سامنے آ رہا تھا۔

اسی وقت اہلیگر پر اعلان ہونے لگا کہ ڈنر کا وقت ہو گیا۔

ہے۔ ہال سے متصل ڈائننگ روم میں سب تشریف لے جائیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ کھانے کے بعد میوزیکل پروگرام ہوگا۔ جو آدمی رات تک جاری رہے گا۔ پارٹی اس کے بعد بھی صبح تک چلتی رہے گی۔“

ماہین نے کہا۔ ”فرح! مجھے بارہ بجے سے پہلے گھر چلے جانا ہے۔ شاہد رضا نے کہا ہے اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھجوادے گا۔“

وہ بے فکری سے بولی۔ ”تمہاری مرضی ماہین! میں تو رات بھر پارٹی انجوائے کروں گی۔ چلو آؤ۔ ڈائننگ روم کی طرف چلے چلتے ہیں۔ ڈرنک کر کے اور بہت دیر ڈانس کر کے مجھے زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

ماہین اس کے ساتھ ڈائننگ روم میں آئی۔ انواع و اقسام کے کھانے میزوں پر سجے ہوئے تھے۔ سویٹ ڈشیں تھیں۔ پھل اور مشروبات تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے تک گیارہ بج گئے۔ ماہین کا شوق پورا ہو گیا تھا۔ پارٹی کے حوالے سے جو ایک تجسس تھا وہ دور ہو گیا تھا۔ اس لیے مزید رکے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اس نے شاہد رضا سے گھر جانے کی بات کی۔ اس نے اگلی بار دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر اسے ایک گاڑی میں گھر بھجوا دیا۔

اس کی امی تاج النساء پریشانی سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ماہین کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ بھائی ندیم بھی اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ اس نے اگرچہ باز پرس نہیں کی لیکن تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ”ماہین! زمانہ بہت خراب ہے۔ تم پہلی بار کسی پارٹی میں گئی تھیں۔ امی نے اجازت دی تو میں نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ اب یہ مت سمجھنا کہ روز بروز تم پارٹیوں میں جاؤ گی اور آدمی رات کے بعد لوٹ آؤ گی.....“

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اپنے دل میں ابھرنے والے مانوس اجنبی جذبات کا تجزیہ کرتی رہی۔ اس کا دماغ رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔ اس کے باوجود دل جھل جھل کر شاہد رضا کی تمنا کر رہا تھا۔ اپنی اور اس کی سماجی حیثیت کے بہت بڑے فرق کے باوجود دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ فرح نے بھی اس کے کردار کے حوالے سے بڑی مایوس کن اور دل شکن باتیں بتائی تھیں۔ اس کے باوجود دل کی زمین پر اس کی چاہت کی پھوار پڑ رہی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور اس کی محبت ہر رکاوٹ گرا کر شاہد کی قربت اور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی پیش قدمی دیکھ کر فرح نے کئی بار اسے ٹوکا۔ سنگین نتائج سے اسے ڈرایا مگر محبت نے اسے ایسی جرأت دی کہ کالوں سنی بات دل

پر اثر نہ کر سکی۔ وہ شاہد رضا کے قریب ہوتی چلی گئی۔ تین مہینے گزر گئے۔ اس دوران وہ شاہد کے فارم ہاؤس میں متعدد بار گئی۔ چھوٹی بڑی کئی پارٹیوں میں شرکت کی۔ اس کے کہنے پر رات گیارہ بجے تک شاہد کا ڈرائیور اسے گھر واپس چھوڑ دیتا تھا۔

شاہد کی محبت اور اس کی نوازشات پا کر ماہین گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی سمجھتی تھی۔ اس کے تصور میں بسنے والا شہزادہ حقیقی زندگی میں محبوب بن کے آ گیا تھا۔ اپنے اور شاہد کی سماجی زندگی کے فرق کے بارے میں سوچ کر کبھی کبھار اسے جبر جبری ہی آ جاتی تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے کی بے مایہ لڑکی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی حسن اور جوانی تھی۔ جبکہ شاہد کے پاس ہر وہ خوبی تھی جسے کوئی بھی لڑکی آئیڈیل لائز کر سکتی تھی۔ ایسے میں ماہین کو خوف محسوس ہوتا تھا کہ کسی نونے خواب کی طرح سب کچھ بکھر نہ جائے۔ اسے ایسی حسرتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ جن کا ملال عمر بھر دل سے نہ جائے۔

پھر ایک دن اس کے سارے اندیشے سچ ثابت ہوئے۔ شاہد اور اس کی محبت میں بھی ایک بڑا سنگین موڑ آ گیا۔ ان کا تعلق قائم ہوئے تین مہینے ہوئے تھے۔ اس دن ٹکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گرمیوں کی بارشوں کا ایک اپنا مزہ ہوتا ہے۔ بند کمروں سے نکل کر کھلی فضاؤں میں بھیجتے رہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس دن ماہین گھر میں ہی تھی۔ شاہد نے فون کیا۔

”ماہین! موسم بڑا سہانا ہے۔ اگر مصروف نہیں ہو تو راوی کنارے چلتے ہیں۔ ایسے شاندار موسم کو انجوائے کرتے ہیں۔“ وہ مصروف ہوئی تب بھی شاہد رضا کے بلاوے پر چلی جاتی۔ گھر سے بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ گھر میں بھائی ندیم کی وجہ سے پیسہ بہت آنے لگا تھا۔ ایسے میں پہلے ماں اور بھائی جو تھوڑی بہت پابندی لگاتے تھے، اب وہ بھی نہیں تھی۔

مقررہ وقت اور جگہ پر شاہد نے اسے پک کیا۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ دریائے راوی کی طرف گئے۔ ماہین کا خیال تھا کہ شاہد اسے کہیں قریب ہی لے کر جائے گا لیکن بہت دیر تک ڈرائیور کے وہ کافی دور آ گئے۔ آس پاس بہت کم آبادی تھی۔ زیادہ تر درخت تھے۔ کہیں کہیں ریٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر گاڑی سے اترے اور لب دریا ایک ریٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔ بہت سی باتوں کے ساتھ انہوں نے چائے پی، اسٹیکس کھائے۔ پھر واپس شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

بارش کی وجہ سے سڑک کی حالت شکستہ ہو گئی تھی۔ کچھ

لے چلیں۔“

وہ اپنے حالات کی وجہ سے پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ بیگم کی فرمائش پر جھٹک کر بولا۔ ”نوافل پڑھ کر دعا مانگنی ہے نا! وہ تو یہاں بھی کر سکتی ہو۔ ویسے بھی تم ہر وقت مصلے پر ہی تو بیٹھی رہتی ہو۔“

بیگم روہانسی سی ہو کر بولی۔ ”خدا را ایسی دل توڑنے والی بات نہ کیجیے۔ داتا دربار جانے کا الگ درجہ ہے۔“

”میں نے داتا دربار جانے سے منع نہیں کیا ہے نیک بخت! مگر وہاں جا کر نوافل پڑھنے کی منطق سمجھ سے باہر ہے۔ تم جانتی ہو وہاں مردوں کا کتنا جہوم رہتا ہے۔“

”بس بس یہ فتویٰ بازی رہنے دیجیے۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”داتا صاحب سے عقیدت رکھنے والے بھی وہاں پر جُری نیت سے نہیں آتے۔ جو ایسا کرتے ہیں۔ رب سوہاناں سے خود نمٹ لے گا۔ چلیے، یہ بہانہ چھوڑ کر کسی گاڑی کا بندوبست کیجیے۔“

انسپکٹر مکرم شاہ کو مناسب نہ لگا کہ بیوی کی عقیدت اور سادگی کے اس معصومانہ احساس کو داغ دار کر دے۔ گھر سے باہر کے دکھوں اور پریشانیوں کے بعد اس کی بیگم ہی تو تھی جو اس کے لیے راحت جاں تھی۔ اس لیے اس کی خواہش اور فرمائش ٹھکرانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اس سے سرکاری گاڑی واپس لی گئی تھی۔ یہ مہربانی کی گئی تھی کہ سرکاری مکان سے فی الحال اسے بے دخل نہیں کیا گیا تھا۔ ایک مہینہ مزید رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔

اے ایس آئی صفدر علی کے پاس اپنی ذاتی کار تھی۔ ضرورت کے مطابق مکرم شاہ کبھی کبھار اس کی آلٹو کار استعمال کرتا تھا۔ صفدر علی اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اکثر اس سے ملنے گھر آتا تھا۔ اس کے بہت سے دفتری معاملات نمٹانے میں بھی مدد کی تھی۔

مکرم شاہ نے اسے فون کیا اور داتا دربار جانے کے لیے کار مانگی۔ آدھے گھنٹے سے کم وقت میں صفدر علی اپنی آلٹو کار لے کر حاضر ہوا۔ ان کے ساتھ داتا دربار تک خود آنے کی پیشکش کی مگر مکرم شاہ نے اس کا شکریہ ادا کر کے منع کیا۔

وہ اپنی بیگم کو بٹھا کے داتا دربار کی طرف روانہ ہوا۔ شام کے سرمی اچالے پھیل گئے تھے، وہ داتا دربار پہنچ گئے۔ اس وقت مغرب کی اذان بھی ہو رہی تھی۔

انہوں نے نماز پڑھی پھر اس کی بیگم بڑی دیر داتا دربار کے مزار کی جالی پکڑ کر دعائیں مانگتی رہی۔ بہت دیر بعد وہ شاہدہ کی جانب واپس روانہ ہوئے۔ راستے بھر اس کی بیگم

اور پانی کی وجہ سے جاز پھسلنے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے رفتاری بہت سست تھی۔ راوی کنارے کی یہ سڑک اس وقت ویران تھی۔ چاروں طرف ایک سکوت تھا۔ گاڑی کے اندر ریکارڈ پلیئر سے غروبِ راجت فتح علی خان کی مدھر آواز میں ہلکی پھلکی غزل سنائی دے رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ دونوں بھی کوئی بات کرتے تھے۔ گاڑی کے باہر ٹپ ٹپ گرتے بارش کے قطروں کی آواز تھی۔

ایسے ہی سکوت میں اچانک گولیاں چلنے کی آواز ایک ہولناک تاثر کے ساتھ چاروں طرف پھیل گئی۔ ساتھ ہی ان کی گاڑی کو شدید جھٹکا لگا اور ٹائر کے برسٹ ہونے کا ہلکا سا دھماکا بھی گونجا۔ اس سے گاڑی بے قابو ہونے لگی تھی مگر شاہد نے بروقت اسٹیرنگ سنبھالا۔ اس کے باوجود سڑک سے نیچے دریا کی جانب جو حفاظتی دیوار بنی تھی، گاڑی اس سے جا ٹکرائی۔ رفتار کم تھی اس لیے حفاظتی دیوار سے تصادم کی شدت بھی کم تھی۔ لینڈ کروزر دریائے راوی کے ساتھ گہری کھائی میں گرتے گرتے پھٹی تھی۔

گاڑی کے اندر کی صورت حال بھی اچھی نہیں تھی۔ حفاظتی دیوار سے تصادم ہوا تو ماہین جھٹکے سے اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرائی تھی۔ اس کا سر وڈنڈ اسکرین سے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے سر پر گومڑ اور وڈنڈ اسکرین پر مکڑی کا جالا سا بن گیا تھا۔ شاہد... بھی فائرنگ اور پھر تصادم کے جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔ اس نے ایک دم گھوڑا کھارٹمنٹ کھول کر اندر سے اپنا پہل نکالا۔ اس کا سینٹی کیچ ہٹا کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگا۔ اچانک ہی وہ اچھل پڑا۔ خوف اور خطرے کے احساس نے بیک وقت اس کے دل کو ٹپٹی میں جکڑ لیا۔ اس کے دائیں جانب درختوں کی اوٹ سے پانچ چھ آدمی اپنا چہرہ چھپائے چھلانگیں مارتے ہوئے سڑک کی طرف آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آٹومیٹک گن تھیں۔

☆☆☆

انسپکٹر مکرم شاہ کے دن رات بڑے اداس اور مایوس گزر رہے تھے۔ پچیس سال تک جرائم پیشہ لوگوں سے ٹکر لیتا رہا تھا۔ ان دنوں اس کا سارا دن اپنی پنشن کے واجبات کے لیے ایس بی آفس سے لے کر اے جی پی آر آفس کے درمیان چکر لگاتے گزرتا تھا۔ ہر جگہ رشوت خورد عملہ رکاوٹیں پیدا کر کے اسے تنگ کر رہا تھا۔ کہیں لڑ بھگڑ کر کہیں کھلا پلا کر وہ اپنی فائلیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچا رہا تھا۔

اس شام بیگم نے فرمائش کی۔ ”سینے! آج جمعرات ہے۔ میں داتا دربار جانا چاہتی ہوں۔ وہاں نوافل پڑھ کر دعا مانگوں گی کہ آپ کی پریشانیاں دور ہو جائیں۔ مجھے داتا دربار

خاموش رہ کر وہ مخالف پڑھتی رہی تھی۔ کرم شاہ کی کسی بات کے جواب میں بس اشارے سے کام چلاتی تھی۔ وقفے وقفے سے اس کے سر سے لے کر ہجروں تک کوئی ذمیفہ پڑھ کر پھونک مارتی تھی۔

اسے بیگم کی اس ادا پر بڑا حیار آ رہا تھا۔ اسے چرانے کے لیے وہ کوئی مذاق کی بات کرتا تھا۔ اس کے دم کرنے پر کوئی فخر و کستا تھا۔ بیگم منہ سے کچھ نہ بولتی، بس غصے سے گھور کر اسے دیکھتی تھی۔ راوی کا ہل پار کر کے وہ دوسری طرف آئے تھے۔ سروں روڑ پر بیٹھ کی طرح گاڑیوں کا رش تھا۔ آٹو کار کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی۔

اچانک ہی کرم شاہ کی نظر دائیں جانب گئی۔ وہ چونک اٹھا۔ ایک سیاہ رنگ کی نئے ماڈل کی لینڈ کروزر اس کی کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر اسے طفیل بابا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سر گھما کر بہت ہی خشکی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ کرم شاہ کو اس کی آنکھوں میں ایسے وحشیانہ تیور نظر آئے تھے کہ اس کی ریزہ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی تھی۔ ذرا آگے جا کر ہائی وے چل گیا۔ ٹریفک کا رش کم ہوا۔ اب گاڑیاں تیزی سے دوڑتی جا رہی تھیں۔ اس کی آٹو بھی ساتھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

تجبی کرم شاہ نے محسوس کیا کہ وہ سیاہ رنگ کی لینڈ کروزر ایک بار پھر اس کی کار کے قریب آ رہی تھی۔ پھر وہ اس کے برابر آ گئی۔ اس کی پچھلی سیٹ کی کھڑکی میں سے طفیل بابا کی وہی زہریلی.... نظریں اسے گھورنے لگیں پھر اچانک ہی اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا ریمو اور دکھائی دیا۔ کرم شاہ کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ اس کی چھٹی حس نے کسی غیر معمولی حادثے کا اشارہ کیا۔ اس نے اضطرابی طور پر ایمپلسٹر بیڑ پر چڑھ کر دباؤ بڑھایا۔ مگر آٹو جیسی کار، لینڈ کروزر کا مقابلہ کیونکر کر سکتی تھی۔

اس کے کچھ سمجھنے سے قبل کانوں نے ٹھائیں ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس کے منہ سے ایک اضطرابی اور اضطرابی چیخ نکلی۔ دوسری چیخ اس کی بیگم کے منہ سے نکلی۔ ایک خود کار نظام کے تحت اس نے زور سے بریک دیا۔ کار کے ہار بہت زور سے چر چرائے۔ آٹھ دس فٹ تک گھسٹے گئے۔ شکر تھا کہ کار کے پیچھے کوئی گاڑی قریب نہیں تھی۔ ورنہ شدید تصادم ہوتا۔ پھر بھی کئی گاڑیوں کے بریک دہنے سے پیسوں کے گھسنے کی ہولناک آوازیں گونجی تھیں۔ اس سارے عمل میں چار پانچ سیکنڈ لگے تھے۔ اس نے فوراً خود کو سنبالا۔ پلٹ کر دیکھا تو دل

دھک سے رو گیا۔

اس کی ساتھ والی سیٹ پر اس کی بیگم دوڑنے کی طرف لڑھک گئی تھی۔ اس کی گردن لہو سے سرخ ہو رہی تھی۔

اس نے چیخ کر ایک اضطرابی عمل کے طور پر بیگم کو بلایا۔ اسے آواز دی مگر وہ اس کی پکار اس کی آواز سے بہت دور بھی نہ لوٹنے والے سفر پر چلی گئی تھی۔

اس نے پلٹ کر ایک وحشیانہ رد عمل کے ساتھ کار کے باہر آگے پیچھے دیکھا۔ شکاری وار کر کے فرار ہو گیا تھا۔ اس کی سیاہ لینڈ کروزر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کی بینڈ لائن کے سیلاب میں تھیں دوڑ نکلی گئی تھی۔

واضح طور پر طفیل بابا کی گولی کا ہدف وہ تھا مگر قدر کی کتاب میں اس لمحے اس گولی پر کرم شاہ کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ اس کے بدلے بیگم اس پر قربان ہو گئی تھی۔ واکا صاحب کے دربار میں اس کی مائٹی ہوئی دعا تھیں اور راستے بھر دم والی پھونکوں نے اثر دیا تھا۔ طفیل بابا کی گولی کرم شاہ کی گردن کے پاس سے ہوئی ہوئی دوسری طرف بیگم کی کتلی میں پھوست ہو گئی تھی۔

ماہین اور شاہد دریا کے راوی کی تفریح سے واپس آتے ہوئے مصیبت میں گھر گئے تھے۔

مضبوط اعصاب کے باوجود شاہد کا دل خوف کے گھیرے میں آ گیا۔ درختوں کی جانب سے آنے والے ہتھیار بدست دشمنوں کے عزائم بڑے خطرناک لگ رہے تھے۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ بھٹل سے ان کا مقابلہ کرے گا۔ آخری گولی تک اپنا اور ماہین کا دفاع کرے گا۔ دوسرے لمحے اسے احساس ہوا کہ دشمن تعداد میں زیادہ تھے۔ ایک بھٹل سے وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بالائے ستم ماہین بھی اس کے ساتھ تھی اور دونوں گاڑی میں محصور تھے۔ یوں دشمنوں کے لیے آسان ہار گٹ بنے ہوئے تھے۔

اسی وقت حملہ آوروں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ ایک غائب پوش نے کھردری سی آواز میں کہا۔ "خیریت چاہتے ہو تو گاڑی سے باہر نکلو۔ ہاتھ اوپر کر کے ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔" شاہد تے بہت کر کے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟"

"تم کچھ پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" اس آدمی نے گالی دے کر دہاتے ہوئے کہا۔ "دیر مت کرو۔ چلو جلدی سے باہر نکلو۔ لڑکی سے بھی کہو کہ خاموشی سے اتر کر سڑک پر کھڑی ہو جائے۔"

ماہین کھنے کی سی کیفیت میں تھی۔ شاہد نے اسے قلی دی اور حملہ آوروں کی بات مان کر باہر نکلنے کی ہدایت کی۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ ایک آدمی نے جھپٹ کر شاہد کے ہاتھ سے پستل چھین لیا۔ اسی وقت درختوں میں سے ایک اور آدمی تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر آیا۔ اس کا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ نزدیک آ کے اس آدمی نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”اپنے فارم ہاؤس میں اپنے کتوں کی موجودگی میں تم بہت بھونکتے تھے۔ اب تمہاری بولتی بند کیوں ہو گئی ہے؟ بھونکتے کیوں نہیں گئے؟“

یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے بڑے زور سے شاہد کے منہ پر طمانچہ مارا۔ چٹاخ کی آواز گونجی۔ ماہین کے منہ سے بھی سراسیمگی سے بھری چیخ بلند ہوئی۔

”اچھا تو اس تماشے کے پیچھے تم ہو طفیل بابا!“ شاہد اپنا سرخ کال سہلاتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ”اپنے پانچ چھ کتوں کے ساتھ مجھے گھیر کر کون سی بہادری دکھارے ہو؟ بے شک ایسی بے غیرتی کی تم سے ہی توقع رکھی جاسکتی ہے۔“

طفیل بابا نے اپنے چہرے سے غلاب اتار لیا اور مشتعل ہو کر اسے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”اسے بے غیرتی نہیں کہتے ہیں۔ کہتے ہیں! یہ انتقام ہے۔ یاد ہے فارم ہاؤس کے باہر تم نے مجھے ذلیل کیا تھا اور مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ تب میں نے کہا تھا تمہیں ایسی جگہ گھیر کر بدلہ لوں گا کہ تم فریاد کرو گے۔ چیخو گے، چلاؤ گے مگر کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ اب دیکھو۔ تم کس قدر بے بس ہو کر میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں جب چاہوں تمہیں مسل کر رکھ دوں گا۔“

”کیا تم بیچ جاؤ گے؟ ٹکیل دادا کے غنڈے بیٹے پر کیا خون معاف ہے؟ اس وقت جتنا ظلم کرو گے، اس کا تمہیں حساب دینا ہوگا۔“

طفیل بابا نے زور سے تہتہ لگایا۔ ”ٹکیل دادا انڈر ورلڈ کا ڈان ہے۔ دور دور تک اس کے نام کی دہشت ہے۔ پولیس سے لے کر خفیہ ایجنسیوں تک اس پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں ہمت نہیں۔ میں اسی ٹکیل دادا کا بیٹا ہوں۔ کسی میں دم ہے جو مجھ سے حساب لے۔ بہت انتظار کے بعد تم میرے جال میں پھنسے ہو۔ تمہیں عبرت کا نشان بناؤں گا اور پولیس میں یہ حسین تکی لے کر جاؤں گا۔ اس کے پرلوچوں گا۔ اس کا جسم ٹھونڈ دوں گا۔ جی بھر گیا تو اپنے ساتھیوں میں بانٹ دوں گا۔“

ماہین نے جھرجھری سی لی۔ شدید گھبراہٹ سے اس کا سر کھونٹے لگا تھا۔ ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ اب تب میں ٹش کھا کر سڑک پر گرنے والی تھی۔

اسی وقت ذرا دور ایک گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ گاڑی راوی مل کی جانب سے آرہی تھی۔ ان سے تقریباً پانچ چھ سو گز دور کھنے درختوں کے نیچے تھی۔

طفیل بابا کے ایک کارندے نے سراسیمگی سے کہا۔ ”بابا! کوئی گاڑی آرہی ہے۔ اس معاملے کو جلدی کرنا ہوگا۔“

طفیل بابا نے غصی انداز میں سر ہلایا پھر ایک دم اپنے راکٹل کا بیٹ بڑے زور سے شاہد کے سر پر دے مارا۔ وہ چیخ بار کر ڈکراتا ہوا سڑک پر گرنے لگا۔

طفیل بابا نے چلا کر کہا۔ ”اس بد بخت کو اس کی گاڑی میں ڈال دو اور سب مل کر گاڑی کو دھکیلتے ہوئے کھائی میں گرا دو۔ میں اس لڑکی کو لے کر جنگل میں اپنے ٹھکانے کی طرف جاتا ہوں۔ تب تک آنے والی گاڑی بھی گزر جائے گی۔ اس کے بعد تم میرے پیچھے آ جاؤ۔ خبردار! گاڑی والوں کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں کوئی واردات ہوئی ہے۔“

ماہین کے کان یہ سب سن رہے تھے مگر اس کے اوسان یوں خطا ہوئے تھے کہ مزاحمت کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ طفیل بابا نے جھپٹ کر اسے پکڑا اور اس کے ہلکے پھلکے جسم کو جھٹکے سے اٹھا کر کندھے پر لا دا اور دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا سڑک پار کر کے گئے درختوں میں گم ہو گیا۔

خوف کی شدت سے ماہین کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اس کے کانوں نے آخری جو آواز سنی وہ بھاری پھر کم لینڈ کروزر کے ٹڑھکتے ہوئے کھائی میں گرنے کی آواز تھی۔ اس کے بعد وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو نگاہوں کے سامنے گھپ اندھیرا تھا۔ ایک تانے کو تو دل اچھل کر حلق تک آ گیا کہ کہیں یہ قبر کی تار کی تو نہیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ابھی اسے ایک روشن دان میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر اترتی دکھائی دی۔ یہ روشنی اتنی تڑھم تھی کہ بس روشن دان کے آس پاس ہی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کسی بلب سے پھوٹ رہی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات کا وقت تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے کوئی چٹائی یا درہ تھی جو اتنی پتلی تھی کہ جسم دکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر چٹ لیٹی رہی اور اپنی ہیئت کڈائی پر غور کرتی رہی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ یہ سوچ کر دل کٹ سا گیا کہ شاہد کو زخمی حالت میں گاڑی میں ڈال کر گہری کھائی میں گرا دیا گیا تھا۔ خدا جانے وہ بیچ گیا تھا یا پھر اس کا ٹوٹا پھوٹا بدن کھائی میں کہیں مردہ حالت میں پڑا ہوگا۔

اپنے بارے میں سوچ کر وہ پریشانی، خوف اور

اضطراب سے کانپنے لگی۔ اپنی بے بسی اور لا چاری کا احساس کر کے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ خدا جانے اسے کدھر لاکے قید کیا گیا تھا؟ آنے والے لمحوں میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جانے والا تھا؟

اسے اپنی امی اور بھائی کی پریشانی کا بھی خیال آیا۔ وہ گھر نہیں پہنچنے کی توان کا اضطراب دیدنی ہوگا۔

اچانک ہی کسی خیال کے تحت وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اندھیرے میں ہاتھ چلاتے ہوئے اپنا موبائل ڈھونڈنے لگی۔ اسے یقین نہیں تھا مگر موبوم سی امید تھی کہ موبائل اس کے پاس ہوگا۔ یہ امید بھی بر نہیں آئی۔ اس کا موبائل گاڑی میں رہ گیا تھا یا پھر انوار کے والوں نے اٹھالیا تھا۔

ایک بیک وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بہت دیر تک روتے روتے اللہ سے فریاد کرنے لگی کہ اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ آئندہ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ کسی طرح کی پارٹی میں نہیں جائے گی۔ کسی لڑکے سے دوستی نہیں کرے گی۔ بس یہاں سے وہ بخیریت واپس چلی جائے۔

کچھ دیر بعد اس کے کانوں نے کمرے سے باہر کہیں قریب ہی کھٹ پٹ کی آواز سنی پھر دروازہ کھلا اور روشنی کا ریلا سا اندر داخل ہوا۔ یہ روشنی کمرے کے باہر کسی طاقت ور بلب سے پھوٹ رہی تھی۔ ماہین نے اضطراری طور پر دیکھا۔ دروازے میں سے ایک شخص اندر جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اندر آیا اور دروازے کے قریب ایک ٹن دبا یا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ماہین نے دیکھا ایک جھاڑ جھنکار سے چلیے کا نہایت کرخت صورت آدمی اس کی طرف ٹوٹتی نظروں سے دیکھتے ہوئے قریب آ رہا تھا۔ سامنے آ کر وہ کھروری آواز میں بولا۔ ”اے لڑکی! تجھے ہوش آ گیا؟ کچھ کھانے پینے کا موڈ ہے تو بتادے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہاں لا کر کیوں بند کیا ہے؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

وہ آدمی بھونڈی سی آواز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”تیری جیسی جوان اور حسین لڑکی کچھ بگاڑ بھی لے تو قسم سے کچھ برا نہیں لگے گا۔ جی چاہتا ہے تیرے بدن کا ہر حصہ چھان ماروں لیکن کیا کروں۔ تجھ پر پہلا حق ہمارے بابا کا ہے۔ اس کا جی بھر جائے تبھی ہماری باری آ سکتی ہے۔“

وہ ہاتھ جوڑ کے فریادی لہجے میں بولی۔ ”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میری ماں بہت پریشان ہوگی۔“

اس آدمی کا مزاج ایک دم بدل گیا۔ درشت لہجے میں

بولا۔ ”اے بس بس۔۔۔۔۔ یہ رونا دھونا اور فریادیں کرنا بند کرو۔ مجھے سخت چڑ ہے لڑکی ذات کے رونے سے۔۔۔۔۔ ایسا نہ ہو بابا کے آنے سے پہلے ہی میں تمہارا ذائقہ چکھ لوں۔ تجھے کچھ چاہیے تو بتادے۔ ورنہ کمرے میں خاموش بیٹھی رہ۔ تمہاری دیر میں بابا آئے گا پھر جنگل میں منگل ہوگا۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔!“ وہ آدمی بھونڈے طریقے سے ہنسا اور بازاری انداز میں آنکھ مار کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے لائٹ اور دروازہ دونوں بند کر دیے تھے۔

ماہین ایک بار پھر تاریکی اور پریشانی میں گھر گئی۔ اس وحشی شکل کے آدمی کی باتیں سن کر وہ پہلے سے زیادہ خوف اور عدم تحفظ محسوس کرنے لگی تھی۔ طفیل بابا موجود نہیں تھا۔ تمہاری دیر بعد آنے والا تھا۔ خدا جانے وہ ذلت اور رسوائی کے کیسے طوفان ساتھ لانے والا تھا۔

وہ خوف سے کپکپاتی رہی۔ پریشانی سے ہچکیاں بھر بھر کے روتی رہی۔ بہت سا وقت گزرا۔

اچانک اس کے کانوں میں کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک دم اس قید خانے کا دروازہ دوبارہ کھل گیا۔ دروازے پر ایک سے زیادہ انسانی ہونے دکھائی دیے۔ اسی وقت کسی نے ٹن دبا کے کمرے کا بلب روشن کیا۔ آنے والوں کے چہرے نظر آنے لگے۔

ماہین کی رگوں میں خون جیسے ٹنبد ہو گیا۔ شدید خوف سے وہ سکڑ سٹ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ آنے والوں میں طفیل بابا بھی شامل تھا۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سارے کمرے سے باہر نکل گئے۔ طفیل بابا اکیلا رہ گیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ گہری ٹوٹتی نظروں سے ماہین کا جائزہ لیتے ہوئے قریب آ گیا۔ اس کے قدم ڈنگ رہے تھے۔ سانس چڑھی ہوئی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھا۔

ماہین دیوار سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر خوف زدہ تھی کہ جیسے مرنے لگتے سے بچنے بچاتے کسی کونے میں دبک کر بیٹھی ہو۔ وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ آنکھوں سے دھاروں دھار پانی گر رہا تھا۔

طفیل بابا نے لڑکھرائی آواز میں کہا۔ ”او میری بلبل! اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو؟ میں حسن و جوانی کا قدر داں ہوں۔ کسی جنگل کا حیوان نہیں۔“

وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔ ”خ۔۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ ایسا سلوک کر رہے

فریادیں کرنے کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جو ایک طرح سے شکاری کی جیت کا اعلان کر رہی تھیں۔

پھر وہ دروازہ دھڑاکے سے کھل گیا۔ اس میں سے طفیل بابا ڈنگاتے قدموں سے باہر نکلا۔

طفیل بابا کی فتح یابی کا منظر سب کو نظر آیا مگر کسی نے جھانک کر نہیں دیکھا کہ بے چاری ماہین پر کتنی قیامتیں ایک ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ اس کی دو شیریں لٹ گئی تھی۔ اس کے بدن پر ستم کاری کے ایسے ایسے نشان ثبت تھے کہ سات سمندر میں غوطے مار کر بھی مٹنے والے نہیں تھے۔

اگلی رات بھی ستم گری اور درندگی کا سلسلہ جاری رہا۔ طفیل بابا شراب اور شباب کے نشے میں دھت اسے نوچتا کھوٹتا اور ہنسنے لگا۔ اس کی کرب ناک چہنچس ہر طرف گونجتی رہیں۔ تیسری رات بھی ہوس ناک برہنہ ہو کر ناچتی رہی۔ طفیل بابا کسی بدست نعل کی طرح اسے روندنا پکھلتا رہا۔ اسے اذیت دے کر خوشی سے قہقہے لگاتا رہا۔

یہ چوتھی رات کی بات ہے۔ ماہین لرزتی کانپتی دیوار سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ شکاری کے آنے کا وقت ہوا تھا۔ وہ لا چاری اور مایوسی کی ایسی انتہاؤں کو چھو رہی تھی کہ اب یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ وہ یہاں سے نکل سکتی ہے۔ اچانک دروازہ کھل گیا۔ ماہین کی آنکھیں بند تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر بھی اس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا گزشتہ تین راتوں میں جس شیطان کی درندگی اور وحشت زدگی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر مزید چر کے ہی لگنے والے تھے۔

اسے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ چاپ غیر مانوس سی تھی۔ اس نے بے اختیار آنکھیں کھول کر دیکھا پھر چونکتی ہوئی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں آنے والا طفیل بابا نہیں تھا۔ ایک نوجوان جوان تھا۔ اس کی سیس بھی ابھی صحیح طرح بھیکی نہیں تھیں۔ وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان کی آنکھیں سرخ سرخ سی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ ہونٹ بھی سیاہ تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ نوجوان نوجوان نشے کا عادی تھا۔

نوجوان کی آنکھوں میں طفیل بابا جیسی ہوس نہیں تھی۔ اس کے بجائے ایک نامعلوم گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سرسری نظروں سے ماہین کی طرف دیکھتا رہا پھر اس سے ذرا فاصلے پر نیچے بیٹھ گیا۔

”تم اتنی گھبراہٹ کیوں ہو؟ سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔“ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے وہ نرم سے لہجے میں بولا۔

اس نے بلند بانگ پر قہقہہ لگایا۔ ”اس سے بڑھ کر اور جرم کیا ہوگا کہ تم میرے دشمن کی محبوبہ ہو۔ جنگ کا اصول ہے کہ دشمن کو شکست دے کر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ تم بھی میرے لیے مال غنیمت کی طرح ہو۔ اب شرافت سے خود میری ہاتھوں میں آ جاؤ۔ ایسی محبت دونوں کا کہ جنگ کے جانور بھی جشن منائیں گے۔“

وہ گڑ گڑائی۔ ”پلیز! میرے ساتھ ایسا سلوک مت کرو۔ میری عزت برباد مت کرو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے جانے دو۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”اے لڑکی! یہ ڈراما بازی بند کرو۔“ طفیل بابا غصے سے گرجتے ہوئے بولا۔ ”تم کون سی پاک باز لڑکی ہو؟ شاہد جیسے عیاش لڑکے کی گرل فرینڈ ہو۔ اس کے فارم ہاؤس میں جانی رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا وہاں کیا کچھ ہوتا ہے؟“

”خدا کے لیے میری بات پر یقین کرو۔ میں ایسی لڑکی نہیں۔ فارم ہاؤس میں کبھی کبھار جاتی ہوں۔ کوئی نشہ بھی نہیں کرتی۔ شاہد نے بھی مجھے غلط نیت سے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔“ طفیل بابا استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”سننے میں بہ ظاہر تمہاری باتیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ لیکن سب جھوٹ ہے۔ اگر سچ بھی ہیں تو اچھا ہے۔ تمہارے کنوارے بدن کے ریشمی لمس کا پہلا ذائقہ میں چکھ لوں گا۔ یہ رات، یہ تنہائی، اس پر تمہارا کورا بدن اور میرے جوان جذبے۔۔۔۔۔ یہ سب مل کر آگ لگا دیں گے۔ میں جل رہا ہوں۔ آؤ میرے سینے سے لگ کر میری آگ بجھا دو یا پھر اسے مزید بھڑکا دو۔۔۔۔۔“

وہ شہوت بھری ہنسی کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ جھٹکے سے اس کا وہ پٹا جسم سے الگ کر دیا۔

ہرنی، جیسے شیر کی گرفت میں آ گئی تھی۔ وہ اسے فوج کھسوت رہا تھا۔ مجھنچوڑ رہا تھا۔ وہ چیخ چلا رہی تھی۔ خدا رسول کا واسطہ دے رہی تھی۔ شکاری سے بچنے کے لیے اس قید خانے کی محدود فضا میں یہاں سے وہاں بھاگ رہی تھی۔ اس کی کرب ناک چہنچس کمرے سے باہر جاری تھیں۔ لیکن اس کی مدد کے لیے وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہاں باہر جو موجود تھے، اس کی چہنچس سن کر وہ جنس آلود قہقہے لگا رہے تھے۔ چٹارے لے رہے تھے۔ یہ خیال ان کے لیے نشاط انگیز تھا کہ کمرے میں بند لڑکی جلد ہی ان کے لیے بھی سامانِ عیش کا وسیلہ بننے والی تھی۔

بہت سا وقت گزرا۔ کمرے سے چیخنے چلانے اور

گا۔“ وہ نوجوان قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تم ڈائلاگ بڑے زبردست بولتی ہو۔ کیا تک ٹاک بناتی تھیں؟“
پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ویسے میں اپنے دل کی بتاؤں تو تم پر بہت ترس آتا ہے۔ تم ایک خوب صورت اور جوان لڑکی ہو۔ بد بخت شاہد رضا کی وجہ سے طفیل بابا کے غصے کا شکار بن گئی ہو۔ اب خدا جانے وہ تمہیں واپس جانے بھی دے گا یا نہیں۔“

ماہین گہرے کرب سے بولی۔ ”مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ تھوڑا سا زہرا کر دو۔ یا کوئی بددوق لے آؤ۔ میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ رسوائی کے آنے والوں کے ساتھ اپنے گھر والوں کے پاس کس منہ سے جاؤں گی؟“
وہ نوجوان اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ لیکن جو تم چاہتی ہو۔ ویسا نہیں کر سکتا۔ میں بابا سے غداری نہیں کر سکتا۔“
نوجوان کچھ دیر اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا پھر بکھری بکھری آواز میں کہا۔ ”میں تمہارے پاس اپنی خوشی سے نہیں آیا ہوں۔ بس میرا نام نکلا تو انکار کر کے اپنا مذاق اڑوانے سے بچنے کے لیے... آیا ہوں۔“

ماہین نے نفرت سے کہا۔ ”تم لوگ انسان کے روپ میں وحشی درندے ہو۔ جو جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد کیا مجھے خوش ہو کر ناچنا چاہیے؟“
”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ اس نے قہقہے انداز میں سر... ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری چٹکیں ہمیں دور دور تک سنائی دیتی تھیں۔“

”وہ شیطان خود کدھر ہے؟“ ماہین ہذیانی انداز میں چلا کر بولی۔ ”کیا اس کی مردانگی صرف تین راتوں میں ہی ڈھیر ہو گئی ہے؟“

وہ نوجوان ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ”اے لڑکی! چپ ہو جا۔ زبان سنبھال کر بات کر۔ ہمارے بابا کے بارے میں ایسی بکواس مت کر۔ ورنہ ننگا کر کے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر چپا جاؤں گا۔“ وہ غصہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بابا ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ مل بانٹ کر کھانے پر یقین رکھتا ہے۔ اس لیے آج مجھے بھیجے تیری چٹکیں نکلوانے کے لیے۔“ آخری بات اس نے تھوک نکتے ہوئے کہی۔

ماہین نے رقت بھری آنکھوں سے کہا۔ ”میں کمزور ہوں۔ بے بس ہوں۔ تم جیسے شیطانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن میرا رب تو کمزور نہیں۔ جس دن پکڑے گا۔ ہمیں مارا جائے گا۔“

حیرت کدو
محبت کی لگن اور مسکون کن لمحات سے نکل کر وقت کی سیلابی لہروں پر مشکل نات باطل یقین واقعات کا تسلسل..... طاہر جاوید مغل کے قلم سے
سروں سے چائے
ماضی کا آئینہ، باختیار اور بے اختیار ان کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات ایسے آرا جیوت کے قلم کی رانی
رمز شناس

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی دلچسپ داستان..... **نازیہ کامران کاشف** کی اچھوتی تحریر

جنگ باز
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلہندہ داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری



عیوق بخاری، عائشہ نصیر، مہوش طالب، محمد شاہ زین رضوان، جاوید بسام، آصفہ ضیا احمد، عمران قریشی و دیگر کی خوب صورت تحریریں

اس کے علاوہ

ماہین نے روتے روتے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
زبان سے کچھ نہیں کہا۔ نوجوان خود اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر
بولاً۔

”میں تمہاری تنہائی میں آتو گیا۔ لیکن میں نے پہلے کبھی
ایسا کام نہیں کیا ہے۔ میں غلط طریقے سے کرنا بھی نہیں چاہتا۔“
وہ سپاٹ سے لہجہ میں بولی۔ ”جب تم اتنے شریف ہو تو
اس بد معاش کے ساتھ کیوں رہتے ہو؟ کیا تمہارا کوئی بڑا نہیں
منع کرنے والا؟“

”اے لڑکی! مجھے مت سمجھاؤ کہ کیا کرنا ہے کیا نہیں۔“
اس نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”ظہیل بابا میرا محسن ہے۔ میرے
پاس جب سر چھپانے کے لیے بھی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ کبھی فٹ
پاتھ پر اور کبھی کسی درکشاپ کے گندے فرش پر سوتا تھا۔ کبھی
گھانا ملتا تھا۔ کبھی پورا پورا دن بھوکا رہتا تھا۔ بچپن سے ہی نشے
کی لت لگی ہوئی تھی۔ اس کے حصول کی پریشانی الگ سے تھی۔
ایسے میں بابا نے مجھے سہارا دیا۔ سر چھپانے کے لیے چھت
دی۔ کام کے بدلے میں مجھے معاوضہ دیا پھر میں اس کے ساتھ
کیوں نہ رہوں؟“

”کیا تمہارے ماں باپ نہیں؟ اپنے جو حالات بتا
رہے ہو اس سے لگتا ہے تم اکیسے ہو۔“
”جی ہاں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ بچپن میں ہی ماں
باپ بس کے حادثے میں فوت ہو گئے ہیں۔ باپ مزدوری کرتا
تھا۔ اس لیے اپنے پیچھے صرف محرومیاں چھوڑ کے گیا تھا۔ میں
ان پریشانیوں اور محرمیوں سے لڑتے لڑتے زندگی گزار رہا
ہوں۔“

ماہین کا خوف وقتی طور پر دور ہو گیا تھا۔ اس نوجوان
لڑکے سے باتیں کرتے ہوئے اسے اچھا لگ رہا تھا۔
اس نے نرم لہجہ میں کہا۔ ”تم ایک اچھے لڑکے ہو۔
بہت کم عمر ہو۔ میری دعا ہے تم ان بڑے لوگوں سے کہیں دور
چلے جاؤ۔ کیا تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

”ہاں۔ راجو کہتے ہیں سب مجھے۔ پورا نام کیا ہے؟ کبھی
اس بارے میں نہیں سوچا۔“
”راجو! یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا شہر کے قریب ہے؟“ اس
نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ جگہ شہر سے بہت دور ہے۔ دریائے راوی
سے بہت آگے جنگل میں واقع ہے۔ تم یہاں سے باہر بھی نکلو گی
تو جنگل میں بھٹکتی رہ جاؤ گی اس لیے بھاگنے کی کوشش بھی مت
کرنا۔“

”مم..... میں کیسے بھاگ سکتی ہوں۔ تمہارے بندے

میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں کہاں بچ کے نکل سکوں گی؟“ وہ
مایوسی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد ماہین نے پوچھا۔ ”کیا تم
رات بھر یہیں رہو گے؟“

”آدمی رات گزرنے تک تو لازمی یہاں رہوں گا۔
ورنہ سب میری نامردی کا مذاق اڑائیں گے۔“ وہ جھجکتے ہوئے
بولاً۔

راجو ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہو گیا۔
ماہین محسوس کر رہی تھی اس کی آنکھیں نیند تلاش کر رہی تھیں۔
اس کی پلکیں بھاری ہونے لگی تھیں۔ ایک آدھ دفعہ آنکھیں بند
بھی ہوئی تھیں۔

وہ ملاحت سے بولی۔ ”راجو! تمہیں نیند آرہی ہے۔
رات بھر یہیں سو جاؤ۔ مجھے تم سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا۔“
اس نے چند منے ماہین کو سوچتی نظروں سے دیکھا پھر
بغیر کچھ کہے ایک طرف پڑا ہوا میلا چیکٹ نکلیا اپنے سر کے نیچے
رکھا اور سکون سے لیٹ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کی ہلکے ہلکے
خراٹیں سنائی دینے لگیں۔

ماہین اس سے ذرا فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی
تھی۔ وہ حیرت اور مسرت سے اس معصوم مزاج لڑکے کو یوں
آسانی سے سوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یکا یک اس کی نگاہوں
کے حیر بدل گئے۔ آہستہ سے اٹھی اور دبے قدموں اس کے
پاس گئی۔ یہ تسلی کر کے کہ وہ گہری نیند سویا ہوا ہے، وہ بے آواز
قدموں سے چلتی دروازے کی طرف گئی۔ بہت احتیاط سے
اندروں کی کنڈی کھولی۔ پلٹ کر دیکھا۔ راجو بے خبر سو رہا تھا۔ اس
نے بہت آہستگی سے دروازہ تھوڑا کھول کر دیکھا۔ اسے ایک
کشادہ محسن دکھائی دیا۔ سرخ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صحن
کے آخر میں دو کمرے تھے۔ راجو کے مطابق ان میں سے ایک
کمرے میں باقی تینوں محافظ موجود تھے۔ ان کمروں کے
دروازے بند تھے۔ وہاں سے آگے بہت سے درخت تھے۔
باہر نکل کر اس نے احتیاط سے اپنے قید خانے کا دروازہ بند کیا
اور دبے قدموں چلتی ہوئی ان دو کمروں سے فاصلہ رکھتی ہوئی
درختوں کی طرف پڑھنے لگی۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ یہ دھڑکا لگا
ہوا تھا کہ باقی محافظوں میں سے کوئی کمرے سے باہر نکلے گا۔
قید خانہ پھر سے اس کا نصیب بن جائے گا۔

خدا خدا کر کے تیس چالیس گز کا فاصلہ اس نے طے کیا
اور درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئی۔ کالج کے صحن میں پھیلی
ہوئی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ایک بیڑ کے پیچھے سے
اس نے پلٹ کر اپنے قید خانے کی طرف دیکھا۔ ایک طمانیت

بھری سانس لی۔

اسی وقت اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس قید خانے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ پھر اسے راجو کھانکی دیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل کر بے تابی سے یہاں وہاں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا باقی محافل کے کمرے کی سمت جانے لگا۔

ماہین سمجھ گئی کہ راجو خیند سے بیدار ہوا تھا۔ اسے نہ پا کر باہر نکلا تھا۔ اسے موجود نہ پا کر اپنے ساتھیوں کو باخبر کرنے ان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جلد ہی سب مل کر اسے تلاش کرنے والے تھے۔

محافل کی نزاکت کا اسے یک دم ہی احساس ہوا۔ اس نے پلٹ کر گھنے درختوں کی جانب دیکھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شدید خوف اور پریشانی کی ایک تیز لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ جائے ماندن، نہ پائے رفتن والی بات تھی۔ آگے گھٹا اور تاریک جنگل تھا۔ پیچھے اس کی جان اور عزت کے دشمن تھے۔ راجو نے بتایا تھا باقی محافل ایسے بے رحم ہیں کہ بلا جھجک سیدھی گولی مار دیتے ہیں۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ اب زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں رہی تھی۔ خوف اس بات کا تھا کہ بکڑی گئی تو ان کی درندگی اور سفاکی پہلے سے بڑھ جائے گی۔

اس نے اک ذرا سوچا پھر تیزی سے گھنے درختوں میں داخل ہو گئی۔ اس کے آگے درخت تھے۔ جھاڑیاں تھیں اور نہ جانے کس قسم کے جنگلی جانور بھی تھے۔ وہ سب سے بے نیاز اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے اس کا بیج سے دور ہوتی گئی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ اس نے اپنے پیچھے اونچی اونچی آوازیں سنیں۔ خوف کی ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی دشمن اسے پکار رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ خطرناک انجام سے ڈرا رہے تھے۔ وہ رکنے کے لیے نہیں بھاگی تھی۔ وہ دوڑنے کے انداز میں اندھا دھند چلتی رہی۔

اچانک ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس کے سامنے کھلے کھیت تھے۔ ستاروں کی روشنی میں اسے اتنا اندازہ ہوا کہ گندم کی فصل تھی۔ وہ اندھا دھند گندم کے کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ اس کی کمر تک لہلہاتے گندم کے خوشے اسے درختوں کی طرح چھپانے میں ناکام ہو رہے تھے۔ اس نے دوڑتے دوڑتے پلٹ کر دیکھا۔ پھر ایک دم نیچے لیٹ گئی۔ شکاری پیچھا کرتے ہوئے درختوں سے باہر آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں

میں موجود ہارچ دور دور تک روشنی پھینک رہا تھا۔ وہ سانس روکے گندم کے کھیت میں دبک کر بیٹھی رہی۔ اس کا بدن جگہ جگہ سے جھل گیا تھا۔ کیڑے پھٹ کر لیر لیر ہو گئے تھے۔ ایک پاؤں کی چپل ٹوٹ کر کہیں گر گئی تھی۔ وہ ہیر زخموں سے چور چور تھا۔ شکاریوں سے بچنے کی خواہش میں ایسی طاقت تھی کہ اسے اپنے زخموں سے اٹھتے درد کا احساس نہ رہا تھا۔ بس ایک ہی جذبہ اور احساس تھا کہ سفاک شکاریوں کے ہاتھ نہیں لگنا تھا۔

بہت دیر بعد اس نے اک ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ ہارچ کی روشنی اسے مخالف سمت جاتی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے کھیتوں میں دوڑتی اور فصل کو روندتی بھاگنے لگی۔ بہت دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کھلے کھیتوں میں اسے ہارچ کی روشنی ایک بار پھر اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ اپنی پکی پکی توانائی کے ساتھ بھاگتی رہی۔ اچانک ہی اسے اپنے بائیں جانب ذرا نشیب میں روشنی نظر آئی۔ وہ ایک ڈھلوانی جگہ تھی۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا، وہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ اس کے دل میں امید کی روشنیاں جل اٹھیں۔ پلٹ کر دیکھا۔ تعاقب کرنے والے شکاری قریب آتے جا رہے تھے۔ اس نے اضطراری طور پر فیصلہ کیا اور تیزی سے بھاگتی ہوئی اس ڈھلوانی جگہ سے اترنے لگی۔ وہ شدید گھبراہٹ ہوئی گئی۔ اندھیرا بھی تھا۔ ایسے میں ڈھلوانی جگہ سے اترتے ہوئے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ لڑھکتے ہوئے سڑک پر جا رگری۔ اس نے لینے لینے دیکھا وہ گاڑی قریب آ گئی تھی۔ پھر اس سے چند قدم دور جھٹکے سے رک گئی تھی۔ ماہین نے ڈوے حواس کے ساتھ اتنا محسوس کیا کہ گاڑی کا دروازہ کھول کر کوئی آدمی اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے نزدیک آ کر وہ جھکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے دیکھتے ہوئے گھبراہٹ ہوئی آواز میں وہ چلا یا۔

”شاہ جی! جلدی سے آئیے! کوئی لڑکی ہے۔ بہت زخمی ہے۔ خدا جانے کون ہے؟“

اس کے بعد ماہین ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔

☆☆☆

مکرم شاہ کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اُس کی شریک حیات، اس کی راحت جان کا کل ایسا سانچہ نہیں تھا کہ وہ بھلا دیتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ بیگم کے قتل کا غم کچھ کم نہ تھا کہ قتل کی تفتیش کے سلسلے میں پولیس کا رویہ بھی افسوس ناک تھا۔ اس نے جب ایف آئی آر میں تفصیل بابا کو نامزد کیا تو اس کے اپنے قاتل کے محرر سے لے کر تھانیدار تک کی ٹانگیں کاٹنے لگی تھیں۔ مکرم شاہ کا انجام ان سب کے لیے نمونہ عبرت تھا۔

”جی ہاں۔ اسے ہم نے بارہا آزمایا ہے۔ آپ کو تو پتا ہے پولیس جہاں بد معاشوں پر ہاتھ ڈالتی ہے وہاں ان کے سر پر ہاتھ بھی رکھتی ہے۔ بہت سے معاملات میں ہمیں ان بد معاشوں کی ضرورت پڑتی ہے۔“

اسی دن، رات کے وقت صفدر علی اس بد معاش کو لے کر مکرم شاہ کے پاس آیا۔ اس کا نام مقبول تھا۔ سب اسے بالے کہتے تھے۔ مضبوط جسم کا بچیس چھیس سال کا گندی رنگت کا نوجوان تھا۔ صفدر علی نہ بتاتا تو وہ کسی بھی زاویے سے بد معاش نہیں لگتا تھا۔ ایک مناسب شکل و صورت کا عام سا جوان دکھائی دیتا تھا۔

صفدر علی نے اسے پہلے ہی ساری بات بتادی تھی۔ مکرم شاہ سے پیسے کی بات ہوئی۔ جتنا وہ مانگا تھا اس سے بھی زیادہ پیسے دینے کی پیشکش کی۔ جب ڈیل فائل ہوئی تو مکرم شاہ نے اسے اپنی لائن آف ایکشن کے بارے میں بتادیا۔

اس دوران مکرم نے سرکاری مکان چھوڑ دیا تھا۔ دریائے راوی کے قریب درختوں کے درمیان ایک کانچ کرائے پر لیا تھا۔ پنشن کے پیسے ملے تو ایک جیب بھی خرید لی تھی۔ ضروری ہتھیار بھی بالے کے ذریعے حاصل کر لیا تھا۔ بالے بھی اس کے ساتھ کانچ میں رہتا تھا۔

☆☆☆

ندیم اور اس کی امی پریشانیوں میں گھر گئے تھے۔ جوان لڑکی کی گمشدگی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ اسے دبا کر بیٹھ جاتے۔ یا شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ تصور کر لیتے کہ خطرہ ٹل گیا ہے اور آنکھ کھولنے کے بعد ماہین گھر واپس آجائے گی۔

تین چار دنوں تک ندیم اور اس کی امی تاج النساء خاموشی سے اسے یہاں وہاں تلاش کرتے رہے۔ ماہین کی گمشدگی کو انہوں نے خود تک محدود رکھا تھا۔

چوتھے دن ندیم کے دماغ میں اچانک ہی ماہین کے کانچ سے پتا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ کانچ کے مین گیٹ پر پہنچ کر اس سوچ میں پڑ گیا کہ ماہین کے بارے میں کس سے پتا کرے؟ کیا کانچ کے پرنسپل سے بات کرے؟ اسے اعتماد میں لے کر ماہین کی گمشدگی سے اسے آگاہ کرے؟ ان کی مدد سے کانچ کے ایسے اسٹوڈنٹس سے ملاقات کرے جو ماہین کے قریب تھے۔ شاید اس طرح کوئی اشارہ مل جائے۔

وہ اس ارادے پر عمل کرنے کا سوچ رہا تھا، اچانک اسے ایک نام یاد آ گیا۔ گھر میں اکثر ماہین، فرح نامی ایک لڑکی کا ذکر کرتی تھی۔ جب بھی ماہین کسی پارٹی میں جاتی تھی، فرح کا

اپنے ساتھیوں کے روتیوں سے مایوس ہو کر وہ اپنے گھر واپس آیا۔ بہت خاموشی سے اپنی بیگم کی آخری رسومات ادا کر کے اسے منوں مٹی تلے دفنادیا۔

وہ پولیس کی کارکردگی اور اس کے کردار سے واقف تھا۔ پچیس سال وہ اس نظام کا حصہ بنا رہا تھا۔ اس کی خامیوں اور خرابیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ طفیل بابا جیسا بااثر اور طاقت ور مجرم بھی گرفتار نہیں ہوگا۔ اگر اس کے پاس کچھ مخصوص ثبوت ہوتے تب بھی تفتیشی افسر اور منکڑے قسم کے وکیل مل کر اسے عدالت سے بھی باعزت بری کرانے والے تھے۔

مکرم شاہ نے خوب سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اپنی عزیز از جان بیوی کے قاتل کو خود سزا دے گا۔ اپنی پچیس سالہ سروس کے دوران اس نے کئی ڈاکوؤں اور بد معاشوں کو انکاؤنٹر میں مار کر دیا تھا۔ طفیل بابا کے بارے میں انتہائی اقدام کا فیصلہ کر کے اسے کوئی گھبراہٹ یا پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

وہ جانتا تھا طفیل بابا جیسے طاقت ور کینکسر کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اسے زبردست حکمت عملی سے کام لینا پڑے گا۔ اور یہ سب وہ اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔

شاہدہ میں اسے ایس آئی صفدر علی ایسا بندہ تھا جو ایک ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں اس کے بہت قریب ہوا تھا۔ زیر عتاب آنے کے بعد بھی اس کی ہمدردی کا سلسلہ جاری تھا۔ مکرم نے اسی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن اسے گھر بلا کر اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اسے ایس آئی صفدر علی بہت دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر خوف، حیرانی اور پریشانی کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ بڑی دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! آپ مجھے بڑی آزمائش میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ میں انکار کر کے آپ کا دل توڑنا نہیں چاہتا مگر میں صاف صاف بتا دوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں ایک کمزور خاندان کا فرد ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ طفیل بابا جیسے دیو قامت بد معاش کے خلاف آپ کا ساتھ دے کر شامت کو دعوت نہیں دے سکتا لیکن میں آپ کو تنہا اور بے آسرا بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایک بندے کو آپ سے ملواؤں گا۔ وہ آپ کا پورا پورا ساتھ دے گا۔“

”وہ کون ہے؟ کیا پولیس کا کوئی جوان ہے؟“

”نہیں۔ چھوٹا سا بد معاش ہے۔ پیسے کے لیے سب کام کرتا ہے۔ گجرات کا رہنے والا ہے۔“

”پیسے کی فکر مت کرو۔ اسے منہ مانگی رقم دوں گا۔ کیا اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟“

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب

کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون پر باقاعدہ حکیم صاحب سے گفتگو کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی وی پی منگوالیں۔ اپنے دوستوں کو بھی ہماری دوائی کا بتائیں۔

المسلم دار الحکومت (رجسٹرڈ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

فون دوپہر 2 بجے تا رات 10 بجے تک کریں۔

0301-6690383

0300-6526061

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

حوالہ دے کر جاتی تھی۔

کالج کا مین گیٹ بند تھا۔ گیٹ کے ساتھ کیمین بنا ہوا تھا۔ اس میں ایک سیکورٹی گارڈ اور چوکیدار موجود تھے۔ اسے گیٹ کے پاس دیکھ کر چوکیدار قریب آیا۔ ندیم نے آہستگی سے پوچھا۔

”دیکھو بھائی! میری بہن کالج میں پڑھتی ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔ اس وجہ سے کئی دنوں سے کالج نہیں آ رہی۔ اس کی قریبی کنبلی اور کلاس فیلو ہے۔ اس کا نام فرح ہے۔ اس سے مل کر اپنی بہن کے لیے نوٹس وغیرہ لینے ہیں۔“

”کیا تم فرح کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں۔ اسے صرف نام سے جانتا ہوں۔“ ندیم نے کہا۔

چوکیدار کے پوچھنے پر اس نے ماہین کے سبکیٹ اور کلاس کے بارے میں بتا دیا۔ چوکیدار نے یہ معلومات انٹرکام پر کسی کو بتا دیں۔ ذرا دیر بعد جواب موصول ہوا تو اس نے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے پاس ہی وینٹک روم تھا۔ چوکیدار اسے ایک کرسی پر بٹھا کر بولا۔

”تم یہاں انتظار کرو۔ فرح کو اطلاع دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آتی ہے۔“

ندیم کو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ کالج میں سیکورٹی انتظام اتنا اچھا ہے۔ پھر اپنی بہن کی گمشدگی کے بارے میں سوچ کر دل درد سے پھٹنے کے قریب ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکی اس طرف آئی۔ وہ کرسی سے اٹھا اور وینٹک روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

”ماہین کے بھائی آپ ہیں؟ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں میں ماہین کا بھائی ہوں۔ اس کے بارے میں آپ سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

”ماہین خود کدھر ہے؟ وہ کئی دنوں سے کالج کیوں نہیں آ رہی؟“ وہ خیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

”میں اسی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں مس فرح! اصل میں وہ تین چار دنوں سے غائب ہے۔ ہماری پریشانی کا آپ اندازہ کر سکتی ہیں۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ مدد کر سکتی ہیں؟“

فرح شدید حیرانی اور پریشانی سے چند ثانیے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر گہرے دکھ سے بولی۔ ”ماہین میری بیٹ فریڈ ہے۔ میں تین دنوں سے درجنوں بار اس کے موبائل پر

جاسوسی ڈائجسٹ

کال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا نمبر بند ہے۔ آف میرے
خدا یا! وہ کہاں جا سکتی ہے؟“

”نہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہمارا اپنے کسی رشتے دار سے کوئی قریبی تعلق نہیں۔ ایسے میں اگر وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے تو کسی کے ساتھ ضرور گئی ہوگی۔ کیا آپ کے علم میں ماہین کا کوئی ایسا دوست تھا جس کے ساتھ اس کا کوئی چکر چل رہا تھا؟“ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

فرح چند ٹاپے سوچتی رہی پھر چوکتے ہوئے بولی۔
 ”ماہین اور شاہد رضا کہیں ایک ساتھ تو نہیں تھے؟ لیکن ایسی کوئی
 بات تو ابھی تک سامنے نہیں آئی ہے کہ حادثے کے وقت شاہد
 کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔“

”آپ کس حادثے کی بات کر رہی ہیں؟ یہ شاہد کون ہے؟“ اس نے بے تاب سے پوچھا۔

فرح رسالہ سے بولی۔ ”ماہین بہت شریف اور حیا والی لڑکی ہے۔ میں اس کے کردار کی کو اسی دے سکتی ہوں۔ وہ اور شاہد بہت عرصے سے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ شاہد شہر کے ایک مشہور بزنس مانیگن حارف رضا کا بیٹا ہے۔ لیکن پچھلے تین دنوں سے وہ ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ہوا ہے۔ دریائے راوی کے راستے پر اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا۔ شاہد کو شدید زخمی حالت میں وہاں سے نکالا گیا تھا۔ تب سے وہ بے ہوش ہے۔ اگر فرض کریں ماہین بھی اس کے ساتھ گاڑی میں موجود تھی تو وہ کیوں نہ ملی؟ جبکہ پولیس اور میسج نمبروں نے حادثے کے مقام کو اچھی طرح کھنگالنا تھا۔“

”یہ شاہد کس اسپتال میں ایڈمٹ ہے؟ کیا اس سے کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے؟“ اس نے موہوم سی امید کے ساتھ پوچھا۔

فرح افسوس سے بولی۔ ”وہ بے چارہ تو آئی سی یو میں ہے۔ میں کل شام اس کے پاس گئی تھی۔ وہ جس حالت میں ہے، مجھے نہیں لگتا ہے وہ جلدی ہوش میں آئے گا۔“

ندیم شوقی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا
ہیں اور شاہد کے درمیان تعلق ایسا گہرا تھا کہ وہ دونوں گھومنے
مرنے کے دور دور چاہا کرتے تھے؟“

وہ ایک ختمی سہاں لے کر بولی۔ ”میں کچھ نہیں
چاہوں گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

نثر لانگ ڈرائیو پر بھی جاتے تھے۔ لیکن میں بالکل نہیں جانتی
 اس دفعہ وہ شاہد کے ساتھ تھی یا نہیں۔ مگر میرا دل کہتا ہے وہ کسی
 سمیت میں ہے؟ شاہد کے حادثے اور اس کی گمشدگی میں کوئی

تعلق ضرور ہے۔"

”میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ اب یہ پتا کرنا ہو گا کہ کیا ماہین حادثے کے وقت شاہد کے ساتھ موجود تھی یا نہیں؟“
فرح اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر حادثے کے وقت ماہین بھی موجود تھی تو وہ کدھر غائب ہے؟ اس کا زخمی بدن یا میرے منہ میں خاک اس کی لاش کسی کو ملنی چاہیے تھی۔“

”یہی تو معما ہے۔ میں اس امکان کو سامنے رکھ کر اپنی تلاش شروع کرتا ہوں..... آپ نے ابھی تک میرے ساتھ تعاون کیا ہے۔ مجھے امید ہے آئندہ بھی جب ضرورت ہوگی آپ میرا ساتھ دیں گی۔“ اس نے کہا۔

”ضرور.....“ فرح نے کہا اور اپنا نمبر اسے لکھوا دیا۔
فرح کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر کے وہ واپس اپنے
گھر آ گیا۔ تاج النساء کی تصویر یعنی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔
وہ خود اندھیرے میں ٹاک توئیاں مار رہا تھا۔ ماں کو کیا امید دلانا
... کھوکھلے سے انداز میں اپنی کوششوں سے اسے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بیٹھ کر اسے سکون نہیں ملا۔ وہاں سے سیدھا رکشاپ آیا۔ وہاں ایک جوان لڑکا اکبر اس کا دوست تھا۔ دونوں مل کر شہر کے درکشاپوں میں مال سپلائی کرتے تھے۔ اکبر کو بکڑ کر ذرا قاصطے پر لے گیا۔ اسے اپنی بہن کی گمشدگی کی ماری تفصیل بتادی۔

وہ ہنسی بٹکا کر دیکھتا رہ گیا پھر غصے سے کہا۔ ”اے گھانڑا!
تجھے دنوں بعد تم آج مجھے یہ سب بتا رہے ہو۔ کیا مجھ پر بھروسہ
نہیں تھا؟“

”ایسی بات نہیں تھی یار! بس اس امید پر اکیلے ہی تلاش کر رہا تھا کہ آسانی سے مل جائے گی۔ اب ہر طرف سے مایوس ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں۔“ اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

”مجھے سے کیا چاہتے ہو؟ حکم کرو یار! تمہاری بہن میری بہن ہے۔“

ندیم نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ ان کے اس موٹر بائیک تھی۔ دونوں اس پر سوار ہوئے اور اس مقام کی طرف روانہ ہوئے جہاں شاہد کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ اس مقام پر پہنچ گئے۔ گاڑی ابھی تک وہاں موجود تھی۔ جدید ماڈل کی لینڈ کروزر کی حالت اس وقت نہایت خراب تھی۔ اس کی باڈی چپک چپک تھی۔ شیشے مارے ٹوٹ گئے تھے۔

پولیس کی تفتیشی ٹیموں نے ان تین چار دنوں میں متعدد راجائے حادثہ کا معائنہ کیا تھا۔ تباہ شدہ گاڑی کو بھی اندر باہر سے کھنگالا تھا۔ ندیم کوئی تفتیشی ماہر نہیں تھا۔ وہ بس ایک

اضطرابی کیفیت میں اس مقام پر آیا تھا کہ اس کی بہن کے بارے میں کوئی مثبت اشارہ مل جائے۔ اسی جذبے کے تحت وہ تباہ شدہ گاڑی کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی وہ اچھل پڑا۔

گاڑی کی باڈی پر اسے دو تین سوراخ نظر آرہے تھے جو واضح طور پر بندوق کی گولیوں سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے اکبر کو بھی متوجہ کرایا۔ وہ بھی اُلجھی اُلجھی نظروں سے ان سوراخوں کو دیکھ رہا تھا۔

”یار اکبر! یہ تو معاملہ ہی کچھ اور لگتا ہے۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کوئی روڈ ایکسیڈنٹ نہیں۔ سوچی سمجھی واردات ہے؟“

”پولیس اپنی تفتیش کے دوران بال کی کھال اتارتی ہے۔ ممکن ہے پولیس ان خطوط پر جانچ پڑتال کر رہی ہوگی۔“ اکبر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

کھائی کی ڈھلوانی زمین پر پگھلے ٹڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن پر انسانوں کے اور بکریوں کے نشان تھے۔ وہ ان پگھلے ٹڈیوں پر سے ہوتے ہوئے اوپر بڑک کی طرف آنے لگے۔ پگھلے ٹڈی کے دائیں بائیں گھاس بھی۔ جھاڑیاں تھیں۔ وہاں جھاڑیاں جس طرح پکلی مسلی ہوئی تھیں اور ڈھلوانی زمین پر جس طرح گڑھے پڑے ہوئے تھے۔

اچانک ہی اکبر شیک کر رک گیا۔ پگھلے ٹڈی سے پانچ چھ قدم دور جھاڑیوں کے نیچے اسے ایک موبائل اسکرین دکھائی دیا تھا۔ دھوپ کی کرنیں اس کی اسکرین پر پڑنے سے چمک رہی تھی۔

اس نے ندیم کی توجہ موبائل کی طرف مبذول کرائی۔ ندیم نے ایک موبائل اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین پر بری طرح ٹوٹی پھوٹی تھی۔ موبائل کے بیک سائڈ پر بھی شیشی کے آثار بڑے واضح نظر آرہے تھے۔ وہ الٹ پلٹ کر موبائل دیکھ رہا تھا۔ اضطرابی طور پر بہن دبا کر اسے آن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اکبر اس کا اضطراب اور اضطراب بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ندیم کے چہرے پر بے چینی اور دکھ کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ”ندیم! کیا بات ہے؟ تمہارے چہرے پر شدید تناؤ ہے۔ کیا اس موبائل کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟“ وہ ٹوٹی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

ندیم نے ہونٹ بھیج کر افسردگی سے کہا۔ ”اکبر! یہ موبائل میری بہن ماجین کا ہے۔ اسے یہ موبائل میں نے ہی خرید کر دیا تھا۔“

”ایک ہی برانڈ کے بہت سے موبائل سیٹ ہوتے ہیں۔ تم اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ اکبر بولا۔

”ماجین کو نام اور جبری بہت پسند تھا۔ موبائل کی پشت پر اس نے میری موجودگی میں نام اور جبری کی تصویر چسپاں کی تھی۔ یہ دیکھو۔ کٹ پھٹ جانے کے باوجود یہ اب بھی موجود ہے۔“

”اگر تمہاری بہن شاہد کے ساتھ موجود تھی تو اس کا جواب کہاں سے ڈھونڈیں گے کہ وہ کدھر غائب ہے؟“ اکبر نے اُلجھن بھرے لہجے میں کہا۔

”میں یہ موبائل کسی ماہر کو دکھاؤں گا۔ اگر اسے آن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہماری پریشانی دور ہوگی۔ دوسری صورت میں پولیس کے سامنے جا کر موبائل پیش کر کے اپنی بہن اور شاہد کے تعلق کے بارے میں بتا دوں گا۔ اس سے کم از کم پولیس ماجین کو تلاش کرنے میں کوئی سرگرمی دکھا دے گی۔“

وہ دونوں سڑک پر آئے۔ بائیک پر سوار ہو کر واپس شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر پہنچ کر وہ موبائل مارکیٹ گئے۔ کئی دکانوں پر موبائل دکھایا۔ کوئی بھی کاری گرا سے آن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سب کا یہی جواب تھا کہ موبائل کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب یہ آن نہیں ہو سکتا۔

ندیم مایوس ہو کر موبائل مارکیٹ سے واپس آیا۔ اس کا اگلا ہدف ایس ایچ او تھا۔ وہ اکبر کے ساتھ ایس ایچ او سے ملا۔ موٹی تو نہ اور گھنٹے سر دالا ایس ایچ او اپنی شکل سے ہی بدحرام، بے ایمان اور کینہ پرور لگتا تھا۔

ساری بات سن کر وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”موبائل اور انٹرنیٹ نے آج کل کی لڑکیوں کو بڑا بے باک بنا دیا ہے۔ ممکن ہے تمہاری معصوم بہن اپنی خوشی سے اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔“

ندیم دل میں لپکنے والے شعلوں کو دبا کر بولا۔ ”سر، یہ موبائل میری بہن کا ہے۔ شاہد کی گاڑی کے حادثے کی جگہ سے ملا ہے۔ آپ پلیز اپنی تفتیش کو اس رخ پر ڈالیں کہ میری بہن شاہد کی گاڑی کے حادثے کے بعد کدھر غائب ہو گئی ہے۔“

”برخوردار! ہمیں مت سمجھاؤ کہ کیا کرنا ہے۔“ ایس ایچ او نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ ”تمہاری عمر سے زیادہ ہماری سروس ایسے حادثات کی کھوج لگاتے گزری ہے۔ یہ موبائل مجھے دے دو۔ ہم اسے فراڈک کے لیے بھیج دیں

گئے۔ وہاں سے رپورٹ موصول ہوئی تو ہم کچھ جان سکیں گے۔

اکبر نے ہنسی بھرتی ہوئے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! ہم نے گاڑی کی باڈی پر گولیوں کے نشان دیکھے تھے۔ کیا شاہد کی گاڑی کو حادثہ اس کے کسی دشمن کے حملے کی وجہ سے پیش آیا ہے؟“

تھانیدار نے ہر خند لہجے میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے تم دونوں خود ہی کسی جاسوس کی طرح سراغ رسانی کرتے پھر رہے تھے۔ پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟ چلو اپنی تفتیش کے ذریعے خود ہی کسی نتیجے پر پہنچ جاؤ اور اپنی بہن کو بازیاب کراؤ بلکہ شاہد کا کیس بھی حل کر لو۔ سرکار سے تعریفی سند اور عارف رضا سے نقد انعام بھی ملے گا۔“

ندیم اس کا غصہ اور طنز نظر انداز کرتے ہوئے بکھری بکھری آواز میں بولا۔ ”تھانیدار صاحب! ہم آپ کے کام میں مداخلت ہرگز نہیں کر رہے ہیں۔ آپ بڑے سمجھدار ہیں۔ خود اندازہ لگا لیں اپنی بہن کی گمشدگی اور ایک حادثے کی جگہ سے اس کا موبائل ملنے سے میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں۔ پلیز ہماری باتوں اور حرکتوں سے ناراض نہ ہوں۔ میری بہن کو تلاش کرنے میں مدد کریں۔“

وہ کندھے اُچکا کر بے نیازی سے بولا۔ ”تمہاری بہن کی تلاش کے لیے میں ایک ٹیم تشکیل دے دوں گا۔ تم خطا بلے کی کارروائی کے لیے ایف آئی آر درج کراؤ اور موبائل یہاں جمع کراؤ۔ جہاں تک بات شاہد کی گاڑی پر لگی گولیوں کے نشانات کی ہے۔ ہم نے شروع دن ہی اس کا پتہ لگا لیا تھا۔ ان گولیوں کے خول کی فرازنگ کی رپورٹ کے لیے اسے لیبارٹری بھیج دیا ہے۔ اگلے دو تین دنوں میں رپورٹ موصول ہوگی۔ تب تک تم دونوں سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ شرلاک ہو جرنل کی کوشش مت کرو۔“

وہ دونوں امید و بیم کی کیفیت میں تھانے سے باہر آئے۔

تین دن گزر گئے۔ وہ اکبر کے ساتھ دریائے راوی کے آس پاس کے کھیتوں اور گھنے درختوں میں ایک موہوم امید کے ساتھ اپنی بہن کو تلاش کرتا رہا۔ دوسری طرف بڑی شدت سے تھانیدار کی طرف سے کسی امید افزا اطلاع کا انتظار بھی کرتا رہا۔

چوتھے دن، صبح سے شام تک وہ بھاگ دوڑ کے بعد تھک ہار کر گھرا آیا تھا۔ ماں موجود نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آیا۔ وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کسی نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا۔ دروازہ کھولا۔ ایک پختہ عمر کا بارعب شخص دروازے پر کھڑا تھا۔

ندیم نے نزلتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی فرمائیے چچا! آپ کون ہیں؟“

اس بارعب شخص نے کہا۔ ”میرا نام مکرم شاہ ہے۔ میرے پاس تمہاری بہن کے حوالے سے اہم خبر ہے۔ کیا تجھے اندر آنے کی اجازت دوں گے؟“

ندیم کو جیسے گیارہ ہزار دولت کا جھٹکا لگا۔ وہ حیرت اور مسرت سے اس بارعب اجنبی کی طرف دیکھتا رہا۔

☆☆☆

ماہین کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو کسی چنگ پر پڑا ہوا پایا۔ کڑکیوں سے باہر دن کا اجالا تھا۔ پہلے تو وہ خالی خالی دماغ کے ساتھ اپنی ہیئت کڈائی کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اسے سب کچھ یاد آیا۔ رات کے واقعات اور طفل بابا کی قید میں گزرے حالات کے بارے میں سوچ کر اس نے... جھجھری سی سی۔ خوف اور پریشانی سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی دشمنوں سے بچ کر وہ کہاں آگئی تھی۔ دوست تھے یا دشمن؟ ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔

پھر مکرم شاہ اس کے سامنے آیا۔ شروع میں تو خوف کی شدت سے وہ کچھ بول نہ سکی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ایسے میں مکرم شاہ نے اسے حوصلہ دیا۔ اس کے دماغ سے سب سے پہلے یہ خوف دور کرایا کہ وہ دشمن نہیں۔ رفتہ رفتہ اپنی باتوں اور سلوک سے اس کے دل میں اپنے لیے اعتماد کا احساس پیدا کیا۔

ماہین کے دل و دماغ سے جب خوف دور ہوا اور اس نے خود کو محفوظ سمجھنا شروع کیا تب اس نے اپنے بارے میں بتا دیا۔

حیا اور خوف کے احساسات کے باوجود جب اُس نے اپنی تباہی کے ذمے دار کے طور پر طفل بابا کا نام لیا تو مکرم شاہ کو دکھ اور افسوس کے علاوہ خوشی بھی ہوئی کہ اس درندے کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اب کوئی عذر باقی نہیں رہا تھا۔ وہ قاتل بھی تھا، ماہین جیسی معصوم لڑکیوں کی عزتوں کا لٹیرا بھی تھا۔

ماہین خود پر ہونے والے ظلم کے بعد شدید ذہنی دباؤ میں تھی۔ اس کے اعصاب بکھر چکے تھے۔ وہ بار بار موت کی بات کرتی تھی۔

مکرم شاہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی! ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو۔ میں جانتا ہوں تم پر درندگی کی انتہا کی گئی



اگلے تین چار دنوں تک مکرّم شاہ اسے ہمت حوصلہ دیتا رہا۔ اس کے اندر زندگی کی طرف لوٹنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا جوش پیدا کرتا رہا۔ طفیل بابا کی زندگی سے اس کے اعصاب کے ساتھ اس کا بدن بھی زخموں سے چور تھا۔

ان تین چار دنوں میں ماہین سے اس کی امی تاج النساء اور بھائی ندیم کے بارے میں وہ بہت سی باتیں جان چکا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے ماہین کی دماغی حالت بہتر ہو جائے۔ اس کے جسم پر جو جو قسم کاریاں کی گئی تھیں۔ ان کے نشان مٹ جائیں۔ اس کے بعد وہ ایک معقول کہانی بتائے گا کہ ماہین کی امی سے ملے گا۔

اس دوران مکرّم شاہ نے بالے کو ایک اہم ذمہ داری سونپ دی کہ وہ ماہین کے بھائی ندیم کے بارے میں معلومات حاصل کر لے۔ وہ کیا کام کرتا ہے؟ کس مزاج کا بندہ ہے؟ طفیل بابا کے خلاف کسی کارروائی کی صورت میں کیا اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟

دو دن بعد بالے نے آکر بتایا کہ ندیم بہ ظاہر موٹر ملکینک ہے۔ در پردہ نشیات فروشی کا دھندا کرتا ہے۔ اس کا شاکا گینگ کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ مکرّم شاہ کے لیے یہ انکشاف بڑا حیران کن تھا۔ جس طفیل بابا نے اس کی بہن کی

ہے اور ایسا کرنے والا بڑے زبردست اثر و رسوخ کا مالک ہے مگر قانون کی مدد سے اسے سخت سزا دلائی جاسکتی ہے۔

”آپ کس قانون کی بات کرتے ہیں چچا! اگر قانون کا خوف ہوتا تو طفیل بابا میرے ساتھ ایسا ظلم بھی نہ کرتا۔ اگر قانون کے ہاتھ لے ہوتے تو طفیل دادا جیسا بد معاشرہ میں دندا تانہ پھرتا۔ ڈرگزر جیسے زہر کا کاروبار نہ کرتا۔“ وہ شدید دکھ اور مایوسی سے بولی۔

”تمہاری بات غلط نہیں ہے بیٹی! اس کے باوجود میں مایوس نہیں۔ تمہیں انصاف دلانے کے لیے میں پوری جدوجہد کروں گا۔“

”میرا جسم بھی میری روح بھی اس وقت زخموں سے چور چور ہے چچا! آپ کے قانون پر بھروسہ کر کے اپنی رسوائیوں کا حصول پٹوانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں جانتی ہوں پولیس تفتیش اور تحقیقات کے نام پر میری چھوٹی سی فیملی کو سرعام بدنام کرے گی۔ مجرموں کو پکڑنے کے بجائے مجھے اور میری فیملی کو ہی ذہنی اذیت دیتی رہے گی۔ نہیں نہیں چچا! مجھے انصاف کی امید میں اپنے چھوٹے سے خاندان کی عزت نیلام کرانے کا ہرگز ارادہ نہیں۔ بس مجھے مر جانا ہے۔ اس بے درد دنیا سے منہ موڑنا ہے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مکرّم شاہ سوچتی نظروں سے اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ نادان نہیں تھا۔ اسی گلے مڑے نظام کا حصہ رہا تھا۔ تھانے کچھریوں میں انصاف کے حصول میں غریب اور بے کس لوگ کس طرح ذلیل و خوار ہوتے ہیں وہ اس سے واقف تھا۔ وہ بس لڑکی کو پرکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ماہین کی سسکیاں کم ہوئیں، مکرّم شاہ ملاحت سے بولا۔ ”بیٹی! تم عدل کے اداروں سے مطمئن نہیں ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کائنات کے صوبے سے بڑے عادل اللہ کی ذات پر بھی بھروسہ نہ کرو۔ تم مرنے کی بات کرتی ہو۔ یعنی اللہ پاک سے مایوس ہونے کی بات کرتی ہو۔ پھر تو تمہاری دنیا بھی آخرت بھی برباد ہوگی۔“

”میں زندہ کیسے رہوں گی چچا! کس منہ سے اپنی امی اور بھائی کے پاس جاؤں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں کیسے انہیں بتاؤں گی کہ مجھے پر کیسی قیامتیں ٹوٹ پڑی ہیں؟“

”تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ۔ میں تمہاری امی اور بھائی کو کچھ اس انداز میں سمجھا دوں گا کہ تم پر گزرے حالات انہیں معلوم نہیں ہوں گے۔ بس تم خود کو حوصلہ دے دو۔ اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کرو۔ جو ہوا ہے اسے بھول جانے کی کوشش

زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔ اسی کے گینگ کا وہ ایک مہرہ تھا۔

مکرم شاہ نے ماہین کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ اسے اپنے بھائی کے خفیہ دھندے کا علم نہیں۔ ان ماں بیٹی کے لیے وہ صرف ایک موٹر مکینک تھا۔

چوتھے دن وہ کانچ سے نکلا اور ماہین کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ بالے بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کے وہ باہر جیب میں ہی بیٹھا رہا۔ مکرم شاہ اکیلا اندر چلا گیا۔

ماہین کے بھائی نے جب اپنی گمشدہ بہن کا حوالہ سنا تو شدید حیرت اور مسرت کے جذبات کے ساتھ اسے گھر کے اندر لے گیا۔ مکرم شاہ کو گھر کی آرائش و زیبائش، قیمتی فرنیچر اور قالین دیکھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی۔

”آپ کون ہیں؟ میری بہن کے بارے میں کیسے جانتے ہیں؟“ ندیم نے اسے ٹھوکتی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”میں ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہوں۔ تمہاری بہن حادثاتی طور پر مجھ سے ٹکرائی تھی۔ وہ اس وقت محفوظ مقام پر ہے۔“

”وہ خود کیوں نہیں آئی ہے؟“ ندیم مضطرب آواز میں بولا۔

مکرم شاہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری امی گھر میں ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بات کر سکتی ہیں؟“

”محترم! کیا مسئلہ ہے؟ کیا ماہین کو کچھ ہوا ہے؟“ اس نے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ پوچھا۔ ”میری امی گھر میں نہیں۔ ماموں کے پاس شیخوپورہ گئی ہیں۔“

”تمہاری بہن اب محفوظ ہے۔ دریائے راوی کے پاس میرے ایک کانچ میں موجود ہے۔ ماہین کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتانی ہیں کہ اچھا ہوتا اگر تمہاری امی بھی موجود ہوتیں۔“

”آپ کی گفتگو میرے لیے بہت پریشان کن ہے۔ پلیز ذرا کھل کر بتائیے۔ میری بہن کو کیا ہوا ہے؟“ وہ بے تابانہ سے بولا۔

مکرم شاہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ ”میں تمہاری بے چینی کو سمجھ رہا ہوں۔ جوان لڑکی کا کئی دنوں تک گھر سے غائب رہنا آسان بات نہیں۔ لوگ حقیقت جانے بغیر ہی کہانیاں گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ واپس آ جائے تب بھی جینا مشکل کر دیتے ہیں۔ چار دن پہلے تمہاری بہن جب گھر سے باہر نکلی تھی، وہ نہیں جانتی تھی اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ یہ کہہ کر مکرم خاموش ہو گیا۔

”تم سے ایک ذاتی سوال پوچھ رہا ہوں۔ اگر جواب نہیں دینا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔“ مکرم شاہ اسے سوچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی بتائیں۔ اگر سوال کا تعلق میری بہن کی سلامتی سے ہے تو ضرور جواب دوں گا۔“

”تمہاری بہن بتا رہی تھی کہ تم ایک موٹر مکینک ہو۔ لیکن تمہارے گھر کی آسائشوں اور قیمتی ساز و سامان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہو؟“

ندیم کے چہرے کا رنگ خستہ ہو گیا۔ جیسے دل و دماغ میں ایک کشمکش ہی ہو رہی ہو۔ جواب دینے میں وہ پس و پیش کرنے لگا۔

مکرم شاہ نے کہا۔ ”دیکھو ندیم! میں کوئی حاضر سرورس تمہانیدار نہیں ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کروں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے پولیس کا مخصوص طریقہ کار استعمال کر کے تمہارے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی ہیں۔“

”اگر آپ جان گئے ہیں تو میرے منہ سے اقرار کیوں کروانا چاہتے ہیں؟“ اس نے خشک لہجہ میں پوچھا۔

”تاکہ تم سے وہ بات پوچھ سکوں جس کا تعلق تمہاری بہن سے بھی ہے۔“ مکرم شاہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میری معلومات کے مطابق تم شا کا گینگ کے لیے کام کرتے ہو۔ کیا تم طفیل بابا سے کبھی ملے ہو؟“

ندیم نے چونک کر ٹھوکتی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ ”جی ہاں۔ اکثر اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”طفیل بابا اور شاہد کے درمیان بہت عرصے سے دشمنی چل رہی تھی۔ اپنے باپ کی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر دونوں ایک دوسرے کو چوٹ پہنچاتے رہتے تھے۔ کچھ مہینے پہلے شاہد نے طفیل بابا کی سب کے سامنے بے عزتی کی تھی۔ اپنے سیکورٹی گارڈز کی مدد سے اس کی پٹائی بھی کی تھی۔ اس کے بدلے میں طفیل بابا نے شاہد رضا کو چند دن پہلے راوی کنارے گھیر لیا۔ اس کو گاڑی سمیت گہری کھائی میں گرادیا۔ تم نے بتایا کہ ماہین کا موبائل کھائی سے مل گیا مگر وہ خود موجود نہیں تھی۔ اب تم خود کڑیاں جوڑ لو۔“

ندیم کے چہرے پر جیسے زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ کمرے میں شدید بے چینی سے ٹپکتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طفیل بابا نے شاہد کو گاڑی کے ساتھ گہری کھائی

میں دھکیل دیا اور میری بہن کو اٹھا کے لے گیا؟“

”کیا اس نے تمہارے ساتھ بھی کچھ بڑا کیا ہے؟“ اس نے چوہکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میری بیوی کا قاتل ہے۔ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نے میری بیوی کو نشانہ بنایا۔ میں شاہد رہ پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ اوتھا۔ اس کے باجوہ میں اتنا بے بس تھا کہ اس کے خلاف ایف آئی آر بھی درج نہیں کرا سکا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس درندے کو خود ہی سزا دے دوں گا۔ میں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ طفیل بابا کو عبرت ناک سزا دے سکوں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تمہاری بہن بھی اس کی درندگی کا نشانہ بن کر میرے سامنے آگئی ہے۔“

ندیم کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں؟ میری غیرت اور میری مردانگی کے لیے یہ ایک گالی نہیں ہے؟“

”تم پہلے اپنی بہن سے ملو۔ وہ سامنے نہیں آئے گی تو اس کی بات سنو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتا دوں گا کہ کیا کرنا ہے؟“

تھوڑی دیر میں وہ دونوں باہر آ کر جیب میں بیٹھ گئے۔ بالے نے جیب اسٹارٹ کی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اس کا بیج کے سامنے پہنچے جہاں ماہین موجود تھی۔

ماہین نے جیب کی آواز سنی تو کھڑکی کے پاس آئی۔ اپنے بھائی کو بھی جیب سے اترتے دیکھا تو اس کے دل کو جھکا لگا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے گلے سڑے وجود کو لے کر کبھی اپنی ماں اور اپنے بھائی کے سامنے نہیں جائے گی۔ وہ اپنی زندگی سے بھی بیزار ہو گئی تھی لیکن کرم شاہ نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ شرمندگی اور بزدلی کی موت کے بجائے اپنے مجرم کو بدترین انجام سے دو چار کرنے کا جذبہ پیدا کیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا لمحہ لمحہ اس انتظار میں کٹ رہا تھا کہ طفیل بابا سے انتقام لینا ہے۔

اپنے بھائی کو کرم شاہ کے ساتھ کامیج میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے ایک دم اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر اس کے بھائی کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ”ماہین! میری بہن تم کمرے میں موجود ہو؟“

اس نے اک ذرا توقف کے بعد پاٹ لہجے میں کہا۔ ”جی ہاں بھیا! میں موجود ہوں۔ آپ یہاں شاہ جی کے ساتھ آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے میرے بارے میں

”جی ہاں۔ یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں ہے۔ اصل واقعہ ہے۔ تمہاری بہن کو وہ گتے کا بچہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے چنگل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ اتفاق سے راستے میں وہ مجھ سے ٹکرائی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اپنے کانچ لے گیا۔ چار دنوں سے وہ کانچ میں موجود ہے۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی جسمانی حالت بھی صحیح نہیں تھی۔ اس لیے یہاں لانے کے بجائے میں خود آگیا تاکہ تمہیں یہ یقین دلا سکوں کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔“

ندیم کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ غم و غصے کی شدت سے چہرے کے خطوط صحیح سے گئے تھے۔ وہ اپنی ٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”اگر آپ کی باتیں سچ ہیں تو میں طفیل بابا کو عبرت ناک انجام سے دو چار کر دوں گا۔ لیکن آپ پر بھروسہ کیوں کروں؟ ممکن ہے آپ نے خود ایسا کیا ہو اور طفیل بابا سے کسی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے اس کا نام لے رہے ہوں؟“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔ یقین دلانے کے لیے یہی کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس جگہ لے جاؤں، جہاں ماہین موجود ہے۔ لیکن ایک مسئلہ ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ اپنے ساتھ ہوئے قلم کا بدلہ لینے سے پہلے وہ گھر والوں سے نہیں ملے گی۔ شاید وہ تم سے ملنے پر راضی نہ ہو۔“

ندیم نے ہونٹ بھیج کر غراتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے وہ بدلہ کیوں لے گی؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ آپ مجھے اس کے پاس لے جائیں۔ وہ سامنے نہ آئے تو دروازے کی لاٹ سے اس سے بات کروں گا۔ یہ یقین کر لوں گا کہ طفیل بابا نے ہی اس پر قلم کیا ہے۔“

”اس کے بعد کیا کرو گے؟ کیا طفیل بابا جیسے بااثر اور طاقت ور بد معاش کے خلاف اکیلے کوئی کارروائی کر سکو گے؟“ کرم شاہ نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ وہ مشتعل لہجے میں بولا۔ ”اپنی بہن کے گناہ گار کو کیفر کر داریں۔ پہنچانے کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

”ایسے فلمی ڈراما گ بول کر تم طفیل بابا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ مجھے دیکھو۔ میں نے ایک عمر فنڈوں بد معاشوں سے لڑتے گزاری ہے۔ میرے پاس قانون کی طاقت بھی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ تمہیں تو وہ چٹکیوں میں اڑا دے گا۔“

میں، آپ کے سپاہی کے طور پر میں اپنی ڈیوٹی نبھاؤں گا۔ اب سے گزرنے والی ہر گھڑی موت کی ٹنگ بن کر اس درندے کے عبرت ناک انجام کے قریب ہوتی رہے گی۔“ اس نے مٹھیاں بچھ کر کہا۔

☆☆☆

چھ سات دن بعد کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ کرم شاہ داتا صاحب کے دربار میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ آنکھیں غم سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ہر جمعرات یہاں آتا تھا۔ داتا دربار کی عقیدتوں بھری فضا میں کچھ دیر بیٹھتا تھا۔ اپنی بیوی کو یاد کر کے آنسو بہاتا تھا۔ اس کے قاتل کو کیفر کر داری تک پہنچانے کے عزم کو تازہ کرتا تھا۔ پھر بڑے ہی بوجھل بوجھل قدموں سے چلتا اپنی جیب تک آتا تھا۔ بالے اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

اس شام وہ داتا صاحب کے حزار کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کا بزر محسوس ہوا۔ اس کے ارتکاز میں غفلت پیدا ہوا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی چونک پڑا۔ ندیم کا نام دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تیزی سے اٹھا اور لوگوں کے جھوم سے الگ ہو کر موبائل کان سے لگا یا۔

”شاہ جی! آپ کدھر ہیں؟“ ندیم نے پوچھا۔

”داتا صاحب کے دربار میں آیا ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے مضطرب لہجہ میں کہا۔

”شاہ جی۔ میں طفیل بابا کے ساتھ شاہدرہ کی بستی شاداب پور آیا تھا۔ آپ جانتے ہیں یہاں شا کا گینگ کا اڈا ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کے بعد واپس لاہور آرہے ہیں۔ طفیل بابا نے بتایا ہے واپسی میں دریائے راوی کے کنارے ایک دوسرے اڈے بھی جاتا ہے۔“

”طفیل بابا کے ساتھ سکیورٹی گارڈز کتنے ہیں؟“

”ہم لاہور سے ایک ہی گاڑی میں آئے ہیں۔ طفیل بابا کے علاوہ ہم تین بندے ہیں۔“

”بہت خوب! ایک گھنٹے بعد شام گہری ہوگی۔“ کرم شاہ۔ سوچ میں ڈوبی آواز میں بولا۔ ”اس وقت تم وہاں سے نکلو گے۔ دوسرے اڈے پر پہنچنے تک اندھیرا چھا جائے گا۔ یہ کسی ایکشن کے لیے مناسب وقت ہے۔ کیا دوسرے اڈے پر بھی اس کے بندے موجود ہوں گے؟“

”جی ہاں۔ پانچ چھ بندے موجود ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے ہمیں راستے میں کارروائی کرنی

سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں نے قسم کھائی ہے جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔ اسے عبرت ناک سزا دینے سے پہلے کسی کے سامنے نہیں آؤں گی۔ آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

ندیم نے تڑپ کر کہا۔ ”میری بہن! بس ایک بار یہ بتا دو کہ طفیل بابا ہی تمہارا گناہ گار ہے۔ اس کے بعد میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔“

”میں اپنی زبان سے کیسے اُس شیطان کا نام لوں گی بھیا! میرے جسم کی رگ رگ میں اس کے لیے نفرت اور غصہ بھرا ہوا ہے۔“

”بس ٹھیک ہے میری بہن! تم اپنی قسم پر قائم رہو۔ تمہارا یہ بھائی اب شاہ جی کے ساتھ مل کر اس شیطان کو تمہارے قدموں پر لانے کی تدبیر کرے گا۔“ اس نے گرجتے ہوئے کہا پھر وہاں سے پلٹ کر کرم شاہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔

”شاہ جی! آپ نے میری بہن پر احسان کیا ہے۔ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ اب جو آپ کہیں گے۔ میں اسی کے مطابق آپ کا ساتھ دوں گا۔ پلیز جلدی سے بتا دیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اس وقت غصے سے پھٹ رہا ہوں۔“

”سب سے پہلے تم اپنے غصے پر قابو پاؤ۔ طفیل بابا سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے جوش کی نہیں، ہوش کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسے چھپ کر گولی مارنا کوئی مشکل بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہاری بہن نے قسم کھائی ہے اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دے گی۔ ورنہ وہ کسی کو منہ نہیں دکھائے گی۔ اس لیے سوچ سمجھ کر ایسی حکمت عملی بنانی ہوگی کہ وہ ورنہ بے بس ہو کر قدموں میں آگرے۔“

”میں تو غم و غصے سے کھول رہا ہوں۔ کیا آپ کے دماغ میں کوئی منصوبہ ہے؟“ وہ مٹھیاں بچھ کر بولا۔

”ہوں۔ تمہیں اس کے قریب ہونا پڑے گا۔ اپنے موٹر درکشاپ کا کام کچھ عرصے کے لیے بند کر دو۔ کوئی جگاڑ کر کے اس کا اعتماد اس حد تک جیت لو کہ وہ جہاں بھی جائے، تمہیں ساتھ لے جائے۔ تم اس کی ہر نقل و حرکت کی مجھے خبر دیتے رہو۔ خاص کر شہر سے باہر دریائے راوی کے آس پاس جب وہ سفر کرے اور اس کے ساتھ سکیورٹی گارڈز کی تعداد بھی کم ہو۔ تب ہم مناسب موقع دیکھ کر اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ آج سے طفیل بابا کے خلاف اس مہم

ہوگی۔“

کبھی کبھار ان سے کوئی بات کر لیتا تھا۔

اندھیری رات میں اس بچی اور ویران سڑک پر ان کی لینڈ کروزر درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک کھیت تھے۔ کبھی کبھیں درخت تھے۔ رہائشی مکانات کی روشنیاں دور چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک ندیم نے دیکھا کہ سڑک پر تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک روشنی جل بجھ رہی تھی۔ اس کا بدن ایک دم ٹن سا گیا۔ دل کی دھڑکنیں جیسے دھمال کرنے لگیں۔ موبائل ٹارچ کی یہ چلتی بجتی روشنی مکرم شاہ کی طرف سے سگنل تھا۔ ندیم نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے نیچے سے ریوالور نکالا۔ ساتھ بیٹھے محافظ نے غور کر اسے دیکھا۔ لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ ریوالور ہاتھ میں لینے کا عمل ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

اسی لمحے سڑک کے دونوں جانب سے تڑتڑا تڑ فائرنگ ہوئی۔ لینڈ کروزر ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ ہچکولے کھانے لگی۔ فائرنگ سے لینڈ کروزر کے چاروں ٹائر دھماکے سے پھٹ گئے۔ اندر بیٹھے افراد میں افراتفری سی پھیل گئی۔ سب کے منہ بے اظہراری طور پر چپیں بلند ہو گئیں۔ نیچے جھٹکے ہوئے ان کے ہاتھ بھی خودکار انداز میں اپنے ہتھیاروں کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور ایسا بدحواس ہوا کہ رفتار بڑھانے کے چکر میں گاڑی ایک طرف سڑک کے کنارے پیڑ سے ٹکرا دی۔ اس کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اندر بیٹھے سبھی افراد اپنی اپنی سیٹوں پر اچھل کر رہ گئے۔ اس تصادم کی وجہ سے وہ ہتھیار بھی سج پکڑ نہ سکے۔ باہر سے فائرنگ اب رک گئی تھی۔

ندیم کے ہاتھ میں پہلے سے ہی ریوالور موجود تھا۔ اس نے اپنے حواس درست کیے۔ منصوبے کے مطابق بہت تیزی سے پلٹ کر عقبی سیٹ پر بیٹھے محافظ کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی محافظ کے منہ سے آخری چیخ بلند ہوئی۔ ندیم کے دوسرے فائر نے ساتھ بیٹھے محافظ کو نشانہ بنایا۔ کسی کے کچھ بچنے تک اس نے ڈرائیور کے سر کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ تینوں گولیاں بارجے سیکنڈز سے کم وقت میں اپنے ہدف کو نشانہ بنا چکی تھیں۔ طفیل بابا شدید حیرت اور خوف سے جیسے سکتے کی حالت میں رہ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے پلٹ کر ندیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ندیم غرایا۔ ”سور کے نیچے امیری اگلی کوئی تیرا بھیجاؤا سکتی ہے۔ لیکن تجھے اتنی آسان موت مرنے نہیں دوں گا۔“

”تجھے تو رپا تڑپا کے مار ڈالوں گا۔“

”ت۔۔۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ شدید خوف سے

اس نے ندیم کو کچھ مزید ہدایات دیں۔ رابطہ منقطع کر کے داتا صاحب کے مزار کے نزدیک آیا۔ آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں کہا۔ ”اے اللہ کے ولی! آپ نے اپنی زندگی میں ہمیشہ محبت اور امن کا درس دیا ہے۔ میں آپ کے وسیلے سے اللہ پاک سے معافی مانگتا ہوں۔ میں ایک ایسے شیطان کو جان سے مارنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں جو اس زمین کے لیے اور یہاں کے پُر امن انسانوں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔ وہ درندہ صفت انسان بے گناہ نہیں۔ بہت سے دوسرے معصوم انسانوں کے علاوہ میری محبوب بیوی کا قاتل ہے۔ اس کے لیے سزائے موت جائز ہے۔“

اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، لوگوں کے ہجوم کو چیرتا باہر آیا۔ وہاں پارکنگ ایریا میں بالے اس کی جیب کے پاس موجود تھا۔

”بالے! وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے ہم نے لمحہ لمحہ گمن کر گزارا ہے۔ چلو، ایک شیطان کو نابود کرنے کے مقدس فرض کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔“ اس نے ہونٹ ہنچ کر کہا۔

بالے ایک دم سمجھ گیا۔ جیب کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ مکرم شاہ دوسری طرف سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بالے نے جیب اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو وہ اسے سمجھانے لگا کہ ان کی لائن آف ایکشن کیا ہوگی۔۔۔۔۔☆ ☆ ☆

دریائے راوی کے پاس شا کا گینگ کے اڈے سے لاہور واپس آتے ہوئے ندیم نے سبج کر کے بتا دیا کہ وہ روانہ ہو گئے ہیں۔ منصوبے کے مطابق مکرم شاہ اور بالے وہاں سے لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔

ندیم اور طفیل بابا کے علاوہ لینڈ کروزر میں تین مزید آدمی تھے۔ وہ طفیل بابا کے سکیورٹی گارڈز تھے۔ ان میں ڈرائیور بھی شامل تھا۔

وہ جوں جوں گھات والی جگہ کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ ندیم کے اندر سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ ان کی رگوں میں خون کی گردش نہایت تیز ہو رہی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ شاہ جی کے منصوبے کو آسان اور کامیاب بنانے کے لیے اسے گاڑی کے اندر کارروائی کرنی تھی۔ اس نے دیکھا تھا گاڑی کے سبھی افراد بے فکری سے بیٹھے ہوئے تھے۔ طفیل بابا

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہارا کیا بکا ڈا ہے؟“
 ندیم جیسے غصے سے بے قابو ہو گیا۔ پوری نفرت سے
 ریوا لور کا دستہ اس کے منہ پر دے مارا۔ یہ ایسا خطرناک اور
 اچانک وار تھا کہ ریوا لور کا دستہ پوری طاقت سے طفیل بابا کے
 منہ اور ناک سے ٹکرایا۔ ایک بھیاںک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔
 سامنے کے دانتوں کے ساتھ ناک کی ہڈی بھی ٹوٹنے کی آواز
 سنائی دی۔

اسی وقت باہر سے کرم شاہ کی آواز گونجی۔ ”ندیم! اپنی
 پوزیشن واضح کرو۔ کیا تم ٹھیک ہو؟“
 ندیم نے جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ ”شاہ جی!
 حالات قابو میں ہیں؟ اس گتے کے بچے کے علاوہ سب مارے
 گئے ہیں۔“

سڑک کے دونوں جانب سے کرم شاہ اور بالے گاڑی
 کے قریب آنے لگے۔ اس دوران ندیم نے فرنٹ سیٹ کا
 دروازہ کھولا تھا اور طفیل بابا کو گھسیٹ کر باہر نکالا تھا۔ اس کی
 حالت بہت خراب تھی۔ منہ سے اور ناک سے بھل بھل خوب
 بہہ رہا تھا۔ اس میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی بھی سکت
 نہیں رہی تھی۔ وہ ڈگمگا رہا تھا۔ پھر ندیم کے ہاتھوں سے
 چھوٹ کر سڑک پر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

کرم شاہ نے ایک نظر گاڑی کے اندر ڈالی۔ پھر سر اپنے
 کے انداز میں کہا۔ ”تم نے تو حیران کر دیا ہے ندیم! ہمارے
 ایکشن کے لیے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا ہے۔“

اس نے دانت چس کر کہا۔ ”میرے اندر آگ لگی ہوئی
 ہے شاہ جی! اپنی بہن کی قسم کا لحاظ نہ ہوتا تو اس گتے کو بھی سہیں
 کاٹ کر پھینک دیتا۔“

”اس کا بھی وقت آئے گا ندیم! لیکن یہاں نہیں۔ اب
 جلدی سے بالے کے ساتھ مل کر اسے اٹھاؤ اور میری جیب میں
 ڈال دو۔ تب تک میں اس لینڈ کروزر کو سڑک کے پار
 جھاڑیوں کی طرف لے جا کر چھپا دیتا ہوں۔“

لینڈ کروزر ابھی تک اسٹارٹ حالت میں تھی۔ کرم شاہ
 اسے پیٹ سے ہٹا کر سڑک کے پار پکے میں لے گیا۔ وہاں
 اک ڈراکشی جگہ تھی۔ جہاں جھاڑیاں تھیں اور چند درخت
 تھے۔ لینڈ کروزر اس میں دھکیل کر چھلانگ لگا کے وہ باہر آیا۔
 اس وقت تک ندیم اور بالے نے طفیل بابا کو جیب میں ڈال دیا
 تھا۔

ذرا ہی دیر میں رات کے اند میرے میں اُن کی جیب
 وہاں سے تیزی سے دوڑتی ہوئی دور جانے لگی۔

☆☆☆

طفیل بابا کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کورسیوں میں
 جکڑا ہوا پایا۔ وہ ایک کرسی پر اس طرح بندھا ہوا تھا کہ ہاتھ
 اور پیروں کو حرکت بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی ناک اور منہ
 سے بہتا خون بندھا ہوا تھا لیکن وہ شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ اپنی
 زبان کو ذرا سی حرکت دی تو غم و غصے سے اس کے بدن میں
 جیسے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس کے سامنے کے بہت سے
 دانت ٹوٹ گئے تھے۔ ناک بھی سوٹی ہوئی تھی۔

اسے وہ لمحہ یاد آیا جب ندیم نے اس کے منہ پر بڑی
 بے رحمی سے ریوا لور کا دستہ دے مارا تھا۔ یہ سوچ کر دل میں
 جیسے لاوے اُٹنے لگے کہ ندیم نے اس کے تین ساتھیوں کو پلک
 جھپکنے میں گولیاں مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے دماغ میں
 یہ خیال جیسے سوئیاں چھو رہا تھا کہ ندیم نے ایسی حرکت کیوں
 کی تھی؟ کیا ماضی میں اس کے ساتھ یا اس کے کسی عزیز کے
 ساتھ کچھ غلط ہوا تھا؟

وہ ندیم کو بہت عرصے سے جانتا تھا۔ متعدد بار ملاقات
 بھی ہوئی تھی۔ ندیم ان کے گینگ کا پرانا ڈرگ ڈیلر تھا۔ جس
 اور آئس ان سے لے کر شہر بھر کے ورکشاپوں میں پلائی کرتا
 تھا۔ ہفتہ دس دن پہلے اس نے آکر درخواست کی تھی کہ آٹو
 ورکشاپ کا کام سنبھال لیں چل رہا۔ اس لیے اپنے گینگ میں
 باقاعدہ شامل کر لے۔ وہ گاڑی گارڈ کے طور پر کام کرے گا۔

طفیل بابا کو اپنی طاقت اور حیثیت کا اتنا زعم تھا کہ یہ
 خیال بھی نہیں آیا کہ ندیم کے بارے میں اک ذرا تفتیش کر کے
 معلوم کرے کہ کیا وہ درست کہہ رہا ہے؟ پرانے تعلق کی بنیاد
 پر اس نے اعتبار کیا اور ندیم کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت
 دے دی۔

طفیل بابا جس کمرے میں قید تھا، وہ مانوس سا مکان تھا۔
 اس نے سرگھما کر یہاں وہاں دیکھا پھر حیرت سے اچھل پڑا۔
 راوی کے اس پار کھیتوں اور درختوں کے بیچ اس کا ایک
 خاص ٹھکانا تھا۔ جو اس کی عیاشیوں اور خرمستیوں کا اڈا تھا۔
 جب بھی کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزارنے کو اس کا دل پھلتا تھا۔
 اسے لے کر یہاں آتا تھا۔ شراب اور شباب کی بھٹلیں سجا کر
 جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیتا تھا۔ بانی اوقات میں یہ کابج
 بند رہتا تھا۔ صرف ایک چوکیدار اس کی نگرانی کے لیے موجود
 ہوتا تھا۔

وہ شدید حیرت ہے سوچنے لگا کہ ندیم اسے بے ہوشی کی
 حالت میں یہاں کیوں لے آیا ہے؟ کیا اسے خوف نہیں کہ
 یہاں میرے بندے آسکتے ہیں؟ یا پھر اس کا کوئی دوسرا مقصد
 ہے؟

اسی وقت وہ ٹھٹھک گیا۔ کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ پھر اس میں سے جو شخص اندر داخل ہوا، اسے بھٹی بھٹی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ انسپٹر کرم شاہ کو بھولا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں تھانے میں جو مار کھائی گئی، اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بدلے میں بعد میں اس نے کرم شاہ کو مارنا چاہا تھا مگر کوئی اس کی بیوی کو لگی تھی۔ طفیل بابا اپنے اثر و رسوخ کے باعث قانون کی گرفت سے بچ گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کرم شاہ نے اسے سزا دینے کا خود فیصلہ کیا تھا۔

اب مجروح اور مقید حالت میں اپنے سامنے انسپٹر کرم شاہ کو دیکھ کر حیرانی سے زیادہ پریشانی کے گہیرے اس کے متورم چہرے پر چھا گئے۔

انسپٹر کرم شاہ اس کے سامنے آیا۔ چند تینے زہریلی نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر نفرت بھرے لہجے میں غرا کر بولا۔ ”سور کے نیچے! تو سمجھتا تھا کہ ظلم کرتا رہے گا اور اپنے بد معاش باپ کی وجہ سے ہمیشہ بچتا رہے گا۔ خدا نے تجھے بہت ڈھیل دی تھی۔ اب تیرے مظالم کا گن گن کر حساب لینے کا مجھے موقع دیا ہے۔“

”تنت..... تم اچھا نہیں کر رہے ہو انسپٹر!“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں غصہ بھی تھا، خوف بھی۔ ”تم سچ نہیں سکو گے۔ میرے بابا سات سمندر پار سے بھی تمہیں ڈھونڈ کر لائیں گے۔“

کرم شاہ نے اگلے ہاتھ کا طمانچہ اس کے سوجے ہوئے منہ پر مارا۔ بہت دیر کا بند خون پھر ناک سے بہہ نکلا۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔

”حرام زادے! اپنا انجام سامنے دیکھ کر بھی ان گیدڑ بیکبوں سے باز نہیں آ رہا ہو۔“ وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ”بہت جلد تیرے اس شیطان باپ کا بھی یہی حشر ہوگا۔“

”ندیم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اس نے میرے ساتھ غداری کیوں کی ہے؟“ اس نے ہاتھوں سے رستے خون کو تھوکتے ہوئے پوچھا۔

”ندیم نے تیرے ساتھ غداری نہیں کی ہے کہیں! وہ تو خود بدلے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کمرے کو غور سے دیکھ۔ یہ تیری عیاشیوں کا اڈا رہا ہے۔ اسی کمرے میں تو نے چند دن پہلے ایک معصوم لڑکی کی عزت پامال کی تھی۔ اسے بدترین جسی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ ندیم اسی لڑکی کا بھائی ہے۔“

”ٹنگ..... کیا تم ماہین کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔ تیرے بندوں کے چنگل سے وہ بچ نکلے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اتفاق سے بھاگتے بھاگتے وہ میرے سامنے آ گئی۔ میں نے اسے محفوظ ٹھکانے میں پناہ دی۔ ندیم کو ایک منصوبے کے تحت تمہارے قریب کر دیا۔ اس نے تیرا اعتماد حاصل کیا۔“

”ٹنگ..... کیا ماہین بھی یہاں موجود ہے؟“ اس نے متوحش آواز میں پوچھا۔

”ہاں۔ تجھ جیسے شیطان نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ اسی دن مرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے اسے حوصلہ دیا۔ تجھ سے بدلہ لینے کا جذبہ پیدا کیا۔ آج وہ مبارک دن آ گیا ہے۔“ کرم شاہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”دیکھو..... مجھے معاف کر دو اور یہاں سے نکال کر میرے بابا تک پہنچا دو۔ اس کے بدلے تمہیں منہ مانگا پیسہ دیں گے۔“ وہ گڑگڑا کر بولا۔ اپنا انجام جتنی دیکھ کر اس کا غرور اور غصہ ختم ہو گیا تھا۔

کرم شاہ نے اس کے چہرے پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”گتے اکینے! اپنے شیطان باپ کے اثر و رسوخ اور درجنوں محافظوں کے بل بوتے پر تو دندنا پھرتا تھا۔ آج موت سامنے دیکھ کر تو کتنا حقیر اور بے بس ہے۔ آج کا دن سودا کرنے کا نہیں، انتقام کا ہے۔ اپنی جان سے زیادہ پیاری بیوی کے بدلے تیرے کٹڑے کٹڑے کرنے کا عزم کیا تھا۔ لیکن ماہین نے مجھ سے یہ حق لے لیا ہے۔ اب آدمی سزا میں تجھے دے دوں گا۔ سزائے موت ماہین دے گی۔“

کرم شاہ نے کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا لوہے کا موٹا راڑ اٹھایا۔ ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر طفیل بابا کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ وہ شدید خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

کرم شاہ نے پوری طاقت سے راڑ گھمایا اور اس کے گھٹنے پر ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ وہ ترپنے لگا۔ رسیوں میں جکڑا ہونے کی وجہ سے وہ تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔ کرم شاہ کے دوسرے وار نے دوسرے گھٹنے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ڈنچ ہوتے بکری کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ درد کی شدت سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ کرم شاہ پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑا تھا۔ وہ لوہے کے راڑ سے مسلسل اس کی دونوں ٹانگوں کو نشانہ بناتا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں پھور پھور ہو گئیں۔ تب تک طفیل بابا بے ہوش ہو گیا تھا۔

ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس نکتے کو سزا دینے کے بعد وہ آئندہ کبھی مرنے کی اور مایوسی کی بات نہیں کرے گی۔ تم یہ فکر چھوڑ دو کہ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ بالے جیسا بہادر جوان اسے اپنی شریک حیات بنانے کے لیے بہ صد خوشی راضی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ماہین اور بالے کو ساتھ لے کر ملتان چلا جاؤں گا۔ ہم وہاں ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ اس نئی زندگی میں ماہین میری بیٹی ہوگی۔ میں اور بالے مل کر کوئی معقول پیشہ اختیار کریں گے۔“

ندیم کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو جھلکانے لگے۔ وہ سب بڑی بے چینی سے اس کمرے کی طرف دیکھنے لگے جہاں انتقام کی آگ میں جلتی ماہین اپنی بربادی کے گناہ گار کو سزا دے رہی تھی۔ چند ثانیوں بعد انہوں نے سنا۔ کمرے سے طفیل بابا کے چیخنے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ پھر انہیں کھڑکی اور دروازے کی درزوں میں سے دھواں نکلتا دکھائی دیا۔ وہ شدید بے چینی اور اضطراب سے کمرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ ان پر بھاری پڑ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کمرے سے نکلتا دھواں گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی طفیل بابا کے چیخنے چلانے کی آوازیں میں بھی موت کا خوف تڑپ رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے میں لگی آگ اب بھڑکنے لگی ہے۔

ندیم است بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ بالے کے چہرے پر جیسے سندروں سا اضطراب اُٹھ آیا تھا۔ مکرم شاہ بھی ہونٹ میچ کر ایک شہداء تار بھرے چہرے کے ساتھ کمرے کے دروازے کے کچھ کھڑکی کے شیشوں میں سے اب دھواں کے ساتھ آگ کی لپٹیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان تینوں پر مایوسی کا احساس غالب آنے لگا تھا۔ سبھی کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ماہین جیسے لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلی۔ اُس کے چہرے پر اپنی فتح کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

کھلے دروازے کے اندر کمرے کا ماحول بڑا آتش ناک نظر آ رہا تھا۔ جہاں بھڑکی ہوئی آگ ایک شیطان صفت انسان کے لیے جہنم کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کمرے کے باہر جہنم جلی ماہین کے چہرے پر آتش انتقام کی پُرمسرت چمک، اس کی بربادی کے گناہ گار کے عبرت ناک انجام کی خبر دے رہی تھی۔

❖❖❖

مکرم شاہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر بالے کو آواز دی۔ ”بالے! بالٹی میں پانی لے کر آؤ۔ ماہین کو بھی بلاؤ۔ وہ اپنا حساب کتاب شروع کرے گی۔“

کچھ ہی دیر میں بالے ایک بالٹی میں پانی لے کر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ماہین سر جھکائے اندر آئی۔ اس نے چھٹی نظروں سے طفیل بابا کی جانب دیکھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔

ماہین نے سوالیہ نظروں سے مکرم شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر وہ بولا۔ ”بیٹی! فکر مت کرو۔ تمہارا شکار ابھی زندہ ہے۔ تم اپنا انتقام لے سکتی ہو۔“ وہ بھرتائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”شکر یہ شاہ جی! آپ نے وعدہ پورا کیا۔ اس درندے کو بے بسی کی حالت میں میرے قدموں میں ڈال دیا۔“

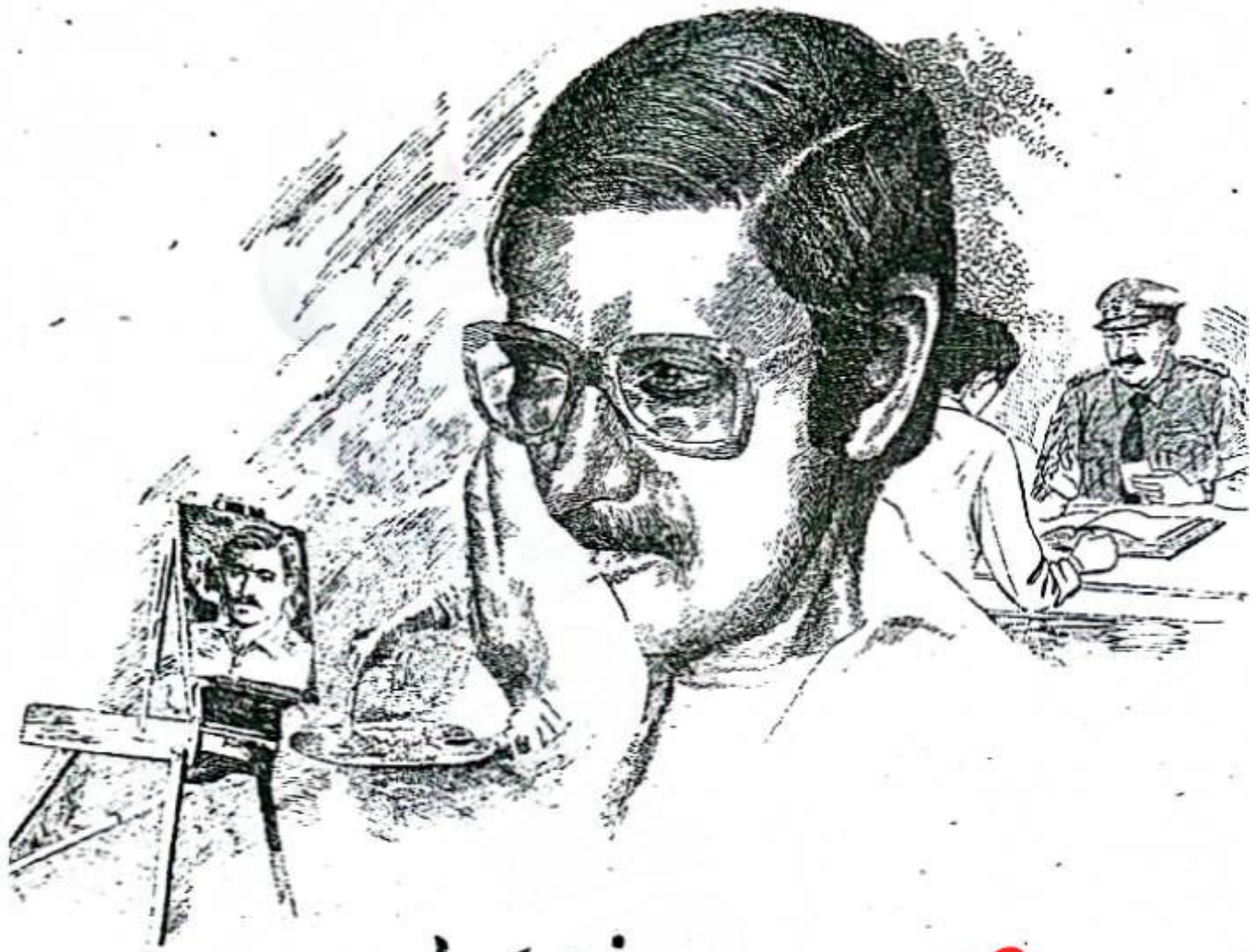
”بیٹی! تم بھی مجھ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس نکتے کو سزا دینے کے بعد کسی انتہائی اقدام کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ ہم سب اس تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ بالے نے بالٹی کے پانی سے طفیل بابا کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ اک ذرا کسمسایا۔ خوشی دیر بعد وہ ہوش میں آگیا۔ آنکھیں پٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

مکرم شاہ اور بالے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ دروازے کے پاس جا کر بالے نے پلیٹ کر ماہین کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک التجا تھی، ایک فریاد تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔ ”پلیز ماہین! تم سلامت باہر آ جاؤ۔ کوئی بڑی بے چینی سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوگا۔“

کمرے کے باہر برآمدے کے آخر میں ندیم ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بہت بکھرا بکھرا اور مایوس لگ رہا تھا۔

مکرم شاہ نزدیک جا کر بولا۔ ”ندیم! یہ اداس ہونے کا وقت نہیں۔ ایک درندے کے غلیظ بوجھ سے زمین کا سینہ پاک کرنے کا مبارک وقت ہے۔ اس لیے خوشیاں مناؤ۔“ ”میں کیسے خوشیاں مناؤں شاہ جی! میری بہن کی تو زندگی برباد ہو گئی ہے۔ اپنا انتقام لے کر بھی وہ زندگی بھر کے لیے داغ دار رہے گی۔ اسے کون قبول کرے گا۔ وہ تنہائی اور مایوسی کا شکار ہو کر خود بھی مر جائے گی۔“ شدید مایوسی اور اضطراب سے اس کی آواز زلزلہ مچا رہی تھی۔

”مریں اس کے دشمن ندیم! میری ماہین سے بات



فنکار

بشریٰ امجد

ہر کام میں مشقت لگتی ہے۔۔۔ یہ بھی محنت سے کام کر رہا تھا مگر بینک کے منیجر کا کہنا تھا کہ اس کام کو بارہ کر کے لاؤ۔۔۔ فنکار کو ناگوار خاطر گزرا مگر وہ مجبور تھا۔۔۔ اس بار اس نے نہ صرف بہتر کام کیا بلکہ اپنے ہر وقت مشاہدے سے ایسا کام دیا کہ ہر جگہ اس کے نام کا ڈنکا بج گیا۔

ایک انوکھی واردات کا دلچسپ تصویری حال

فنکاروں کی قدر و قیمت ہمارے ملک میں کیا ہے، اس بارے میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں اور ایک مصور۔۔۔۔۔ اس کے لیے تو زندگی ایک الزام بن جاتی ہے۔ اصل مجرم خود جمال تھا۔ یہ ایک فطری غیر جمالی حرکت تھی کہ وہ تصویر کشی کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کس سے متاثر تھا۔۔۔۔۔ پکاسو، وان گوگ، ڈاؤنی، جیکسن پولاک، رائٹل، ریمبراں۔۔۔۔۔

وہ پاکستانیوں کے اکچ بھی بنانا تھا لیکن مشہور جاسوسی ڈائجسٹ: جولائی 2025ء

تصویر کا سائز بھی بڑا کرو۔“ فیجر نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے تصویر واپس جمال کو پکڑادی۔
جمال بد مزہ ہو گیا تھا تاہم مرتبا کیا نہ کرتا۔

☆☆☆

سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ فیجر نے بینک کا ایک ملازم ساتھ کر دیا تھا کہ جمال بہ آسانی سامنے عمارت کی چھت پر جا سکے۔ صبح کے گیارہ بجے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ چھت پر پہنچ کر جمال نے ایزل اور کینوس سیٹ کیا اور منہ بنا کر سامنے دو منزلہ بینک کی ”بلڈنگ“ کو دیکھا۔ تصویر ایک طرف رکھی۔

”عموماً آرٹ سے نا آشنا افراد مجھ سے جزئیات کی فرمائش کرتے ہیں اور عموماً یہ فرمائش غیر ضروری ہوتی ہے۔ اب اس دو منزلہ کو میں بلڈنگ نہیں بنا سکتا۔ یہ حبیب بینک پلازا ہے اور نہ ہی چندر نگر روڈ والی نیشنل بینک کی مرکزی اونچی بلڈنگ۔“ وہ سوچ رہا تھا کہ تصویر پر بلڈنگ بھی لکھنا پڑے گا۔ ظاہر ہے وہ یہ حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک اس کی توجہ بینک کی چھت کی طرف مبذول ہوئی جہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ جمال نے اس کے پرو قائل کا جائزہ لیا۔ وہ شخص گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں سیاہ جوتے تھے۔ چہرے سے وہ ایک جوان آدمی تھا۔ جمال نے نظر ہٹائی اور اپنے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”رک جاؤ۔ حرکت مت کرنا۔“ اجنبی اچانک بلند آواز میں بولا۔ جمال نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ انداز خطرناک اور گن کا رخ جمال کی طرف۔ اسلحے سے جمال کی کوئی جان بچان نہیں تھی۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کہ اجنبی کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہے، اس میں سے کوئی ننگی تو اس کی جان جائے گی۔ اجنبی کے تیور بھی قاتلانہ تھے۔ جمال کے پسینے چھوٹ گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جمال نے بے اختیار ہاتھ کھڑے کر کے اُسے ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔ خود اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو چلے تھے۔ اس کی نگاہ بے اختیار نیچے سڑک پر گئی۔ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا کار بینک کے سامنے رکی۔ دو آدمی کار میں سے نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ دونوں بینک میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھے۔ دودھماکے ہوئے۔ پہلے بیگ والا فٹ پاتھ پر گر پڑا پھر اس کا ساتھی گٹھنوں پر آکر اوندھالیٹ گیا۔

جمال نے دو آدمی دیکھے جن کے ہاتھوں میں ویسی ہی

شخصیات کی تصویر بنانے کا اسے بہت کم موقع ملا تھا۔ قدرتی مناظر کی تصویر بھی بنانا تھا تاہم زیادہ تر وہ انٹرنیٹ کی مدد سے ماضی کے نامور ماسٹرز کی تصاویر بناتا تھا۔ فاقوں اور بد حالی نے اس کا حلیہ خراب کر دیا تھا۔ وہ بمشکل دو کمروں کے فلیٹ کا کرایہ نکال پاتا۔ اسے کچھ رقم ڈائجسٹوں میں کام کرنے سے مل جاتی تھی۔ بد قسمتی کہ ڈائجسٹوں کا دور اب مائل بہ زوال تھا۔

وہ اپنے کام کے معاملے میں کڑوی تنقید کا شکار رہتا تھا۔ جمال تنقید کرنے والوں کو بدذوق اور جاہل (آرٹ کے معاملے میں) گردانتا تھا اور یہی بدذوقی اچانک اسے شہرت کی بلندیوں پر لے گئی۔ قسمت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ ناقدین رنگ و حسد کے جذبات کے ساتھ جمال کے گن گارہے تھے۔ ایک ہی تصویر نے اسے اتنے پیسے دلادے جتنا معاوضہ وہ سیکڑوں تصاویر بنا کر بھی حاصل نہ کر پایا تھا اور شہرت یونس کے طور پر ملی۔

جمال کی مذکورہ تصویر ایک قاتل کی تھی۔ قاتل اگرچہ مفرور نہیں تھا لیکن پولیس کے لیے جرم ثابت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ قاتل کی تصویر ماسٹر پیس ثابت ہوئی اور اس کو مشہور گیلری میں آویزاں کیا گیا اور تین قاتلوں کو سزائے موت سنادی گئی۔ دیگر دو قاتل کے ساتھی بھی۔

یہ سب کیونکر ہوا، آغاز کیسے ہوا؟ نیشنل بینک ناظم آباد کے فیجر فرمائش کرتے اور نہ جمال کی قسمت کا دروازہ کھلا۔ فیجر برہان کے علم میں تھا کہ جمال نے پراچے کے باہر کھڑے چار بینک ملازمین کی تصویر بنائی تھی۔ اوروں کی طرح۔ حسب معمول اس نے تنقید کرتے ہوئے کہا۔

”ہم اس تصویر کو اگر بینک میں لگادیں تو ہمارے کسٹمرز اسی وقت متوجہ ہوں گے جب وہ تصویر میں بینک کا نشان دیکھیں گے۔ ہمارے لیے جزئیات اہم ہیں۔“ فیجر نے جمال سے کہا۔ ”پس منظر میں بلڈنگ بھی نظر آنی چاہیے۔“

”میں غیر ضروری تفصیلات اُجاگر کرنے کا قائل نہیں۔ ویسے بھی بینک پراچے کی عمارت کوئی بلڈنگ نہیں ہے۔“ جمال نے دبا دبا انداز اختیار کیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ فیجر کی تیوریوں پر عمل پڑ گئے تھے۔

”اسی لیے تم نا کام ہو۔“ فیجر نے بدلتا علی کا مظاہرہ کیا۔ ”سڑک کی دوسری جانب عمارت کی چھت پر جاؤ، تصویر بھی لے جاؤ۔ وہاں سے بلڈنگ اور نشان دونوں نظر آئیں گے۔ تصویر دوبارہ بناؤ میری ہدایت کے مطابق اور

فنکار

وہ جان گیا تھا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ پولیس میں اس کا بتایا ہوا حلیہ نوٹ کرنے کے بعد پیڈ بند کر چکا تھا۔ نوٹ بک اس نے آگے بیٹھے پولیس میں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ حلیہ تھانوں اور میڈیا تک پہنچانا ہے۔“

☆☆☆

ڈاکٹر زکوزیادہ مغز ماری کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد اس نے حرکت قلب، بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا۔ ایک گھنٹے بعد جمال اسپتال سے باہر تھا۔ اسی دوران میں خبر اس تک پہنچ گئی تھی کہ جو دو آدمی مارے گئے تھے، ان کا تعلق ہیڈ آفس سے تھا۔ دونوں موٹی رقم جمع کرانے وہاں ناظم آباد براؤنچ آئے تھے۔ ان کے ساتھ

ڈرائیور بھی تھا۔ وہ اندر ہی بیٹھا رہا ورنہ شاید وہ بھی مارا جاتا۔ کوئی گارڈ ساتھ نہیں تھا۔ رقم کا ٹرانسفر کامیابی سے

مکمل تھی جس کے نشانے پر وہ خود تھا۔ اس نے پھر سامنے بینک کی چھت پر دیکھا۔

اور تیسرا دھماکا ہوا۔ چھت پر موجود اجنبی نے جمال کو نشانہ بنایا تھا۔ ظاہر تھا کہ سڑک والے ڈاکوؤں کا سامی تھا۔ جمال کربناک انداز میں چیخ مار کر گرا۔ ایزل اور کیونس اس پر گرے۔ اس کا بدن نیچے چھپ گیا۔

چند لمحے وہ ساکت اور بے جان پڑا رہا پھر اس کی حیرت بیدار ہوئی۔ دل دھڑک رہا تھا، بدن میں جان تھی۔ قاتل کرنے والا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ کیونکہ ٹارگٹ مٹ کر گیا، وہ چیخنے والا تھا کہ خود کو روک لیا۔ اگر وہ ابھی تک وہاں تھا تو جمال کے چیخنے پر دوسرا قاتل کرے گا۔

نیچے شور شرابا بڑھتا جا رہا تھا۔ جمال نے زیادہ انتظار نہیں کیا اور لیٹے لیٹے پھٹا شروع کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں چند افراد چھت پر نمودار ہوئے۔ ان میں بینک کا وہ ملازم بھی تھا جس نے عمارت کی چھت پر جانے کے لیے جمال کی مدد کی تھی۔ انہوں نے جمال پر سے کیونس ہٹایا۔

”میں نے اُسے دیکھا ہے۔ اُس نے مجھے گولی ماری ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ میں نے۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔“

پولیس آ رہی ہے۔ ایک نے کہا۔

”اوہ، تم زخمی ہو۔“ بینک کے ملازم نے بائیں شانے کے نیچے خون دیکھا۔ گولی بغل کے قریب گوشت پھاڑ کے کہیں نکل گئی تھی۔ زخم جان لیوا نہیں تھا۔ زخم کی تھی کہ وہ بچ گیا۔ تاہم ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔

پولیس کو بلاؤ، میں نے اُسے دیکھا ہے۔ میں پہچان لوں گا۔ جمال نے ایک ہی رٹ لگا لی ہوئی تھی۔ وہ سامنے بینک کی چھت پر تھا۔

”تم خاموش رہو۔ خون نکل رہا ہے۔“

اتنے میں پولیس کے چند اہلکار چھت پر نمودار ہوئے۔ صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور جمال کو اسپتال پہنچانے کا حکم دیا گیا۔

اسپتال کی طرف جاتے ہوئے خون بند کرنے کا عارضی بندوبست کیا گیا۔ گاڑی کے عقبی حصے میں ایک پولیس والا موجود تھا۔ جمال جذباتی انداز میں اسے قاتل کرنے والے کا حلیہ اور نقوش بتا رہا تھا۔ اسے زخم کی پروا نہیں تھی۔

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان) کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

ایک نئے کال کے واسطے

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔ اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائد آریڈی، ای 311 شارجہ

971504805734

URDU BOOKS WORLD FZC.

BUSINESS CENTRE

SHARJAH PUBLISHING CITY

FREE ZONE, AL ZAHIA,

SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,

E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

کی تیز روشنی ہو۔ تم یہ کام کل بھی کر سکتے ہو، اب شام ہو گئی ہے۔“ جمال نے کہا۔

”وہ کس لیے؟“

”میں نے جو دیکھا، اُسے کیسوس پر منتقل کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ سب انسپکٹر نے اتفاق کیا۔

دوسرے دن وہ ٹاپ فلور پر تھے جہاں جمال کو ایک روشن کمرے میں لایا گیا۔ اس کے ضروری ساز و سامان کا بندوبست کل ہی کر لیا گیا تھا۔ قاسم جان کا فوٹو اس کے حوالے کر کے ان لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔

”یہ فوٹو اپنے پاس رکھو۔“ جمال نے کہا۔

شجاعت نے حیرت کے ساتھ شانے اُچکائے اور ساتھی کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے اور کوئی تبصرہ کیے بغیر فوٹو لے کر چلے گئے تاہم اب وہ پہلے کے مانند زیادہ پُر امید نہیں تھے۔

اُن کے جانے کے بعد جمال نے سامان، رنگ اور برش سیٹ کیے۔ سادہ کیسوس کو گھورتا رہا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ تصویر کی آنکھ پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور دائیں ہاتھ میں ایک برش سنبھالا۔ گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے کام میں جُست گیا۔ بلا کا ارکاز تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیتیں جموئیک دی تھیں۔ جموئے گواہ قاتل کرنے والے کو بچالے جائیں گے۔ اس حقیقت نے جمال کو مشتعل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی کولیاں بھی اُس روز وہ بھول گیا تھا۔ بائیں جانب بدن میں قابلِ برداشت تکلیف کا احساس غائب ہو چکا تھا۔

قاسم جان اور اس کے جموئے گواہ جمال کی عکاسی دیکھ کر بولنا بھول جائیں گے۔ تصویر میں جمال نے قاسم جان کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھا اور دوسرا برش اٹھایا۔ دوسری طرف پولیس کی واحد امید جمال کی مصوری تھی لیکن یہ امید تقریباً ٹوٹ چکی تھی۔ شام کے وقت انسپکٹر شجاعت نے کمرے میں جھانکا۔

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔“ اس نے جمال سے کہا۔

”پینٹنگ نہیں دیکھو گے؟“ جمال پُر سکون تھا۔

شجاعت نے کیسوس پر نظر ڈالی اور دنگ رہ گیا۔

”چاہو تو تنقید کر سکتے ہو۔ میں عادی ہو چکا ہوں۔“

جمال نے جیسے طنز کیا۔

شجاعت دل ہی دل میں جمال کے کمال کو سراہ رہا تھا

پھر کسی خیال کے تحت وہ بولا۔

”تم نے بتایا تھا کہ جب تم نے قاسم کو چھت پر دیکھا تو وہ گرے سوٹ میں ملبوس تھا؟“

جمال نے ترش لہجے میں کہا۔ ”جب کسی کو تنقید کرنے کے لیے کہا جائے تو ناقد ہمیشہ کوئی نہ کوئی غیر اہم نکتہ تلاش کر لیتا ہے۔“

شجاعت کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”اگر تم مجھے پینٹ کرو گے اور میں نے سیاہ سوٹ

زیب تن کیا ہے..... پینٹنگ میں تم سیاہ کے بجائے خاکے

سوٹ دکھاؤ گے تو کیا میں اعتراض کرنے میں حق بجانب نہیں

ہوں گا؟“

”تم نے پور ٹریٹ کو پسند کیا ہے اور بہ آسانی قاسم

جان کو پہچان لیا ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟“

”درست ہے۔“ انسپکٹر نے اعتراف کیا۔ ”لیکن تم

نے تفصیلات کو نظر انداز کر دیا ہے۔“

جمال نے رنگوں کی مخصوص پلیٹ اور برش نیچے رکھ

دے۔

”یہ پور ٹریٹ کس کا ہے؟“ جمال نے سوال کیا۔

”قاسم جان۔۔۔۔۔ بلکہ پورا منظر نامہ ہے۔“

”پروفیشنل ناقد کے لیے اتنا کافی ہے۔“ جمال نے

کہا۔ ”لائٹ، شیڈ اور پس منظر کسے کہتے ہیں اور وہ کیسا

ہے..... ناقد غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

پینٹر سبز یا نیلا سوٹ استعمال کرے گا تب بھی پور ٹریٹ میں

قاسم نظر آئے گا۔ ناقد مجموعی طور پر پور ٹریٹ پسند کرے گا تو

بہت کافی ہے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں، بالکل درست ہے۔ اب چیک فیکچر برہان کی

مثال دیکھو۔ میں نے براؤنج کے چار ملازمین کا اسکیچ بنایا تھا۔

اس نے تسلیم کیا کہ وہ براؤنج کے ملازم ہیں لیکن اس نے تنقید

کس بات پر کی؟“

”کس بات پر؟“

”اس تصویر میں چیک کا نشان نظر نہیں آیا۔ اس نے

اعتراض کے ساتھ مطالبہ کیا کہ چیک کا نشان بھی نظر آنا

چاہیے۔ کیا مذاق ہے، وہ چیک ہے، کوئی جیل نہیں۔“

”لیکن بذاتِ خود قاسم اعتراض کر سکتا ہے کہ تم نے

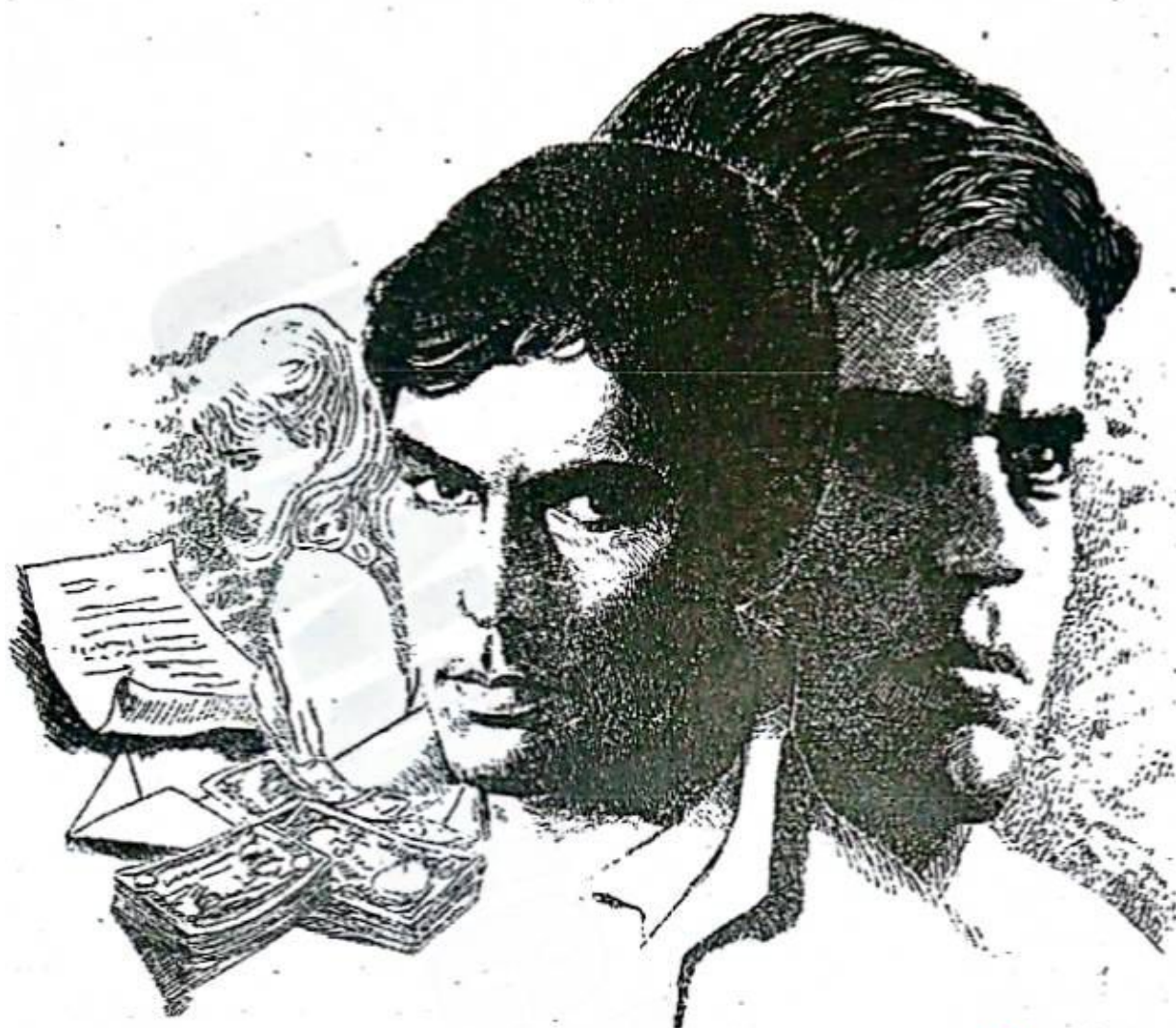
اس کو گہرے نیلے رنگ کا سوٹ کیوں پہنا دیا؟“

”وہ کہاں ہے؟“ جمال نے سوال کیا۔

”آزاد ہے۔ اگرچہ ہماری نظروں میں ہے اور ہمارا

قاسم جان کی سانس رکنے لگی۔ کیڑس پر پینٹنگ بولتی ہوئی لگ رہی تھی۔ سڑک پر سیاہ ہنڈا کار اور سامنے بینک کی عمارت تھی۔ کار سے نکلنے والے دو آدمیوں کو زمین بوس

جمال اُن گنت باریہ جملہ دہرا چکا تھا..... انہوں نے صرف تین منٹ میں سازی کا روائی عمل کی تھی جبکہ میں وہ ایسے کسی طرح بھی تین منٹ میں نہیں بنا سکتا تھا۔



طمانچہ

عکس فاطمہ

عمل کا دار و مدار نیت پر ہے... نیت اچھی ہو تو مشکل سے
مشکل کام آسانی سے پایا تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں...
انسانیت اور نیت کے ملاپ میں جتن لینے والی پُر حقیقت
کہانی کے تلخ مناظر...

لغظوں کی صداقت سے قیامت ڈھانسنے والا مانچہ...

دیگر سماجی کارکنان کی دیکھا دیکھی، توفیق بھائی
بھی یہ شوق اٹھا تھا کہ کیوں نہ اس میدان میں بھی کامیابی
کے جھنڈے گاڑے جائیں۔ قبل اس کے وہ کاروبار کی دنیا
میں اچھا خاصا نام کما چکا تھا۔ اس کے پاس روپے پیسے کی
کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ کباڑ اور اسکرپٹ وغیرہ کا بزنس کرتا
تھا جس میں منافع بعض اوقات کئی سو گنا ہوتا تھا مگر اس
کاروبار سے منسلک رہتے ہوئے وہ معاشرے میں اس
معیار اور ڈھنگ کی زندگی نہیں گزار رہا تھا جو نلاحی اور

جاسوسی ڈائجسٹ 151 جولائی 2025ء

”ہاں، ہاں..... بالکل.....“ انور بھائی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا ہوں توفیق بھائی، تم نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے مشورہ مانگا ہے تو میرا فرض بنتا ہے کہ اس راستے پر بکھرے ہوئے کانٹوں، پتھروں اور چھوٹے بڑے گڑھوں کے بارے میں تمہیں واضح طور پر بتا دوں تاکہ تم بے خبری میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جو جس کی واپسی ممکن نہ ہو۔“

توفیق بھائی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اسی لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”تو پھر میری بات دھیان سے سنو.....“ انور بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے جس میدان میں کودنے کا فیصلہ کیا ہے، وہاں شہرت کے ساتھ کئی طرح کے رسک بھی بڑے ہوئے ہیں۔“

توفیق بھائی نے آنکھیں سکیڑ کر اپنے دوست کو دیکھا اور پوچھا۔ ”مثلاً کون سے رسک؟“

”ذلت، بدنامی، رسوائی اور جگ ہنسائی کا رسک.....“ انور بھائی نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ”ان سماجی کارکنوں پر آئے روز گھٹاؤنے الزامات لگتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں انور بھائی.....“ توفیق بھائی پلکیں جھپکاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”آپ کن الزامات کی بات کر رہے ہیں؟“

”انسانی اعضا اور محصوم بچوں کی بیرون ملک اسمگلنگ، ڈرگز ٹریڈنگ، جعلی شادیاں اور مجبور لڑکیوں کو جسم فروشی کے دھندے پر لگانا۔ ایسولینرز کے اندر مریضوں کی جگہ غیر قانونی اسلحے کی ترسیل..... وغیرہ!“ انور بھائی نے پُرسوج انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”اخبارات اور ٹی وی والے ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تم کس کس کے سامنے صفائیاں پیش کرتے پھر دو گے۔ سوشل میڈیا پر الگ سے تمہارے خلاف ایک جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔“

”ہاں، انور بھائی! ایسا میں نے بھی سنا ہے۔“ توفیق بھائی ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ طوقان بدتمیزی تو سراٹھاتا ہی ہے لیکن کسی سماجی کارکن کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہو پاتا۔ چند روز کے بعد یہ دھول پٹھ جاتی ہے..... اللہ اللہ، خیر سلا!“

”توفیق بھائی! تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ یہ

رقابہ جی تھیلوں کے مالکان اور مہتمم کا خاصہ ہے۔ وہ بھی ویسی ہی شان و شوکت اور شہرت کا طلب گار تھا۔ دولت نے اس کے لیے ہر شے کو خریدنا تو آسان بنا دیا تھا لیکن اس توت خرید کے مل بوتے پر وہ عوام میں ویسی مقبولیت حاصل نہیں کر سکا تھا جس کی تمنا اس کے دل میں بے قراری سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

شہرت کی بلند یوں کو چھوٹے کا فیصلہ تو اٹل تھا اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا گیا تھا مگر طریقہ کار بہ الفاظ دیگر طریقہ واردات توفیق بھائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس سلسلے میں اپنے ایک دیرینہ مخلص دوست انور بھائی سے مشورہ کرنے چلا گیا۔

انور بھائی بنیادی طور پر ایک صنعت کار تھا اور اس کا تعلق ٹیکسٹائل انڈسٹری سے تھا۔ علاوہ ازیں وہ بہت سوشل انسان تھا۔ بزنس کمیونٹی کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی اس کی پہچان اور اثر رسوخ تھا۔ انور بھائی نے پوری توجہ سے توفیق بھائی کا مقدمہ سنا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”توفیق بھائی.....!“ چند لمحات کی گنجیم خاموشی کے بعد انور بھائی نے کہا۔ ”شہرت حاصل کرنے کے لیے فی زمانہ سیاست کا میدان مجھے سب سے زیادہ زرخیز نظر آتا ہے۔ جب دوسرے سیاست دان تمہارے پیسوں سے ایکشن جیت سکتے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں.....؟“

یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ توفیق بھائی بعض آزاد امیدواروں کی انتخابی مہم کے لیے فنڈنگ کیا کرتا تھا۔ اور اس کا یہ فعل خالصتاً کاروباری ہوا کرتا تھا۔ اس کام میں لگائی ہوئی رقم مع سود واپس آ جاتی تھی۔

”اول تو مجھے سیاست بالکل پسند نہیں ہے.....“ توفیق بھائی نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں جوان چھوٹے موٹے سیاست دانوں پر پسا لگاتا ہوں، وہ ایک ایسا جوا ہے جس میں ہار کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ امیدوار ایکشن میں کامیاب ہو یا ناکام..... میری الویسٹ کی ہوئی رقم منافع کے ساتھ مجھے واپس مل جاتی ہے۔ یہ میرے اور کسی سیاست دان کے درمیان ایک ”بزنس ڈیل“ ہوتی ہے۔ سیاست کی دلدل میں اترے بغیر میں اپنی مرضی کے فوائد حاصل کرتا رہتا ہوں.....“ وہ لمبے بھر کے لیے تھا، ایک دو گہری سانس لیں پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہیں اپنی خواہش اور ترجیحات کی جو کچھ سنائی ہے، وہ تمہاری سمجھ میں آئی کہ نہیں؟“

”تم نے اپنے آفس کے اکاؤنٹس وغیرہ کا حساب رکھنے کا تو ذکر کر دیا۔“ انور بھائی نے بہ دستور پر معنی انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن تمہارا حساب کون رکھے گا بھائی.....“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ توفیق بھائی نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”توفیق بھائی! تم زندگی کی ساتھ سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہو۔“ انور بھائی نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ”زیلٹا بھائی کے انتقال کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ تمہارا بیٹا اور بیٹی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں اور تم بالکل اکیلے رہ گئے ہو۔ یہ خشک اور بے کیف روز و شب کب تک چلیں گے.....؟“

”میں سمجھا نہیں انور بھائی.....“ توفیق بھائی کے

چہرے سے فکر مندی جھلکنے لگی۔ ”جو بھی کہتا ہے، واضح الفاظ

میں کہہ ڈالو..... خواہ خواہ پیلیاں کیوں بھجوار ہے ہو؟“

”ارے بھائی! میں یہ کہہ رہا ہوں.....“ انور بھائی

نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جب تم اپنی

فلاحی تنظیم کے لیے ایک ڈسٹریکٹ آفس بنانے کا فیصلہ کر ہی

چکے ہو تو پھر ایک دل نشیں اور پُرکشش سیکریٹری کیوں نہیں؟

تمہارا کام بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ تم اپنی تنظیم کے

معاملات کو سنبھالنے کی ٹیم دو دو میں تھک کر چور ہو جاؤ

گے۔ ایسے منہمک اور پڑمردہ لمحات میں اگر تمہیں کسی حسین و

جلیل دوشیزہ کی قربت حاصل ہوگی تو تم دوبارہ جی اٹھو

گے..... کیا کہتے ہو بھائی؟“

انور بھائی نے اس کے دل کے رنگ آلود تاروں کو

اپنے الفاظ کی صیقلی حرکت سے چھیڑ دیا تھا۔ توفیق بھائی

کے رگ دپے میں کیف و انبساط کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس

کا چہرہ، آنے والے دنوں کے رومان پرورہ شمس تصور

سے چمک اٹھا۔ دیرینہ دوست کی اس تجویز کا کوئی جواب

نہیں تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ کے اندر توفیق بھائی کی فلاحی تنظیم ”انسان

نیت“ نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ اگرچہ تنظیم کا نام

بالکل نیا اور عجیب سا تھا لیکن اگر سنجیدگی سے اس پر غور کیا

جائے تو اس کے اندر سے انسان، انسان کی نیت اور

انسانیت جھلکتی تھی۔ تنظیم کا دفتر ایک معروف کاروباری

علاقے میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا اسٹاف چار افراد پر

مرد خود بہ خود نہیں بیٹھ جاتی۔“ انور بھائی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”بلکہ اسے بٹھانے کے لیے کئی لوگوں کے کھلے ہوئے منہ کو ٹوٹوں سے بھرتا پڑتا ہے جن میں میڈیا اور پولیس والوں کے علاوہ بعض سیاسی پارٹیاں بھی سرگرم عمل ہوتی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں انور بھائی!“ توفیق بھائی زیر لب

مسکراتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ”ان بھوکے بچے

اور منہ کھلے ضرورت مند افراد کی روٹی روزی کا میں بھی

خیال رکھوں گا۔“

توفیق بھائی کو اپنی ضد پر جمادیکھ کر انور بھائی نے

ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، تجربہ

کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس میدان میں قدم رکھنے

سے پہلے چند باتیں تمہیں ذہن نشین کرنا ہوں گی.....“

توفیق بھائی ہمتن کوش ہو گیا۔

”ابتدا میں تمہیں میرا تعاون حاصل رہے گا.....“

چند لمحات کی خاموشی کے بعد انور بھائی نے کہنا شروع کیا۔

”میں اپنے علاوہ بھی چند ایسا سر تمہیں مہیا کر دوں گا لیکن

جب تمہارا یہ کام بڑھے گا تو تمہیں ایسے لوگوں کی ضرورت

پیش آئے گی جو رضا کارانہ طور پر تمہاری فلاحی تنظیم کو

بھاری عطیات دینے کے لیے تیار ہو جائیں اور اس سطح کے

لوگ ایمان داری اور شفافیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے

ہیں۔ اگر تمہارا اسٹیم بے عیب اور واضح ہو گا تو پھر کچھ لو

تمہیں نیشنل اور انٹرنیشنل لیول پر ڈورز کی کوئی کمی محسوس

نہیں ہوگی۔“

”سمجھ گیا انور بھائی.....“ توفیق بھائی نے اثبات

میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آج کل کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا

زمانہ ہے۔ میں اپنی تنظیم کا ایک باقاعدہ آفس بناؤں گا

جہاں ڈورز کی دی ہوئی ایک ایک پائی کار یکا کر ڈر کھا جائے

گا۔ میرے اس عالی شان آفس میں ایک قابل اور تجربہ کار

اکاؤنٹنٹ بھی ہو گا جو ہر چیز کا حساب رکھے گا۔ کوئی مجھ پر

انگی اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ میں یہ کام مال بنانے

کے لیے نہیں، بلکہ نام اور شہرت کمانے کے لیے شروع

کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، اس شہر اور اس ملک میں

بسنے والے ایک ایک شخص کی زبان پر میرا نام ہو.....“

”ایک اہم بات تم بھول رہے ہو توفیق بھائی!“

انور بھائی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

توفیق بھائی نے ابھرنے زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کون

کی بات؟“

مشکل تھا یعنی توفیق بھائی، ان کی سیکریٹری شہلا، اکاؤنٹ سرمد علی اور چھوٹے موٹے کام کرنے والا آفس بوائے صدیق احمد۔ توفیق نے اپنی عظیم کے آفس پر دل کھول کر جیسا خرچ کیا تھا۔

سیکریٹری کے انتخاب کے لیے لگ بھگ چالیس خواتین کے انٹرویو کیے گئے تھے اور پھر توفیق بھائی نے شہلا کو اد کے کر دیا تھا۔ شہلا کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کا توفیق بھائی متلاشی تھا یا انور بھائی نے جس طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ بلاشبہ شہلا پر کشش شخصیت کی مالک ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ہی مہذب اور خوش گفتار بھی تھی۔

”شہلاجی! میں نے اپنی اس فلاحی تنظیم کے اغراض و مقاصد سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔“ انٹرویو کے آخر میں توفیق بھائی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں یہ کام مال بنانے کے لیے نہیں بلکہ شہرت بکمانے کے لیے کر رہا ہوں۔ امید ہے، اس کام میں آپ میری بھرپور مدد کریں گی۔“

”کیوں نہیں، ضرور۔۔۔۔۔“ شہلا نے تائیدی انداز سے میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مال بنانے کے لیے تو درجنوں کام کیے جاسکتے ہیں توفیق صاحب۔ انسان اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ سب سے زیادہ اہم ہے اور یہ کار تو آپ کی عظیم کے نام سے بھی جھلکتا ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ اس نیک مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ آپ کو شہرت، عزت اور آخرت۔۔۔۔۔ سب کچھ ملے گا۔ میں اس مشن کے ہر مرحلے میں آپ کا ساتھ دوں گی بہ شرطیکہ۔۔۔۔۔“

شہلانے ڈرامائی انداز میں توقف کیا تو توفیق بھائی نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔ ”آپ کس شرط کی بات کر رہی ہیں؟“

”ایمان داری کی!“ شہلانے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”جب تک آپ اس عظیم مشن کو غلوں نیت اور ایمان داری کے ساتھ لے کر چلتے رہیں گے، میرا تعاون آپ کو حاصل رہے گا لیکن جیسے ہی مجھے محسوس ہوا کہ آپ پٹری سے اتر گئے ہیں، میں اپنا راستہ الگ کر لوں گی۔۔۔۔۔“

”ان شاء اللہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ توفیق بھائی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”توفیق صاحب! میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں

کہ بے ایمانی کی کوئی بھی قسم مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔“ شہلا نے ٹھہرے ہوئے مگر کڑوے لہجے میں کہا۔ ”اپنی اس عادت کی وجہ سے میں نے زندگی میں بڑے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ ماجد کو چھوڑ دینا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“

”کون ماجد؟“ توفیق بھائی نے بے ساختہ پوچھا۔ ”میرا سابق شوہر ماجد حسین۔۔۔۔۔“ شہلا نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ کسٹم کے جھگے میں انپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی میں ماجد نے ماسٹرڈ کر رکھا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن اس سچی میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بالآخر میں نے ماجد کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا۔“ فلاحی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اکثر لوگوں نے مجھ سے یہی کہا کہ میرا یہ فیصلہ بے وقوفی کا منہ بولا ثبوت ہے لیکن میں نے کسی کی بات کو لائق توجہ نہ جانا کیونکہ یہ فیصلہ میں نے ان لوگوں سے پوچھ کر نہیں کیا تھا۔ یہ تو میرے دل، میرے ضمیر کی آواز تھی اور میں اپنے اس فیصلے پر پوری طرح مطمئن تھی۔ میں ایک حرام خور شخص کی اولاد پیدا کر کے اس دنیا کو اخلاقی معذوروں کا تحفہ نہیں دے سکتی تھی۔۔۔۔۔“

”آپ کی یہ شادی کتنا عرصہ چلی تھی؟“ شہلا کے خاموش ہونے پر توفیق بھائی نے سوال کیا۔

”کم و بیش ایک سال۔۔۔۔۔“ شہلانے بتایا۔ ”لگ بھگ ایک سال پہلے میں نے ماجد سے آزادی حاصل کر لی تھی۔“

”ٹھیک ہے شہلاجی!“ توفیق بھائی نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ ”انسان نیت“ میں کام کرتے ہوئے آپ کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا کہ آپ کی اس مثبت سوچ نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“

”شکریہ سر۔۔۔۔۔“ شہلانے معتدل انداز میں کہا۔

توفیق بھائی نے شہلا کو پچاس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنی سیکریٹری مقرر کر لیا۔ اس فیصلے انٹرویو کے بعد توفیق بھائی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شہلا دونوں کاموں کے لیے انتہائی موزوں تھی۔ نمبر ایک، اس کا دل بہلانے کے لیے نمبر دو، اس کی فلاحی تنظیم کا نام روشن کرنے کے لیے۔

☆☆☆

”ٹھیک ہے۔“ توفیق بھائی نے اثبات میں سر ہلایا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ آخر کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔“

”کیا آپ نے سرمد علی کو حسابات میں گڑبڑ کرنے کے لیے کہا ہے یا وہ اپنی مرضی سے یہ مجرمانہ حرکت کر رہا ہے؟“ شہلا نے توفیق بھائی کے چہرے پر نگاہ جما کر کڑے لہجے میں سوال کیا۔

”میں..... میں..... بھلا اسے..... بے ایمانی کرنے کے لیے کیوں کہوں گا۔“ توفیق بھائی نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ ہمارے اکاؤنٹس نے اکاؤنٹس میں کون سی گڑبڑ کر دی ہے؟“

”یہ ایک اتفاق ہے کہ میں آفس میں رکھے کمپیوٹر سسٹم کے پاس ورڈ سے واقف ہوں اور خوش قسمتی سے مجھے اپنی مرضی کے مطابق اس سسٹم کو چلانا بھی آتا ہے۔“ شہلا نے بہ دستور توفیق بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پچھلے چھ ماہ سے میں نے سرمد علی کے رویے میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی ہے۔ میں جب بھی اس کے کمپن کی طرف جاتی ہوں، وہ نہ صرف کمپیوٹر پر کام کرنا بند کر دیتا ہے بلکہ اس کے مانیٹر کو بھی ایسے رخ میں گھما دیتا ہے کہ میری نظر اسکرین پر نہ پڑ سکے۔ اس نے جب تین چار بار ایسی حرکت کی تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں موقع کی تاک میں رہنے لگی پھر دو روز پہلے مجھے ایک ایسا موقع مل گیا۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”اس دن سرمد نے چھٹی کی گھنٹی اور آپ بھی کسی پارٹی سے ملاقات کے لیے آفس سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے مدین بھائی کو دو تین کام بتا کر ایک گھنٹے کے لیے کہیں بھیج دیا اور خود آفس کے سسٹم پر بیٹھ گئی۔ پاس ورڈ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ لہذا اہتمام فائلنگ رسانی حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“ یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ ایک بار پھر رکی۔ اس مرتبہ توفیق بھائی سے صبر نہ ہوا۔

”قت..... تو آپ نے..... تنظیم کے حسابات میں کیا دیکھا؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”گڑبڑ گھوٹالا.....“ شہلا نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ”کم از کم ہمیں کروڑ کا گھٹلا.....“

”یہ..... یہ آپ کیا..... کہہ رہی ہیں.....؟“ توفیق

”انسان نیت“ نے ماہ شعبان میں اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ توفیق بھائی کی خوش قسمتی کہ آگے ماہ صیام یعنی مسلمانوں کے لیے رمتوں اور برکتوں والا مہینہ رمضان المبارک تھا لہذا اس نے اس موقع کو خوب اچھے سے کیش کرایا۔

انور بھائی نے حسب وعدہ اپنی ٹیکسٹائل ملز سے سو تھان جیمس اور سو تھان لیڈیز کپڑے کے بھجوا دیے۔ انور بھائی کے کہنے پر جوڑیا بازار کے ایک بیوپاری نے راشن کے ایک ہزار تھیلے بھی انسان نیت کو دے دیے۔ ان تھیلوں میں ایک متوسط گھر آنے کے لیے مہینے بھر کا راشن بند تھا۔ اس طرح توفیق بھائی نے عید الفطر سے پہلے اپنی فلاحی تنظیم کے پلیٹ فارم سے خوب دل کھول کر مستحق افراد کی مدد کی۔ عید کے دو ماہ بعد توفیق بھائی نے اپنی جیب سے پانچ ایسے افراد کو کچ کے لیے روانہ کیا جو تھکی، پرہیزگار اور غریب تھے۔ ان کارناموں کی وجہ سے توفیق بھائی کا نام بھی ان افراد میں شامل ہو کر منظر عام پر آ گیا جو خدمت خلق کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

اب بعض غیر حضرات نے توفیق بھائی کی فلاحی تنظیم کو عطیات بھی دینا شروع کر دیے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سلسلہ ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچ گیا۔ شہلا، توفیق بھائی کی سیکریٹری تھی۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی چنانچہ تنظیم کو ملنے والے ڈونیشنز اور اخراجات کے معاملات اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھے۔ اگرچہ توفیق بھائی برابر نیکی اور بھلائی کے کاموں میں معروف تھا اس کے باوجود بھی تنظیم کے کھاتے میں، ایک سال کے اندر کروڑوں روپے جمع ہو چکے تھے۔

”سر! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“ ایک روز شہلا نے توفیق بھائی سے کہا۔

”ہاں، ہاں..... ضرور!“ توفیق بھائی اپنی سیکریٹری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ میری تعلیم کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ شہلا نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے ”بی کام“ کر رکھا ہے۔“

”میں کوئی اکاؤنٹ بھلے نہ سہی.....“ شہلا نے رسائی بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں کامرس اور اکاؤنٹس کے علاوہ آئی ٹی کے معاملات کو بہت اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہوں۔“

بھائی نے انجھن زدہ اور حیرت بھری نظر سے اپنی خوب صورت سیکریٹری کی طرف دیکھا۔

”میں صد فیصد سچ کہہ رہی ہوں سر.....“ شہلا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”پچھلے ایک سال میں ہماری تنظیم کو بڑی اماؤنٹ کے جو عطیات ملے ہیں، وہ سب میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح ہم نے اس دوران میں قلمی کاموں میں جو پیسا خرچ کیا ہے، اس کا حساب بھی مجھے زبانی یاد ہے۔ اس تمام ترجیع تفریق کے بعد ہی میں ایک حتمی نتیجے پر پہنچی ہوں اور وہ یہ کہ..... تنظیم کے اکاؤنٹس میں اس وقت جو رقم موجود ہونا چاہیے، اس میں لگ بھگ پچیس کروڑ روپے کم ہیں۔“

”شہلاجی! آپ نے تو میرے دماغ کی چولیس ہلا کر رکھ دی ہیں۔“ توفیق بھائی دونوں ہاتھوں سے اپنا سر... تھامتے ہوئے بولا۔ ”میں تو سرمد کو بہت بھروسے والا بندہ سمجھتا تھا۔“ لمحے بھر کو رک کر اس نے شہلا کو چونکی ہوئی نظر سے دیکھا اور ٹٹولنے والے لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ نے اس حوالے سے سرمد سے کوئی بات تو نہیں کی نا.....؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ شہلا نے نفی میں جواب دیا۔ ”یہ آپ نے عقل مند کی کا ثبوت دیا ہے شہلاجی!“ وہ تو صنفی نظر سے اپنی سیکریٹری کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے صرف دو دن کی مہلت دیں۔ اس دوران میں، میں نہایت ہی رازداری کے ساتھ اس معاملے کی تہ میں اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اس موضوع پر بات کریں گے۔ اگر سرمد علی واقعی اس ضمن میں ملوث ہوا تو میں اس نمک حرام کو چھوڑوں گا نہیں.....“

بات کے اختتام میں وہ خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ ”سر! میں آپ کے معاملے میں حسن ظن رکھتی ہوں کہ آپ واقعی اس ضمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ شہلا نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”آپ کا خائن یا بد عنوان ہونا مجھ سے ہضم نہیں ہو پائے گا۔“

”اس بیک گمان کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں شہلاجی۔“ توفیق بھائی نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ واقعی میری سیکریٹری ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں۔“ ”سر! یہ تو میرا فرض ہے۔“ شہلا نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں آپ سے وفاداری اور آپ کی خیر خواہی کی ہی توقعواہ لیتی ہوں۔“

”تنخواہ تو میں سرمد علی کو بھی نکڑی دیتا ہوں۔“ توفیق

بھائی نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”مگر..... خیر.....“ معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر توفیق بھائی خاموش ہو گیا۔ شہلا نے بھی مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

☆☆☆

”انسان نیت“ کا آفس ڈھائی کروڑ پر مشتمل تھا۔ تکنیکی زبان میں اسے ”ڈھیا“ کہنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ آفس کا ایک کمر توفیق بھائی کے تصرف میں تھا، دوسرے کمرے کو پارٹیشن کی مدد سے دو کینئر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ایک کینین اکاؤنٹ سرمد علی کے استعمال میں تھا جبکہ دوسرے کینین میں توفیق بھائی کی سیکریٹری شہلا بیٹھتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ”آدھا کمر“ بھی تھا جو بہ طور کچن استعمال ہوتا تھا اور آفس ہوائے صدیق احمد اسی نصف کمرے میں موجود رہ کر باقیوں کے احکامات بجالانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ صدیق احمد کی عمر چالیس سے تینواڑھ تھی مگر عہدے کے اعتبار سے وہ ”آفس ہوائے“ ہی کہلاتا تھا۔

شہلا والا کینین اور توفیق بھائی کے کمرے کی درمیانی دیوار میں ایک سلائیڈنگ ونڈو تھی جس پر اندر کی جانب یعنی توفیق بھائی کے کمرے کی طرف ایک بلاسٹڈز پڑا ہوا تھا جو اکثر گرا ہی رہتا تھا۔ گزشتہ روز شہلا نے توفیق بھائی سے جو انتہائی اہم اور حساس نوعیت کی گفتگو کی تھی، اس کے جواب میں توفیق بھائی نے جس انداز میں خود کو کلیئر کرنے کی کوشش کی تھی، وہ وضاحت شہلا کے لیے اطمینان بخش ثابت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے باس کی طرف سے کھٹک سی گئی تھی چنانچہ حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے اس نے ایک راستہ نکال لیا اور اس راستے کا نام تھا..... سلائیڈنگ ونڈو!

شہلا نے مذکورہ ونڈو کے پٹ کو دو، ڈھائی انچ سلائیڈ کر کے اتنا گیپ پیدا کر لیا کہ وہ توفیق بھائی کے کمرے میں ہونے والی باتوں کو یہ آسانی مَن سکے۔ شہلا کی اس انقلابی حرکت کا توفیق بھائی کو اس لیے بھی احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ونڈو پر پڑے بلاسٹڈز کی وجہ سے اس ”درز“ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

آئندہ روز شہلا کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ انور بھائی اور توفیق بھائی کی شرانگیز اور منافقانہ گفتگو نے صورتِ حال کو آشکار کر دیا۔ وہ دونوں اسی موضوع پر بات کر رہے تھے جس کی جانب شہلا نے توفیق بھائی کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

بہترین تحریریں، لاجواب رد واد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
کراچی

شمارہ جولائی 2025ء

کی جھلکیاں

سماج نگار

اس بڑے قلم کار کی کہانیاں پڑھتے
تھے، اب ان کی سوانح حیات پڑھیں

فاتح

ہمارا فخر ہمارے ہوا باز جنہوں نے دشمنوں
کو ان کی اوقات بتائی، دلچسپ تحریر
لکھیں۔ مسلمانوں کا دلچسپ نگار
اس ادیب کا ذکر خاص جس
نے اردو ناولوں کو نئی جہت بخشی

جام جام

منسلکی دنیا سے ایک فتادور
شخصیت کا چونکا نے والا زندگی نامہ

جان بجا

نادانستگی میں وہ سرحد پار کر گیا، جہاں
ہر قدم پر ایک نیا سانحہ منتظر تھا

زندہ مقتول

حیرت میں ڈال دینے والی انتہائی دلچسپ سچ بیانی

سچی کہانی

بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، دلچسپ واقعات

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

”توفیق بھائی.....“ توفیق بھائی کا مقدمہ سننے کے
بعد انور بھائی نے کبھی انداز میں کہا۔ ”یہ مکار عورت
ہماری دو ٹوہری کو سمجھ چکی ہے لہذا اسے پہلی فرمت میں
لو کری سے نکال دو.....“

اگرچہ توفیق بھائی نے یہ کام فلاحی مقصد کو ذہن میں
رکھ کر اپنی شہرت اور نمود و نمائش کے لیے شروع کیا تھا لیکن
اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر ان پر جتن برسنے
لگے گا۔ پھر اس مشن میں انور بھائی بھی اس کے قدم سے
قدم اور کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھ رہا تھا اس لیے
انور بھائی کی تجویز بڑی آسانی سے توفیق بھائی کی سمجھ میں
آگئی تھی اور وہ دونوں اس دھندے میں پارٹنرز بن گئے
تھے۔ مطلب یہ کہ خدمتِ خلق اور خدمتِ وطن کو ایک
دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلنا چاہیے۔

”کیا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہو سکتا؟“ توفیق بھائی
نے فکر مندی سے کہا۔ ”یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاشی
بھی نہ ٹوٹے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

”ہاں، بہت اچھی طرح.....“ انور بھائی نے معنی
خیز انداز میں کہا۔ ”تم یہ چاہ رہے ہو کہ شہلا تمہارے آس
پاس موجود رہے اور تنظیم کے اکاؤنٹس والے معاملات کو
تمہی دوسرے طریقے سے سنبھال دیا جائے۔“

”ہاں بالکل.....“ توفیق بھائی نے جلدی سے کہا۔
”سرمد علی ہمارا اپنا بندہ ہے۔ ہم اس سے جیسا کہیں گے، وہ
انکار نہیں کرے گا۔“

”توفیق بھائی! یہ سرمد کا نہیں، شہلا کا معاملہ ہے۔“
انور بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ
بہت خطرناک ہو چکی ہے۔ وہ اکاؤنٹس اور آئی ٹی کی
باریکیوں سے واقف ہے اور اصولوں کی اس قدر پکی ہے
کہ اس نے اپنے بد عنوان اور رشوت خور کسٹمر انسپکٹر شوہر کو
بھی چھوڑ دیا تھا۔ شہلا کے بارے میں یہ سب تم ہی نے
مجھے بتایا تھا نا.....؟“

”ہاں.....“ توفیق بھائی نے اثبات میں جواب
دیا۔

”اس کے باوجود بھی تم اس چلتی پھرتی دفعہ تین سو دو
یعنی ایک لاکھ کو اس کے سر پر لٹکا کر رکھنا چاہتے ہو.....“
انور بھائی نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”اور وہ بھی اپنی ٹھکر کی
خاطر.....؟“

”انور بھائی! یہ ٹھیک ہے کہ میں شہلا سے دل لگا چکا
ہوں لیکن یہ معاملہ ٹھکر سے آگے کا ہے۔“ توفیق بھائی

کی خاطر ہمیں آخری آپشن پر جانا ہو گا۔“ انور بھائی نے سفاکی بھرے انداز میں کہا۔ ”تیس تیس ہزار میں کوئی بھی سڑک چھاپ غنڈا حسن و خوب صورتی کے اس دیوان کو قصہ پارینہ بنا دے گا۔۔۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بیجے کی بانسری!“

اپنے کہیں میں، ان مردودوں کی بحر مانہ گفتگو پر کان لگائے بیٹھی شہلا کے رگ و پے میں سر اسٹیک دوڑ گئی۔ ایک ایک کی اس کا بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اسے اپنے ارد گرد موت کے سائے منڈلاتے دکھائی دینے لگے تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں پیدا گیر، انسان نما شیطان ایک گھبر مٹے پر سر جوڑے ”انسان نیت“ کے آفس میں بیٹھے تھے۔ پچھلے چار روز سے شہلا کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کا فون بھی مسلسل بند آرہا تھا۔ گزشتہ میٹنگ میں دونوں پارٹنرز نے شہلا کو نوکری سے۔۔۔ بلکہ اس دنیا ہی سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن قبل اس کے کہ توفیق بھائی اسے فار کرنا، وہ اچانک مفقود النہر ہو گئی۔

”توفیق بھائی!“ انور بھائی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے اس کے گھر پر کسی کو بھیج کر صورت حال جاننے کی کوشش کی؟“

”میں خود گیا تھا اس کے گھر۔۔۔“ توفیق بھائی نے پڑمردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”شوہر سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی ایک آنٹی کے ساتھ رہ رہی تھی کیونکہ اس کے والدین عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور بھائی بہن کوئی تھا نہیں۔“

انور بھائی نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”شہلا کی آنٹی نے اس کی گمشدگی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”آنٹی کے مطابق شہلا دینی چلی گئی ہے۔“ توفیق بھائی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ اپنی موجودہ جاب سے خوش نہیں تھی اور پچھلے چھ ماہ سے وہ ملک سے باہر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے تمام ملکی ممالک کے مختلف اداروں میں اپنی سی دی دے رکھی تھی۔ بالآخر دینی کی ایک کہنی نے اسے بلالیا۔“ توفیق بھائی سانس درست کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر نجف سے لہجے میں کہا۔

”بس، اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کی آنٹی کو بہت کریدا ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔“ تم اس کی فیس و بلیو کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ ہمیں بڑے عطیات صرف اس لیے ملے ہیں کہ شہلا میرے پہلو میں کھڑی ہوتی تھی۔ اس کے ملکوتی حسن اور دل آویز گفتگو کے سامنے بڑے بڑے اداروں کے مالکان کے دل پھل جاتے ہیں۔ شہلا ہماری تنظیم کا اثاثہ ہے۔“

”اور اگر اس اثاثے نے کل کلاں تم سے یہ مطالبہ کر دیا کہ کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کو بلا کر ہمیں اپنی تنظیم کا آڈٹ کروانا چاہیے تو۔۔۔؟“ انور بھائی نے حکیمے لہجے میں کہا۔ شہلا کی تمام تر توجہ ان دو معاشرتی ناسوروں کی گفتگو پر لگی ہوئی تھی۔ قدرت نے ان کی غلیظ اصلیت کو شہلا پر پوری طرح واضح کر دیا تھا۔

”انور بھائی! ڈرانے والی باتیں تو نہ کرو۔۔۔“ توفیق بھائی نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

”میں تمہیں آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں توفیق بھائی!“ انور بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شہلا کی فیس و بلیو کی اب ہمیں ضرورت نہیں رہی کیونکہ ہمارا کام اچھے سے چل نکلا ہے اور جہاں تک تمہاری ٹھکر کا تعلق ہے تو فکر نہ کرو۔۔۔“ وہ لمبے بھر کو تھما پھر بڑے بے ہودہ انداز میں اضافہ کر دیا۔

”اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور بندوبست کر دوں گا اور وہ بھی اس سے کم تنخواہ میں۔ کیا سمجھے؟“

”سمجھ گیا انور بھائی!“ توفیق بھائی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اگر شہلا نے نوکری سے نکالے جانے کے بعد ہمارے اس گڑ بڑ کھوٹے کو میڈیا یا پولیس تک پہنچا دیا تو۔۔۔؟“

”ان امکانات کے بارے میں، میں نے تمہیں ابتداء ہی میں بتا دیا تھا توفیق بھائی!“ انور بھائی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور تمہارا جواب یہ تھا۔۔۔ ان بھوکے ننگے اور منہ کھلے ضرورت مند افراد کی روزی روٹی کا میں خیال رکھوں گا۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔ میں نے ایسا کہا تھا۔“ توفیق بھائی نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”اس وقت ہمارے پاس فنڈز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم، ہمارے خلاف آوازاٹھانے والے ہر شخص کا منہ لوٹوں سے بھر کر اسے خاموش کر سکتے ہیں لیکن شہلا کہنے اور چمکنے والی چیز نہیں ہے۔“

”تب تو اس چیز کی آواز کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے

سربہ کف

طاہر جاوید معمل

دکھ کی کہانی بڑی دردناک ہوتی ہے... جسے سننا آسان نہیں ہوتا... بعض اوقات سننے والے کے پاس اس کا اپنا ذہن ساتھ نہیں دیتا... مضبوط شانیں ڈھلک چکے ہوتے ہیں... اب تمہیں دیکھنا پڑتا ہے کہ ہمیں دکھ کیا ہے... (دید ترین مسافت کی ممکن کے باوجود حالات کا بوجھ کندھوں پر اٹھانے چپ چاپ چلا جاتا ہے... کبھی خود سے کبھی راستوں سے الجھتا ہے... مگر کسی آواز پر رکتا نہیں... اسے تلاشنا تھا... اپنا پرانا پیراں... دل گرفتہ تھا... طلسماتِ غم ہستی سے سانسیں رکتی تھیں مگر اس کی تلاش... شناخت کا رقص جنوں اسی طرح تازہ تھا... ہر لمحہ مری ساعت سے اسے گلے ملتا تھا... ظلم کی ڈور کہاں اور کسے وٹاؤں، ابھی معلوم نہ تھا... ایک دھن تھی جو سنائی نہیں دیتی تھی... یہ بھی اس کی لیے ہر آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری تھا...

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات سے لبریز ایک لہورنگ داستان

جمشید صاحب کے تین چہرے پر کچھ دیر گہری سنجیدگی چھائی رہی، تب انہوں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بات چیت شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ آپ لوگ ایک ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہو جو سرے سے ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ زرقاب خاں نے ذرا تنک کر کہا۔ ”آپ خود مستان خان اور اس کے ساتھیوں کو یہاں سے پکڑ کر لے گئے ہو۔“

”مگر اب وہ قانون کی گرفت میں ہیں۔“

زرقاب نے دانت میں ماچس کی تیلی سے خلال کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے تینوں بندے جس پارٹی کے پاس ہیں، ان کا بھی اپنا ایک قانون ہے۔ ان کے قانون کے مطابق بھی آپ کے تینوں بندوں کو سزائے موت ہو چکا ہے۔ اگر آنے والے بدھ تک مستان خان کو سزائے جیل سے رہا ہو کر یہاں امارے پاس نہیں پہنچا تو وہ لوگ ایک بندے کا سر کاٹ کر آپ کے پاس بھیج دے گا اور امارے خیال میں پہلا سر اُسی چھوٹے مولوی صیب کا ہوگا جس کا دونوں بھائی پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اگلا نمبر ایک ہفتے بعد اس لڑکے کا ہوگا جس کا نام عمران ہے۔“

زرقاب بے حد سنجیدہ لہجے میں بے حد سنگین اطلاع دے رہا تھا۔

زرقاب کی گفتگو سے بھی پتا چل رہا تھا کہ اب تک
مستان رب پیارے کے پاکستانی یا افغان ساتھیوں کو امید تھی
کہ شاید وہ بری ہو جائے گا یا بہت کم سزا ہوگی لیکن اب جبکہ
سزائے موت ہو گئی تھی، وہ اپنے ”پلان بی“ پر آگئے تھے۔
میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”زرقاب
خاں! جلد بازی کے فیصلے اچھے نہیں ہوتے۔ تم لوگوں کو
انتظار کرنا چاہیے۔ بجلی عدالت سے کیس ہائی کورٹ میں
جانے والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستان اور اس کے ساتھی کو ہائی
کورٹ سے ہی ریلیف مل جائے۔“

زرقاب نے طنزیہ انداز میں ہلکا سا ہتھکڑ لگایا۔
”ڈپٹی صیب! تم تو ایسے بات کر رہا ہے جیسے تمہارا تینوں
بندہ امارے پاس ہے اور امارے جلد بازی کر رہا ہے۔ یہ بدہ
کے روز سر کاٹنے والا فیصلہ امارا نہیں اُن لوگوں کا ہے اور امار
آپ کو برا دراندہ مشورہ دیتا ہے، آپ ان مغز پھرے لوگوں
سے ماتحت لگاؤ۔ وہ خدائی خوار وہی کرے گا جو کہتا
ہے۔“

اگلے تقریباً ایک گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ دونوں
طرف سے دیگر افراد کے علاوہ ہمارے اہم مددگار رفیع رند
نے بھی اس میں حصہ لیا۔ رفیع رند میں بچایت کے بچوں جیسی
صلاحیت تھی۔ وہ زرقاب خاں اور اس کے ساتھیوں کو کافی
حد تک نرم کرنے میں کامیاب رہا۔ زرقاب کے ایک ساتھی
دولت خاں نے وائریس سیٹ کے ذریعے کسی سے رابطہ کر
کے نئی ہدایات بھی لیں۔ گفتگو کے آخر میں طے ہوا کہ جلد
بازی سے پرہیز کیا جائے گا۔ اگلے کم از کم 20 دن تک کسی
یرغمالی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کوئٹہ میں انتظامیہ کے اعلیٰ
عہدیداروں سے بات کی جائے گی۔ مستان رب پیارے
کے قریب چالیس ساتھی جن کی ضمانتیں ہو چکی ہیں، ان پر کوئی
اور کیس نہیں بنے گا اور وہ رہا ہو جائیں گے۔ انوائکنڈ گان
کی طرف سے یہ رعایت دی جائے گی کہ کل یا پرسوں
وائریس یا موبائل فون کے ذریعے ہماری بات تینوں
یرغمالیوں یعنی عمران، وقاص اور انوش سے کروائی جائے
گی۔

ہمیں رات ان افغانیوں کے اسی خفیہ ڈیرے پر
گزارنا تھی۔ ان کا رویہ کافی دوستانہ ہو گیا تھا۔ یہاں ٹوش
پانچ خیمے تھے، رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہم اپنے خیموں
میں چلے گئے تو زرقاب اور اس کے ساتھی ادھ بجے الاؤ کے
قریب ہی رہے۔ رات خشک ہو گئی تھی۔ انہوں نے شراب
وغیرہ پی اور بروہی زبان کے گانے بھی سنتے رہے۔ مختصر

لباس والی دونوں لڑکیاں بھی وہیں پر موجود تھیں پھر زرقاب
خاں ان میں سے ایک لڑکی کو بغل میں دبا کر چھوٹے خیمے
میں چلا گیا۔

رات ٹھیک مگرری۔ سڑی قسم کے سادہ ناشتے کے
بعد بات چیت کا ایک اور دور اچھے ماحول میں ہوا۔ ہماری
گفتگو کے دوران میں زرقاب خاں کے پاس موجود جدید
وائریس سیٹ پر سنل آئے۔ وہ کال ملا ہوا ٹیلوں کی ادٹ
میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے معاون دولت خاں کو
بھی وہیں پر بلا لیا۔ ان دونوں کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد
ہوئی۔ میں نے زرقاب کا چہرہ دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں
جشید صاحب سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی اہم خبر آئی ہے ان
لوگوں کے لیے۔“

وہ کچھ قاصلے پر کھڑے آپس میں دھیمی آواز میں
باتیں کر رہے تھے۔ تب وہ چاروں، پانچوں پھر ہمارے
پاس آن بیٹھے۔ دولت خاں ہمارے اس سب انسپکٹر الوار
کے قریب ہی بیٹھا تھا جس کے پاس ہماری اگلی شٹ گن
تھی۔ دولت خاں نے یونہی عام سے انداز میں شٹ گن
انوار کے ہاتھ سے لے لی، جیسے اسے دیکھنا چاہ رہا ہو۔ تب
شٹ گن انوار کو واپس کرنے کے بجائے اس نے اپنے
ایک ساتھی کو تھما دی۔ یکدم ہمیں اندازہ ہوا کہ ان سب کے
روپیے کچھ بدلے ہوئے ہیں۔

”خیریت تو ہے؟“ جشید صاحب نے زرقاب سے
پوچھا۔

”اماری طرف تو سب خیریت ہے۔ آپ کا خیریت
ٹھیک سے مالم نہیں۔“

میں نے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ کم از کم تین
آٹومیک رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے زرقاب کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ہم سب کی طرح ہمارا مددگار رفیع رند
بھی مشدد نظر آتا تھا۔

زرقاب طنزیہ انداز میں بولا۔ ”تم لوگ اپنے خیموں
بندوں سے بات وغیرہ کرنا چاہتا تھا نا۔ ام نے سوچا ان کا
آواز سن کر شاید تمہارا سلی نہ ہو۔ تمہیں ان سے ملائی دیا
جائے۔“

یہ حیرت کا دوسرا شدید دھچکا تھا۔ زرقاب کی معنی خیز
بات سمجھ میں آرہی تھی۔ ہمیں ہمارے ساتھیوں سے ملانے کا
مطلب یہ تھا کہ اب ہم بھی ان افغانیوں کے جیسے جے جا میں
ہیں۔

سفید کپڑی کو شہادت کی انگلی سے کھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ یقیناً غفلت ہوئی ہے جیل حکام سے۔ اب ایسا بھی نہیں کہ مجرموں کو عدالت لے جایا جا رہا ہو اور راستے میں گڑبڑ ہوئی ہو۔ ظاہر ہے رات کا وقت تھا۔“

”سرا ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“ میں نے کہا۔ ”چلیں وہ مستان اور اس کے دونوں ساتھی نکل بھی گئے ہیں تو باقی اور قریباً ساٹھ رب پیارے بھی تو جیل میں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”میرے خیال میں اُن کی بہت زیادہ پروا نہیں ہے ان خبیثوں کو۔ ویسے بھی اب ہم ان کی کسٹڈی میں ہیں۔ یہ سودے بازی کر سکتے ہیں۔“

دوپہر کو ہمیں پانی اور مناسب کھانا خیمے کے اندر ہی پہنچایا گیا۔ خیمے کا پہرا مزید سخت کر دیا گیا تھا۔ ہمیں اب امید بلوچستان پولیس کے ان جوانوں سے ہی تھی جو ٹریک سسٹم کے ذریعے یقیناً ہماری لوکیشن سے آگاہ تھے۔ وقت رخصت ان سے جو طے ہوا تھا وہ یہی تھا کہ ہم صبح دس بجے تک بات چیت کے بعد واپس پلٹ آئیں گے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے ہم سپر تین بجے تک بھی اسی لوکیشن پر رہیں تو پھر وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جب وہ موقع نکل کے مطابق ہماری مدد کو پہنچیں۔ (اس پارٹی کے پاس لمبی رینج کے وائرلیس بھی موجود تھے)

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ڈیڑھ بج گیا تھا۔ اس دوران میں ہماری خواہش کے باوجود زرقاب خاں یا دولت خاں نے ایک بار بھی ہمیں اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ ”کچھ اچھلی محسوس ہو رہی ہے۔“ سب انسپکٹر انوار مشکوری نے خیمے کی جھری میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی دیکھا، اونٹوں کو قریب لایا جا رہا تھا۔ ہمارے گھوڑے بھی کھولے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹے خیمے کی مٹا میں ڈھیلی کر دی گئی تھی۔

”یہ لوگ کوچ تو نہیں کر رہے؟“ میں نے کہا۔ جشید صاحب کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے گہرے ہو گئے۔ دو چار منٹ میں صورت حال واضح ہو گئی۔ زرقاب خاں سگریٹ پھونکتا ہوا ہمارے خیمے کے سامنے آیا۔ ”امارا خیال ہے کافی آرام کر لیا تم لوگوں نے۔ اب چلیں تمہیں تمہارے دوستوں سے ملاتے ہیں۔“ بات کرتے ہوئے اس نے اپنے سر سے جس جانب اشارہ کیا،

وہاں بارڈر تھا۔

جشید صاحب کڑے لہجے میں بولے۔ ”دیکھو

جشید صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تو ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ جن تین رائفل برداروں نے ہمیں گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا، وہ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ گئے تاکہ ہم کوئی رد عمل نہ دکھاسکیں۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ جشید صاحب نے خیمے لہجے میں پوچھا۔

زرقاب نے اپنی اونچی ناک پر نیم سیاہ شیشوں والی عینک درست کی اور چھوٹی بوتل سے شراب کے دو گھونٹ بھر کر بولا۔ ”خوام اس میں کیا کر سکتا ہے۔ یہ تو قدرت کا فیصلہ ہے۔ جب حالات بدلتا ہے تو پھر سب شرائط مراکز بھی بدل جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور آپ کا قسمت ہے کہ کل رات وہاں کوئٹہ میں حالات بدل گیا ہے۔“ زرقاب کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

”نکل کر بات کرو زرقاب۔“ میں نے کہا۔

”زرقاب نے مجھے خوشخوار نظروں سے دیکھنے کے بعد جشید صاحب سے بات جاری رکھی۔ ”تم لوگ بہت نخرے میں تھا، مستان رب پیار کی رہائی کا بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ مستان رب پیارے کا بہت سا عقیدت مند ہے اس علاقے میں۔ ان سب کی بددعاؤں نے تمہارا بیڑا غرق فرمایا ہے۔“

زرقاب خاں کے ساتھی بننے لگے۔ زرقاب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں کے لیے خوش خبری ہے کہ کل رات امارا مستان اور اس کا دو ساتھی جیل توڑ کر رہا ہو گیا ہے۔“

یہ واقعی حیران کن اور تشویش ناک خبر تھی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ واقعی کوئٹہ میں یہ انہونی ہو چکی ہے۔ اب یہ افغانی جارحانہ طرز عمل اپنا چکے ہیں اور اب ان کے نزدیک ہماری حیثیت بھی یرغالیوں کی ہے۔

ہمیں رائفلوں کے نشانے پر رکھ کر ایک بڑے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ خیمہ ہر قسم کے ساز و سامان سے خالی تھا۔ شاہ رخ اور اس کی ”نوجوان دادی“ نے جس مددگار رنج رند کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اس خالی خیمے میں آیا تھا اور کافی حیران تھا۔ بہر حال کچھ دیر بعد اسے ہم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ خیمے کے سامنے دو لمبے ترنگے افغانی بھاری بھر کم آٹو میک رائفل اٹھائے بالکل چوکس کھڑے تھے۔

جشید صاحب، میں اور ہمارے دونوں ساتھی خیمے کے اندر ایک چٹائی پر بیٹھے تھے۔ جشید صاحب نے اپنی

زرقاب! تم لوگ شدید قسم کی وعدہ خلافی بلکہ دغا بازی کر رہے ہو۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“
 ”اوائے! انجام تو تم نےستان کا بھی بُرا کرنے کا پکا پکا پروگرام بنایا ہوا تھا، لیکن دیکھو وہ اب آزاد ہے۔ ان باتوں کو چھوڑو، آگے کا سوچو، چلو شاپاش اٹھ جاؤ۔“

صورت حال نازک ہو گئی تھی۔ اگر اپنے بددگاروں کے حرکت میں آنے سے پہلے ہم افغان ایریا میں داخل ہو جاتے یا کسی اور دشوار جگہ پر پہنچا دیے جاتے تو مشکلات میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا تھا۔ ہم چاروں کھڑے ہو گئے۔ (ہمارا ڈرائیور پیچھے چھوڑی ہوئی اسٹیشن وین میں ہی رہ گیا تھا) ہمارے ہاتھ پشت پر رسیوں سے باندھنے کے لیے ایک بندہ اندر داخل ہوا۔ دو افغانی رائفلیں سونے، انگلیاں ٹریگرز پر رکھے ریڈارٹ کھڑے تھے۔ یوں تو ہم چاروں نشانے پر تھے۔ تاہم ہمارے دونوں جوان ساتھیوں پر رائفل برداروں کی خصوصی توجہ تھی۔ انہیں معلوم نہیں تھا انہیں زیادہ خطرہ جواں عمر والوں سے نہیں پہنچے عمر والے سے ہے۔ میں ایک خاص لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے جونہی دیکھا کہ ہاتھ باندھنے والا افغانی ایسی پوزیشن میں ہے کہ وہ رائفل برداروں اور جشید صاحب کے درمیان آ گیا ہے۔ اور اگر فائرنگ ہوئی بھی تو کم از کم جشید صاحب تو محفوظ رہیں گے، یا ایک میں نے سر جھکا کر دونوں رائفل برداروں پر چھلانگ لگا دی۔ میرے دونوں بازو پوری لینتھ کے مطابق دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ میں دونوں رائفل برداروں کو لیتا ہوا پتھری کی سطح پر آ گیا۔ ایک رائفل سے برست لکھا جو آسمان کی طرف رخ کر گیا۔ چھوٹے خیموں کے سامنے کھڑی دو لڑکیاں خوف سے چلا گئیں۔ ایک دم ہی تھلکے سا بچ گیا تھا۔ بلوچی اہلکار انوار نے نہایت دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے نیچے دبے ہوئے ایک افغانی سے رائفل چھین لی اور اس کی پہلی دو گولیاں اس شخص کے سینے پر ماریں جو مجھ پر رائفل سونت رہا تھا۔

اس دوران میں نے بھی اپنے نیچے دبے ایک شخص سے رائفل چھین لی تھی۔ اس رائفل پر باقاعدہ سنگین لگی تھی۔ یہ سنگین میں نے اس شخص کی شہ رگ میں گھونپ دی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ اپنی بیلٹ میں سے خنجر کھینچ رہا ہے، میں مہلت دیتا تو وہ یہ خنجر میرے پہلو میں اتار دیتا۔ یہی وقت تھا جب میں نے زرقاب کو دیکھا، وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ سیون ایم ایم رائفل کا رخ ہماری طرف کر رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور جشید صاحب کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ایک

بڑے پتھر کی اوٹ میں گرا۔ زرقاب نے ایک طویل مہلک برست مارا۔ پتھر کی اوٹ نے ہمیں محفوظ رکھا البتہ چند گولیاں پیچھے کھڑے ان گھوڑوں کی طرف گئیں جن پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ ایک گھوڑا پتھر کی زمین پر گر کر ترے لگا۔ انوار نے اپنی رائفل کا رخ زرقاب کی طرف کیا مگر اس سے پہلے ہی زرقاب نے کئی گولیاں چلائیں۔ سب انسپکٹر انوار تو بال بال بجا البتہ اس کے عقب میں موجود رنج رند کے سر میں ایک گولی لگی اور وہ پتھر کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

اسی اثنا میں شدید فائرنگ سے گھبرا کر دو تازی گھوڑوں نے رسی تڑالی اور سر پٹ بھاگے۔ ایک خیمے کو بڑی طرح کھینچتے اور روندتے ہوئے وہ اوپر جاتے راستے کی طرف گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ زرقاب ایک پتھر کی اوٹ سے لپک کر نکلا اور بھاگتے گھوڑے پر جست لگا کر سوار ہو گیا۔ میں نے دو تین فار کیے لیکن وہ رائگاں گئے۔ ہم چاروں جشید صاحب سمیت محفوظ رہے تھے مگر ہمارے ساتھ آنے والا جواں سال بددگار رنج رند ایک لاش کی صورت ڈھلوان پر پڑا تھا۔ افغانی حملہ آوروں میں سے پانچ افراد وہیں پر کھیت رہے تھے، زرقاب خاں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ زرقاب کا قریبی ساتھی دولت خاں بھی غائب ہے۔ یقیناً اس نے بھی پانا پلٹتے دیکھ کر ٹیلوں میں راہ فرار اختیار کی تھی۔

اس خونی جھڑپ میں ایک اور ٹریجڈی بھی ہوئی تھی۔ جو دو گھوڑے ڈر کر سر پٹ بھاگے انہوں نے ایک خیمہ روندنا تھا۔ اسی خیمے میں ایک تاجک لڑکی بھی سگری سہمی بیٹھی تھی۔ وہ بھی خیمے کے ساتھ ہی روندی گئی تھی۔ گھوڑے کا وزن عموماً 600 کلو گرام کے قریب ہوتا ہے۔ بھاگتے گھوڑے کی زد وزن سے بڑھ کر خطرناک ہوتی ہے۔ خوش شکل لڑکی کے رخسار اور کپڑی پر گھوڑے کے ٹم کا گہرا نشان تھا، اس کی کھوپڑی ایک طرف سے ہچکی نظر آتی تھی اور پسلیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ دوسری لڑکی اس سے لپٹ کر آہ و فغاں کرنے لگی۔

ہم نے اس شوٹ آؤٹ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ زرقاب اور دولت خاں وغیرہ کو بھی مار بھگایا تھا مگر ہمارا زیادہ دیر یہاں رکنہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ یہ جگہ افغان بارڈر کے بہت نزدیک تھی۔ وہ لوگ کسی بھی وقت پلٹ سکتے تھے۔ زرقاب خاں کے خیمے سے ولایتی شراب کی بوتلیں، ہنٹر بیف، دو رائفلیں اور ایک مزید وائرلیس سیٹ برآمد

کس طرح ہو دلربا..... اور کل رات تم جس طرح انتہائی بے ہودہ لباس میں چکراتی پھر رہی تھیں، وہ کیا تھا؟“
وہ تاجستانی لہجے میں شکستہ انگلیں بول رہی تھی، روتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”آپ پولیس والے ہو، آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ یہ بد معاش لوگ عورت ذات کو کس کس طرح مجبور کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں سہیلیاں ہی نہیں، ہمارے گھر دوں کی دیوار بھی ٹٹی ہوئی ہے۔ ہم ”دو شنبے“ کے ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ میرے والد ایک اخبار میں کام کرتے ہیں۔ وہ منشیات فروشوں کے خلاف لکھتے تھے، وہیں سے زرقاب وغیرہ ان کے دشمن ہو گئے۔ بات اتنی بڑھی کہ ایک روز مجھے اور فرشتہ کو کالج کے راستے سے اغوا کر لیا گیا.....“

وہ ایک بار پھر چادر میں چہرہ چھپا کر سکیوں سے رونے لگی۔ وہ کافی کمزور نظر آتی تھی، رنگ زرد تھا، جیسے بیمار بھی رہی ہو۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اور فرشتہ قریباً ایک سال پہلے ان لوگوں کے ہتھے چرمی تھیں۔ وہ انہیں پتا نہیں کہاں کہاں لیے پھرتے رہے ہیں۔ دلربا نے دو دفعہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی، پھر اس نے اور فرشتہ نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ زرقاب اور دولت خاں وغیرہ ان دونوں کو اپنے مہمانوں کے سامنے بھی پیش کرتے تھے یا ان لوگوں کے سامنے جن سے انہیں کوئی فائدہ حاصل کرنا ہوتا تھا۔

دلربا بولی۔ ”پرسوں رات زرقاب نے ہم دونوں سے کہا تھا کہ کچھ پولیس والے یہاں آ رہے ہیں۔ کوئی غرہ دکھائے بغیر ان کا دل خوش کرنا ہے۔“

میں اور جشید صاحب اریکٹڈیشنڈ اسٹیشن وین میں دیر تک دلربا نام کی اس ڈبلیو پٹی لڑکی کی ڈھارس بندھاتے رہے اور اس کے حالات جانتے رہے۔ اس کی گفتگو سے انکشاف ہوا کہ پچھلی سردیوں میں وہ حاملہ ہو گئی تھی۔ قدحار کے قریب کسی ”دیہاتی دایہ“ سے اس کا ابارشن کرایا گیا جس کے بعد وہ مرتے مرتے بچی۔ وہ اب بھی پوری طرح صحت مند نہیں تھی، اس کے باوجود زرقاب اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔

زرقاب کا نام لیتے ہوئے تاجک دلربا کے لہجے میں دنیا جہان کی نفرت اور کراہت سمٹ آتی تھی۔ اپنی سبیلی فرشتہ کی ناگہانی موت دلربا کی نفرت کو اور بڑھا دے رہی تھی۔ جب جشید صاحب نے اس سے پوچھا کہ وہ ان تین بندوں کے بارے میں کیا جانتی ہے جو پاکستانی ہیں اور جن

ہوا۔ ہمارے تین گھوڑے کم ہونچکے تھے۔ تاہم چار اونٹ یہاں موجود تھے۔ ہم نے برآمد شدہ اسلحہ اور دیگر سامان ایک اونٹ پر بار کیا۔ رنج رند اور تاجک لڑکی ”فرشتہ“ کی لاشیں ایک اونٹ پر باندھیں۔ افغانی گینگ کے افراد کی لاشوں کو تھسٹ کر ایک ٹرے ہوئے خیمے کے اندر لپیٹ دیا اور جگت میں والپس روانہ ہو گئے۔ تب تک سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ ریگستانی سورج سارا دن آگ برسانے کے بعد مغرب کی طرف جھکا چلا جا رہا تھا۔ فضا میں گدھ منڈلا رہے تھے۔

بارڈر سے محفوظ فاصلے پر پہنچ کر قدرے اطمینان محسوس ہونے لگا۔ زندگی کتنی ناپائیدار چیز ہے۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ کل اسی وقت ہمارا مددگار رنج رند ہمارے ساتھ بارڈر کی طرف جا رہا تھا، فیس بول رہا تھا، اب اونٹ کی پشت پر لاش کی صورت بڑا تھا۔ تاجک لڑکی کا نام ”دلربا“ تھا۔ وہ گھوڑے پر تھی اور مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے ناکافی لباس کو چھپانے کے لیے جشید صاحب نے اسے ایک چادر فراہم کر دی تھی۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہے، انگلیں بھی بول سکتی ہے۔

رات دس بجے کے لگ بھگ ہم قریباً 25 کلومیٹر طے کر کے اپنی چھوڑی ہوئی اسٹیشن وین تک پہنچ گئے۔ دن بھر کی بے پناہ تپش اب کافی کم ہو چکی تھی۔ جو پولیس پارٹی ہمیں کوردے رہی تھی اب اس سے رابطہ ہو چکا تھا۔ وہ ہم سے کم و بیش چار کلومیٹر کی دوری پر رک گئے تھے۔

جشید صاحب غم زدہ تاجک لڑکی ”دلربا“ کو لے کر اسٹیشن وین میں بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کھانے کے لیے کچھ بسکٹس اور دودھ وغیرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی سے گزارا کیا۔ تاجک دلربا کچھ بھی کھانے سے انکار کر رہی تھی۔ جشید صاحب نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ”بیٹی! تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔ شکر کرو کہ تم موت کے گھیرے سے نکل آئی ہو۔“

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”انہوں نے میری سب سے پیاری دوست کو مار دیا۔ انہوں نے فرشتہ کو مار دیا۔ میں بھی مرجاتی تو اچھا تھا۔“

معلوم ہوا کہ فرشتہ اس دوسری لڑکی کا نام تھا جس کی کھلی ہوئی لاش اونٹ کی پشت پر پڑی تھی۔ کچھ دیر رونے کے بعد دلربا کے آنسو کچھ ختم گئے۔

میں نے پوچھا۔ ”تم ان جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ

کو مبینہ طور پر زرقاب کے کچھ ہم پیشہ لوگوں نے یرغمال بنا رکھا ہے؟

دلربا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا اور گزر گیا۔ کچھ دیر گم سم رہنے کے بعد بولی۔ ”نہیں سر! میں اس بارے میں نہیں جانتی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”لیکن میں جانتا ہوں کہ تم جانتی ہو اور بتا اس لیے نہیں رہیں کہ ڈر رہی ہو۔“

”میں نہیں جانتی جی۔“ اس نے نہایت اضطراب سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ تمہاری زندگی برباد کرنے والے اور تمہاری دوست کی موت کا سبب بننے والے اپنے کیسے کی سزا پائیں؟“

جشید صاحب نے پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”دلربا! سب پولیس والے ایک سے نہیں ہوتے۔ تمہیں بیٹی کہا ہے تو تمہاری حفاظت بھی بیٹیوں کی طرح کریں گے۔ کوئی آج نہیں آنے دیں گے تم پر یا تمہارے کسی پیارے پر۔“

وہ کافی دیر تک تذبذب میں نظر آئی۔ دو باتیں ہمارے حق میں جاتی تھیں۔ ایک تو فرشتہ کی موت کے بعد وہ شدید غم و غصے میں تھی۔ دوسرے ہم نے چار پانچ گھنٹے پہلے زرقاب اور اس کے ساتھیوں کو جس طرح ہزیمت سے دوچار کیا تھا، وہ اس سے متاثر تھی بلکہ شدید متاثر تھی۔ یکا یک اس نے چند سسکیاں بھریں اور اپنی زبان کا تالا کھول دیا۔ اس نے جو کہا انکشاف انگیز تھا، بولی۔ ”سر آپ کے تینوں بندے زرقاب خاں کے پاس نہیں، اور نہ ہی اس کے کسی جاننے والے کے پاس ہیں۔“

”تو..... کہاں ہیں وہ؟“ جشید صاحب نے پوچھا۔ ”وہ پاکستان میں ہی ہیں۔ آپ میری حفاظت کا ذمہ لے رہے ہیں اس لیے آپ کو بتا رہی ہوں۔ وہ انہی لوگوں کے پاس ہیں جن کے پاس آپ کل دوپہر تک مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی شاہ رخ یا شاہ خاں نام کا لوجوان ہے اور اس کے گھر والے ہیں جنہوں نے ان تینوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ اب تک آپ نے جو کچھ سنا سمجھا ہے، وہ فراڈ ہے، دھوکا ہے۔“

میں نے جشید صاحب کا تین کتابی چہرہ دیکھا، وہاں حیرت آمیز سنسنی کی لہر تھی۔ میری اپنی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ پرسوں رات شاہ رخ کی لوجوان ”دادی“ کو دیکھ کر

اور سن کر ایک موہوم سا شک تو پیدا ہوا تھا مگر اس شک کا رخ اس طرح کی صورت حال کی طرف تو ہرگز نہیں تھا۔

میری دھڑکن سر پٹ ہو گئی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ پرسوں رات کو ہم جس جگہ پر تکلف ڈنکر کر رہے تھے، عمران جو نیئر، وقاص اور انوش جٹ بھی وہاں کہیں اس پاس ہی پائے جاتے تھے۔

”یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہوا دلربا؟“ جشید صاحب نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

وہ ذرا توقف کے بعد بیٹھے لہجے میں بولی۔ ”کسی وقت میری کمر میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں زرقاب اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے مجھے بزرگ کی دو گولیاں کھلا دیتا ہے۔ کوئی تیز نشہ آور گولیاں ہیں، درد بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے اور سر کو نیند سی چڑھ جاتی ہے۔ اس رات میں دوپہر تک بڑی سوئی رہتی ہوں۔ پچھلے ہفتے بھی اس نے رات کو مجھے وہ گولیاں دیں۔ میرا دل بہت متلا رہا تھا۔ میں نے گولیاں کھانے کے بجائے گدیلے کے نیچے چھپا دیں۔“

وہ اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھنے کے بعد دوبارہ بولی۔ ”آدھی رات کے بعد زرقاب نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں سو رہی ہوں اور مجھے ارد گرد کی بالکل کوئی خبر نہیں، وہ خیمے سے باہر کھڑا ہو کر دولت خاں سے باتیں کرتے لگا۔ دونوں فٹے میں تھے، آواز بھی کچھ اونچی تھی..... میں نے وہ سب سن لیا، جو آپ کو بتایا ہے۔“

تاہم دلربا کی یہ گفتگو ہمارے لیے بہت انکشاف انگیز تھی۔ کئی دیگر باتوں کے علاوہ یہ بتا بھی چلا کہ سردار گزین کے پوتے شاہ رخ کو عام طور پر شاہ خاں کو کہہ کر پکارا جاتا ہے اور وہ ایک بڑا شکاری بھی ہے۔ ان کی حویلی کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ انگریزوں کے دور کی تعمیر کردہ ہے اور اسے ”سردار حویلی“ بھی کہا جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد میں اور جشید صاحب دین سے باہر نکل آئے۔ صورت حال مزید سنگین ہو رہی تھی۔ اس کا واضح مطلب تو یہ تھا کہ سردار حویلی میں شاہ رخ اور اس کی ”دادی“ کی ساری مہمان نوازی اور تمام معاہمتی گفتگو صرف ایک ڈھونگ تھی۔ تعلیمی ادارے کے لیے اور اس ادارے کے حامیوں کی دلجوئی کے لیے یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے تھے، فقط چال بازی تھی۔

اس ساری صورت حال میں ہمارے لیے جو سب سے اطمینان بخش بات تھی وہ یہی تھی کہ عمران زندہ سلامت

مستان رب پیارے کو چھڑوانا چاہتے تھے مگر اسی دوران میں کوئٹہ میں ایک انہونی ہو گئی۔
 ”انہونی؟“ شاہ خالو نے پھر اداکاری کی کوشش کی۔
 ”غالباً مستان اور اس کا ایک ساتھی سینٹرل جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ جمشید صاحب نے جواب دیا۔

یہ گفتگو دو تین منٹ مزید جاری رہی، پھر جمشید صاحب نے شاہ خالو کو بتایا کہ ہم اپنی اسٹیشن دین تک آپکے ہیں اور اب واپس جبرہ نوشیر میں ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

شاہ خالو ہماری ”مدد“ کے لیے فوری طور پر کچھ لوگ بھیجنے کی بات کر رہا تھا۔ جمشید صاحب نے کہا۔ ”ہم تو تاجک لڑکی اور رنج کی لاش دین میں لے کر واپس روانہ ہو رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے کارندے یہاں پہنچ کر جانور اور سامان وغیرہ اپنی حفاظت میں لے سکتے ہیں۔“

☆☆☆

اب ہم ایک بار پھر سردار حویلی میں تھے۔ دونوں لاشیں شاہ خالو اور اس کے ایک مربی اکبر خاں کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ وہ لوگ باؤڈا خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جمشید صاحب نے اور میں نے اسے بڑی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ جو کچھ اس نے ہمیں بتایا ہے، کسی بھی صورت وہ کسی اور سے اس کا ذکر نہیں کرے گی، ورنہ اس کی اپنی جان شدید خطرے میں ہوگی۔

رات آخری پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی۔ صبح میں جاگا تو حویلی میں ذرا سو گواہی سی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ کل جاں بحق ہونے والا رنج رند موجودہ سردارنی گوحار زینت کا دور پار کا رشتے دار بھی تھا۔ اسے رات ہی دہا دیا گیا تھا۔ تاجک لڑکی فرشتہ کو بھی امانتا سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔ شاہ خالو جس کو داکاں ماں کہتا تھا عام لوگ اسے بڑے احترام سے گوحارجی یا گوحار زینت کہہ کر بلاتے تھے۔

سورج کا آٹھ گولا اس صحرائی بستی کے آفتی پر دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا۔ میں جمشید صاحب کے کمرے کی طرف گیا، وہ ابھی تک انڈولر کی ہوا میں سو رہے تھے۔ حویلی میں جزیئر کے ذریعے بجلی فراہم ہوتی تھی۔ رات کی ماراماری میں میری زخمی ٹانگ جو اب تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی، پھر تھوڑا سا درد محسوس کر رہی تھی۔ میں ذرا لنگڑاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا تو ایک آواز نے مجھے روک لیا۔ ”سنو بھائی..... بات سنو.....“

وہیں جبرہ نوشیر گوفھ میں کہیں موجود ہے۔ اب ہمیں سوچنا یہ تھا کہ کرنا کیا ہے؟ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم ان خطرناک لوگوں سے فوری ٹھکر لینے کے بجائے فوراً چافٹی یا دھک سے ٹکک طلب کریں اور پوری تیاری کے ساتھ ان لوگوں کا گھیراؤ کیا جائے۔ ایسی صورت میں اس امر کا خدشہ بدرجہ اتم موجود تھا کہ یرغالیوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اس تاجک لڑکی کے ذریعے جو کچھ ہم جان چکے تھے، فی الحال اپنے سینے میں رکھیں اور واپس گوفھ میں پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لیں۔

ابھی میں جمشید صاحب اور انوار وغیرہ صلاح مشورہ کر رہی رہے تھے کہ جمشید صاحب کے فون پر شاہ رخ خاں یعنی شاہ خالو کی کال آگئی۔ جمشید صاحب نے اسپیکر آن کر دیا۔ شاہ خالو نے قدرے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”جی ایس پی صاحب! بہت دیر لگادی آپ نے۔ خیر خیریت تو ہے نا؟“

جمشید صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”نہیں شاہ خالو! خیریت نہیں ہے۔ سمجھو کہ بہت کڑ بڑ لگ گئی ہے۔“

”میں..... سمجھا..... نہیں؟“

”ان لوگوں نے دھوکا دیا ہے۔ ہمیں بھی جس بے جا میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی ہے۔ ان کے پانچ چھ لوگ جان سے گئے ہیں۔ زرقاب اور دولت خاں وغیرہ بھاگ گئے ہیں۔“

”ادھ ماکی کاڈ..... یہ کیسے ہو گیا؟“ شاہ خالو نے سخت حیرانی اور تشویش والا لہجہ بنایا۔

جمشید صاحب نے کہا۔ ”ایک افسوسناک اطلاع بھی ہے شاہ خالو۔ اس فائرنگ میں رنج رند کی جان بھی گئی ہے۔ ہم اس کی باڈی کو اپنے ساتھ ہی واپس لا رہے ہیں۔ باقی لاشیں ہم نے وہیں موقع پر چھوڑ دی ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنا کچھ ہو گیا۔“ شاہ خالو کی آواز اُبھری۔

میں اندر سے ترخ کر رہ گیا۔ وہ خبیث یقیناً اداکاری کی کوشش فرما رہا تھا۔ ایک لمبے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”مگر جمشید صاحب! ان لوگوں کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی فیئرڈیل کرنا یا کر دانا چاہتے ہیں۔“

”بد ذات، کینے لوگوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔“ جمشید صاحب نے زہر خند انداز میں کہا۔ ”زرقاب کی باتوں سے پتا چلا ہے کہ وہ ہمارے ساتھیوں کے بدلے

مڑ کر دیکھا تو ایک کمرے میں وہی پہلوان نما شخص بیٹھا نظر آیا جسے میں نے پہلے بھی ایک دودھ یہاں دیکھا تھا۔ یہ اسی دراز قد شاہ زیب کا ساگھی تھا جسے شاہ خانو کا دوست بتایا جاتا تھا۔

میں پہلوان نما کے قریب پہنچا تو وہ میری ٹانگ کو دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”برادر! تمہاری ٹانگ کی چوٹ پرانی لگت ہے۔ ذرا پتلون کا پانچہ تھوڑا سا اوپر اٹھاؤ۔“

انداز ایسا مصومانہ اور ہمدردانہ تھا کہ میں نے پتلون ذرا اوپر اٹھائی۔ پہلوان نے کسی ماہر کی طرح جائزہ لے کر کہا۔ ”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چوٹ گرنے سے آئی ہے اور اب ٹھیک ہے۔ مگر کل رات تم لوگوں نے ان بد معاشوں کے ساتھ بارڈر کے علاقے میں جو مارا ماری کی ہے، اس کی وجہ سے تمہارا اندر کا پٹھا پھر دکھنے لگا ہے۔“

”یہ اندر کا پٹھا کیا ہوتا ہے پہلوان جی؟“
”سمجھو یہ اٹو کا پٹھا ہوتا ہے۔ اس کا درد آہستہ آہستہ ہی جاوت ہے۔ تم شام کو میرے پاس آنا۔ میں تمہیں تھوڑا سا ساج کروں گا۔ تمہیں فائدہ ہو دے گا۔“
”آپ مالش وغیرہ کرتے ہیں؟“

پہلوان کا منہ ایسا ہو گیا جیسے شہ کے کڑوے پتے چبا لیے ہوں۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہے گا مگر پھر خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”کچ کھوت ہیں کہ پٹیل کے گھونسلے میں اور ک کا سودا کہاں۔ بھائی میرے، میں باقاعدہ علاج کرت ہوں بڑی جوڑ کا۔ جانا پہچانا نام ہے میرا۔ پہلوان حشمت راہی۔“

”آپ لباس سے پنجاب کے رہنے والے لگتے ہیں۔ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟“

”کہیں آنے کے لیے کوئی سلسلہ ضروری ہوتا ہے؟“ پہلوان نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ پھر جواب نہ پا کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”پرسوں شاہ زیب سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی نا۔ وہ اپنا جگر ہے۔ بہت بڑا فائٹر ہے وہ۔ پاکستان سے باہر بھی بہت بڑا نام ہے اس کا۔ اس کی ساری شہرت میں قریباً قریب انوے فیصد حصہ میرا ہی ہے۔ یوں سمجھو کہ سارے داؤ بیچ میں نے سکھائے ہیں اسے۔“

”وہ پہلوانی کرتا ہے؟“
”اس کو نئی طرح کی پہلوانی کہوت ہیں یار۔ شاید تم نے بھی سنا ہو۔ مارشل آرٹ۔ اور بھی کئی نام ہیں اس

نئی طرح کی پہلوانی کے۔ مگر اصل داؤ بیچ تو ہماری صدیوں پرانی پہلوانی سے ہی نکلے ہوئے ہیں نا۔“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ بولا۔ ”ویسے تم لوگوں نے کل غلطی کی۔۔۔۔۔ بلکہ میں تو کہوت ہوں غلطایا کیا۔ اگر شاہ زیب بھی تمہارے ساتھ ہوتا تو شاید وہ دو جانوں کا نقصان نہ ہوتا جو کل بارڈر کے پاس ہوا۔ بلکہ میں تو کہوت ہوں کہ اس وقت وہ زر قاب خاں وغیرہ بھی رسیوں سے بندھے ہوئے یہاں موجود ہوتے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو پہلوان جی۔ آگے بھی موقع آئیں گے پھر آزمائیں گے آپ کے پٹھے کو۔“

وہ ذرا گھبرایا۔ ”دوسروں کے سامنے اُسے میرا پٹھانا کہنا۔ وہ ناراض ہو جاوت ہے۔ وہ بس میرا چھوٹا بھائی کہلاتا پسند کرت ہے۔“

مجھے کھانے کی خوشبو تو آرہی تھی مگر کھانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر پتا چلا کہ کافی سارا کھانا پہلوان جی نے الماری میں رکھا ہوا ہے۔ فرمانے لگے۔ ”یہ رنجی رند جو کل مارا گیا ہے، یہاں کی سردارنی کو حارزینت کا رشتے دار تھا۔ آج پوری حویلی میں بس چائے رس کا ناشتا ہی ملے گا۔ میں نے بڑی باورچن سے کہہ کر ناشتا بنوایا ہے، کیونکہ میں تو ناشتا ہی کرت ہوں یا رات کا ہلکا سا کھانا کھات ہوں۔“

پہلوان جی نے الماری کھولی۔ ویسی کچی میں تھے تھیں تل دار پر اٹھے تھے۔ کم و بیش چار انڈوں کا آلیٹ پیاز ٹماٹر وغیرہ ڈال کر بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سوڑے کا اجارہ، نہاری کا بڑا پیالہ، دہی کی گاڑھی لسی کا لیالب بھرا جگ، رنگوں والے کچے اور سات آٹھ باقر خاناں۔

میں سمجھ گیا کہ پہلوان جی ان لوگوں میں سے ہیں جو ناشتا کرتے ہیں یا صرف رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ دوپہر کا اس لیے نہیں کھا پاتے کہ دوپہر تک ناشتا ہی بمشکل ختم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اسی دوران میں چمکیلی روشن آنکھوں والا وہ دراز قد شاہ زیب بھی اندر داخل ہو گیا جس کے بارے میں پہلوان نے بتایا تھا کہ وہ بلا کا فائٹر ہے اور بروٹائی سے یہاں آیا ہے۔ اب مجھے کچھ کچھ یاد آرہا تھا۔۔۔۔۔ میں جن دنوں مارشل آرٹ کے ٹرینر کی حیثیت سے امارات میں مقیم تھا، میں نے لاہور اور کراچی کے کچھ ایٹس میں اس طرح کے نام کی کوچ سنی تھی۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ وہ فائٹر کسی معاملے میں اُلجھنے کے بعد بروٹائی نکل ہو چکا ہے۔ اگر یہ وہی تھا تو پھر اس سے ملنا ایک اچھا اتفاق تھا۔

دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی ہزاری تھی۔ ”انکل حشمت! آپ ناشا ذرا جلدی ختم کر لیں۔ ہمیں شاہ خانو کے ساتھ چائی تک جانا ہے۔“

تموڑی دیر بعد میں نے دیکھا تو شاہ خانو اور شاہ زیب ایک لینڈ کرور پر سوار بڑے سنجیدہ چہروں کے ساتھ سردار حویلی سے باہر نکل رہے تھے۔ پہلوان حشمت کے علاوہ ایک گن من بھی ان کے ساتھ تھا۔

اسی اثنا میں کوئٹہ سے ماہین کی فون کال آگئی۔ اس نے ایک طرح سے اپنی ساری کشتیاں جلادی گئیں۔ لاہور میں اس کے اہل خانہ اسے مسلسل واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ عمران کی بازیابی سے پہلے واپس نہیں جائے گی۔

”جی انکل تابش! کیا صورت حال ہے؟“ ماہین نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”سب اچھا ہے ماہین..... بس یوں سمجھو کہ ہم عمران اور اس کے دونوں ساتھیوں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ دعا کرو، جلد ہی اچھی خبر ملے گی۔“

”وہ..... بالکل ٹھیک ہے نا؟ اس کا زخم تو اب ”ہل“ ہو چکا ہوگا.....؟ وہ ہے کس جگہ؟ فون وغیرہ پر آپ کی بات ہوتی ہے اُس سے؟“ ماہین نے بڑی بے تابی سے ایک ساتھ کئی سوال داغ دیے۔

”ماہی! میں فون پر تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا، سمجھو کہ وہ بالکل ٹھیک اور تندرست ہے۔“

”عمران جن لوگوں کے پاس ہے انہوں نے کیا مطالبہ کیا ہے؟“

”بس وہ عمران اور اس کے دونوں ساتھیوں کے بدلے کسی اور کو رہا کرانا چاہتے ہیں۔ بہت جلد معاملہ حل ہو جائے گا۔“ میں نے گول مول بات کی۔

”پلیز انکل! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ اس کام میں دیر نہ کریں۔“

میں نے اسے تسلی بخشی دے کر بات ختم کر دی۔ ماہین کا دکھی لب و لہجہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ جو ”اقرارِ محبت“ اس نے اپنے سینے میں چھپا رکھا ہے، وہ اب اس کے لیے بہت بڑا بوجھ بن چکا ہے۔ وہ اپنی بے وجہ تاخیر کے لیے بہت پچھتا بھی رہی ہے۔

اسی دوران میں جمشید صاحب بھی فریش ہو کر اور چائے رس کا ناشا کر کے آگئے۔ ”تابش! ہمیں بہت زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ بغیر تہیہ کے بولے۔ ”مستان اور

”کیا گپ شب ہو رہی ہے انکل حشمت؟“ شاہ زیب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ان تابش صاحب کو یہی بتاوت تھا کہ اگر پرسوں آپ لوگ شاہ زیب کو اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تو ان لوگوں کی جینڈنچ جاتی۔“

”تموڑی بہت جینڈ تو خیر اب بھی جی ہے اُن کی۔ لیکن بات تو تب ہے کہ اصل مسئلہ حل ہو۔ تینوں بندے واپس ملیں۔ گوہار جی اور شاہ خانو بھی بہت پریشان ہیں۔ شاہ زیب نے کہا۔

میں اب اس شاہ زیب کو کیا بتاتا کہ وہ پریشان ہیں نہیں، بس نظر آرہے ہیں۔ اصل مجرم وہ خود ہی ہیں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے شاہ زیب کو مخاطب کیا۔ ”پہلوان جی تمہیں اپنا پٹھان بتا رہے تھے۔ کیا تمہیں بھی پہلوانی کا شوق ہے؟“

پہلوان جی بدک کر بولے۔ ”میں نے پٹھان کب کہا؟ چھوٹا بھائی ہے میرا۔“

”سوری، سوری..... چھوٹا بھائی ہی کہا ہوگا، میں نے غلط سنا۔“

شاہ زیب اپنی قدرے بھاری آواز میں بولا۔ ”یہ پٹھا بھی کہہ سکت ہیں بس اُلو کا پٹھان کہیں، یہی بڑی بات ہے۔“

اسی دوران میں شاہ زیب کے قیمتی موبائل پر کال کے سنگل آئے۔ ”ہاں شاہ خانو۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا اور تن کر چلتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔

”شاہ زیب اور شاہ خانو میں بڑی کچی یاری ہے۔“ پہلوان حشمت نے ایک چوتھائی پرائیڈ میں اکٹھے تین چار سوڑوں کا لقمہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”یوں سمجھو کہ دونوں یک بیک اور دو قالب ہیں۔“

”آپ کی اردو کافی اچھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اردو اچھی ہو تو ہی شاعری کانوں کے راستے دل میں وڑتی ہے اور وڑ کر جگہ بناوت ہے۔“

”تو آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔“

”کرتا ناہیں، بس ہو جاوت ہے۔ یوں سمجھو کہ نکل جاوت ہے جذبات کے پریشر سے۔ اب تو حویلی میں سوگواری کا ماحول ہے، کوئی چنگا موقع ہوا تو تمہیں سناؤں گا۔“ پہلوان نے سوڑوں والا لقمہ نیچے کرنے کے لیے آدھا گلاس لسی گلے میں انڈیلی، دلچسپ آدھی تھا، شاید مزید بات ہوتی، مگر اسی دوران میں شاہ زیب نامی وہ نوجوان پھر آتا

اس کا خطرناک دست راست جیل سے فرار ہو چکے ہیں۔
 ممکن ہے کہستان چوری چھپے یہاں پہنچ چکا ہو یا یہاں سے
 دور رہ کر شاہ خاں وغیرہ سے رابطے میں ہو۔
 ”بالکل جی۔ استان ایک جنونی شخص ہے، وہ کچھ بھی
 کر سکتا ہے۔“

”ہمارے لیے یہ بات بھی بڑی تکلیف دہ ہے تاہم
 کہ وہ تینوں اس سردار حویلی میں یا آس پاس کہیں موجود ہیں
 اور مدد کے خنجر ہیں۔“ جمشید صاحب کا اشارہ عمران، النوش
 اور وقاص کی طرف تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد ہم گوہار زینت سے رنج رندی
 تعزیت کے بہانے سردار حویلی کے زنان خانے میں پہنچے۔
 ہمارے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد اس وسیع حویلی کے
 حدود اربعہ کا پتا چلائیں اور جاننے کی کوشش کریں کہ
 ہمارے تینوں مغوی یہاں کس جگہ ہو سکتے ہیں۔ یہ بلوچی طرز
 کی دو منزلہ قدیم حویلی تھی۔ ایسی حویلیوں میں خفیہ گوشے اور
 تنہا خانے وغیرہ ہوتے ہیں۔ حویلی کے عقب میں کافی بڑا باغ
 تھا جو غالباً پانی کی قلت اور سخت ترین گرمی کے سبب جھاڑ
 جھکاڑ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ جواں سال گوہار
 زینت نے زنان خانے کی بیٹھک میں ہم سے ملاقات کی۔
 وہ سرتاپا ایک سیاہ چادر میں لبوس تھی، چہرے پر رسمی طور پر
 سوگواری بھی طاری کر رکھی تھی۔

گوہار زینت نے بارڈر کے قریب ہونے والی
 جھڑپ کا حال تفصیل سے سنا اور ان افغانیوں کے خلاف
 نفرت کا اظہار کیا جو بجرمانہ کارروائیوں میں ملوث ہوتے
 تھے۔

میں نے کہا۔ ”گوہار صاحبہ آپ بھی جان چکی ہیں
 کہ استان اور اس کا ایک صف ممکن جیل سے فرار ہو چکے
 ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم یہاں آپ کے
 پاس حجرہ نوشیر میں ہیں۔ کیا آپ اُن کی طرف سے خطرہ
 محسوس کرتی ہیں؟“

”خطرہ تو ہے۔ لیکن مجھے پتا ہے کہ اب استان یہاں
 حجرہ نوشیر آتے ہوئے سو بار سوچے گا۔ اب یہاں اس کے
 اور اس کے ہمنواؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ خاص طور
 سے اس انکشاف کے بعد کہ استان کا دوستانہ ان افغانیوں
 سے بھی ہے، جنہوں نے آپ لوگوں کے تین بندے یرغمال
 بنا رکھے ہیں۔“ وہ شاندار اداکاری کر رہی تھی۔

جمشید صاحب نے کہا۔ ”سنا ہے کہ ارد گرد کے
 علاقے میں استان کے بہت سے پیروکار ہیں اور وہ اب بھی

اُس کے حق میں آوازیں بلند کر رہے ہیں۔“
 ”ان کے پیٹ میں جو درد ہے وہ میں اچھی طرح
 سمجھتی ہوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہاں پر مولانا مرحوم رحیم
 صاحب کی آخری خواہش پوری ہو اور اسکول مدرسہ بنے۔
 لیکن یہ تو اب بن کے رہے گا۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اللہ
 نے چاہا تو چند روز میں، میں خود افتتاح کروں گی۔ اس
 اسکول کا۔“

پھر گفتگو کا رخ تاجک لڑکی دلربا کی طرف مڑ گیا۔
 ہمیں کل اطلاع ملی تھی کہ وہ اپنی دوست کی موت کا دکھ بڑی
 طرح محسوس کر رہی ہے اور اسے کافی بخار بھی ہے۔ جمشید
 صاحب نے کہا کہ ہم اس کی عیادت کرنا چاہتے ہیں۔ گوہار
 زینت کچھ تذبذب میں نظر آئی۔ تاہم پھر ایک بڑی عمر کی
 ملازمہ کے ساتھ اس نے ہمیں دلربا کے کمرے میں جانے
 دیا۔ وہ لیٹوں کی طرح زرد دکھائی دیتی تھی۔ خوب صورت
 نقوش خزاں رسیدہ تھے۔ دیہاتی انداز میں اس کا ایارشن
 کرایا گیا تھا۔ وہ ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہیں تھی مگر
 بے حس زر قاب اسے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا۔

جہانگیرہ ملازمہ ہمارے سر پر مسلط تھی۔ ذہین دلربا
 نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے بڑی طرح کھانا شروع کیا
 اور ساتھ ہی پانی کا اشارہ کیا۔ ملازمہ پانی لینے نکلی تو جمشید
 صاحب نے جلدی سے کہا۔ ”دلربا! اپنے ارد گرد نظر رکھو۔
 لوے نصیب امکان اس بات کا ہے کہ وہ تینوں بندے کہیں
 اسی حویلی میں بند ہیں۔“

دلربا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے بھی کچھ ایسا ہی
 لگتا ہے جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے شاید تنہا خانہ
 وغیرہ تو اس حویلی میں موجود نہیں۔ پیچھے جو باغ ہے، وہاں
 درختوں کے جھنڈ ہیں تاکہ چندی اینٹوں کے بنے ہوئے
 تین چار کمرے ہیں۔ رکھوالی کے دو تین گتے وہاں ہر وقت
 چکراتے ہیں۔“ وہ پھنسی پھنسی کمزور آواز میں بول رہی
 تھی۔

”کسی ملازم وغیرہ کو تم نے ان کمروں کی طرف جاتے
 دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

دلربا نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔ ”لیکن ہو سکتا ہے
 کہ ایک دو ملازم وہاں کمروں کے اندر ہی موجود ہوں۔“

جمشید صاحب نے ایک بار پھر دلربا کو نہایت سختی سے
 اپنی زبان بند رکھنے کی ہدایت کی۔ اسی دوران میں ادیب عمر
 ملازمہ واپس آگئی۔

☆☆☆

کے دو اور دیہات میں بھی اسی طرح کے دو چھوٹے اسکول کھولنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے جو مقامی اور غیر مقامی خفیہ ہاتھ علم و ہدایت کی اس آمد کو کس نہس کرنا چاہتے تھے، وہ کیونکر بے حرکت رہ سکتے تھے۔

☆☆☆

ورزش بلکہ سخت ترین ورزش عمران دانش کے دور سے میری زندگی کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔ میں کہیں بھی ہوتا اس کے لیے کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیتا تھا۔ میں رات آخر پہراٹھ گیا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب صحرا سے گزرنے والی ہوا میں ایک خاص قسم کی لطافت اور ٹھنڈک آ جاتی ہے۔ میں خاموشی سے چھت پر چلا گیا۔ سردار حویلی میں بس کہیں کہیں ہی روشنی نظر آتی تھی۔ باغ کی جانب مرغ اذانیں دیتے تھے اور رکھوالی کے گتے شور مچا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا۔ میں نے شرٹ اتار دی اور ہوا میں لمبے سانس لیے۔ نگاہ دور جنوب کی طرف اٹھ گئی جہاں گوار تھا اور جہاں نہایت لمبے اور کھنکھنے والوں کی خوش رنگ شانزے چند روز کے لیے میری زندگی میں آئی تھی۔ پھر اپنی اس جرأت کا خمیازہ تین ماہ پہلے اسے اپنی موت کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا۔ اس کا قاتل سہراب میرزا وہ اب قانون کی گرفت میں تھا۔ میں نے دل میں تپ کر رکھا تھا کہ اگر اپنی دولت و اثر و رسوخ کے نتیجے میں یہ مکروہ شخص قانون کے شکنجے سے نکل بھی گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پھر ان خیالات کے ساتھ ہی نوعمر زانی کا چہرہ بھی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس کے نقوش کافی حد تک بڑی بہن سے ملتے تھے۔ البتہ اس کے برعکس وہ بہت لاابالی اور کم فہم تھی۔ اب اس بات کو دوسرے سے زائد وقت گزر چکا تھا کہ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے کنیشنز کے مالک عطا خاں کے سپرد کر دیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ زانی نے خط کے حوالے سے جو نہایت چمکانا و احمقانہ حرکت کی تھی، اس نے مجھے سخت شاک پہنچایا تھا۔ البتہ میرا یہ فیصلہ درست ثابت کر دیا تھا کہ میں نے اسے اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا۔

خود کو دارم آپ کرنے کے لیے میں ابھی ہلکی پھلکی ورزش ہی کر رہا تھا کہ دائیں طرف حویلی کی چار دیواری کے باہر ایک متحرک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر چونکا۔ یہ گاڑی حویلی میں سامنے والے گیٹ سے داخل ہونے کے بجائے چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی اور ایک نسبتاً چھوٹے

تیسرے روز روایتی طرز کی شاندار اونٹ گاڑی میں سوار ہو کر گوہار زینت خود اسکول کی عمارت کی ترائین و آرائش دیکھنے کے لیے پہنچی۔ میں اور جمشید صاحب بھی ساتھ تھے۔ اس اونٹ گاڑی کے آگے پیچھے گھڑ سوار مسلح محافظ تھے۔ راستے میں کئی جگہ دیہاتوں نے گوہار زینت کی سواری دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اسکول کی پیشانی پر ”جدید اسلامی گوارہ تعلیم“ کے الفاظ ایک بڑے بورڈ پر نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔

ہم بھی نما گاڑی سے اتر کر اندر پہنچے۔ شاہ خانو، شاہ زیب اور پہلوان حشمت وغیرہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ کافی بڑی عمارت تھی۔ یہاں رنگ و روغن کو آخری ٹچ دیا جا رہا تھا۔ دیواروں پر تعلیم و تربیت کے حوالے سے سلوگن وغیرہ لکھے جا رہے تھے۔ نئے مسکراتے چہروں والے بہت سے دیہاتی بچے بھی سخت گرمی کے باوجود یہاں موجود تھے۔ انہیں یہ سب کچھ بہت نیا اور انوکھا لگ رہا تھا۔ گوہار زینت نے گھوم پر کر خود سارے انتظامات کا جائزہ لیا اور ہدایات وغیرہ دیں۔ اس کا ”پوتا“ شاہ خانو بھی شانہ بشانہ تھا۔

جب ہم سب جائزے کے بعد باہر نکل رہے تھے، نجانے کہاں سے ایک بار پھر وہی کپل پوش خستہ حال بھک منکا ٹپک پڑا۔ وہ یکا یک چلاتا ہوا بچوں کی طرف بھاگا۔ ”بھاگ جاؤ..... بھاگ جاؤ..... مارے جاؤ گے..... بھاگو.....“ اس نے ریت کی مٹھیاں بھر بھر کر بچوں کی طرف پھینکیں۔ ”سب تباہ ہو جائے گا۔ سب ختم ہو جائے گا۔“

بچے خوف زدہ ہو کر تتر بتر ہوئے۔ وہ خود بھی فرارے سے اپنا کپل لہراتا ہوا درختوں کی طرف بھاگ نکلا۔ حویلی کے دو تین مسلح محافظ اس کے پیچھے لپکے اور اس پر پتھر وغیرہ پھینکے، وہ درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ بچے پھر آہستہ آہستہ شاندار اونٹ گاڑی کے گرد جمع ہونے لگے۔ گوہار زینت اور شاہ خانو نے کئی بچوں کے سر پر پیار دیا۔ گوہار زینت کے اشارے پر ملازموں نے بچوں میں ٹافیاں اور جوس کے پیکٹ وغیرہ بھی تقسیم کیے۔ یہ سب کچھ ایک اسموک اسکرین کی طرح تھا۔ اس کے پیچھے کیا ہے، یہاں پر موجود شاید کسی کو معلوم نہیں تھا۔ستان اور سردار حویلی والے اب بھی اندر سے ایک ہی تھے۔ کوئی اندھی سازش پروان چڑھ رہی تھی۔ کل ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علاقے میں شعور کی جو ہلکی سی لہر جاگ رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ارد گرد

نے پرسوں رات ہی شاہ خانو اور اس کی جواں سال ”دادی“ کو بتا دیا تھا۔ جمشید صاحب نے کہا تھا کہ ان اہلکاروں کو گوٹھ سے دور اس لیے رکھا گیا ہے کہ عام لوگوں میں خواہ مخواہ ہراس پیدا نہ ہو۔

وہیں میرے کمرے میں بیٹھے بیٹھے جمشید صاحب نے اسپیشل فورس کے ان جوانوں کو کال کی اور وہ اپنے انچارج انسپکٹر غلام قادر کی قیادت میں سردار حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب صبح کے تقریباً نو بجے کا عمل تھا۔ سورج کا آتشیں گولا دھیرے دھیرے گوٹھ حجرہ نوشیر پر بلند ہو رہا تھا۔ ایک نہایت گرم اور طویل دن کی شروعات تھی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اسپیشل فورس کے یہ اہلکار گوٹھ میں پہنچ گئے اور جمشید صاحب کی ہدایت کے مطابق سردار حویلی کے بالکل قریب ہی ایک مقامی زمیندار کے ڈیرے پر ٹھہر گئے۔

گوہار زینت کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوئی ہے اور دن میں گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں جاتی۔ ہم نے اس کے پوتے شاہ خانو سے رابطہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ ناشتے کے فوراً بعد کسی ہنگامی چنپائی میں شرکت کے لیے گاڑی پر نکل گیا ہے۔ اسے دس پندرہ کلومیٹر دور جانا تھا اور اس کی واپسی سہ پہر سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ میں نے جمشید صاحب سے کہا۔ ”ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے جناب۔ جو لوگ رات کو یہاں پہنچے ہیں چوگئے ہو سکتے ہیں۔“

جمشید صاحب نے اپنے نیم سفید گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”تاہم اگر ان آنے والوں کا تعلق مستان سے نہ ہوا تو ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔“

”میرا دل گواہی دے رہا ہے جی۔ ان بندوں کا تعلق مستان وغیرہ سے ہی ہے۔ فرض محال..... فرض محال نہیں بھی تو یہ لوگ کسی اچھے ارادے سے یہاں نہیں پہنچے۔“ اکبر خاں نامی ایک ادیب عمر شخص جو انتقال کر جانے والے سردار گزین خاں کا دست راست تھا۔ اب شاہ خانو وغیرہ کے لیے بھی خصوصی ہرکارے کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس کے ماتھے پر کسی کلباڑی وغیرہ کا پرانا زخم تھا اور اس کے چوڑے جڑے اس کی سخت جانی کے غماز تھے۔

جب جمشید صاحب نے اسے بتایا کہ انہیں حویلی کے مہمان خانے میں کسی مشکوک بندے کی موجودگی کا شبہ ہے اور وہ مہمان خانے کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، تو اکبر خاں کا

بھاگ سے پہلو کی جانب سے حویلی کے وسیع احاطے میں آئی۔ میں برساتی کی اوٹ سے سب دیکھ رہا تھا۔ گاڑی میں سے ڈرائیور کے علاوہ تین چار نومند افراد اترے۔ انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ ٹویوٹا کار میں سے کچھ اسلحہ وغیرہ نکالا۔ ایک جواں سال شخص نے ان کا استقبال کیا اور انہیں لے کر حویلی کے آراستہ پیراستہ مہمان خانے کی طرف بڑھا۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ افراد عقبی برآمدے کے ایک ایسے مقام سے گزرے جہاں معقول روشنی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے اُن کے چہرے روشنی میں آئے۔ یا شاید اس کو ایک سیکنڈ ہی کہنا چاہیے۔ ان میں سے ایک چہرے کو دیکھ کر میں چونکا۔ یہ مستان رب پیارے کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ایک لگتا تھا جھاڑ جھنکار ڈاڑھی، سر کے بالوں میں عین درمیان سے نکالی ہوئی مانگ..... اور بھاری مونچھیں۔ شاید یہ انہی سفاک لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے قریباً دس ماہ پہلے جنگور کے قریب ایک قبرستان میں ہمیں گھیرا تھا اور گولیوں کی بارش کی تھی۔ اسی قاتلنگ میں عمران شدید زخمی ہوا تھا۔ اس شخص کی دید نے میری آنکھوں میں جیسے انگارے بھر دیے۔ کیا یہ وہی تھا یا پھر میری نگاہیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔ اگر یہ وہی تھا تو پھر اس پر ”مہر تصدیق“ ثبت ہوتی تھی کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔

میں جمشید صاحب کو جگانا نہیں چاہتا تھا لیکن بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ورزش کے بعد میں نیچے آ گیا۔ کچھ دیر بعد جمشید صاحب بھی جاگ گئے۔ وہ نہادھو کر کمرے سے نکلے تو میں انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔ انسپکٹر اور ایس آئی انوار مشکوری بھی کمرے میں آ گئے۔ میں نے جمشید صاحب کو ساری صورت حال اور اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ جمشید صاحب بولے۔ ”مستان جیل توڑ کر بھاگا ہوا مجرم ہے۔ اگر اس کا کوئی قریبی ساتھی یہاں سردار حویلی میں موجود ہے تو یہ سراسر قابل دست اندازی پولیس معاملہ ہے۔“

”میرا خیال بھی یہی ہے جی۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ رات کے اندھیرے میں یہاں خاموشی سے کپکپے والے یہ چاروں افراد کون ہیں؟“ سب انسپکٹر انوار مشکوری نے کہا۔ ”میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں اپنے ریزرو اہلکاروں کو بھی یہاں بلا لینا چاہیے۔“

ان ریزرو اہلکاروں کے بارے میں جمشید صاحب

کوشش کرے۔

ہمارا خیال تھا کہ پانچ دس منٹ تک نتیجہ سامنے آجائے گا۔ لیکن پندرہ منٹ گزر گئے اور پھر بیس منٹ۔ اکبر خاں واپس آیا اور نہ ہی ہمیں گویا رزینٹ کا دیدار ہوا۔ اب واضح ہوتا جا رہا تھا کہ جان بوجھ کر تاخیر کی جا رہی ہے اور اس تاخیر کے دوران میں کوئی ہیرا پھیری کر دی جائے گی۔

میں نے اپنی رست واش دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جشید صاحب! میرا خیال ہے جلد انتظار نقصان دہ ہوگا۔“

جشید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم کوریڈور سے گزر کر مہمان خانے کی طرف بڑھے۔ مہمان خانے کے دروازے سے تیس چالیس قدم پہلے ہی حویلی کے دو سطح گارڈ ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک بولا۔ ”سرکار! بہت معافی چاہتے ہیں لیکن مالکوں کا حکم ہے کہ۔۔۔۔۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”مالکوں نے بات کرنی ہوتی تو اب تک آ جاتے۔“

تین اور سطح محافظ آ گئے۔ وہ ڈر بھی رہے تھے اور اڑ بھی رہے تھے۔ بحث نے طول پکڑا اور آوازیں بلند ہوئیں تو ایک جانب کا دروازہ تیزی سے کھلا۔ ہمیں اکبر خاں اور گویا رزینٹ کی شکلیں ایک ساتھ نظر آئیں۔ صاف محسوس ہوا کہ وہ لوگ آس پاس ہی موجود تھے اور صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

گویا رزینٹ نے چہرے پر حیرت سجا رکھی تھی، ذرا تلخ لہجے میں جشید صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے یہاں۔ سردار حویلی میں کوئی سرکاری بندہ اس طرح بلند آواز میں نہیں بولا۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں مجبوراً بولنا پڑ رہا ہے۔ آپ کے یہ مگن مین کار سرکار میں مداخلت کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس نفوس ثبوت موجود ہے۔ آپ کے مہمان خانے میں کم از کم ایک ایسا بندہ موجود ہے جو پورے صوبے کی پولیس کو مطلوب ہے۔“

”دیکھو بھائی! تم بہت بڑا الزام لگا رہے ہو۔“ وہ ایک دم سرخ ہو کر بولی۔

جشید صاحب نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ ہماری میزبان ہو۔ ہم آپ پر الزام نہیں لگا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اس مطلوب بندے کی موجودگی آپ کے علم میں بھی نہ ہو۔ آپ کے کسی کارندے نے یہ حرکت کی ہو۔ بہر حال ہمارے لیے ابھی فوری طور پر مہمان خانے کی

سانو لا چہرہ خون کے دھاؤں سے سرخی مائل ہو گیا۔

وہ بلوچی لہجے کی اردو میں بولا۔ ”سرکار! یہاں آنے جانے والے ہر بندے پر کڑی نظر ہوتی ہے، کوئی غلط بندہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ تمہیں بھی اس کی خبر نہ ہو۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ رات کو آخری پہر چار پانچ بندے بڑی خاموشی کے ساتھ حویلی میں پہنچے ہیں اور مہمان خانے میں موجود ہیں۔ وہ بندہ بھی ان میں شامل ہے۔“

وہ ذرا برہمی سے بولا۔ ”آپ مائی باپ ہوتی۔۔۔۔۔ جو چاہے الزام لگا سکتے ہو۔ لیکن۔۔۔۔۔ گویا رزینٹ یا شاہ خانوکی اجازت کے بغیر میں آپ کو مہمان خانے میں کیسے جانے دے سکتا ہوں؟“

جشید صاحب بولے۔ ”شاہ خانو تو گوٹھ میں موجود نہیں ہے۔ جہاں وہ ہے وہاں کال کے سگنل بھی نہیں جا رہے۔ پھر اب کیا کرنا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔“ اکبر خاں ٹوکھائی سے بولا۔

”تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنی گویا رزینٹ کو جگاؤ اور انہیں بتاؤ کہ ہم کیا چاہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بارہ بجے سے پہلے نہیں آ سکتیں۔ بُرا نہ ماننا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔“

”بُرا تو ہم مانیں گے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ارجح معاملہ ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے مہمان خانے کی طرف قدم بڑھایا تو اکبر خاں جلدی سے آگے آ گیا۔ اس کی سانولی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ چند لمحے شدید تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے جی۔ آپ ذرا رکیں۔ میں گویا رزینٹ کو جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے جشید صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نظر کی ٹینک اتارتے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کر لیتے ہیں لیکن زیادہ نہیں کریں گے۔“

اکبر خاں جلدی سے زنان خانے کی طرف اوجھل ہو گیا۔ مجھ سے مشورے کے بعد جشید صاحب نے ایک نکل فورس کے انچارج انسپکٹر غلام قادر کو کال کی اور اسے حکم دیا کہ حویلی کو چاروں طرف سے نظر میں رکھا جائے، خاص طور سے عقبی سمت سے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہاں سے نکلنے کی

تہ مقابل کے سر کے بال میری منہ میں تھے۔
 ”نہیں چھوڑوں گا اسے۔۔۔۔۔ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔۔“
 تہ مقابل شاہ زیب جنونی انداز میں بولا۔ ”اس نے حویلی کی
 عزت خراب کی ہے۔ یہ گواراجی کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر
 معافی مانگے گا۔“

جب جشید صاحب نے دیکھا کہ تہ مقابل کسی
 صورت میں اگر بیان چھوڑنے پر تیار نہیں، دوسری طرف
 میں نے بھی اس کے بالوں پر اپنی گرفت قائم رکھی ہوئی ہے
 تو وہ شٹا سے گئے۔ نیم تاریکی میں شاہ زیب سے مخاطب
 ہو کر بولے۔ ”دیکھو! اگر تمہیں زور آزمائی کا اتنا ہی شوق
 ہے تو طریقے سے کر لو۔ یہاں حویلی کی نیچی آرائش برباد
 مت کرو۔ باہر آ جاؤ، کھلے میدان میں۔۔۔۔۔ یہاں کسی نے
 گولی وغیرہ چلا دی تو سیدھی سیدھی 302 ہو سکتی ہے۔“

گواراجی نے غائبانہ تھوڑا بہت زخمی بھی ہوئی تھی۔
 اسے دو تین ملازما میں سہارا دے کر کسی ساتھ والے کمرے
 میں لے جا چکی تھی۔ وہ وہیں پر اپنے دل کی بھڑاس نکال
 رہی تھی، اس کے بکنے بھکنے کی تہم آوازیں سنائی دیتی تھیں۔
 تہ مقابل میرا اگر بیان چھوڑ رہا تھا اور نہ میں اس کے
 سر کے بال۔ میں نے کہا۔ ”جشید صاحب! اگر اس بھر شیر

چکنا چور کیا پھر ایک الماری الٹائی۔۔۔۔۔ پھر ایک دروازہ توڑا،
 پھر ایک قیمتی میڈل وال کو تھپس تھپس کر دیا، اس کے باوجود وہ
 خود زمین بوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کے زمین بوس نہ ہونے
 پر حیرت تھی۔ دوسری طرف اسے شاید اس توانائی پر حیرت
 تھی جو میرے اس طویل دھکے میں موجود تھی۔ بہت عرصے
 بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک برابر کی چوٹ کا تہ مقابل ملا
 ہے۔

میرے طویل اور زوردار دھکے کے جواب میں
 تہ مقابل نے بھی مجھے ایسا ہی طویل دھکا دینے کی کوشش کی۔
 میرا اگر بیان بدستور اس کی آہنی گرفت میں تھا۔ اس کا دھکا
 بھی طویل ثابت ہوا مگر دس بارہ قدم سے آگے نہیں جاسکا۔
 ایک دیوار سے پشت لگا کر میں نے اسے روک لیا۔ کئی اور
 قیمتی اشیاء چکنا چور ہو گئی تھیں۔

”مار چھوڑوں گا تجھے۔“ تہ مقابل میرے کان میں
 بھنکارا مگر اس سے پہلے کہ وہ وار کرتا، اچانک لائٹ چلی
 گئی۔ دن ہونے کے باوجود حویلی کے اس اندرونی حصے میں
 اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جشید
 صاحب اور اکبر خاں سمیت کئی افراد ہمارے درمیان
 آ گئے۔ میرا اگر بیان ابھی تک تہ مقابل کے ہاتھ میں تھا اور

پاکیزہ کون خوابوں کے پار رہتا ہے

خوابوں، خیالوں اور تخیلات کی دنیا ہمیشہ ہی مسحور کن لگتی ہے۔ سنہرے اور روپلے خوابوں پر نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ
 ہی کوئی قدغن لگا سکتا ہے۔ امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل میں تخیلاتی دنیا کبھی معاون ہوتی ہے تو کبھی انسان مایوس بھی
 ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مایوسی بھی آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

حسین داستاں اور خوابوں کی تعبیر۔۔۔۔۔ ایسے ہی تو بنتی ہے ایک دلکش تحریر

مایہ ناز، قلم کار، برد عزیز ناول نگار محترمہ

افشاں آفریدی

کے ماہر انداز بیان کا ایک اور دلکش، حسین و پر لطف قسط دار ناول

جلد ہی ماہنامہ پاکیزہ کے صفحات کی زینت بنے جا رہا ہے

نے اپنی ہر شیری دکھائی ہے تو میں تیار ہوں لیکن مہمان خانے کی تلاشی ابھی ہوگی اور ہر صورت ہوگی۔“
جشید صاحب نے چند لمحے توقف کیا، پھر ہولے سے بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تلاشی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کے بال چھوڑ دو تاہم۔“

میں جشید صاحب کے اس لب و لہجے کو بخوبی پہچانتا تھا۔ اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی تھی۔ ان کے کہنے پر میں نے شاہ زیب کے بالوں پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ درمیان میں کھڑے اکبر خاں اور جشید صاحب نے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ شاہ زیب نے بھی میری گردن کو ایک زوردار چوکا دینے کے بعد گریبان چھوڑ دیا۔ جشید صاحب اور سب انسپکٹر انوار سمیت سات آٹھ افراد ہمارے درمیان موجود تھے۔ چند افراد شاہ زیب کو سنبھال کر دوسری طرف لے گئے۔ جشید صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے آئے۔ میرا گریبان پھٹ کر پیٹ پر جھول رہا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے کئی وغیرہ کی۔ باہر سے تہمقائل شاہ زیب کی لکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اگر اپنے باپ کا ہے تو بھانگنا مت۔۔۔۔۔“ چند لمحے بعد وہ دوبارہ پکارا۔ ”باہر آ جاؤ بیٹی! تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“
میرا جی چاہا کہ باہر نکل کر اسے مناسب سا جواب دوں لیکن پھر خود کو سنبھالا۔ جشید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے کیوں کہا کہ اب تلاشی کی ضرورت نہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ہنگامے کے دوران میں ان لوگوں نے اپنا کام سیدھا کر لیا ہے۔۔۔۔۔ رات کو جو مہمان آئے تھے، انہیں مہمان خانے سے نکال لیا گیا ہے۔“
جشید صاحب کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ تلاشی کے حوالے سے اکبر خاں وغیرہ ایک دم ایزی ہو گئے ہیں۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک اور طوفان کھڑا ہو گیا۔ شور سن کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ معلوم ہوا کہ حویلی میں ہنگامے کا پتا چلنے کے بعد گوجار زینت کے پوتا صاحب واپس آ گئے ہیں۔ شاہ خانو گرج برس رہا تھا اور ہمارے کمرے کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہ زیب، اکبر خاں، پہلوان شمسیت سمیت پانچ چھ افراد نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ مجھے مخاطب کر کے دہاڑ رہا تھا۔ ”ادئے اکل ڈہٹی! یہ پولیس گردی ہم نے بھی چلنے دی

ہے، نہ اب چلنے دیں گے۔ تو نے دائی ماں پر ہاتھ اٹھایا ہے تو اس حویلی سے زندہ نہیں نکلے گا۔۔۔۔۔“ جو اس کے منہ میں آ رہا تھا بک رہا تھا۔ ہاتھ میں کولٹ پستول بھی دکھائی دے رہا تھا۔

میں اور جشید صاحب بالکل سکون میں تھے۔ ایسے بہت سے طوفان چڑھتے اور اترتے ہوئے ہم نے دیکھے تھے۔ البتہ انسپکٹر اور سب انسپکٹر انوار کچھ کم مسم سے ہو گئے تھے۔

پھرے ہوئے شاہ خانو کو اس کا دوست شاہ زیب ہی زیادہ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ بار بار کچھ کہہ بھی رہا تھا، بس اتنی سی بات میرے کانوں تک پہنچی۔ ”سزا ملے گی یا را، ضرور ملے گی۔“

وہ اور اکبر خاں شاہ خانو کو سنبھالتے ہوئے اور دھکیلتے ہوئے ہمارے کمرے سے دور لے گئے۔

حویلی کی فضا میں کشیدگی تھی۔ انجیل فورس کے آٹھ دس ارکان حویلی کے آس پاس موجود تو تھے لیکن اگر خدا نخواستہ بات بہت بگڑ جاتی تو ہمارے لیے اپنا دفاع کرنا مشکل تھا۔ مقامی تھانے کی پولیس تو سردار حویلی کی بے دام کی غلام تھی، اس سے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد شاہ زیب پھر ہماری قیام گاہ کے سامنے آن دھمکا۔ اس کا چہرہ غصے اور پسینے کی آمیزش سے چمک رہا تھا۔ انوار مشکوری باہر ہی کھڑا تھا۔ اسے مخاطب کر کے کڑے لہجے میں بولا۔ ”باہر بلاؤ اپنے اس تابش صاحب کو۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

انوار نے اندر آ کر مجھے اور جشید صاحب کو بلایا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا مگر جشید صاحب نے میرے کندھے پر دباؤ ڈال کر مجھے پھر بٹھا دیا۔ ”میں بات کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

میرے منع کرنے کے باوجود وہ باہر چلے گئے۔ شاہ زیب اور جشید صاحب کچھ فاصلے پر جا کر ایک نیم کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ دونوں میں ٹکرا رہا تھا گفتگو ہونے لگی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ گفتگو بحث کی طرف جارہی ہے۔ شاہ زیب بار بار ہاتھ اٹھا کر میرے کمرے کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ سب انسپکٹر انوار بھی نیم کے درخت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یقیناً تھوڑی بہت آواز اس تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد انوار اترے ہوئے چہرے کے ساتھ میری طرف آیا۔ کمرے میں پہنچ کر بولا۔ ”تابش صاحب! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں چاغی سے کچھ اور نفری منگوانی

کر کہا۔ ”شاہ زیب ایک..... ایک بہت خطرناک فائٹر ہے۔ باہر کے ملکوں میں اس نے بڑے بڑے بد معاش فائٹروں کو ناکوں چھو لے چبوائے ہیں۔ دیکھنے میں یہ آپ کو عام سا لگتا ہووے گا مگر مارا ماری کے وقت کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔“

”میں بھی تو تمہیں عام سا ہی لگتا ہوں، مگر ہو سکتا ہے کہ لڑائی کے وقت کچھ اور طرح کا ہو جاؤں۔“

میرا اطمینان پہلوان شمسٹ کو مزید پریشان کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ میں نے کہا۔ ”اچھا، تمہارا یہ پٹھا، میرا مطلب ہے چھوٹا بھائی بروٹائی میں کیا کرتا تھا؟“

وہ جڑ بڑھ کر بولا۔ ”بروٹائی ناہیں، بروٹائی سے آگے ایک جزیرہ ہے جامنی..... آپ سمجھو کہ وہاں کے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے ہر طرح کی لڑائی اور جنگ کا دیوتا مانتے ہیں۔ اور شاید ٹھیک ہی مانتے ہیں۔“

تب اس نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ”برادر! آپ چھوڑو! ان سب باتوں کو۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میں دل سے چاہت ہوں کہ تم شاہ زیب کے سامنے ناہیں آؤ۔ کوئی درمیان کاراستہ نکال لو..... تمہاری عزت رہ جاوے گی اور دیکھو..... ویسے بھی تمہاری یہ لت (ٹانگ) پوری طرح ٹھیک نا لگتے ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم پہلے بھی تھوڑا بہت درد سہہ رہے ہو۔“

میں مسکرایا۔ ”پہلوان شمسٹ! درد سہنا میرا شوق ہے۔ درد جتنا زیادہ ہو، میں اتنا ہی لطف اٹھاتا ہوں۔ تمہاری فکر مندی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی بہت فکر مندی اپنے منہ بولے چھوٹے بھائی کے لیے بھی سنبھال رکھو۔ کچھ اس کا بھی توجہ دینا ہے تم پر۔“

پہلوان شمسٹ سا گیا۔ وہ ایک ساتھ ہی مایوس اور ناراض نظر آ رہا تھا۔ ”تم ضد کرتے ہو برادر۔ تم ایک دو منٹ سے زیادہ اس کے سامنے ٹک ناہیں پاؤ گے۔ کاش یہ سب نہ ہو۔“

میں نے کہا۔ ”اور اگر ہو تو کاش وہ لوگ بھی یہاں ہوں جو بروٹائی کے کسی جزیرے میں اسے دیوتا کا مقام دیتے ہیں.....“

وہ کچھ اور جھنجھلا گیا۔ ”آخر تم لوگ کیوں کر رہے ہو اس طرح؟ حویلی والوں نے تمہارا کچھ بگاڑا ناہیں بلکہ مدد ہی کر رہے ہیں۔ تمہارے اغوا ہونے والے بندوں کو واپس لاتے لاتے انہوں نے خود اپنا ایک بندہ مروا لیا ہے۔ باقی

رہی اس مستان رب پیارے کی بات..... تو گو حار جی خود اس کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ مستان کے چلے چانٹوں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ ڈنکے کی چوٹ پر اسکول شروع کر داری ہیں۔ وہ کیوں پناہ دیویں کی مستان کے کسی بندے کو یہاں؟“

میں نے کہا۔ ”پہلوان شمسٹ! تم ہڈی بہت اچھی جوڑتے ہو گے اور شعر بھی۔ لیکن سازشوں کی کڑیاں شاید تم نہیں جوڑ سکتے۔ یہاں بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو تمہاری اور تمہارے دوست کی سمجھ سے باہر ہے..... یہ لوگ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔“

پہلوان کی جھنجھلاہٹ اب عروج پر تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا بولا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ میں جینس کے سامنے الٹا لٹکا ہوا ہوں۔“ اس کے بعد وہ پاؤں سے فرش کو کوبتا ہوا واپس چل پڑا۔ سات آٹھ قدم اٹھا کر پھر واپس آیا۔ عیسیٰ آواز میں کہنے لگا۔ ”کچھ دیر پہلے تمہاری اور شاہ زیب کی جھڑپ کے وقت جو لائنٹ گئی تھی..... وہ میں نے ہی بجھ گئی تھی۔ میں سوچ آف کیا تھا میں نے کہ..... شاید بات یہیں پر ختم ہو جائے۔ لیکن اب سمجھ میں آ گیا ہے۔ یہ ناہیں ختم ہوگی۔“ وہ بھڑکا ہوا سا باہر چلا گیا۔

میں نے بائیں جانب کھڑکی میں سے دیکھا۔ حویلی کے ملازم اور دیگر لوگ احاطے میں ایک جگہ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو ایم ایم اے فائٹر شاہ زیب کے ہاتھوں میری درگت بننے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس صورت حال سے جس کو سب سے زیادہ تکلیف تھی وہ جمشید صاحب تھے۔ ان کا کوئی بس نہیں چل رہا تھا۔

حویلی کا ایک گیٹ کھول دیا گیا تھا، وہاں سے مزید لوگ بھی اندر آنا شروع ہو گئے تھے۔ سورج جیسے سوانیز نے پر تھا، ایسی گرم دوپہر میں نے کم ہی دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پرندے اور درخت تک الامان پکار رہے ہیں۔ تپتی ہوئی ریشمی زمین سے حرارت کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایسی آفتابیں دوپہر میں شاہ زیب یقیناً بے مبری کا مظاہرہ ہی کر رہا تھا۔ ورنہ اس نے دودو ہاتھ کرنا ہی تھے تو شام یا شام کے بعد کا کوئی وقت رکھ سکتا تھا۔ اس کا جوشیلا پن ہی تھا کہ وہ اور شاہ خانو ایک بات پر اڑ کر رہ گئے تھے۔ میں گو حار زینت سے دست بستہ معافی مانگوں یا پھر سامنے آ کر دودو ہاتھ کروں۔

چلچلاتی آتشیں دھوپ میں سروں پر پگڑیاں، ٹوپیاں

ثابت ہو رہی تھی کہ سردار حویلی والے دہرے چہروں کے مالک ہیں۔ باہر سے مہربان اندر سے قہرمان۔ مستان رب پیارے کے ایک قریبی ساتھی کا یہاں موجود ہونا نہایت سنگین خطرات کی نشاندہی کر رہا تھا۔

اب دن کے بارہ بج چکے تھے۔ سورج نے ابھی سے آگ برسانا شروع کر دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد شاہ زیب کی طرف سے ایک پٹھان گارڈ پیغام لے کر آ گیا۔ پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ میں گوجہاری سے معافی مانگ کر خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ یا ٹھیک دو گھنٹے بعد میدان میں نکل آؤں۔

جشید صاحب میری قابلیت اور صلاحیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں بھروسہ تھا کہ میں بروٹائی سے وارد ہونے والے اس ایم ایم اے فائٹر کو ہینڈل کر لوں گا..... البتہ اسپیکٹر اور سب اسپیکٹر انوار مشکوری کافی مشکوک دکھائی دیتے تھے۔ غالباً یہ عمروں کا فرق ہی تھا جو انہیں مشکوک کر رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں کپڑے بدل رہا تھا جب کسی نے جلالت آمیز انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے پینٹ کی ہیٹ باندھ کر دروازہ کھولا۔ ایک شخص نے پھرتی سے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی پہلوان حشمت راہی تھا۔ شلواری کے اوپر لمبی نیلی قمیص میں اس کی توند کسی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے اب تک اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہی دیکھی تھی لیکن آج وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ چھوٹے ہی بولا۔ ”برادر تائش صاحب..... بہت چھپ کر آپ کی طرف آیا ہوں، آپ سے ایک منت کرنے کے لیے۔“

”منت کیوں، حکم کرو پہلوان حشمت۔“ میں نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ملے جلے میوانی اور پنجابی لہجے میں بولا۔ ”یہ دیکھو جی، میں ہاتھ جوڑت ہوں آپ کے سامنے۔ آپ اس پھٹے بازی میں نہ پڑو۔ بالکل نہ پڑو۔ جس بندے کے بارے میں آپ ٹھیک سے جانتے ہیں ہوں اس کے متھے کیوں لگت ہو؟ میں ہمیشہ سچ بات کہت ہوں، آپ مجھے عام پولیس والوں سے بہت دیکھ رہے ہو۔ میں..... دل سے آپ کا بھلا چاہت ہوں۔“

”مجھے اپنے پٹے سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ میں مسکرایا۔

”یہ مذاق کی بات نہیں ہے برادر۔“ اس نے شہنا

چاہیے۔ بات بگڑی ہوئی لگ رہی ہے۔“

بہت دیر ہوئی میں نے ایسی اطلاعات سے پریشان ہونا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اطمینان سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا ہے یہ بروٹائی کا پیسے خاں؟“

”سر..... وہ کہتا ہے کہ آپ نے عمر وغیرہ کا لحاظ خود ختم کر دیا ہے یا تو آپ کو اس کے ساتھ دودھ ہاتھ کرنا ہوں گے یا گوجہاری زینت سے معافی مانگنا ہوگی۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔“

میں کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ زیب لمبے ڈگ بھرتا واپس جا رہا ہے۔ جشید صاحب ایک بار پھر اس کے پیچھے گئے۔ اسے روکا اور پھر سمجھانے لگے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ میں دروازہ کھول کر چلپلائی دھوپ میں نکل آیا۔ ”سر! آپ واپس آجائیں۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”یہ لڑنا چاہتا ہے تو اپنا شوق ضرور پورا کرے۔ میں تیار ہوں۔“

مجھے یوں باہر نکلنے اور بولنے دیکھ کر حویلی کے چار پانچ محافظ بھی باہر نکل آئے۔

شاہ زیب نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”کہتے ہیں کہ اس عمر میں بھی بڑی گرمی ہے تیرے خون میں۔ تین چار بندوں سے اکیلا ہی منٹ لیتا ہے۔“

”تین چار سے زیادہ بھی ہوں تو پیچھے نہیں ہٹتا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ تین چار سے زیادہ بندے تیری وحشی عمر کا خیال کرتے ہوں۔ تجھے استاد سمجھ کر تیری عزت خراب نہ کرتے ہوں، تیری یہ استادی آج تیری ناک کے راستے نہ نکالی تو شاہ زیب نام نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

واپس جانے لگا تو وہ پکارا۔ ”پھر چوہے کی طرح دیک کر نہ بیٹھ جانا۔ مجھے وقت اور جگہ بتا کر جا۔“

”یہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ جس وقت کہو گے باہر آ جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں آ گیا۔

جشید صاحب کو یہ سب کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ یہ سارا جوشیلا پن لگ رہا تھا۔ لیکن صورت حال ہی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ پیچھے ہٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہمارے یہاں آنے کا اصل مقصد تو عمران، وقاص جمالی اور انوش جٹ کی بازیابی تھی مگر حالات کیا سے کیا ہوتے جا رہے تھے۔ یہ بات تو اب تقریباً

تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی اور لاکٹ وغیرہ اتار دیے تھے۔

میں نے اپنی تین اتار کر ایک طرف پھینکی اور صرف جین اور جوگرز کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جلتی ہوانے میرے جسم پر آتشیں بوسہ دیا۔ ایک لمحے کے لیے، فقط ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اگر اس وقت عمران جو نیز موجود ہوتا تو کبھی مجھے جامنی کے اس جواں سال فائٹر کے سامنے نہ آنے دیتا۔ خود آگے بڑھتا۔ اب وہ نہیں تھا۔ یہیں کہیں نامعلوم بھول بھلیوں میں گم تھا۔

مجھے باہر آتے دیکھ کر لوگوں نے شور مچایا۔ میں نے محسوس کیا کہ زیادہ تر تماشاخیوں کی ہمدردیاں شاہ زیب کے ساتھ ہی ہیں۔ ”ایم ایم اے“ کے اصول کے مطابق میں نے جوتے اتار دیے تو شاہ زیب نے بھی تسمے کھول کر جوتے ایک طرف اچھال دیے۔ اس کے انداز میں بے پناہ اعتماد تھا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”ڈپٹی! تمہاری عمر کا لحاظ کر رہا ہوں۔ ایک آخری بار پھر کہتا ہوں، گوحار جی پر ہاتھ اٹھا کر تم نے غلطی کی ہے۔ معافی مانگ لو۔“

”میں پھر کہتا ہوں۔ میں نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ صبح وہاں جو کچھ ہوا گوحار زینت صاحب کی شعلہ مزاحمتی کی وجہ سے ہوا۔ میں نے بس انہیں خود سے دور رکھنے کی کوشش کی۔“

”عمر کا لحاظ نہیں رہے گا۔“ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ”میرا ہاتھ تو بہت سخت بڑے گام پر۔“

”لیکن میں عمر کا لحاظ رکھوں گا۔ اپنا ہاتھ ہولارکھوں گا تم پر۔“ میں نے زبردست لہجے میں کہا۔

صبح اچالے میں ایک ایسا قطعہ تھا جہاں تھوڑی بہت گھاس موجود تھی۔ اس گھاس میں زردی زیادہ اور ہریالی کم تھی۔ دائیں طرف زنان خانے کی بالکونیاں تھیں جو نائیک چندی اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ان بالکونیوں کے نیچے اچالے میں سنگ سرخ کا مستطیل فرش تھا جو ٹوٹے پھوٹے خشک ٹواریوں تک چلا گیا تھا۔ بائیں جانب سردار حویلی کا مین گیٹ اور ڈیوڈھی تھی۔ ڈیوڈھی کے دائیں بائیں ٹین کے شیڈوں کے سائے میں سردار حویلی کی تین چار گاڑیاں اور دو اونٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔

جلتے سورج کے نیچے پستادھاروں کی طرح بہتا تھا اور ہم ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اگر تجھے مات ہوگئی تو پھر تجھے بھی جشید صاحب سے معافی مانگنا

اور صافے وغیرہ رکھے کافی تعداد میں تماشاخی سردار حویلی کے اچالے میں جمع ہو چکے تھے اور مزید آرہے تھے۔ ان میں لڑکے بالے اور بڑے بوڑھے بھی تھے۔ بظاہر تو کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی مگر ممکن تھا کہ زنان خانے کی دوسری منزل کی بڑی بڑی پتھروں اور پردوں کے پیچھے خواتین موجود ہوں۔

جشید صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے، وہ اس صورت حال پر سخت جھنجھلائے ہوئے نظر آتے تھے۔ ابھی ہم نے ایک دو فقروں کا تبادلہ ہی کیا تھا کہ گھڑی سے باہر کسی نے دونوں ہاتھ زور سے شیشے پر مارے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ وہی محبوبہ الحواس سا بھگ منکا تھا جو دو تین بار پہلے بھی دکھائی دے چکا تھا۔ کھڑکی میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ وہ غصیلے انداز میں بولنے لگا۔ ”تم سب گدھے ہو، نکھوتے ہو، ڈنگر ہو۔۔۔۔۔ آپس میں لڑ رہے ہو، اس خبیث سے لڑو جو تمہیں لڑاتا ہے اس جیٹی چڑی والے کا سر توڑو جس نے تم پر موت کی بارش کی۔ گولے بارود کا مینہ برسایا۔۔۔۔۔ بھول گئے ہو بغداد کو۔۔۔۔۔ بھول گئے ہو کابل کو۔۔۔۔۔ ہاں بھول گئے ہو تم۔ بڑی ماڑی یادداشت ہے تمہاری۔ ڈولے شاہ کے چوہوں جیسے دماغ ہیں تمہارے۔ مگر اس کی یادداشت کمزور نہیں۔ وہ ہزار سال پرانی باتیں بھی یاد رکھے ہوئے ہے۔۔۔۔۔ اور یہی نہیں۔۔۔۔۔ بے وقوف! وہ ہزار سال آگے کی باتیں بھی جانتا ہے۔ وہ تمہارا یہ اسکول کبھی نہیں بننے دے گا۔ یہ اسکول تم دنیا کے کسی بھی کونے میں بنانے کی کوشش کرو گے، یہ کسی بدروح کی طرح کسی نہ کسی سردار گزین کے جسم میں گھس جائے گا۔ اس اسکول کو ملیا میٹ کر دے گا۔“

وہ تقریر کرنے والے انداز میں بولتا چلا گیا۔

ایک دور سے حویلی کے دو گارڈز نے اسے دیکھا اور گالیاں بکتے ہوئے اس کی طرف لپکے۔ وہ اپنا کبل لہراتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ گارڈز نے اسے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے مارے، تاہم وہ ان کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ”سرا اُجڑ دیہاتی لگتا ہے مگر باتیں پڑھے لکھوں جیسی کرتا ہے۔“

”پڑھے لکھوں جیسی۔۔۔۔۔ اور گہری بھی، کوئی کہانی ہے اس کے پیچھے بھی۔“ جشید صاحب نے کہا۔

میں نے گھڑکی میں سے دیکھا۔ پسینے میں بھیگا ہوا شاہ زیب میدان میں آگیا تھا اور تھملائے ہوئے انداز میں بادھرا دھر چکرارہا تھا۔ اس نے سرخ ٹی شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی۔ بغیر آسٹیوں والی شرٹ سے اس کا کسرتی جسم

ہوتا۔ لیکن بحثا بحثی میں معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ آپ یہاں کی کرتا دھرتا ہیں، آپ کی توہین کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

میں اس وقت حیران رہ گیا جب گوہار زینت کے اشارے پر ایک لمبے ترنگے شخص کو اندر لایا گیا۔ جہاں جھنکار داڑھی، سر کے بالوں کے بیچ میں سے مانگ۔ یہ وہی شخص تھا کہ جس کے بارے میں مجھے شک ہوا تھا کہ وہ دو تین اور افراد کے ساتھ مہمان خانے میں اتر رہا ہے۔ یہ سو فیصد مستان رب پیارے کا ساتھی تھا۔

گوہار زینت میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اسی بندے کے بارے میں تمہیں اعتراض تھا کہ یہ حویلی میں کیوں آیا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”اگر تب تم تھوڑا جمل کرتے تو میں خود اسے تمہارے سامنے لے آتی۔ مجھے بڑی یہ بات لگی تھی کہ تم زبردستی مہمان خانے میں جانا چاہتے تھے۔“

اس کے بعد گوہار زینت نے اس بندے کی یہاں موجودگی کے بارے میں جو وضاحت کی، اس کا لب لباب یہ تھا کہ..... یہ بندہ مستان سے علیحدہ ہو چکا ہے بلکہ اس کے خلاف ایک طرح کا اعلان بغاوت کر چکا ہے اور حویلی کی پناہ میں آیا ہے۔ اس بندے کے لیے بھی یہ خبر باعث پریشانی ہے کہ مستان کو جیل سے فرار ہو چکا ہے۔

اس مفصل وضاحت کے بعد گوہار زینت اور اس کے چند معزز ساتھیوں نے میرے اور شاہ زیب کے درمیان نہ صرف صلح کرائی بلکہ گلے بھی ملایا۔ بظاہر تو شاہ زیب مناسب طریقے سے ہی بفلکیر ہوا۔ تاہم اس کا انگ انگ مجھے بتا گیا کہ یہ صلح صرف دیکھنے والوں کے لیے ہے۔ ایک پُر تکلف کھانے کا اہتمام بھی تھا۔ کھانے کے دوران میں گوہار زینت اور شاہ خالو بڑی سنجیدگی سے مفرور زرقاب خاں اور دولت خاں کے بارے میں بات کرتے رہے۔ ہمارے تینوں یرغمالیوں کے بارے میں ”پریشانی“ کا اظہار بھی جاری رہا۔ رات دس بجے کے قریب ہم اپنے کمروں میں لوٹ آئے۔

☆☆☆

سردار حویلی میں جزیئرز کے ذریعے اتر کر چلائے جاتے تھے اور بھی کبھی ٹھنڈی ہوا کے لیے ان میں برف بھی ڈالی جاتی تھی ورنہ اس بلا کی گرمی میں رات کو سونا مشکل ہو جاتا۔ رات کوئی دو بجے کا عمل ہوگا۔ مجھے اپنے بالکل قریب آہٹ سنا کی دی، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوئی بڑی احتیاط سے

دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے نچکے کے نیچے پستول کی موجودگی یقینی بنائی اور پھر پوچھا کہ کون ہے؟ دوبارہ سوال دہرانے کے باوجود جواب نہیں ملا۔ میں نے پستول نچکے کے نیچے سے نکال کر شرٹ کے نیچے اڑسا اور دروازہ کھولا۔ ایک لڑکی مجھے تقریباً دھکیلتی ہوئی جلدی سے اندر آئی اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ مدھم روشنی میں اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں جاگ چکا ہوں اور سب کچھ اپنے ہوش و حواس میں دیکھ رہا ہوں۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر اور آنکھیں سکیڑ کر میں نے پھر اس کا جائزہ لیا۔ میرے سامنے زعفران عرف زانی کھڑی تھی۔ وہی لا آبالی، آفت کی پرکالی جسے میں قریباً ڈھائی ماہ پہلے گوادر کے قریب عطا خاں کے سپرد کر کے خاموشی سے نکل آیا تھا۔ وہ اب یہاں اس گرم رات میں گوادر سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر دور سردار حویلی میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ ناراضگی، حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

عجیب انداز سے بولی۔ ”سرگشده! ایسے کیا دیکھ رہے ہیں میری طرف۔ شاید آپ کو پریشانی ہو رہی ہے کہ میں زندہ سلامت پھر آپ کے سامنے آن موجود ہوئی ہوں۔“

”تم..... تم یہاں حویلی میں کیسے پہنچی ہو؟“ میں نے اپنی بے پناہ حیرت دباتے ہوئے پوچھا۔

”جناب میں تو یہاں پچھلے ایک ماہ سے موجود ہوں۔ یہ سوال تو آپ سے کرنا بنتا ہے کہ آپ اس حویلی میں کیسے آدھمکے ہیں؟“

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”تم اس طرح میری طرف مت دیکھو۔ میں تمہیں کہیں لاوارث چھوڑ کر نہیں آیا تھا۔ حاجی عطا خاں جیسے بندے کے سپرد کیا تھا اور اس لیے کیا تھا کہ تمہیں مزید خطرات سے بچانا چاہتا تھا۔“

”سرا! ایک دن بگ سسر (شانزے) سے باتیں کرتے ہوئے آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جو مسئلے اور خطرے انسان کی قسمت میں لکھے ہوتے ہیں، وہ اس تک پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔ مجھ تک بھی پہنچے۔“ وہ یکایک افسردہ نظر آئی۔

”کیا تم عطا خاں کے کنٹینر میں اس کے ساتھ کوئٹہ نہیں گئی تھیں؟“

”مئی تھی۔ لیکن عطا خاں بالکل اور طرح کا بندہ نکلا۔ شاید آپ کو بھی اس سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں حیران ہوا۔ عطا کا نورانی

تھا۔ غصے اور جھلٹ کی ایک بلند لہر میرے سراپا میں دوڑ گئی۔ اس خط کی وجہ سے مجھے ماہین کے سامنے جس طرح کی خجالت اور شرمندگی کا سامنا ہوا تھا، وہ مجھے اب تک بھولی نہیں تھی۔

”تم پر لے درجے کی بداخلاق و بے شرم لڑکی ہو۔ اپنی اور میری عمر کا لحاظ کیے بغیر تم نے جو کچھ کیا، وہ مجھے بھلائے نہیں بھول۔ کاش مجھے دوبارہ تمہاری شکل نہ دیکھنا پڑتی۔“

”سوری سر..... ویری سوری.....“ اس نے بلا جھجک دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ ”پپ..... پتا نہیں اُس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ لیکن..... ایک بات آپ کو بھی پتا ہوگی۔ میں نے اس لیٹر میں کوئی غلط لفظ لکھا نہیں تھا۔ جہاں کوئی ایسا لفظ آسکتا تھا وہ جگہ میں نے خالی چھوڑ دی تھی۔ چھوڑ دی تھی نا؟“ اس نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

جی چاہا کہ اُس مذہب پر ایک ٹھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دوں لیکن پھر اس گہرے صدمے کا خیال آیا جو اپنی بہن کی موت کے سلسلے میں وہ کچھ ہی عرصہ پہلے پیمیل چکی تھی اور اب بظاہر بالکل بے آسرا تھی۔

جب میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تو اس نے جلدی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں سر! آپ اپنی ایک ٹانگ پر پورا وزن ڈال نہیں پارہے۔ آپ بیٹھ جائیں پلیز۔“

میں نے بے رخی سے ہاتھ چھڑایا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”اب کیا چاہتی ہو تم۔ کوئی مزید تماشائگانا چاہتی ہو کہ آدھی رات کو یہاں میرے کمرے میں گھس آئی ہو؟“

”آپ کو دیکھنے کے بعد میں آپ سے ملے بغیر کیسے رہ سکتی تھی؟“ وہ بے باکی سے بولی۔

دفعتاً مجھے کل دوپہر کی بات یاد آئی جب لڑائی رکنے کے بعد کسی نے مجھے بالکونی سے نیکار تھا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”کل احاطے میں لڑائی کے بعد تم نے آواز دی تھی مجھے؟“

”یس سر! بس آواز ہی دے پائی تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو نیچے اتر کر بھاگتی ہوئی آتی اور..... اور.....“ وہ چپ ہو گئی۔ ذرا توقف کے بعد بولی۔ ”پھر کوئی ایسی بات کہہ دی تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔ ویسے سر..... آپ بار بار عمر کی بات کیوں کرتے ہیں؟ میں تو آپ کو جوانوں سے زیادہ جوان دیکھتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں آپ غیر معمولی ہیں سر..... ریلی ایکسٹرا آرڈنری..... کل جس طرح آپ نے

چہرہ لگا ہوں میں گھوم گیا۔

”نہیں، نہیں سر! میرا یہ مطلب نہیں۔ وہ مجھے بڑی کہہ کر بلاتا تھا اور بڑی ہی سمجھتا رہا مگر وہ کوئی پہنچ کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا کہ وہ میری حفاظت نہیں کر سکے گا۔ وہ ان لوگوں سے خوف زدہ ہو گیا تھا جو میرے اور آپ کے پیچھے تھے۔“

ڈھائی مہینے پہلے کے وہ سارے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے جب زانی کی بڑی بہن شانزے کے بہیمانہ قتل کے بعد سہراب کا چھوٹا بھائی اگلن میرے ہاتھوں جان سے گیا اور میں زانی سمیت ”تقاب کرنے والوں“ سے بچ کر بھاگ نکلا۔

”ہمارا تقاب کرنے والے کو اور سے کوئی کیسے جا پہنچے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ سہراب میرا زادہ بھی قریباً تین ماہ پہلے کو اور سے گرفتار ہو کر کوئی جا پہنچا تھا۔ آپ سمجھ لیں کہ آج کل کوئی اور کپلاک وغیرہ سہراب میرا زادہ کے گینگ کا گڑھ بنے ہوئے ہیں۔ عطا خاں بہت جہاندیدہ آدمی ہیں۔ ڈیڑھ ماہ پہلے انہیں سمجھ آگئی تھی کہ وہ میری حفاظت نہیں کر پائیں گے۔ عطا خاں صاحب کا ایک چچا زاد بھائی اکبر خاں ہے جو یہاں سردار جوہلی کا پرائیمازم ہے۔ وہ ان دنوں کوئی آیا ہوا تھا۔ عطا خاں صاحب کو اکبر پر پورا اعتماد ہے۔ انہوں نے مجھے اکبر خاں کے ساتھ یہاں چائی کے اس کوٹھ میں بھیج دیا۔“ زانی نے دو لمحوں توقف کیا پھر بولی۔ ”اور سچی بات یہ ہے کہ اب تو مجھے بھی لگتا ہے کہ میں اس دور دراز کوٹھ میں سہراب کے گینگسٹرز سے محفوظ ہوں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں موجود ہوں؟“ میں مسلسل حیرت کے زخموں میں تھا۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں بے باکی سے مسکرائی۔ ”میں نے کل کی گرم دوپہر میں آپ کو ایک نہایت گرم لڑائی لڑتے ہوئے دیکھا۔ بہت سی دوسری عورتوں کے ساتھ میں بھی لیڈیز پورشن (زنان خانہ) کی ایک بالکونی میں موجود تھی۔ سر..... سر..... آپ نے کمال کر دکھایا۔ بگ سسٹر شانزے..... جو کچھ آپ کے بارے میں بتاتی تھی، وہ اب میں آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ گریٹ ہو سر..... بلکہ گریٹ سے بھی تھوڑا زیادہ۔“

اچانک مجھے وہ بے ہودہ خط یاد آ گیا جو اس احمق نے کنٹینر کے سفر کے دوران میں میری ٹیپس کی جیب میں پہنچایا

سرخ پتھر کے دیکھے ہوئے فرش پر نیچے پاؤں کھڑے ہو کر اپنے حریف کو اپنے مقابل آنے کا چیلنج کیا وہ یادگار تھا۔ سردار حویلی میں بھی سب لوگ حیران ہیں۔ کچھ سادہ لوح دیہاتوں کا کہنا ہے کہ آپ نے کوئی جادو ٹونا کیا ہوا تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ شاید آپ نے اپنے ٹکڑوں کے نیچے کچھ لگا یا ہوا تھا لیکن میں جانتی ہوں یہ سب آپ کی قوت برداشت کا کرشمہ تھا۔

وہ بات کرتے کرتے بے باکی سے صوفے پر میرے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ میں یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی محبوب بیوی ثروت کی وفات کے بعد میرے مزاج میں عورت کے لیے نہ ہونے کے برابر گنجائش رہ گئی تھی۔ چند ماہ پہلے کوادر میں دراز بالوں والی شانزے کے حوالے سے جو کچھ بھی ہوا، وہ چند ماہ کے اس دورانیے میں ہوا جب زندگی میں دوسری بار میں اپنے ہوش و حواس سے بالکل بیگانہ ہو چکا تھا۔ میں اُن مردوں میں ہرگز ہرگز نہیں تھا جو پختہ عمر میں کسی نوخیز لڑکی کو اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھ کر خود پسندی کے بانس پر چڑھ کر فخر سے پھول جاتے ہیں۔ ان کے اندر کے مرد کو اس امر سے تسکین ملتی ہے کہ وہ جوانی کی عمر سے گزر جانے کے باوجود صنفِ مخالف کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ میں دل کی گہرائی سے چاہ رہا تھا کہ اس غیر محتاط لڑکی کو اپنے پہلو سے اٹھا کر دروازے پر دے ماروں، اور دفن ہو جانے کے لیے کہوں۔ اگر کچ پوچھا جائے تو میں اس سے ایک طرح کی کراہت محسوس کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی نہایت سخت بات کہہ دیتا، وہ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ ”سرا! یہاں کہا یہی جا رہا ہے کہ آپ لوگ اپنے تین ساتھیوں کی رہائی کے لیے یہاں آئے ہیں جو انعامیوں کے پاس ہیں۔ مجھے آپ کے اس معاملے کا تو ٹھیک سے پتا نہیں..... لیکن یہاں سردار حویلی میں کچھ اور معاملے ایسے ہیں جو حیران کن ہیں اور جن کا مجھے پتا چلا ہے۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ دھیمہ اور رازدارانہ ہو گیا۔

”کس طرح کے معاملے؟“ میں ذرا چونکا۔

”سرا! آپ..... یہاں کی کرتا دھرتا کو حار جی کو کیسی عورت سمجھتے ہیں؟“

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اس کا کردار تھوڑا ہٹ کر ہے۔ سردار گزین کے انتقال کے بعد وہ یہاں سردار حویلی کی سربراہ ہے نوجوانی میں ہی اسے کافی اختیار مل گئے

ہیں اور شاہ خانو اسے اپنی دادی مانتا ہے۔“

”جی ہاں وہ اسے دادی مانتا ہے..... لیکن یہ پھر دادی ہے۔“ زانی کے ہونٹوں پر تہم سی مسکراہٹ پھیلی۔ ”یہ اچھی دادی نہیں ہے۔“

”کیا برائی ہے اس میں؟ اکثر لوگ اس سے مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں۔“ میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

”شاید آپ کی نظر میں اسکول والا معاملہ ہے کہ وہ مولانا عبدالکریم اور ان کے دو جاں بحق ہونے والے بیٹوں کی آخری آرزو پوری کرتے ہوئے یہاں ایجوکیشن کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ مجھے یہ معاملہ بھی کچھ زیادہ ”زانیپرٹ“ نظر نہیں آتا..... مگر میں یہاں کو حار زینت کے ذاتی کردار کی بات کر رہی ہوں۔“

اسی اثنا میں ساتھ والے کمرے سے جمشید صاحب کے کھانسنے اور پھر بستر سے اٹھنے کی آواز آئی۔ شاید گرمی اور جس کے سبب وہ ٹھیک سے سو نہیں پار رہے تھے۔ وہ جاگ گئے تھے تو میرے کمرے میں بھی جھانک سکتے تھے۔ کم از کم اندیشہ تو اس بات کا تھا۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”میرا خیال ہے اب تم چلی جاؤ۔“

”ٹھیک ہے سر موقع ملا تو کل رات بارہ بجے کے بعد چکر لگاؤں گی۔ آپ کو نکلنے پریشان نہیں ہونا، میرے لیے یہ بالکل آسان ہے۔“

میں چاہتا تھا کہ اُسے دوبارہ آئیے سے منع کروں مگر وہ ایک ڈیڑھ ماہ سے اکبر خاں کی ”بھینچی“ کی حیثیت سے سردار حویلی میں موجود تھی اور لگتا تھا کہ کافی کچھ جانتی بھی ہے۔ میں نے اسے منع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جمشید صاحب غالباً پھر سو گئے تھے۔ ”گڈ نائٹ سرا!“ اس نے ہولے سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی، تاہم چار پانچ قدم چل کر رک گئی۔ واپس مڑی۔ ”سر جی! اس لیٹر والی غلطی کے لیے پھر سوری..... لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”سرا! آپ بار بار عمر کا ذکر کرتے ہیں۔ میں اتنی چھوٹی نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ میرے برتھ سرٹیفکیٹ میں عمر غلط ہے۔ میں ٹوئنٹی سیکنڈ ایئر میں ہوں۔“

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ شلوار قمیص کے نیچے اس نے جو گر پھین رکھے تھے، بالکل آواز پیدا نہیں ہوئی۔

طویل عمر

”وہ کون شخص ہے جس کی طویل ترین عمر ہوئی ہے؟“
”وہ امیر رشتے دار جس کی موت کے بعد کچھ رقم ملنے کی توقع ہو۔“

دوسرا طریقہ

”ڈارنگ! بیوی نے کہا۔“ کبھی کبھی تو مجھے اپنے رہن سہن پر بڑی شرم آتی ہے۔ میرے والد اس مکان کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ بڑے بھائی نے کھانے اور پینے کا حساب اپنے ذمے لے رکھا ہے، خالہ جان بکلی اور گیس کے بل ادا کرتی ہیں اور میری سبکی مرچانہ دکانوں میں قلم دیکھنے کے لیے کھٹ روانہ کرتی رہتی ہے۔ میں شکایت تو نہیں کرتی، البتہ یہ ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ کیا ہم اس سے بہتر زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے؟“

”کیوں نہیں۔“ شوہر نے کہا۔ ”ابھی تمہارے ایک چچا اور دو بھائی ایسے ہیں جو میں ایک پیسہ بھی نہیں بھیجتے۔“

لاہور سے فرحان اختر کا حساب

انتظار

جنگل میں ایک گدھا بیمار پڑا سسک رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کتا جا بیٹھا اور اسے لپٹائی ہوئی بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گدھے میں اتنا دم نہ تھا کہ اٹھ کر کتے کو دوپٹی رسید کرنا۔ اس نے سیاست سے کام لیا، بولا۔ ”کتے میاں! آج کیا دن ہے؟“

کتے نے جواب دیا۔ ”بدھ، کیوں؟ تم نے دن کیوں پوچھا؟“

گدھے نے کہا۔ ”تم خواہ تو اوقات ضائع کر رہے ہو۔ میں اتوار سے پہلے نہیں مروں گا۔ اس وقت تک تم اپنے دوسرے کام انجام دے ڈالو۔“

کتا گدھے سے زیادہ چالاک تھا، بولا۔ ”بھائی گدھے، تم میرے کاموں کی فکر نہ کرو، اتفاق کی بات کہ میں اتوار تک بالکل فارغ ہوں۔ یہیں بیٹھ کے تمہاری موت کا انتظار کروں گا۔“

لاڈکانہ سے اجیت سنگھ کا چٹلا

اگلے روز رات کے کھانے پر علاقے کے نئے ڈی ایس بی فیاض خان سے بھی ملاقات ہوئی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی پہلے افسر کی طرح سرکار سے زیادہ سردار حویلی کا ملازم ہے۔ شاہ خانو کی موجودگی میں اس نے اپنی اب تک کی کارکردگی کے بارے میں بتایا اور پورا یقین دلایا کہ زر قاب خاں اور دولت خاں کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی جائے گی۔ فیاض خان نے ایک دن پہلے تاجک لڑکی دلربا سے بھی ملاقات کی تھی اور اس سے پوچھ چکھ کرتا رہا تھا۔ دلربا پر مجھے اور جمشید صاحب کو پورا بھروسہ ہو چکا تھا کہ وہ اس بُروداد کا اہم ترین راز اپنے سینے میں ہی رکھے گی۔

رات قدرے گرم تھی لیکن تھوڑی ہوا بھی چل رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تھوڑی ہی دیر بعد شاہ زیب کا ساتھی پہلوان حشمت آدھکا۔ وہ اس بات پر خوش نظر آتا تھا کہ میری اور شاہ زیب کی صلح ہو گئی ہے۔ عمران کی طرح وہ بھی دلچسپ باتیں کرتا تھا اور کبھی کبھی بے پرکی بھی اُڑانے لگتا تھا۔

میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو جی، مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تم دونوں کی عزت رہ گئی ہے۔ کسی کی ہار ہوئی اور نہ جیت۔“

پھر پہلوان نے میری کسی درخواست کے بغیر ہی میری ٹانگ کا معائنہ کیا اور ماہرانہ انداز میں کہا۔ ”ٹائش صاحب! اب تم کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ چوٹ تازہ ہو جاوے گی اور محتاط رہنے والی بات میں صرف ٹانگ کی وجہ سے ہی نہیں کہہ رہا۔“

”تو پھر.....؟“

”بڑا نہ ماننا..... کوئی ذرا سی بات شاہ زیب کو پھر بھڑکانے کا سبب ہے۔ وہ دل کا بڑانا ہیں۔ بہت کھرا بندہ ہے اور کھرے بندے تمہاری ہی طرح ہتھ سے جلد اکھڑ جاوتے ہیں۔“

”یہ بات اُس کو بھی بتانا۔“ میں نے کہا۔
”اچھا چھوڑ دیجی ان باتوں کو۔“ لوسل صفائی کی خوشی میں یہ موتی چور لڈو کھاؤ۔ خالص بیسن اور دیسی مٹی کے ہیں۔ یہ دیکھو بیچ میں تل اور بادام بھی لگے ہیں۔“

ایک چھوٹے ڈبے میں یہ چار بڑے لڈو تھے۔ میں نے ایک لڈو تھوڑا سا چکھا، باقی ساڑھے تین، پونے چار لڈو پہلوان جی خود ہی کھا گئے۔ ساتھ ساتھ تعریف کرتے جاتے تھے۔ ”شاید کسی کو جانندھر کے نام کا بھی پتا نہ ہوتا۔ یہ صرف

لڈو ہے جس کی وجہ سے لوگ جالندھر کو جانتے ہیں۔ اب سچ بتانا یہ لڈو جو تم نے کھائے ہیں۔ جالندھر کے لڈو سے کم ہیں؟“ میں نے ہلکی سی ہر ہلایا۔

وہ بولے۔ ”ایسے کئی علاقے اور شہر ہیں جو خود مشہور نہیں تھے کسی وجہ سے مشہور ہوئے۔۔۔ شاید تمہیں یقین نہیں آوے گا۔ یہ جو ملتان ہے سو بہن طوے کی وجہ سے اتنا مشہور نہیں جتنا میرے دادا اور چچا دادا کی وجہ سے مشہور ہوا۔“

”وہ کیسے پہلوان جی؟“

”تم نے جتنی توسنی ہووے گی۔“

”مجھنی جاگھسی ملتان، وہاں بڑے بڑے پہلوان کھائیں گریاں اور بادام، ماریں مٹکا کڈیں جیانا“

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے محسوسانہ انداز میں بات جاری رکھی۔ ”اس جگہ میں جن پہلوانوں کا ذکر ہے ان میں میرے دادا اور چچا دادا سر فرست تھے۔ ملتان ہی نہیں پورے سندھ میں ان کا نام گونجت تھا۔“

”سندھ میں؟ لیکن ملتان تو شاید پنجاب میں آتا ہے۔“

پہلوان جی ذرا چوٹے پھر سنبھل کر بولے۔ ”یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔۔۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے بولے۔ ”ویسے ہو سکے تو چائے ضرور پی لیتا۔“ مٹی ہو یا ٹھیکین لیکن گرم ہو۔ لڈوؤں کے بعد اچھی ہودت ہے۔“

پہلوان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا مگر خیندا بھی آنکھوں سے دور تھی۔ میں بستر پر نیم دراز خیالات کے تانے بانے میں رہا تھا۔ میں نے زانی کو آنے سے منع نہیں کیا تھا مگر یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہاں آتے ہوئے وہ کسی کی نظر میں نہ آ جائے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر بہت مدھم دستک ہوگئی۔ وہ آگئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا وہ چھپاک سے کمرے میں گھس آئی۔ کل کی طرح وہ بلوچی طرز کی شلوار قمیض میں تھی لیکن پاؤں میں جوگرتے تھے۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ چھینٹا پتی ہوئی آئی ہے اور کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ وہ زنان خانے سے نکل رہی ہے۔

میں نے اسے لمبی چوڑی باتوں کی طرف نہیں جانے دیا۔ جلد ہی مدعا پر آگیا۔ میں نے کہا۔ ”زانی اکل تم مجھے

گو حار زینت کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہی تھیں۔“ ”بتاتی ہوں سر اسی لیے تو آئی ہوں۔ لیکن کیا اس سے پہلے آپ اس زبردست اور حیران کن اتفاق پر کوئی بات نہیں کریں گے کہ ہم ایک بار پھر اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں؟“

”اچھے بُرے اتفاقات تو ہوتے ہی ہیں زندگی میں۔ یہ بھی ایک زبردست اتفاق ہے۔“

”لیکن اچھا ہے یا بُرا؟“ اس نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

”نی الحال تو بُرا نہیں ہے۔ لیکن اگر تم اسی طرح بیکار باتیں کرتی رہیں تو بُرا ہو بھی سکتا ہے۔“

میرے لہجے کی گہری سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے، وہ بھی کچھ سنجیدہ ہوئی۔ ”سر! یہ سردار حویلی بلکہ سارا علاقہ عجب گورکھ دھندا ہے۔ یہ بے رحم، سفاک لوگ بھیدوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یقیناً آپ کو بھی بہت عجیب لگتا ہوگا یہ دیکھ کر کہ شاہ خاں کی دادی جسے وہ دالی ماں کہتا ہے تقریباً اس کی ہم عمر ہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ شاہ خاں کے دادا صاحب یعنی سردار گزین نے 75 سال کی عمر میں گوہار زینت سے شادی کی اور پھر تین چار سال بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسی عمر میں گوہار زینت بیوی کیسے کاٹ سکتی تھی۔ لہذا اس نے یہاں ایک جوان بندے سے ٹانگا جوڑ رکھا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا سر؟“

”کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”ثبوت ہے تو بات کر رہی ہوں نا۔۔۔ اور سر یہ ثبوت یونہی نہیں ملا مجھے۔ بہت خطرہ مول لیا میں نے۔“ زانی نے صوفے پر باقاعدہ آلتی پالتی ماری اور میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”زنان خانے کی رسوئی کے پاس ایک لمبی راہداری ہے۔ اس کے آخر میں دو کمرے ہیں، ان کمروں کی طرف کوئی بھی نہیں جاتا۔ سختی سے منع ہے۔ ایک رات مجھے شک گزرا کہ گوہار زینت ایک لمبی کالی چادر اوڑھ کر ان کمروں کی طرف گئی ہے۔ اس وقت تو میں کچھ نہ کر سکی مگر دو راتوں بعد جب ایک دفعہ پھر ان کمروں کی طرف گئی تو میں نے رسک لے کر اس کا پیچھا کیا اور وہ سب کچھ دیکھا جو حیران کر دینے والا تھا۔“

شاید وہ تفصیل بتانا چاہتی تھی مگر میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ وہاں کسی بندے سے ملتی ہے۔“

”صرف ملتی ہی نہیں ہے۔“ زانی نے آنکھیں

نکال کر میرے سامنے کر دی۔ اسے حیران کن دڈیو کہنا چاہیے اور یہ یقیناً اسی قدیمی طرز کے بڑے روشندان سے بنائی گئی تھی۔ کوئی بہت اچھی نہیں تھی، آواز بھی نہیں تھی پھر بھی سارا ماجرا سمجھ میں آ رہا تھا۔

میں عمران جو نیز کو ایک بار پھر اسی تصویر والے کمرے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی جہازی سائز کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ صاف ستھری پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سامنے گویا زینت تھی مگر حیران کن طور پر وہ بالکل معمولی شلوار قمیص میں تھی، جیسے سردار حویلی کی کوئی ادنیٰ ملازمہ ہو۔ عمران کے سینے پر تولیا پھیلا ہوا تھا، قریب ہی شیو بنانے کا سامان بھی رکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے تک گویا زینت خود عمران کی شیو بناتی رہی ہے۔ پھر اس نے تولیا سمیٹ کر عمران کی ٹھوڑی وغیرہ صاف کی۔ بالکل اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے ہاتھوں کے ناخن تراشنے لگی۔ جب پاؤں کے ناخنوں کی باری آئی۔ اس نے خود عمران کی چپل اتاری اور کسی معمولی کنیز کی طرح قالین پر بیٹھ کر ناخن تراشے۔ عمران بے حد سنجیدہ بلکہ بیزار نظر آتا تھا۔ گویا زینت کا لباس معمولی اور خستہ ہونے کے باوجود ایسا تھا کہ نگاہوں کو اس کے جوان جسم کی طرف متوجہ کر دیتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ عمران پر لدی گئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی، دوسری طرف صوفے پر بیٹھے عمران کی ہر حرکت سے اکتاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ بھی بول رہا تھا لیکن گویا زینت سے بہت کم۔

وہ محبت سے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ ٹھوڑی کے گڑھے کو چھوتی رہی۔ تب اس نے اپنے ہونٹ عمران کے ہونٹوں کے بالکل مقابل کر دیے۔ جیسے شدت سے چاہ رہی ہو کہ عمران خود اپنے ہونٹ اس کی طرف بڑھائے۔ مگر وہ اسی طرح گریزاں بیٹھا رہا۔ وہ لجاجت کا اظہار کر رہی تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ اس نے منت سماجت والا ماحول بنایا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے خود عمران کا ایک ہاتھ پکڑا اور ذرا مسکراتے ہوئے اپنے کندھے پر رکھ دیا۔ جیسے وہ خود چاہ رہی ہو کہ عمران اسے جگہ جگہ سے چھوئے، اس قربت کا فائدہ اٹھائے مگر جب وہ ٹیس سے مس نہ ہوا تو یکایک اس کے تاثرات بدل گئے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے اس نے عمران کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے سر کو زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ وہ طیش میں آگ بگولا ہو گئی تھی۔ چھوٹی تپائی پر رکھا ہوا ایک گلاس اس نے اٹھایا اور دیوار پر پٹخ کر چکنا چور کر دیا۔ تب

نچائیں۔ ”ایک پورا ڈراما ہوتا ہے وہاں..... اور میں پروف کے بغیر بات نہیں کر رہی ہوں جی۔“

اس نے اپنی چادر نما اوڑھنی کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لباس میں سے ٹچ موبائل نکال کر ایک تصویر مجھے دکھائی۔ یہ تصویر کسی پرانی طرز کے ادھ کھلے روشندان میں سے اتاری گئی تھی۔ تصویر اتنی صاف نہیں تھی مگر واضح طور پر پتا چل جاتا تھا کہ گویا زینت یا اس جیسی کوئی عورت ایک مرد کے ساتھ تنہائی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس مرد کو دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ وہ عمران تھا۔ سو فیصد عمران تھا۔ وہ دھاری دار شرٹ اور ڈراؤزر پہنے ایک جہازی سائز کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ ایک لڑکی اس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکا کر بڑی لگاؤ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ نوے فیصد امکان تھا کہ یہ گویا زینت ہی ہے۔ عمران کا وزن پہلے سے کچھ کم نظر آتا تھا اور وہ کم صم سا تھا۔

میرا دل بول اچھلنے لگا۔ مطلب یہ تھا کہ عمران کا سراغ لگ گیا ہے اور وہ مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اسی سردار حویلی میں کہیں پایا جاتا ہے۔

زانی غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”اپنی بولی۔“ ”سرا! کیا یہ بندہ آپ نے پہلے دیکھا ہوا ہے؟“ ”نہیں..... نہیں تو..... مگر..... یہ تصویر جو تم دکھا رہی ہو، اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔“

”ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے سرگشہ.....“ وہ ذرا چپک کر بولی۔ ”آپ دیکھیں گے اور خود کہیں گے..... ہاں، ہاں زانی ڈیئر..... ثابت ہو گیا..... بالکل ہو گیا۔“ جوش کی وجہ سے اس کی آواز ذرا بلند ہو گئی تھی۔ میں نے اسے گھورا۔ اس نے جلدی سے کالوں کو ہاتھ لگائے۔ ”سوری جی سوری۔“ اور اس جانب دیکھنے لگی جدھر جمشید صاحب کے کمرے کا دروازہ تھا، میں نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”یہ تصویر جو تم نے دکھائی ہے، اتاری کیسے، یہ تو کسی کمرے کا روشندان لگتا ہے؟“ ”اور میں آپ کو کیا لگتی ہوں؟“ وہ اپنے ہاتھوں کے پيالے میں ٹھوڑی ٹکا کر بولی۔ ”کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں روشندان پر نہیں چڑھ سکتی۔ میں تو مینار پاکستان پر چڑھ سکتی ہوں، بغیر لفٹ یا سیڑھی کے۔ مذاق نہیں جی، جمناسٹر ہوں میں۔“ اس نے اپنے ڈولے دکھائے۔

جب میرے چہرے پر بدستور سنجیدگی دیکھی تو جلدی جلدی موبائل کی اسکرین پر انگلی چلانے لگی اور ایک دڈیو

ریت میں تھڑکی گئی۔

انوار کے پاس قہر ماس موجود تھا۔ اس نے قہر ماس کے ڈھکن میں پانی انڈیل کر اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے دو گھونٹ لیے پھر ٹوٹی آواز میں بولا۔ ”بارہ سے اوپر ٹائم ہو گیا ہے۔۔۔ زیادہ وقت نہیں۔۔۔ کچھ کر سکتے ہو تو جلدی کر لو۔۔۔ بہت سے بچے مر جائیں گے۔۔۔“

اس کی آنکھوں کی پتلیاں الٹ رہی تھیں۔ غشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا، چند قہرے اس نے مزید بولے کہ کچھ لوگوں نے اس سے اسکول میں دھماکا فیز مواد نصب کرایا ہے مگر اسے یہی بتایا گیا کہ یہ اسکول والوں کو صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ جب اسے حقیقت کا پتا چلا تو وہ برداشت نہ کر سکا۔ یہ انکشاف اس پر تھوڑی ہی دیر پہلے ہوا تھا۔ وہ اسکول کی طرف بھاگا تاکہ اسکول والوں کو اس سنگین ترین خطرے سے آگاہ کر سکے۔ جن لوگوں نے اس سے یہ کام کرایا تھا، وہ اس کے پیچھے لپکے۔ اسکول کے عقبی دروازے کے قریب انہوں نے اس پر فائرنگ کی اور زخمی کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ہمیں جو فائر سنائی دیے تھے وہ یہی تھے۔

بات کرتے کرتے زخمی کو ایک دم ہلکی سی آنے لگی پھر اس پر مکمل غشی طاری ہوئی اور وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے میرے اور انوار مشکوری کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ زخمی نے جو کچھ بتایا اگر وہ درست تھا تو پھر ہمارے پاس صرف دس پندرہ منٹ ہی بچے تھے۔ میں اور انوار اٹھ کر اسکول کی طرف بھاگے۔ جس ٹیلے پر ہم دونوں بیٹھے تھے وہاں سے گوٹھ کی آبادی کا فاصلہ ایک کلو میٹر سے کم نہیں تھا۔ ہم نے یہ فاصلہ بھاگتے ہوئے ہی طے کیا۔ ساتھ ساتھ میں موبائل پر اپنے ریزرو اہلکاروں سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

اسکول کے مین گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو ہم دھکیلتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک بارش نیچر نظر آیا جو چند بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میری کیفیت دیکھ کر وہ چونکا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”بچوں کو جلدی نکالو یہاں سے۔ یہاں سخت خطرہ ہے۔ بارودی مواد پھٹ سکتا ہے۔۔۔ جلدی کرو۔“

نیچر ہٹا بٹا کھڑا تھا جیسے کچھ سمجھ ہی نہ پا رہا ہو۔ میں نے اس کے پاس کھڑے بچوں کو مین گیٹ کی طرف دھکیلا۔ ”بھاگو۔۔۔ نکلو یہاں سے۔۔۔ فوراً نکلو۔“

دوسری طرف انوار مشکوری بالکل چھوٹی ننھی بچیوں

توجع ہونے والے لوگوں میں کھانا اور بچوں میں مفت کتابیں وغیرہ بھی تقسیم کی گئیں۔ شاہ زیب اور دیگر مہمان بھی اس تقریب میں شریک تھے۔

اگلا دن سوموار کا تھا اور تب سے باقاعدہ پڑھائی شروع ہونا تھی۔ یہ پھر ایک گرم دن تھا۔۔۔ مجھے حویلی میں گھٹن سی محسوس ہوتی تھی۔ میں انوار مشکوری کے ساتھ گوٹھ سے باہر چلا گیا۔ کوئی ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ایک ٹیلا سا تھا اور یہاں درختوں کی وجہ سے درجہ حرارت کچھ کم محسوس ہوتا تھا۔ ہم وہاں جا بیٹھے۔۔۔ جگہ بالکل سناں دکھائی دیتی تھی۔ مقامی لوگ گوٹھ میں ہی اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ اسی اثنا میں گوٹھ کی جانب سے دو فائر ہونے کی مدہم آواز سنائی دی۔ ہم نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اٹا ڈکا شوقیہ فائر بھی ہوتے رہتے تھے۔ تاہم چند منٹ بعد ہم اس وقت بری طرح چونکے جب قریب ہی جھاڑ جھنکار میں بھاگتے قدموں کی دھب دھب سنائی دی۔ پھر براؤن شلوار قمیص والا ایک شخص جھاڑیوں سے نکل کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کا ایک پہلو خون سے تر تھا۔ میں تو ہمیشہ کی طرح سادہ لباس میں ہی تھا، البتہ انوار نے وردی پکٹن رکھی تھی۔

انوار کو دیکھ کر وہ رک گیا اور ہمارے سامنے آ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ گولی اس کی کمر میں کندھے سے نیچے لگی تھی، وہ بُری طرح ہانپا ہوا تھا۔ سانس اٹک رہی تھی۔ بغیر کسی تمہید کے وہ بولا۔ ”آپ پولیس والے ہو، میں تھانے جانے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔ اگر۔۔۔ کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ تو جلدی کر لیں۔ اسکول میں بچوں کی زندگی خطرے میں ہے۔۔۔ اُن میں سے۔۔۔ بہت سے مارے جائیں گے۔۔۔ اسکول کے دو کمروں میں ڈائنامائٹ فٹ ہے۔ وہ ٹائم بم کی شکل میں ہے۔۔۔ بارہ بج کر تیس منٹ پر یہ دونوں بم پھٹ جائیں گے۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ ”اور تمہیں گولی کس نے ماری؟“

”انہی لوگوں نے۔۔۔ جنہوں نے مجھ سے یہ قلم کرایا ہے۔ انہوں نے۔۔۔ مجھے بھی دھوکا دیا۔۔۔ انہوں نے کہا تھا، یہ صرف ڈرانے کے لیے ہے لیکن۔۔۔ لیکن انہوں نے بلاسٹ کا ٹائم بدلا ہے۔۔۔ انہوں نے دھوکا کیا۔۔۔ م۔۔۔ میں گناہ گار ہوں۔۔۔ لیکن اتنا بڑا گناہ۔۔۔؟ نہیں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔۔۔“

وہ ادغہ مہم نہ گرا۔ اس کی جھاڑ جھنکار ڈاڑھی مٹی اور

کے کلاس روم میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ انہیں کھینچ کھینچ کر کمرے سے نکال رہا تھا اور مین گیٹ کی طرف دھکیل رہا تھا۔ بچے اب خود بھی ہراساں ہو چکے تھے اور کمرے سے نکل نکل کر مین دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

ایک قاری صاحب نے انوار کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔
”آپ کیوں کر رہے ہو ایسا؟ کیا ہو گیا ہے؟“

”اسکول میں بم کی اطلاع ہے۔ کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔“ انوار چلا آیا۔

”تمہی بچوں والا کلاس روم بمشکل خالی ہوا ہی تھا کہ ایک سماعت ٹھن دھماکا ہوا۔ درود یو آر رزے اور کلاس روم کی جگہ گرد و غبار کا دبیز بادل نظر آیا۔ میں نے ایک انسانی دھڑکھڑاہٹ میں اچھلتے اور دور درختوں میں گرتے دیکھا۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میری قوت سماعت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے بچے گرتے پڑتے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب دوسرا زوردار دھماکا ہوا۔ یہ نسبتاً بڑی کلاس کے بچوں کے کمرے کی طرف ہوا۔ بد قسمتی سے یہاں دس پندرہ بچے ابھی موجود تھے۔ کلاس روم کی چھت پڑے کی دھجیوں اور ٹوٹے پھوٹے فرنیچر سمیت ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ ایک بلند و بالا جھنڈا جس پر لکھا تھا۔ علم، طاقت ہے، ٹوٹ کر زمین ہوس ہوا اور اس آگ میں دھڑا دھڑ چلنے لگا جو دوسرے دھماکے کے بعد سرعت سے پھیل رہی تھی۔

ان مناظر کو بیان کرنے کے لیے لوہے کا جگر درکار ہے۔ میرے عین سامنے دو تین بچے جن کی عمریں آٹھ نو سال کے قریب تھیں، پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھے اور بڑی طرح تڑپ رہے تھے۔ ستم یہ کہ ان کے جلتے ہوئے جسم سلامت بھی نہیں تھے۔ ہاں یہ وہی بچے تھے جو آج صبح صاف سحرے یونیفارم پہن کر اپنی نئی نویلی کتابوں کو سینے سے لگائے، اپنی پیشانیوں پر اپنی ماؤں کے آخری بوسے وصول کر کے بڑے چاؤ سے اسکول کی طرف آئے تھے۔ اب وہ موت کے بے رحم شکنجے میں تھے۔ میں انہیں بچانے کے لیے ان کی طرف بڑھا مگر پھر مجھے صاف پتا چلا کہ ان کے لیے کوشش کرنا اب بیکار ہے۔ ان دو تین بچوں سے زیادہ مدد کی ضرورت ان بچوں کو تھی جو دھڑا دھڑ جلتے کلاس روم میں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ میں نے زمین پر گری ہوئی ایک چادر اٹھا کر جسم کے گرد لپیٹی اور جلتے ہوئے کلاس روم کی طرف لپکا۔ جواں ہمت انوار کٹھوری میرے پیچھے

آ رہا تھا۔ تپش تھی اور جلتے گوشت کی پھینکی ہوئی بو تھی۔ دھوئیں میں بھڑی طرح کھانٹتے اور چلاتے ہوئے ایک سات آٹھ سالہ بچے کو میں نے اٹھایا تو وہ اس طرح مجھ سے چٹا کہ مجھے جکڑ ڈالا۔ میں نے بمشکل دوسرے بچے کو بغل میں دبایا اور انہیں باہر لے آیا۔ اب بیسیوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ریزرو پولیس والے بھی زمیں دار کی حویلی سے نکل کر بھاگتے ہوئے مدد کے لیے آ رہے تھے۔

اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں، میں تین مرتبہ آگ اور دھوئیں میں گھسا، چار پانچ بچوں کو باہر نکالا۔ تب میری نگاہ جواں سال سردار نی کو حار زینت پر پڑی۔ وہ ایک مکلی جیپ میں یہاں پہنچی تھی۔ شاہ خانو بھی ساتھ تھا۔ گو حار زینت کے تاثرات سے لگتا تھا کہ یہ صدمہ اُس کے لیے ”نا قابل برداشت“ ہے۔ وہ ارد گرد کھڑے لوگوں پر دہاڑ رہی تھی۔ ”آگے بڑھو۔۔۔۔۔ مدد کرو۔ پانی بھینکو آگ پر۔۔۔۔۔ بچوں کو نکالو۔۔۔۔۔“

میرا جی چاہا کہ اُس کا منہ نوچ لوں۔ میرے دل کی گواہی تھی کہ جو آگ بجھانے کا کہہ رہی ہے، وہی آگ لگانے والی ہے۔

ایک بوڑھا اپنا سفید سر پیٹ رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک پانچ چھ سالہ معصوم بچی کی سخ لاش پڑی تھی۔ یہ غالباً اس کی پوتی یا لڑکی تھی۔ وہ لوحہ خواں تھا۔۔۔۔۔ وہ پکار رہا تھا۔ ”اور کھولو اسکول۔۔۔۔۔ اور دو انگریزی تعلیم۔۔۔۔۔ اور اوپر والے کے غضب کو آواز دو۔ ہمیں نہیں چاہیے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ ہمیں اپنے بچوں کی زندگیاں چاہئیں۔ ہائے میری سوہنی۔“ وہ لاش کو اٹھا کر اپنے سینے میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔

قیامت صغریٰ کے مناظر تھے۔ گو حار زینت کی ہدایت پر چار پانچ گاڑیاں موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ سردار حویلی کے ملازم زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال رہے تھے۔ شاہ خانو کے علاوہ گو حار زینت خود بھی زخمیوں کو اٹھانے میں مدد کرنے لگی۔ یہ گو حار زینت دو چہروں والی خطرناک بلا دکھائی دے رہی تھی مجھے۔ میرا خون بڑی طرح کھولنے لگا تھا۔

گمشدہ ماضی کی کھوج میں سرگرداں
ایک سر پھرے اجنبی کی دیوانگی اور جنوبی
سرکشی کی سنسنی خیز داستان کے ہائی۔
واقعات اگلے ماہ پڑھیں۔

زہریلی مکھی

پروفیسر خلیل جبار

ایک لمحہ... صرف ایک لمحہ ہی کامیابی سے ہمکنار کر
سکتا ہے... اور ایک ہی لمحہ کامیابی کو ناکامی میں بدل
سکتا ہے... اپنی آرزو کی تکمیل کے لیے نائے گئے ایک
منصوبے میں رونما ہونے والے تغیرات...

زندگی و موت کی سنسنی خیز بازی..... جو آخری لمحوں میں الٹ پھرتی ہے۔

”روزانہ ہی میں خوش رہتی ہوں۔“ نیسی نے کہا۔
”جانتا ہوں، تم سے دوستی بھی اسی لیے کی ہے۔“
”تم ہر وقت خوش رہنا چاہتے ہو؟“ نیسی نے کہا۔
”اس میں کوئی شک نہیں، زندگی ایک بار ملتی ہے اسے
بھر پور طریقے سے گزارنا چاہیے۔“ کارٹر نے کہا۔
”بالکل میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں۔“
نیسی نے کہا۔
”ہماری دوستی کو ایک سال ہو چکا ہے۔“ کارٹر نے کہا۔

وہ اپنی بیوی سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس کی
بیوی کو اس کے دادا جان کی طرف سے ملنے والی دولت نے کچھ
اور ہی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کسی صورت اس دولت کو کھونا
نہیں چاہتا تھا۔
کارٹر اور نیسی بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بار میں ہلکی
پھلکی موسیقی چل رہی تھی۔ نیسی کے چہرے سے خوشی پھوٹ
رہی تھی۔ کارٹر بھی یہ بات محسوس کر چکا تھا۔
”آج تم بہت خوش ہو چہ؟“ کارٹر نے پوچھا۔



”ہماری دوستی روز بروز مضبوط سے مضبوط ہو رہی ہے۔“

”ہاں۔“ کارٹر نے کہا۔

”ہماری دوستی کو مضبوط رشتے میں تبدیل کرنے کو ہمارا بچہ اس دنیا میں آنے کو تیار ہے۔“ نینسی نے مسکراتے ہوئے کارٹر کی طرف دیکھا۔

یہ بات سن کر کارٹر کو زوردار جھٹکا لگا۔ یہ خبر اس کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”تمہیں کیا ہوا، کس سوچ میں ڈوب گئے...؟“

”تم نے خبر ہی ایسی سنائی ہے۔“ کارٹر نے کہا۔

”اچھی خبر سنائی ہے، تمہیں تو اس خبر پر خوش ہونا چاہیے۔“

”آج سے کچھ دن پہلے تم یہ خبر سنائیں تو میں بہت خوش ہوتا۔“

”اور اب کیوں خوش نہیں ہو؟“ نینسی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں اپنی بدتمیز بیوی سلی سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن۔“

”اب کیا ہوا؟“

”سلی کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیوں؟“

”اس کی خاص وجہ ہے۔“

”خاص وجہ؟“ وہ چونکی۔

”جس ادارے میں کام کرتا ہوں، اس ادارے کے مالی حالات خراب چل رہے ہیں، ابھی بھی چھانٹی ہو سکتی ہے۔“

”اداروں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔“

”ان دنوں میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ادارہ مجھے فارغ کر دے، جب تک مجھے کسی دوسرے ادارے سے آفر نہ ہو جائے، میں نہیں چاہتا کہ ادارہ مجھے فارغ کر دے۔“

”اچھا تو اس لیے خوفزدہ ہو؟“

”اور بھی وجہ ہے۔“

”اچھا اور کیا وجہ، کہیں تمہیں سلی سے زیادہ محبت تو نہیں ہو گئی ہے؟“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

”مجبور ہو گیا ہوں۔“

”کیسی مجبوری؟“

”میری بیوی سلی کے دادا اسمتھ کا انتقال ہو چکا ہے، جس کے اثاثوں کی مالیت 40 ارب کے قریب ہے، وہ سوسٹرز

لینڈ کا امیر ترین شخص تھا، اس کی وصیت کے مطابق سلی کو دس ارب ملیں گے۔“

”اوہ!.....“ وہ چونکی۔

”تم سے شادی کرنے کے لیے مجھے سلی کو طلاق دینا پڑے گی، ایسی صورت میں سلی کو ملنے والی دولت سے میں محروم ہو جاؤں گا۔“ کارٹر نے کہا۔

”میرے اور تمہارے آنے والے بچے کا کیا بنے گا؟“

”تمہارے کئی دوست ہیں، کسی بھی دوست کو یہ کہہ کر کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو، اس سے شادی کر سکتی ہو۔“

”جس نوعیت کے تعلقات میرے تم سے ہیں، اس نوعیت کے، میں نے کسی اور دوست سے تعلقات نہیں بنائے۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”شادی۔“

”موجودہ صورت حال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“ کارٹر نے کہا۔

”ناممکن کو ممکن تم بنا سکتے ہو۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس بات کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیں۔“

”یہ موضوع ایسا نہیں ہے کہ زیادہ عرصے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔“

”اس موضوع پر فی الحال میں بات نہیں کرنا چاہتا۔“

کارٹر نے دو ٹوک جواب دیا۔

”ابھی نہیں تو کسی اور دن پر رکھ لیتے ہیں۔“ نینسی نے کہا۔

”یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔“ کارٹر نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

وہ بظاہر نینسی پر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، لیکن اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ نینسی سے کس طرح جان چھڑائے۔ یہ حقیقت تھی، جس وقت اس کی نینسی سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی، وہ اپنی بیوی سے بہت پریشان تھا اور اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا، جب نینسی سے ملاقات ہوئی کارٹر کو محسوس ہوا کہ جس محبوب بیوی کی اسے تلاش ہے وہ اب ملی ہے، اس کے ساتھ شادی کر کے وہ ایک کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ ایک ملاقات کے بعد ان کی ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اب اکثر ملاقاتیں کرنے لگے۔

کارٹر کو سلی کے دادا اسمتھ کی وصیت کے مطابق دولت ملنے کا نہ پتا چلتا تو وہ نینسی کی زبانی حاملہ ہونے کی خبر پر بہت خوش ہوتا،

زہریلیں مکتھیں

”کیا مرد ایسا نہیں سوچے؟“ سلی نے ترکی بڑی کہی۔
”حالات و واقعات سے اندازہ ہو جاتا ہے، اس لیے
عورت پر شک کر بیٹھتا ہے۔“ کارٹر نے کہا۔
”تمہاری بڑھتی ملاقاتوں نے مجھے تشویش میں مبتلا کر
دیا ہے، اس لیے اپنے شک کا اظہار کر دیا، اگر میرا شک درست
نہایت ہوا، تو تم میرے غصے کو برداشت نہیں کر سکو گے۔“ سلی
نے کہا۔

”اب تک تمہارا ہی غصہ برداشت کرتا ہوا آ رہا ہوں۔“
کارٹر نے کہا۔

”میں میں چاہتی ہوں۔“
”کیا!“ کارٹر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”کہ کوئی اور تم پر غصہ نہ کرے۔“ سلی مسکرائی۔
”نہیں اگر حالہ نہ ہوتی وہ کارٹر کو آسانی سے بھٹا دیتی۔
ایسا کرتے ہوئے اسے وقتی طور پر تکلیف ضرور ہوتی، لیکن اس
جدائی کو سہہ جاتی، لیکن اب صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ
کسی صورت کارٹر کو کھوٹ نہیں چاہتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر جانے پر وہ ایک بار پھر بار میں بیٹھے تھے۔
کارٹر کے چہرے سے غم مندی جھلک رہی تھی۔

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ نینسی نے پوچھا۔
”پورے ایک ہفتے میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا
رہا ہوں۔“

”مجھ سے زیادہ دنیا میں جو بچے آنے والا ہے اس کے
بارے میں غور و فکر کرو۔“ نینسی نے کہا۔

”اس بچے نے ہی میری سوچ کو تبدیل کر دیا ہے۔“
”اچھا تم کیا چاہ رہے ہو؟“

”پہلے میرا ارادہ تھا کہ تم اس بچے کو ضائع کر دو، یا اپنے
کسی فریڈ کو اس بچے کے باپ کا نام دے دو۔“

”اور اب کیا ارادے ہیں؟“ نینسی نے پوچھا۔
”تم جانتی ہو میری بیوی بد زبان ہے، ابھی وہ اتنی بد

زبان ہے تو دولت مل جانے پر وہ مجھے اپنی ٹھوکروں پر رکھے
گی۔“ کارٹر نے کہا۔

”وہ کیا، کوئی بھی عورت دولت مل جانے پر خود کو ہواؤں
پر اڑاتا محسوس کرے گی۔“ نینسی نے کہا۔

”شادی کو دس سال گزر جانے پر بھی وہ مجھے ایک بچہ بھی نہ
دے گی۔“

”تم نے کسی اسپیشلسٹ سے رجوع نہیں کیا؟“ نینسی
نے پوچھا۔

”اولاد کی کس کو خواہش نہیں ہوتی۔“

اور بچے کو نینسی کی دوستی کا جذبہ سمجھ کر قبول کر لیتا، لیکن اب حالات
مختلف ہو چکے تھے۔ کارٹر نے نینسی سے اپنی بیوی سلی کے بارے
میں غلط فہمی گہا تھا۔ وہ ایک بد چیز عورت تھی۔ وہ کئی بار کارٹر کے
ساتھ اس سے ملاقاتیں کر چکی تھی۔ سلی کو ان دونوں کی بڑھتی
ملاقاتوں پر شک ہونے لگا تھا، وہ کئی بار اپنے شک کا اظہار بھی کر
چکی تھی، اس کا شک دور کرنے کو اس نے یقین دلانے کی پوری
کوشش بھی کی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہے، وہ اس کے جواب سے
 مطمئن نہیں تھی۔

ایک روز اس کے دیر سے گھر آنے پر وہ بولی۔ ”تم
ضرور نینسی کے ساتھ ہو گے؟“

”تم سے میں بالکل بھی جھوٹ نہیں بولوں گا، ہاں میں
اس کے ساتھ ایک پارٹی میں تھا، کیونکہ مجھے اس تقریب کی
رپورٹ تیار کر کے ادارے کو دینا تھی۔“

”نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم دونوں کے
درمیان کچھ چل رہا ہے۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا تم تصور کر رہی ہو۔“
”تو تم دونوں کی بڑھتی ہوئی ملاقاتوں کو میں کیا نام

دوں؟“
”دوستی اور کچھ نہیں۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔“
”تم سنجیدہ ہو تو میں بھی رنجیدہ نہیں ہوں۔“

”نینسی سے دوستی کی کوئی خاص وجہ؟“ سلی نے اس
کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”وہ ایک خبر رساں ادارے میں کام کرتی ہے اور میں
بھی وہی بات ہم میں مشترک ہے، ایک ہی شعبے میں کام

کرنے پر دوستی ہو جانا اور رابطے رکھنا فطری ہی بات ہے۔“
”ٹھیک ہے یہ تعلقات دوستی تک ہی رہنا چاہئیں، دوستی

سے زیادہ نہیں بڑھنے چاہئیں۔“
”جیسا تم سوچ رہی ہو، ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”یہ بات میں کسی صورت برداشت نہیں کروں گی کہ
تمہارے اس سے تعلقات میں مزید اضافہ ہو۔“

”تعلقات میں مزید اضافے سے تمہاری کیا مراد
ہے؟“ کارٹر نے پوچھا۔

”ایک مرد اور ایک عورت کے تعلقات کس نوعیت تک
جاسکتے ہیں یہ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔“ سلی نے مسیخی خیر

انداز میں اسے دیکھا۔
”عورت ہونا اس لیے ایسا سوچ رہی ہو۔“ کارٹر نے

کہا۔

کی بے شمار فائلیں بھری پڑی ہیں، پولیس نے سرتوڑ جدوجہد کی، لیکن قتل کے مقدمے میں ملوث ملزمان تک نہیں پہنچ سکی۔
”مجھے بھی یہ بات بتاؤ گے کہ تم سیلی کو کس طرح قتل کرو گے۔“

”صبر کرو، ابھی نہیں بتا سکتا۔“

”کیوں؟“ نینسی نے پوچھا۔

”کام ہو جائے پھر بتا دوں گا۔“

”ہو سکتا ہے تم نے جو پلاننگ کی ہے، اس میں کوئی ایسا کمزور پہلو ہو، جس سے تم پکڑے جاؤ، تمہارے بتانے پر میں اس کمزوری کو ختم کرنے کے بارے میں مشورہ دے سکوں گی۔“

”میرے بنائے منصوبے کا کوئی کمزور پہلو نہیں ہے، اس لیے میں پُر امید ہوں۔“

”ٹھیک ہے، مجھے مت بتاؤ، بس میری تم سے ایک گزارش ہے۔“

”وہ کیا؟“

”کوئی ایسا کام مت کرنا کہ تم مجھ سے دور ہو جاؤ۔“

”یہ سب میں تمہارے لیے ہی کر رہا ہوں۔“

”جانتی ہوں۔“

”جانتی ہو تو خاموشی سے صبر تحمل کا مظاہرہ کرو اور جیسے رکھو ہمارے لیے اچھا وقت آنے والا ہے، ایک بار سیلی کے دادا کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے۔“ کارٹر نے کہا۔
”میں تمہاری کامیابی کی منتظر رہوں گی۔“ نینسی نے کہا۔

”بے فکر رہو، تمہیں اچھی خبر ملے گی۔“ کارٹر نے کہا۔
وہ دن بھی بالآخر آئی گیا، جب سیلی کے دادا اسٹھ کی وصیت کے مطابق دولت سیلی کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئی۔
سیلی اور کارٹر دولت ملنے پر بہت خوش تھے۔ سیلی اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ کارٹر کے ذہن میں کیا چل رہا ہے، اگر پتا چل جاتا تو وہ کارٹر سے نہ صرف ہوشیار ہو جاتی بلکہ علیحدگی کا مطالبہ کر دیتی۔ کارٹر کے ذہن میں سیلی سے چھٹکارا پانے اور اس کی دولت حاصل کرنے کا اچھوتا خیال آ گیا تھا لیکن وہ اس پلان کے بارے میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا حتیٰ کہ نینسی کو بھی نہیں جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

کارٹر کو اپنی بیوی کو ہلاک کرنے کا خیال اس کے ذہن میں اچانک سے آ گیا تھا۔ وہ اپنے دوست جمی سے ملنے اس کی لپہ لڑی میں گیا تو اس نے ایک شیشی میں ایک عجیب و غریب سی کھٹی دھکی جو دیکھنے میں بظاہر شہد کی کھٹی لگ رہی تھی، لیکن کھٹی نہیں۔

”ہاں یہ تو ہے۔“
”سیلی کا خیال تھا کہ مجھ میں باپ بننے کی صلاحیت نہیں ہے، وہ اکثر مجھے اس بارے میں مار چڑھتی کرتی تھی۔“
”یہ تو زیادتی والی بات ہے، بغیر ٹیسٹ کے اس طرح کے الزامات لگانا اچھی بات نہیں۔“

”میں نے اسپیشلسٹ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا، جب ہمارا میڈیکل ہوا، اس میں یہ بات محل کر سامنے آئی کہ سیلی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے اور مجھ میں بچے پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔“ کارٹر نے کہا۔
”یہ تو تم نے ثابت کر دیا ہے۔“

”کیسے؟“ کارٹر چونکا۔

”مجھے حاملہ کر کے۔“

”ہاں، تم نے ٹھیک کہا۔“

”آنے والے بچے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔“

”تم میرے بچے کو ضرور جنم دو گی۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں، لیکن تمہاری بیوی سیلی کو پتا چلا تو۔۔۔۔۔“

”وہ مجھ سے طلاق لے کر کسی اور سے شادی کر لے گی۔“

”یہ تمہارے حق میں بہت بُرا ہو جائے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“

”تم بچے کو کسی دوسرے شہر میں جنم دو گی۔“

”ٹھیک ہے میں ایسا کر لوں گی، لیکن جب وہ بڑا ہوگا اور سیلی کو اس کے بارے میں علم ہوگا تو کیا ہوگا؟“

”بچے کے بڑا ہونے تک وہ زندہ ہوگی تو کچھ کرے گی۔“

”میں تم سیلی کو قتل کرنے کا ارادہ کر چکے ہو؟“

”اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے، اس کے مرنے پر ہی میں اس کی ساری دولت کا وارث بن سکوں گا۔“

”قتل کے مقدمے میں تم پھنس بھی سکتے ہو، ذرا یہ بھی تو سوچو۔“

”میں ایسی پلاننگ کروں گا کہ پولیس اپنا سر ہٹتی رہ جائے گی، لیکن قتل کا سراغ نہ لگا سکے گی۔“

”ایسی کون سی پلاننگ ہے کہ تم قتل کے مقدمے سے صاف بچ جاؤ گے؟“

”پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ذمہ داروں میں قتل کے مقدمات

زہریلیں سکتیں

اور اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کس طرح اس کمپی سے بیوی کو ڈنگ لگوا دے تاکہ اس کی بیوی سے ہمیشہ کے لیے جان جھوٹ جائے۔ بیوی کو ڈنگ لگوانا اتنا آسان نہ تھا۔ اس چکر میں خود اس کی جان بھی جاسکتی تھی۔ سوچے، سوچے اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آئی گیا۔ جس کی مدد سے بیوی ہلاک ہو سکتی تھی۔ سلی صفائی پسند بھی کارٹر اس بات سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لیے اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ صبح کے وقت کمپی کو گلاس کے اندر قید کر کے چلا جائے گا۔ اس جگہ پر جب سلی صفائی کرے گی، تو یقیناً گلاس بھی اٹھائے گی۔ کمپی اپنی فطرت کے مطابق انسان کو دیکھ کر ڈنگ مارنے کی کوشش کرے گی، اور وہ سلی کو ڈنگ مار دے گی جب وہ شام کو دفتر سے لوٹے گا سلی مر چکی ہوگی۔ سلی کے مرجانے پر اس پر کل کا الزام بھی نہیں آئے گا اور وہ سلی کی دولت کا مالک بن جائے گا۔ کارٹر نے یہی کیا۔ دفتر جاتے ہوئے اس نے ہوشیاری سے کمپی کو گلاس کے اندر قید کر دیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اس نے بہت احتیاط سے کام لیا، ورنہ وہ خود ہی کمپی کا شکار ہو جاتا۔

شام گئے وہ خوش خوش گھر لوٹا، لیکن جب اس نے سلی کو زندہ دیکھا وہ بری طرح چونکا، وہ کچھ سوچ کر کمرے میں گیا۔ سلی نے کمرے کی صفائی کی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر سے وہ گلاس بھی سلی نے ہٹا دیا تھا۔ کمپی کو نہ پا کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ کمپی نے سلی کو کیوں ڈنگ نہیں مارا اور اب وہ کمپی کہاں چلی گئی ہے۔ اس نے کمرے پر نظر دوڑائی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی دیکھ کر وہ سمجھ گیا۔ کمپی کمرے سے کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی ہے، ورنہ ضرور کمپی کمرے میں موجود ہوتی۔ کارٹر کی ساری محنت ضائع ہو چکی تھی۔ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔

سلی اس کے لیے کافی تیار کر چکی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم میں آنے پر، وہ کافی لے آئی۔ اس نے کافی کا کپ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، لیکن ذہن اس بات پر پریشان تھا کہ سلی اب تک زندہ کیوں ہے۔ اس کے دوست بھی کے مطابق وہ زہریلی کمپی انسان کو دیکھ کر فوراً اسے ڈنگ مار دیتی ہے۔ کیا جی نے جھوٹ بول کر اسے یہ قیافہ بنا دیا تھا۔

”کس سوچ میں کم ہو؟“ سلی نے پوچھا۔
”کچھ نہیں ہے، آج کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک گیا ہوں۔“

”تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم واقعی زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تھک چکے ہو، ایسے میں کافی کا کپ تمہاری صحت اتارنے میں معاون ثابت ہوگا۔“ سلی نے مسکراتے ہوئے

”اس کمپی کو تم نے کیوں محفوظ کر رکھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ عام کمپی نہیں خاص ہے۔“
”اچھا وہ کیسے؟“

”یہ ایک زہریلی کمپی ہے، جو افریقا کے جنگلات میں پائی جاتی ہے، انسان کی دشمن ہے، انسان کو دیکھتے ہی اسے ڈنگ مار دیتی ہے اور یہ اتنی آسانی سے نہیں ملتی، جنگلات میں اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔“

”تم کہہ رہے ہو، تو واقعی یہ نایاب کمپی ہوگی۔“
”چند سال قبل میرا افریقا میں ایک سیمینار میں جانا ہوا تھا، اس سیمینار میں ایک سیشن اس کمپی کے بارے میں بھی تھا، اس سیمینار کی بدولت مجھے اس کمپی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔“
”یہ کمپی تمہیں کہاں سے ملی ہے اور تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”افریقا سے جب یہاں آیا تو کچھ ارادہ نہیں تھا، چند دن قبل یہ کمپی میری لیبارٹری میں کہیں سے اڑتی ہوئی آگئی، میں اسے مارنا چاہتا تھا کہ یہ اپنے زہر سے کسی انسان کو مار نہ دے۔“

”تم نے اسے پھر مارا کیوں نہیں؟“
”اس کمپی کا زہر کینسر اور دیگر امراض میں استعمال ہوتا ہے، اس لیے دل میں خیال آیا کیوں نہ اس کمپی کی افزائش کی جائے اور اس کمپی کی نسل کو بڑھا کر خوب منافع کمایا جائے۔“
”گڈ! یہ تو بہت اچھا خیال آیا ہے۔“ کارٹر نے کہا۔
”اب مسئلہ یہ آ رہا ہے کہ یہ مادہ کمپی ہے اور مجھے نہ کمپی حاصل کرنا ہے، سچی میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں گا، اس بارے میں، میں نے اپنے دوست ڈیوڈ کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ نہ کمپی یا اس کمپی کا ایک جوڑا مجھے بھیج دے، وہ جلد مجھے اس کا جوڑا آیا نہ کمپی بھیج دے گا۔“

”تمہارا دوست اس کے بدلے اچھی رقم وصول کرے گا۔“

”ایک بار کا خرچہ ہے پھر اس کمپی سے جو افزائش ہوگی اس کے بعد میں پیسوں میں کھیلوں گا۔“ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گھر آتے ہوئے کارٹر کو اچھوتا خیال آیا کہ وہ اس کمپی کو حاصل کر کے اپنی پیگم سلی کو ہلاک کر سکتا ہے، اور کسی کو اس کے قتل کرنے کا پتا بھی نہیں چل سکے گا۔“

ایک دن موقع پا کر کارٹر نے اس کمپی کو چڑایا اور جی کو اس کمپی کی چوری کی خبر بھی نہ ہوئی۔ کارٹر کمپی کو گھر میں لے آیا

کچھ اچھا نہیں لگتا، ایسا کچھ میرے ساتھ آج ہو رہا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے، تم سو جاؤ، سونے سے طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ سیلی نے کہا۔
 ”ہاں میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ کارٹر نے یہ کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

کروٹ بدل کر بھی وہ سویا نہیں تھا۔ اس کا ذہن سوچوں میں گم تھا۔ اس نے سیلی سے جان چمڑانے کا شاندار منصوبہ تیار کیا تھا، لیکن وہ اس طرح سے قفل ہو جائے گا، اس کا تصور میں نہ سوچا تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، اسے کب خیر آئی کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ وہ گہری نیند میں تھا، سوتے میں کارٹر کو ایسا ہی محسوس ہوا، جیسے کسی پھرنے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا ہو۔ بے اختیار اس کی آنکھ کھل گئی۔ زہریلی کبھی اس کے ہاتھ پر بیٹھی تھی، اس نے کارٹر کو ڈنگ مارا تھا۔ کارٹر اس زہریلی کبھی کو دیکھ کر بڑی طرح سے گھبرا گیا۔ اس کے جاگنے پر کبھی اس کے ہاتھ پر سے اڑ گئی۔ کبھی نے جہاں ڈنگ مارا تھا وہ جگہ سرخ ہو چکی تھی۔ اس کے برابر بیڈ پر سیلی بھی موجود نہیں تھی۔ وہ بڑی طرح سے خوفزدہ ہو چکا تھا۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ اس نے بیڈ سے اٹھنا چاہا، لیکن اس کے ہاتھ، پاؤں سے جیسے جان نکل گئی ہو، وہ اٹھ نہ سکا۔ کارٹر چیخا چاہتا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی، اچانک سیلی کمرے میں داخل ہوئی۔ کارٹر کو خوف زدہ حالت میں دیکھ کر اس نے کہا۔

”کیا بات ہے، تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟“
 اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ کارٹر کی نظریں ٹیبل کی طرف ہی تھیں، جہاں زہریلی کبھی اڑ کر بیٹھی تھی، سیلی نے جب ٹیبل کی طرف دیکھا، اسے وہی کبھی دکھائی تھی، جسے اس نے صبح بھگا دیا تھا۔ سیلی نے ایک فائل اٹھا کر کبھی پر دے ماری۔ کبھی اسی وقت مر گئی۔

”اس کبھی سے اتنے خوفزدہ ہو گئے تھے، نو دیکھو، میں نے ایک منٹ میں اس کبھی کو مار ڈالا، اس کم بخت کبھی کی موت میرے ہاتھ لکھی تھی جو دوبارہ رات میں کمرے میں آ گئی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر کارٹر کی طرف دیکھا، جو بے سدھ بیڈ پر پڑا تھا کبھی کا زہرا پنا اثر دکھا چکا تھا۔

سیلی تیزی سے کارٹر کی طرف بڑھی۔ اس نے کارٹر کو ہلا جلا کر دیکھا، لیکن اس میں زندگی کی رتق باقی نہیں رہی تھی۔ کارٹر اپنے بچائے جال میں خود ہی پھنس گیا تھا۔ وہ سیلی کو ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ جس کبھی سے وہ سیلی کی موت چاہتا ہے، اس کبھی کا خود کشکار ہو جائے گا۔

❖❖❖

کہا۔
 ”بالکل۔“ کارٹر نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔
 ”آج صفائی کرتے ہوئے میں نے ایک عجیب و غریب کبھی دیکھی۔“

”اچھا اس میں کیا خاص بات تھی؟“
 ”وہ عام کبھیوں کے مقابلے میں بالکل مختلف تھی، ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ شہد کی کبھی ہے، لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ شہد کی کبھی نہیں ہے۔“
 ”تم نے وہ کبھی کہاں دیکھی؟“

”اپنے گھر میں۔“
 ”اپنے گھر میں لیکن وہ ہمارے گھر میں کیسے آ گئی۔“
 کارٹر نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹیبل پر رکھے گلاس کے اندر بند تھی۔“

”وہ گلاس میں بند کیسے ہوئی؟“ کارٹر نے پوچھا۔
 ”میں خود حیران ہوں، وہ گلاس میں کیسے قید ہوئی، رات اس کمرے میں ہم دونوں ہی تھے، کوئی اور آیا بھی نہیں۔“ سیلی نے کہا۔

”یہ تو ایک طرح سے معما بن گیا ہے۔“ کارٹر نے کہا۔
 ”ہاں۔“ سیلی نے کہا۔
 ”اس کبھی کو تم نے مار دیا، یا خود ہی خود ہی اڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔“

”جب میں نے گلاس اٹھایا، وہ تیزی سے گلاس سے باہر آئی اور میری جانب بڑھی، لیکن اس وقت میرے ہاتھ میں جھاڑن تھی، جب جھاڑن گھمائی، کبھی ڈر گئی، اور کمرے سے نکل کر غائب ہو گئی۔“

”وہ موت کے خوف سے کمرے سے نکل گئی ہوگی۔“
 کارٹر نے کہا۔

”زندگی سے سب کو پیار ہوتا ہے، ایسے ہی کبھی کو بھی اپنی زندگی سے پیار تھا، اس لیے کبھی نے خود کو ہلاک ہونے سے بچایا ہوگا۔“ سیلی نے کہا۔

رات میں ان کا ذہن باہر کرنے کا ارادہ تھا۔ اسی لیے وہ ڈنر کرنے گھر سے باہر نکل گئے کھانا کھا کر وہ کچھ وقت کے لیے باہر بھی گئے، وہاں بھی کچھ دیر بیٹھ کر وہ گھر لوٹ آئے۔ دونوں ہی تھک چکے تھے۔ اس لیے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ سیلی یہ بات محسوس کیے بنا نہیں رہ سکی کہ کارٹر کچھ پریشان ہے۔

”کیا بات ہے کارٹر تم آپس سے آئے ہو تو، پریشان ہو؟“
 ”کبھی کبھی انسان کو جب زیادہ ٹھنک ہو جاتی ہے، اسے

جو گھر آپ نے خود نہ بنایا ہو، وہ آپ سے پہلے بھی
ایک زندگی گزار چکا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ آپ کے کچن
میں ناشا بنا چکے ہوتے ہیں، آپ کے لیونگ روم میں ٹی وی
دیکھ چکے ہوتے ہیں، آپ کے بیڈ روم میں سو چکے ہوتے
ہیں۔ یا شاید وہیں مریجی چکے ہوں۔
میرا فارم ہاؤس 1928ء میں جیرڈ ٹینائل اور اس کی
بیوی جینا نے نیو میکسیکو کے شہر ٹاکس سے بیس میل دور، ایک
ویران علاقے میں بنایا تھا، اُس وقت یہ جگہ بالکل سناں

زرا اور زہین عاشہ نصیر

زہین اور زن یہ ایسی تھیں... جو ایک دوسرے
سے جدا نہیں ہوتی... خیالات اور احساسات انسانی
وجود سے ہی منسلک نہیں ہوتے... ان کا تعلق مادی اشیاء
سے بھی جڑا ہوتا ہے... سفر در سفر کرتی ایک ایسی
کہانی... جس کے کرنا کسی ختم نہیں ہوتے... نظروں
سے اوجھل ہونے کے باوجود ان کا تصور... ان کی شخصیت
پر تلے آنے والے وجود میں منظر ہر لمحہ تھی... زمین سے
رشتہ جوڑے رکھنے والے ایک شخص کی حقیقی محبت و
الفت جو جنون کی آخری حدوں تک پہنچا دیتی تھی اور وہ
کسی صورت اس سے دست بردار ہونے پر راضی نہ تھا...

زرا اور زمین کا ازلی تنازعہ..... دشمن کا روایتی ارادہ.....



تھی اور اب بھی زیادہ فرق نہیں آیا۔
ہوں، متحرک ہوں مگر لگتا ہے جیسے کسی کو خبر ہی نہیں کہ میں یہاں ہوں۔

ٹینائل خاندان نے یہ گھر اور کھیت خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا بغیر کسی برقی اوزار کے، اس وقت بجلی نہیں تھی، اور آس پاس کوئی انسان نہیں، صرف جنگلی گتے تھے۔ آج بھی یہاں زیادہ تر فون نہیں چلتے۔ کوئی سگنل نہیں۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ جب میں یہاں آیا تو مجھے ٹائٹ اسٹینڈ میں بیٹا کی ڈائری ملی۔

جبرڈ ایک محنتی کسان تھا، زمین کھود کر اور بیج بو کر روزی کھاتا، اور بیٹا کپڑے سلائی کرتی تھی۔ اناری میں اب بھی ایک ڈی تیار شدہ شادی کا جوڑا اپنے کھڑا ہے، شاید بیٹا کا آخری کام۔ وہیں مجھے خاندان کی تصویریں بھی ملیں، محنت کش لوگ، سخت چہرے والے۔

محاشی بحران نے انہیں مالی طور پر توڑ کر رکھ دیا تھا، اور پھر گرد کے طوفانوں نے زمین برباد کر دی۔ زرخیز زمین کو کنکریٹ کی طرح سخت پتھر میں بدل دیا، جو صحرا کے سورج میں تب رہا تھا۔ جب کھیتی باڑی کرنے کا خواب ٹوٹا، تو جبرڈ نے ٹاؤس کے کنارے ایک گاڑیوں کی مرمت کی دکان کھول لی، تب اس کی عمر غالباً اسی کے قریب تھی، اس عمر میں یہ محنت اس کے لیے بہت زیادہ تھی۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر میں جبرڈ دنیا سے رخصت ہوا اور کچھ عرصے بعد بیٹا بھی۔ ویتنام کی جنگ نے ان کے پوتے کو نگل لیا، ایک بیٹی نے ایک میرین سے شادی کی، اور دوسری منشیات کی زیادتی سے مر گئی۔ نوے کی دہائی تک، آخری ٹینائلز بھی نیو میکسیکو چھوڑ چکے تھے۔

بالآخر، ٹاؤس کا ڈنٹی نے ٹیکس نہ دینے پر دکان اور فارم دونوں کو ضبط کر لیا۔ سالوں تک یہ دونوں جگہیں خالی اور ویران پڑی رہیں، یہاں تک کہ میں آیا اور انہیں خرید لیا۔ اب یہ سب میرا تھا۔

پھر بھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ”ٹینائلز“ اب بھی یہیں کہیں موجود ہوں۔ کیونکہ بھی کبھار، مجھے ان کی ڈاک موصول ہوتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سب مشین کا کام ہے جو بغیر سوچے سمجھے ”آخری معلوم پتے“ پر ڈاک بھیج دیتی ہے، مگر پھر بھی، مردہ انسان کے نام پر ڈاک ملنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

ٹینائل ایئرے کو مرے بھی بارہ سال ہو چکے ہیں، مگر اس کا نام اب بھی کچھ میٹنگ لسٹوں میں ہے۔ میں زندہ جاسوسی ڈائجسٹ

دفتر زیادہ متاثر کن نہیں ہے: ساٹھ کی دہائی کی تین گاڑیاں مختلف حالتوں میں کھڑی ہیں۔ ان کے گرد پڑے بکھرے ہوئے ہیں جیسے شکار کیا گیا ہرن چیر پھاڑ دیا گیا ہو۔ میرا دفتر ایک کارنر میں شیٹ راک کہیں ہے، جس میں ایک میز، وال مارٹ کالیپ ٹاپ، اور کچھ کاغذات۔ ٹائٹلو، فروخت کی رسیدیں وغیرہ۔

میں میز پر بیٹھ گیا اور اسے ایک پرانی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے شک بھری نظر سے کرسی دیکھی، ایک ہاتھ سے گرد جھاڑی اور بیٹھ گئی۔

کنارے اور فارم کیا، پچیس سال دور سنان ملائے میں؟“
”تقریباً نہیں، اور یہاں کے دیہی علاقوں میں یہ
صرف آدمے گھنٹے کی دوری ہے تو کیا ہوا؟“ میں نے
کندھے اچکائے۔

”آپ کا نام ضلع کی زمینوں کے ریکارڈ میں درج
نہیں۔ یہ تو.....“

”غنائل کے نام پر ہے۔“ میں نے بات مکمل کی۔
”یہ فارم سو سال سے غنائل کا ہی تھا۔ ان کا نام اب بھی بورڈ
پر لکھا ہے۔ مجھے اسے بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔“

”ٹھیک۔“ اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”تو، اگر آپ
برائے نام نہیں تو، یہ سب آپ کو کتنے میں پڑا؟“

”یہ سوال اب بے معنی ہے۔ میں نے ایک سال لگا
کر یہ شاپ چلانے کے قابل کی ہے، اور گھر ابھی بھی زیر
مرمت ہے۔ یہ چیزیں برائے فروخت نہیں ہیں۔“ میں نے
کہا۔

”کم آن، مسٹر بیٹن، ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے اگر قیمت
درست ہو۔“ وہ تھوڑا اٹھلا کر بولی۔ ”ٹاؤس کاؤنٹی میں بنجر
زمین تین ہزار فی ایکڑ میں جا رہی ہے۔ بیک ٹیکسز غالباً
پچھتر سے اسی ہزار ہوں گے۔ میری کمپنی تیار ہے کہ آپ کو
خاصا منافع دے کر خرید لے۔ میں کہوں گی، آپ کی سرمایہ
کاری سے بھی دگنی رقم؟ اور ہماری سنجیدگی ظاہر کرنے کے
لیے.....“ اس نے اپنا بریف کیس کھولا، ایک لفافہ نکالا اور
میز پر میری طرف سرکا دیا۔

”یہ ایک لاکھ کی تخمینہ رقم ہے۔ آپ ابھی چیک میں
جمع کرا سکتے ہیں، اور بقیہ رقم آج کاروباری اوقات کے
اختتام سے پہلے، نقد میں، آپ کو مل جائے گی۔“
اب اس نے واقعی میری توجہ حاصل کر لی تھی لیکن اس
وجہ سے نہیں جس کا اسے گمان تھا۔

”اچانک یہ دلچسپی کیوں، مس؟ آپ کسان نہیں
لگتے، اور وہ زمین تو اتنی بنجر ہے کہ وہاں صرف کانٹے دار
جھاڑیاں ہی اگتی ہیں۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

ہماری فرم ایک موکل کی طرف سے بطور نمائندہ کام
کر رہی ہے۔ خریدار نے ہمیں مکمل رازداری کا پابند کیا ہے،
اس لیے اگر آپ بولی کی امید کر رہے ہیں.....“

”دراصل، میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔ میری دکان
اگلے آٹھ مہینے کے لیے بک ہے، گھر کی مرمت ابھی شروع
ہی ہوئی ہے۔ میں یہاں اچھا خاصا سیٹل ہو چکا ہوں، اور فی
الحال..... بلکہ کبھی بھی دوبارہ نقل مکانی کرنے کا کوئی ارادہ

”تو؟“ میں نے کہا۔ ”پہلے سوال پر واپس آتے
ہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں،
مسٹر بیٹن، ہے نا؟ آپ کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ ہماری
فرم کافی عرصے سے آپ کے فارم کے مالک سے رابطہ
کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ گاؤنٹی کے ریکارڈ میں مالک
کا نام اب بھی مسٹر ایلرے غنائل درج ہے۔“ اس نے
پروفیشنل انداز میں بات شروع کی۔

”ایلرے سے بات کرنے کے لیے آپ کو کسی
روحانی عامل کی ضرورت ہوگی۔ وہ 2013ء میں مر گیا تھا۔
مغربی ٹیکساس میں شراب کے نشے میں گاڑی چلا تے ہوئے
ایک ٹرک سے ٹکرا گیا۔“ اگرچہ ضرورت نہیں تھی پھر بھی میں
نے تفصیل بتائی۔

”انسوس ہوا سن کر۔ ہم نے آپ کا پتا جیمبر آف
کامرس کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن آپ کا
فون نہیں درج نہیں، اور سوشل میڈیا پر بھی آپ کا کوئی
سراغ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”حتیٰ کہ آپ کی کارلائٹ بھی کسی
فہرست میں نہیں۔ یہ کاروبار چلانے کا خاصا لاکھا طریقہ لگتا
ہے۔“

”فارم پر فون نہیں چلتے، وہ جگہ بہت دور ہے۔ اور
یہاں، میں ترجیح دیتا ہوں کہ کاروبار آسنے سائن ہو۔ اس
طرح کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور آپ کا اصل کاروبار ہے کیا؟“ ایک اور
سوال۔

”میں ایک ’آؤ آر کیا لوجسٹ‘ ہوں۔ پرانی
گاڑیوں کو ڈھونڈتا ہوں، انہیں نئے جیسا بنا کر میٹھے داموں
بیچتا ہوں۔ میرے کچھ چنے ہوئے گا ہک ہیں، اور ایک
وینٹک لسٹ ہے۔ ان قیمتوں پر میں فون پر سودا نہیں کرتا۔ تو
اب آپ بتائیں آپ یہاں کیوں ہیں؟“

”بس یہ کہ.....“ وہ کچھ اور کہنے لگی تھی پھر سوال بدل
دیا۔ ”تو یہ گیراج واقعی آپ کا ہے؟ اور وہ غنائل فارم بھی؟
چھ سو ایکڑ زمین؟ یہ سب کیوں؟ کیا آپ کسان ہیں، مسٹر
بیٹن؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”نہیں۔ پہلے مجھے ایلرے کا باڈی
شاپ پسند آیا، لیکن مجھے رہنے کے لیے جگہ چاہیے تھی، اور
چونکہ دونوں جائیدادیں غنائل کے نام پر تھیں، میں نے
پرانے ٹیکس ادا کر کے انہیں خرید لیا۔“

”لیکن یہ تو کافی غیر موزوں ہوگا، شاپ ٹاؤس کے
جاسوسی ڈائجسٹ جولائی 2025ء

کل دوپہر سے پہلے کال کر سکتے ہیں۔ دوپہر کے بعد؟
ہماری پیشکش میز سے ہٹ جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے۔
”سجھے؟“

جب میں نے اس بات پر بھی کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ پلٹی
اور باہر نکل گئی۔ وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میں تقریباً اسے
واپس بلا لیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے بجائے، میں نے اس کی پیشکش پر کچھ لمحے
غور کیا، پھر پینٹ بوتھ میں جھانک کر پا کو سے کہا کہ میں آج
کے دن کا کام ختم کر رہا ہوں، اور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر
بیس میل دور اپنے فارم کی طرف گاڑی دوڑا دی۔

اپنی جیب کو کھیتوں کے ساتھ بنے پرانے گودام میں
پارک کیا، پھر اس پرانے فورڈ گارڈن ٹریکٹر پر چڑھ گیا جو
اس جگہ کے ساتھ ہی ملا تھا، اور زمین کے گرد چکر کاٹنے لگا۔

کوشش کر رہا تھا کہ اسے کسی اجنبی کی نظر سے
دیکھوں، ایک ایسے اجنبی کی نظر سے جس کے پاس بہت پیسہ
ہو۔

مجھے کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دیا جو اس خاص صحرا کے
کلڑے کو قیمتی بناتا ہو۔

یہ کبھی ایک مٹی کا کھیت تھا، اور اب یہ بنیادی طور پر
چٹان کے مانند ہے۔ ایک ایسی زمین جو ٹینا ہلڑی کی طرح مردہ
ہو چکی تھی۔

پھر بھی؟ ایک نہایت پرکشش اور بہت چمکی وکیل نے
مجھے اتنی بڑی رقم کی پیشکش کی تھی اس زمین کے لیے جو
برسوں سے ویران پڑی تھی۔

اب میرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اس کھیل کا نام معلوم نہیں
تھا، اور نہ ہی یہ کہ کھلاڑی کون تھے۔ میں جتنا بھی سرکھپاتا،
فائدہ نہ ہوتا۔

مجھے مزید معلومات کی ضرورت تھی۔
تو ایک گھنٹے تک اپنے ٹریکٹر پر ادھر ادھر گھومنے کے
بعد میں نے تلاش ترک کی اور جیریڈ کی پہاڑی کی طرف
نکل پڑا۔

نیمائیل قبرستان ایک بنجر سی چوٹی پر واقع ہے جہاں
سے پوری زمین نظر آتی ہے۔

ایک ایسا منظر جو مجھے کچھ بھی نہیں بتاتا تھا۔
گرد آلود، خشک، بیس میل کے دائرے میں پانی کا
کوئی نام و نشان نہیں، وہ گہرا پتھر بلا علاقہ ایسا لگتا تھا جیسے
صرف جھاڑ جھنکار ہی اگ سکتا ہو۔

پریشان ہو کر میں نے جیریڈ کی قبر کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ میں کھڑا ہو گیا، سوچا بات ختم ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا نہ
ہوا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی، میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ دکان؟“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
”آسانی سے بدلی جاسکتی ہے۔ فارم کی رقم سے تو آپ اپنی
مرضی کی بالکل نئی جگہ بنا سکتے ہیں۔ تو مسئلہ گیراج نہیں ہے،
ہے نا؟“ یہ سوال نہیں تھا۔ ”چلیے سیدھی بات کرتے ہیں،
مسٹر بین، اصل مسئلہ کیا ہے؟“

”میں نے چھ سال افغانستان میں گزارے ہیں۔ دو
بار تعیناتی ہوئی۔ جب ہم ہمسہ پہنچے تو وہ جگہ کچرے کے ڈھیر
جیسی تھی، اور جب وہاں سے نکلے تو اس سے بھی بدتر ہو چکی
تھی۔ فوج سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا، پھر
ٹاؤس آ گیا۔ مجھے نیو میکسیکو پسند ہے۔ پہاڑ، صحرا، یہ سب
کچھ.....“ میں نے ایمانداری سے اپنے دل کی بات کر
دی۔

”کچھ کچھ افغانستان جیسا؟ جنگ کے بغیر؟“ وہ
بولی۔

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”خیر، مجھے وہ
دکان اور فارم ہاؤس ملے، اور مجھے لگا کہ یہ جگہ میرے لیے
موزوں ہے۔ چیزوں کو برباد کرنے کے بجائے اب انہیں
دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا گھر اچھا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔
”ابھی زیادہ دیکھنے لائق نہیں لیکن بنیاد اچھی ہے۔
اسے جیریڈ نیمائیل اور اس کی بیوی مینا نے 1928ء میں اپنے
ہاتھوں سے بنایا تھا۔ وہاں سکون ہے۔ نہ کوئی پڑوسی، نہ شور
شراب۔“

وہ ہچکچائی، پھر آہستہ سے اپنا لپ ٹاپ بند کیا، اس کی
نظریں مسلسل مجھ پر جمی رہیں۔ وہ جانے کے لیے اٹھی، لیکن
دروازے پر رک کر میری طرف مڑی۔

”مجھے افسوس ہے مسٹر بین کہ میں اس ملاقات کے
لیے اتنی کم تیاری کے ساتھ آئی۔ چونکہ میرا موکل ایک ایسی
پراپرٹی کے لیے بہترین قیمت دے رہا ہے جو سالوں سے
ویران پڑی تھی، مجھے لگا آپ بیچنے میں دلچسپی رکھتے ہوں
گے۔ چونکہ آپ بات نہیں کرنا چاہتے، تو کوئی بات نہیں۔ ہم
فہرست میں اگلے نام کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔“ وہ ایک
لمحے کے لیے رکی جیسے چاہتی ہو کہ میں گھبرا جاؤں گا۔

جب میں نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے کندھے
اچکائے اور اپنا بزنس کارڈ میری میز پر رکھ دیا۔ ”برائے کرم
اس پر غور کیجیے، مسٹر بین۔ ہماری پیشکش بہت منصفانہ ہے،

میں کاٹ دی، اس انتظار میں کہ شوٹر آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جاگا، بدن اکڑا ہوا تھا، جینز اور کام کے جوتے پہنے... دہے قدموں پر آمدے میں آیا۔ سائے میں رہتے ہوئے اور میز کا پایہ ہتھیار کے طور پر پکڑے، میں محن میں گھوما اور حالات کا جائزہ لیا۔ گولیوں کے نشانات اسٹبل کی دیوار پر نظر آرہے تھے۔ چار نشانات ٹیناٹل کے درخت پر تقریباً سیدھی قطار میں لگے تھے۔

اندھیرے میں یہ نشانے بازی واقعی کمال کی تھی۔ گولی لگنے اور آواز سننے کے درمیانی وقفے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مٹی کے راستے کے آخر میں درختوں کے پیچھے سے فائرنگ کر رہا تھا، شاید چار سو میٹر دور سے۔ وہ بھی رات کے وقت۔ شوٹر یقینی طور پر ماہر تھا، جس کے پاس رات میں دیکھنے والی دور بین سے گیس ہتھیار تھا۔ میں واقعی متاثر ہوا..... شاید ان کا مقصد بھی یہی تھا۔

میں نے دکان پہنچ کر پولیس کو بلانے کے بارے میں سوچا، لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میں ابھی فوج سے واپس آیا تھا اور ڈیٹرائٹ میں ایک بار میں جھکڑا ہوا تھا، جس پر مجھے فوجداری مقدمہ بھگتنا پڑا۔ اگر میں رپورٹ کرتا تو پولیس سوالات کرتی اور میرے جھوٹے جواب ان کو پسند نہیں آتے۔ مجھے ان کے مقابلے میں آدمی رات کے شوٹر سے نمٹنا زیادہ بہتر لگا۔

میں نے مکمل لباس پہنا اور ٹاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔

دکان پر ایک نئی مصیبت میرا انتظار کر رہی تھی۔ جب میں اپنی پارکنگ میں پہنچا، تو پاکو، میرا ماہر چیٹ اور باڈی ورکر، دفتر کے دروازے کے سامنے پکڑ کاٹ رہا تھا۔

”ہیکو؟ کیا ہوا؟“ اپنی جیب سے اترتے ہوئے کہا۔ ”دو آدمی کل رات میرے گھر آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں اب تمہارے لیے کام نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں غیر قانونی ہوں، انہوں نے کہا کہ چھوڑ دو ورنہ وہ ایگریگیشن کو اطلاع دیں گے۔ اگر مجھے واپس بھیج دیا گیا تو شاید میں دوبارہ نہ آسکوں۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا، ڈیو۔ مجھے جانا ہوگا۔“ وہ سخت خوفزدہ تھا۔

”ایزی بڈی۔“ میں نے کہا۔ ”پریشان نہ ہو۔ یہ صرف ایک کاروباری معاملہ ہے جس میں، میں الجھ گیا ہوں۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ تمہارا کوئی عزیز ٹکسن میں

”کیا تمہارا دماغ خراب تھا جب تم نے یہ سفید ہاتھی خریدا تھا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس رات کسی نے میرے گودام پر فائرنگ کر دی۔

رات کے تیسرے پہر۔ میں اچانک سیدھا اٹھ بیٹھا۔ پھر ایک اور گولی چلی اور میں فوراً بستر سے لڑھک کر نیچے آگرا!

میں نے نیچے کے نیچے ہاتھ مارا تا کہ اپنی آٹونیک گن نکالوں..... وہ وہاں نہیں تھی!

اور ظاہر ہے، ہوتی بھی کیسے؟ نیو میکسیکو میں، اگر کوئی مجرم اسلحہ رکھے تو اسے چھ سال جیل ہے، اور میں جتنا وقت کاٹ چکا ہوں، وہی کافی ہے۔ اس ریاست میں میرے لیے کوئی گن نہیں۔

تیسری گولی چل چکی تھی! میں نے پہلی گولی کی ”تھپ“ سنی جو میرے گودام کی دیوار سے ٹکرائی، پھر لمحہ بھر بعد دور سے چلائی گئی رائفل کی آواز سنائی دی۔

پھر ایک اور گولی۔ کیا وہ قریب آ رہا تھا؟ بس بہت ہو گیا!

میں نیچے جھک کر بیڈروم سے باہر ریٹنگا، ہال وے میں آیا، پھر سیڑھیوں سے اتر کر لینڈنگ پر پہنچا۔

ایک ستون کے پیچھے ہاتھ مار کر میں نے وہ ڈوری کھینچی جو اتاری کی سیڑھی نیچے لاتی تھی۔

لیکن جیسے ہی میں اوپر چڑھنے لگا، آخری لمبے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں پہلے سے کوئی موجود ہے، سائے میں چھپا بیٹھا ہے!

حکمت عملی کا وقت نہیں تھا۔

میں سیڑھی پر چڑھا اور اس سائے کو ایک زوردار شیخ مارا جو کسی کا بھی جیڑا توڑ دیتا۔ مگر اس کے بجائے، ٹیناٹل کے لباس کا ڈی آؤٹا ہوا اتاری کے پار جاگرا، اور میری مٹھی درد سے سن ہو گئی۔

میرے منہ سے بے اختیار گالی نکلی تھی، پھر میں نے ایک پرانی میز کا پایہ اٹھایا، اور خود ڈی کی جگہ سائے میں بیٹھ گیا۔

مگر کچھ نہیں ہوا۔ مزید کوئی گولی نہیں چلی۔ کسی نے دروازے کا ہینڈل تک نہیں ہلایا۔ کچھ دیر بعد میں خاموشی سے اتاری کے فرش پر لیٹ گیا اور باقی کی رات کچی کچی نیند

ہے، تم نے بتایا تھا؟

”ایک کزن ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”تو پھر وہیں جا کر کچھ دن کے لیے چھپ جاؤ۔ میں معاملہ سلجھا لوں گا، تمہیں فون کروں گا، اور ہم دوبارہ کام شروع کریں گے۔“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا، حالانکہ مجھے خود بھی یقین نہیں تھا کہ کچھ ٹھیک کر سکوں گا۔ ماریا لوبووی واحد شخصیت تھی جسے میں جانتا تھا، اور مجھے شک تھا کہ وہی تھی جس نے اندھیرے میں میری بازو کو گولیوں سے چھلنی کیا یا میرے بہترین کارکن کو دم کاٹ دیا۔ اور مجھے ابھی تک یہ تک پتا نہیں تھا کہ کھیل ہے کیا۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ جلد کوئی آکر سب کچھ بتائے گا۔۔۔ اور میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔

پاکو کے جانے کے ایک گھنٹے بعد، ایک نئی کیڑی لاک لے سکیڈ میرے پارکنگ لائٹ میں آکر رکی اور میری جیب کو ہلاک کر دیا۔ میں نے اپنی سیکورٹی کیمروں پر گاڑی کو دیکھا۔

ایریڈونا کی نمبر پلیٹ تھی۔ مطلب کرائے کی گاڑی، انٹرپورٹ سے لی گئی تھی۔ یہ جاننا اچھا لگا۔ بد قسمتی سے، اس بار ماریا لوبو، وہ وکیل عورت نہیں آئی تھی۔ دو آدمی گاڑی سے باہر نکلے۔

ایک لٹبال کے کھلاڑی جیسا تھا سنہرے بال، میسی کا سستا جیکٹ۔ اس کا ساتھی زیادہ اسمارٹ تھا، مجھے لگا کہ شاید یہ پولیس والے ہوں۔ دونوں کے کندھوں پر ہتھیار تھے، مگر نیو میکسیکو میں یہ عام بات ہے۔ یہ ریاست ”اوپن کیری“ کی اجازت دیتی ہے، اور ان کے ہتھیار چھپے ہوئے بھی نہیں تھے۔

دونوں کے پاس گلاک ٹائٹین تھے۔ وہ دکان میں بغیر دستک دیے داخل ہوئے۔ لمبے قد والا شخص بغیر اجازت میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک لفافہ میری طرف سرکایا۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ اس میں نقدی کی ایک گڈی تھی جو خاصی معقول دکھائی دیتی تھی۔

”میرا خیال ہے تمہارا نام بتین ہے، ٹیٹائل نہیں۔“ سنہرے بالوں والے نے کہا اور ہاتھ بڑھایا۔ میں نے نظر انداز کر دیا۔

”میرا نام اسٹیفن ہے، دوست مجھے اسٹین کہتے ہیں۔“ اس نے اپنے گڑھے دار چہرے والے ساتھی کا تعارف کروانے کی زحمت نہیں کی، اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔

”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں، مسٹر اسٹین؟“

میں نے سیٹ لہجے میں پوچھا۔
”ہم تمہیں امیر بنانے آئے ہیں، دوست۔ تمہیں ڈھونڈنا مشکل کام تھا۔ ہماری جولاہ فرم ہے، وہ ایک میچے سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ان کے پاس تمہارا نام غلط تھا، وہ تمہیں ٹیٹائل سمجھ رہے تھے۔ جیسے تمہارے بازو پر بورڈ لگا ہے۔“
وہ رکا، جیسے کسی وضاحت کی امید رکھتا ہو۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ دوبارہ بولنے لگا۔ ”میرا خیال ہے، ان کے کسی وکیل نے تمہیں آفر دی ہوگی، اور تم نے سوچا ہوگا کہ پیسے کا درخت ہلا کر اور زیادہ کمائے ہو؟“

”نہیں۔۔۔ اس کی آفر ٹھیک تھی۔“ میں نے کہا۔
”لیکن میں بیچنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔“

”تمہیں رکھنی چاہیے۔ ہم تمہیں دو گنی قیمت دے رہے ہیں۔ لالچ نہ کرو، دوست۔ ہمیں نچوڑنے کی کوشش تمہیں ہماری پڑے گی۔“

یہ تو مکمل دھمکی تھی مگر میں پُر سکون رہا۔ ”میں نچوڑنے کی کوشش نہیں کر رہا، مسٹر اسٹین، میں ایک کاروبار چلا رہا ہوں۔ میرے پرائیویٹس ہیں جو مجھے وقت پر دیتے ہیں۔ اگر میں تمہیں یہ جگہ بیچوں گا، تو مجھے نئی ورکشاپ، نیا گھر ڈھونڈنا پڑے گا، اور اس دوران میرا وقت ضائع ہوگا، گا ہک چمن جائیں گے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ بس یہی میری آخری بات ہے۔ تم زمین کی تلاش میں تھے، لگا ہے غلط جگہ آگئے ہو۔ اب اگر اجازت دو، تو مجھے ایک 1938 ڈیلا ہے کی بریک ٹھیک کرنی ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا لیکن ان میں سے کوئی نہیں ہلا۔

”لگتا ہے تم بات سمجھ نہیں رہے، مسٹر۔۔۔ یا جو بھی تمہارا نام ہے۔ دیکھو، میں اور مسٹر گارزا ایہاں کمیشن پر کام کرتے ہیں۔ مطلب ہمیں ہر ڈیل کا کچھ فیصد ملتا ہے۔ اگر ڈیل نہ ہو تو کمیشن بھی نہیں۔ کیا تم ہمیں ہماری مزدوری سے محروم کرنا چاہتے ہو، مسٹر ٹی؟“ اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

”میرا نام دراصل بتین ہے۔“ میں نے کہا پیچھے سے گولف ہیک میں سے گولف کی چھڑی نکال کر اس کا ہیڈ اپنی ہتھیلی پر مارنے لگا۔

”بات ختم ہوگئی، مسٹر اسٹین۔ اپنا لفافہ، اپنی آفر اٹھاؤ اور چلے بنو۔“

وہ کھڑا ہو گیا، میری طرف رخ کیے، مگر لمبے کا نام نہیں لیا۔ ”تم مجھ پر یہ چیز تان رہے ہو؟ سچ میں؟“ اس نے

قدحار میں، جہاں میں نے خدمات انجام دیں، اگر آپ سڑک کے پار کھڑی عورت کو صرف دیکھ بھی لیں، چاہے اس کی پشت ہو، تو آپ کی کھوپڑی اڑ سکتی ہے۔ تو جان بوجھ کر ڈیلا ہے کو نقصان پہنچانے پر کیا طے گا، اس کا اندازہ آپ خود لگائیں۔

اور پھر انہوں نے کام اور بھی آسان بنا دیا۔

گاڑی لے کر جانے کے بجائے، وہ سڑک پار ایک طرف چلے گئے، اور اپنی چھپاتی نئی ریٹیل اسکینڈ میرے ڈرائیوے میں اس طرح کھڑی کر گئے جیسے یہ جگہ اُن کے باپ کی ہو صرف مجھے چڑانے کے لیے۔

میں دوبارہ دکان کے اندر گیا، ایک آٹھ اونس کی پلاسٹک واٹر بوتل لی، اسے سک میں خالی کیا، اور اس میں اچھن اسٹارٹ کرنے کے لیے استعمال ہونے والا تیز قسم کا پیٹرول بھر دیا۔ بوتل کی گردن میں تیل سے بیجا ہوا کپڑے کا ٹکڑا ڈھونڈ کر، میں نے اسے آگ لگا دی، پھر دکان کے سامنے والے دروازے سے باہر نکل کر وہ بوتل اسکینڈ کے پچھلے حصے کے نیچے لٹکا دی۔

پانچ سیکنڈ بعد، پلاسٹک کی بوتل پھٹ گئی، پیٹرول زمین پر بہہ گیا اور فوراً آگ بھڑک اٹھی، جو اسکینڈ کے نیچے تیزی سے پھیل گئی۔

چند منٹ بعد فائر ٹرک چنٹا ہوا آیا اور گاڑی پر پانی ڈالنا شروع کر دیا تاکہ ٹینک پھٹنے سے پہلے آگ بج جائے۔ اس کے باوجود، ریٹیل گاڑی مکمل طور پر برباد ہو چکی تھی..... پینٹ جل گیا، ڈائرینگ اور فیول لائنز ختم۔

میں یہ سب اپنے آفس کے لیپ ٹاپ پر سیکورٹی کیمرے میں دیکھ رہا تھا: گاڑی میں آگ، لوگ ڈائری سے باہر نکل کر آگ بجھانے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں انتظار کرتا رہا، گالف اسٹک ہاتھ میں، اس موقع کے ساتھ کہ وہ دونوں غنڈے یا شاید پولیس آئے گی۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا کہ پولیس ان دونوں سے سوال کر رہی ہے اور دونوں سر ہلا ہلا کر ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ بھی آگ کے بارے میں اتنے ہی حیران ہیں جتنا کہ باقی لوگ۔ کسی نے میری طرف یا میری دکان کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب ایک خاتون پولیس آفیسر نے میرے دروازے پر دستک دی، تو وہ صرف آس پاس کے گواہوں سے معلومات لے رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پینٹ بوتھ میں کام کر رہا تھا، کچھ نہیں سنا، اور وہ مزید

اپنی جیکٹ کھولی اور پستول دکھایا۔ ”وہ سنا ہے نا، چاقولے کر بندوق والی لڑائی میں جانا؟“

”میرے پاس چاقو نہیں، دوست۔ میرے پاس فائبر آئرن ہے۔ یہ جھاڑیوں اور ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو حساب نہیں جانتے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھ پر گن تان سکتے ہو اور اسٹریچر کے بغیر جاسکتے ہو، تو ہمت کرو۔ ویسے بھی کل رات نیند پوری نہیں ہوئی، طبیعت چڑچڑی ہے۔“

اشین یا تو بہت بہادر تھا یا بہت بے وقوف، لیکن اس کا ساتھی نہیں۔ گارز انے حساب لگایا کہ میں اس کے ساتھی کو مار سکتا ہوں اس سے پہلے کہ وہ گن نکالے۔ اس نے سر ہلایا اور آہستہ سے ہاتھ اٹھا دیے۔

”چلو اشین، لگتا ہے مسٹر بین کل رات اپنے فارم پر شور کی وجہ سے چڑچڑے ہیں۔“

”شور تھا؟“ میں نے مصنوعی حیرت دکھائی۔ ”واقعی..... میں تو سو گیا تھا۔“

”تو اب جاگ جاؤ۔“ اشین نے میری ڈینک پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”کل رات تو آغاز تھا۔ تمہیں آگے بہت مصیبت آسکتی ہے۔“

”ٹینک ٹاک۔“ میں نے کہا اور گالف اسٹک کو اپنی ہتھیلی پر مارا۔

”اچھا، اچھا، ہم جا رہے ہیں۔“ گارز انے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا جیسے ہتھیار ڈال رہا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا، اور کچھ تذبذب کے بعد، اشین نے لفافہ اٹھالیا، لیکن دروازے میں رکا۔

”یہ جگہ تو کباڑ ہے، دوست، لیکن یہ اور بھی بُری ہو سکتی ہے۔ تم نے تو ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں.....“

”چپ رہو، اشین۔“ گارز انے آواز لگائی۔ ”چلو یہاں سے۔“

میں اُن کے پیچھے باہر نکلا تاکہ یقین کر لوں کہ وہ واقعی جا رہے ہیں، لیکن وہ مکمل طور پر نہیں گئے۔ جیسے ہی وہ ڈیلا ہے کے پاس سے گزرے، اشین نے ہائیڈرو لک لفٹ کے لیور کو چھوا، جس سے پرانی روڈ سٹریٹ گاڑی نیچے گر گئی اور اس کے نیچے رکھا اسٹینڈ کھلا گیا، ساتھ ہی فیول ٹینک بھی تھوڑا سا دب گیا۔ نقصان معمولی تھا، چند گھنٹوں کی مرمت کا کام، اور اتنا معمولی کہ شاید میں نظر انداز کر دیتا..... اگر اشین نے جاتے جاتے مڑ کر نہ دیکھا ہوتا۔

”اوہ، معذرت۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

اور یہی اُس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

پڑے گا، یہ بہت پرکشش پیشکش ہے۔ اور صرف ہمارے درمیان، یہ ان کی آخری حد نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ جوابی پیشکش دیں۔“

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ ”یہ ایک فراخ دلانہ پیشکش ہے مگر مسئلہ قیمت کا بھی تھا ہی نہیں۔“

اس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ ”تو پھر مسئلہ کیا ہے، مسٹر بیٹن؟“

”فوج کے بعد میں نے پہلی بار کوئی جگہ خریدی ہے۔ یہ پرائیوٹ ہاؤس میرے لیے خاص ہے۔ لیکن آپ کے موٹروں کے لیے یہ اتنا خاص کیوں ہے؟ وہ اسے اتنا حاصل کرنے کے خواہشمند کیوں ہیں؟ میں حیران ہوں۔“

وہ رکی، پھر کندھے اُچکائے۔ ”آف دی ریکارڈ؟ میری معلومات کے مطابق، وہ وہاں کم آمدنی والے مزدوروں کے لیے ہاؤسنگ پروجیکٹ بنانا چاہتے ہیں، شہر میں کرایہ برداشت نہ کرنے والے درکرز کے لیے۔ اس سے علاقے میں روزگار کے مواقع بھی پیدا ہوں گے اور سستی رہائش بھی۔ اگر آپ یہ پیشکش مسترد کرتے ہیں، تو ممکن ہے کچھ ناراض مقامی لوگ آپ کے لیے مشکلات کھڑی کریں۔“

”کچھ لوگ تو پہلے ہی مشکل کھڑی کر رہے ہیں میڈم لیکن وہ مقامی مزدور نہیں ہیں۔ وہ مسلح غنڈے ہیں، اور میرا اندازہ ہے کہ آپ انہیں ناموں سے جانتی ہیں۔“ میرا لہجہ تلخ ہوا۔

”اگر ہمارے کلائنٹس نے آپ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی، تو میں یقین دلاتی ہوں کہ وہ یہ سب ہمارے علم اور اجازت کے بغیر کر رہے تھے۔“ اس نے میرا چہرہ دیکھا۔

”یہ سب بیکار کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اب بھی برائے فروخت نہیں۔ کہانی ختم، کچھ نہیں بدلا۔“

”دراصل، بدلا ہے۔“ اس نے افسوس سے کہا۔ ”میں امید کر رہی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے، مگر چونکہ آپ بغض ہیں.....“ اس نے اپنا بریف کیس نکھولا اور ایک آٹھ بائیس دس کی تصویر نکال کر میز پر رکھ دی۔ تصویر میں ایک مقامی قبائلی عورت تھی، پرانی ہاؤس ڈریس میں۔

میں نے بھویں چڑھائیں۔ ”یہ کون ہے؟“

”بظاہر، یہ آخری نمائندہ ہے۔ اس کا نام کارمین سیتا سان میگوئل ہے۔ وہ ناجائز اولاد ہے، ایک نمائندہ وارث

سوال کیے بغیر چلی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں غنڈوں نے پولیس کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا، حالانکہ وہ ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ کیا ہوا۔ کسی وجہ سے وہ بھی پولیس کو شامل نہیں کرنا چاہتے تھے مگر کیوں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

مجموعی طور پر، آج کا دن بہت برابر ہوا تھا۔ میں اپنے بہترین کارنگر سے محروم تھا اور میری ہاڑ میں ان دو غنڈوں کی گاڑی برباد ہو چکی تھی، جو شاید انشورڈ ہو۔ اصولاً، مجھے لگا کہ..... اس سے ہمارا حساب تقریباً برابر ہو گیا تھا، حالانکہ مجھے شک تھا کہ وہ لوگ شاید ہی اسے اس نظر سے دیکھیں۔ مجھے لگا کہ وہ رات کو فارم پر مجھ پر حملہ کرنے آئیں گے مگر وہ نہیں آئے۔ میں اندھیرے میں جاگتا رہا، اپنا بھروسہ مندمیز کا پایہ تھا، مگر کوئی نہیں آیا۔

اس کے بجائے، اگلے دن، صورت حال نے پھر مکمل طور پر پلٹا کھالیا۔ ایک بار پھر ماریا لو بو اپنی مرسیڈز میں میرے گیراج پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتری، اس بار وہ نیلے رنگ کا بزنس سوٹ پہنے ہوئے اور پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

”مسٹر بیٹن؟ کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟“

میں رکا۔ ”آپ میں بہت ہمت ہے، خاتون، یہ ماننا پڑے گا۔“

”آج میں پوری تیاری کے ساتھ آئی ہوں، اگر آپ میری بات سنیں تو۔ زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں؟“ میں نے کندھے اُچکائے۔ ”ویسے بھی اکیلا ہوں، میرا ایک بہترین کارنگر احتفالی دے گیا ہے۔“

”یہ سن کر افسوس ہوا۔“ وہ رکی انداز میں بولی۔ ”واقعی؟ مجھے لگا یہ آپ ہی کا منصوبہ تھا۔“ میں نے اس پر چوٹ کی۔

”بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مگر آپ اس بارے میں جانتی ہیں۔“

اس نے میری بات مکمل طور پر نظر انداز کر دی۔ ”جیسا کہ میں نے کہا، آپ کی کل کی پیشکش پر رد عمل کے بعد میں نے اپنے کلائنٹس سے مکمل بریکنگ لی، اور وہ اس بار زیادہ کھل کر بولے۔ میری تجویز پر انہوں نے اپنی پیشکش بہتر بنانے پر اتفاق کیا۔ چھ لاکھ ڈالر فوراً، اور پچاس ہزار آخری ادائیگی پر۔ سب کچھ نقد۔ آپ کو ماننا

وہ کسی وضاحت کی خاطر رہی مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔
 ”اب یہ بات غیر متعلق ہے، چاہے آپ قانون سے
 بھاگ رہے ہیں یا گواہوں کے تحفظ کے پروگرام میں ہیں،
 جب محترمہ سان میگوئل مقدمہ دائر کریں گی، تو آپ کی یہ
 پراسرار اور مختصر تاریخ سب کے سامنے آجائے گی۔ یہ کیس
 ایک فرسٹ نیشن خاتون، جو چار سو سال کی نسلی نا انصافی کا
 شکار ہے، اور ایک پراسرار سفید فام قبضہ گیر کے درمیان ہو
 گا۔ حالات میں اس بڑی تبدیلی کے پیش نظر، ہمارے
 کلائش نے اپنی پیشکش میں نوے فیصد کی کرنے کی ہدایت
 کی ہے۔“

”نوے فیصد؟“ میری آواز بلند ہوئی۔ ”یہ تو بہت
 بڑی کمی ہے۔“

”بے شک.....“ اس نے بھی سر جھکایا۔ ”مجھے
 افسوس ہے، مگر میں صرف اپنے کلائش کی ہدایات پر عمل کر
 رہی ہوں۔ اگر یہ آپ کو انتقامی لگے.....“

”انتقامی لگے؟“
 ”مجھے علم ہے کہ کل ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک
 کرائے کی گاڑی جلنے کا.....؟“

میں نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا، ابھی
 تک اس اچانک حملے کو ہضم کر رہا تھا۔

”یہ ان کی آخری پیشکش ہے، مسٹر بین۔ اگر آپ
 نے اسے مسترد کیا، تو ہم مقدمہ کریں گے، ہم جیتیں گے، اور
 آپ کو شاید کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ آپ کے پاس چوبیس گھنٹے
 ہیں۔ اس بار سمجھداری سے فیصلہ کیجیے، مسٹر بین۔ پیسے لے
 لیجیے۔ برائے کرم۔“

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کیونکہ وہ
 ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں تو کھیل کے اصول بھی نہیں جانتا تھا،
 اور مجھے ہرا دیا گیا تھا۔ ماریا خاص طور پر خوش نہیں لگ رہی
 تھی، بلکہ کچھ افسوس زدہ سی تھی، مگر اس سے نتیجہ نہیں بدلا۔
 اب فتح مکمل طور پر اسی کی تھی، اور میں بڑی طرح ہار چکا
 تھا۔

ایک رکی خاموشی کے بعد، جو شاید مجھے کچھ کہنے کا
 موقع دینے کے لیے تھی، اس نے اپنا بریف کیس بند کیا اور
 کھڑی ہوئی۔

”آپ کے پاس میرا کارڈ ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”اگر آپ کوئی جوابی پیشکش دینا چاہیں، تو میں ایک بہتر اور
 منصفانہ تصفیہ کروانے کی پوری کوشش کروں گی، حالانکہ ان
 حالات میں ایسا ہونا ممکن نہیں لگتا۔ پھر بھی انصاف کے

جسے حال ہی میں اپنی وراثت کا علم ہوا ہے۔ اس کی ماں،
 شینا ریڈ فرن، مرحوم ایڈریس ٹیٹاٹیل کے ساتھ کئی سالوں
 تک رہی، بظاہر بطور نوکرانی، مگر درحقیقت اس کی معشوقہ بھی
 تھی۔ یہ وقت کی وہ مدت ہے جو انہیں کاسن لابی کے طور
 پر قانونی حیثیت دیتی ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ اب ممکن
 نہیں لیکن..... ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ مسٹر ٹیٹاٹیل نے شینا
 کا کرایہ، بطوریٹل، اور کارمین سیٹا کی کالج فیس ادا کی تھی۔“
 ”آپ کو مجھے قائل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔
 ”میں نے ٹیٹاٹیل خاندان کی تصویریں دیکھی ہیں اور
 اس میں یقیناً ان کی جھلک ہے۔ لیکن جب میں نے یہ
 جامدادیں خریدیں، تو ایک کلرک نے مجھے یقین دلایا تھا کہ
 ان کے ٹائٹل ٹیکسٹر ہیں، اور دونوں جامدادیں ترک شدہ
 تھیں۔“

”مسٹر ٹیٹاٹیل نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی، اور جو
 عدالت کی طرف سے مقرر کردہ ایگزیکوٹر تھا، اس نے ممکنہ
 وارثوں کو تلاش کرنے میں کوتاہی کی۔ محترمہ سان میگوئل
 ریاست کے ان غلط اقدامات کو بہ آسانی عدالت میں چیلنج
 کر سکتی ہیں، جن میں یہ زمین ضبط کرنا بھی شامل ہے۔ نتیجتاً،
 آپ کی یہ جامداد خریداری کا بعد میں قرار پاسکتی ہے۔ ریاست
 شاید آپ کی اصل خریداری کی رقم واپس کرے، مگر اس کے
 سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔“
 میں خاموش رہا۔

”آپ، ظاہر ہے، کارمین سیٹا کے دعوے کو چیلنج کر
 سکتے ہیں مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ٹاؤس ایک لیبرل
 سیاسی نظریات رکھنے والا علاقہ ہے، جہاں نسلی نا انصافی کے
 معاملات پر بہت ہمدردی پائی جاتی ہے۔ کوئی سفید فام مرد،
 کسی فرسٹ نیشن عورت کے خلاف ٹاؤس کاؤنٹی میں مقدمہ
 نہیں جیت سکتا، مسٹر بین۔ خاص طور پر آپ نہیں۔“
 ”خاص طور پر میں کیوں نہیں؟“ میں چونکا۔

”جب آپ نے ہماری پہلی پیشکش مسترد کی، تو میں
 نے اپنے تفتیش کاروں سے آپ کا تفصیلی پس منظر معلوم
 کرنے کو کہا۔ جانتے ہیں انہیں کیا ملا؟“ اس نے رک کر
 میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔
 ”پانچ سال سے زیادہ پرانی آپ کی کوئی معلومات
 دستیاب نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ اس وقت سے پہلے
 وجود ہی نہیں رکھتے تھے، مسٹر بین۔“

تھانے کے تحت میں تیار ہوں۔ مجھے کال کریں، اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ جو کچھ کر سکتی ہوں، کروں گی۔“

پھر وہ اٹھی اور دروازہ بند کرتی ہوئی چلی گئی، میں اپنے دفتر کی دیوار پر لگے کیلنڈر کو گھورتا رہ گیا۔

لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ میں ڈیٹرائٹ میں پلا بڑھا ہوں۔ اگر کوئی تمہیں کے مار دے، تو بہتر ہے فوراً کھڑے ہو جاؤ، ورنہ لاتیں بھی کھانے لگو گے۔ وہ میرا دھیان کھینچتا چاہتے تھے، اور اب وہ کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کے پاس یعنی طور پر دکھانے کے لیے خاصی رقم تھی، لیکن یہ رقم کس کی تھی، میں نہیں جانتا تھا۔ سب سے بڑھ کر، مجھے یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ وہ زرعی زمین جو میری پیدائش سے بھی پہلے سے بیکار پڑی تھی، اچانک اتنی قیمتی کیوں ہو گئی تھی۔ ماریا نے یہی طور پر اپنی تحقیق کر لی تھی۔ اب وقت تھا کہ میں بھی اپنی تحقیق کروں۔

جب میں دوپہر کی دھوپ میں باہر نکلا تو میں نے اسٹین اور اس کے ساتھی کو ایک نئی ٹیلی کیڈی لاک میں دیکھا جو سڑک کے اس پار کھڑی تھی۔ وہ مجھے گھور رہے تھے جب میں غصے سے اپنی جیب کی طرف جا رہا تھا۔ اسٹین نے مجھے انگلی دکھائی اور مسکرایا، لیکن بس وہیں تک۔ اب انہیں مجھے چھیڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مکمل ختم ہو چکا تھا اور وہ جیت چکے تھے۔ اب وہ صرف جتا رہے تھے۔

میں جلدی سے اپنی جیب میں گھسا اور شہر کی طرف نکل پڑا، دل میں غصہ لیے، بغیر کسی خاص منزل کے۔ لیکن کچھ میل چلنے کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ آخر میں نے کھویا ہی کیا ہے؟ غریب لوگوں کے لیے ہاؤسنگ پروجیکٹ تو ایک نیک کام لگتا ہے، تو پھر سیدھا مجھ سے بات کیوں نہ کی گئی؟ اتنے سخت طریقے کیوں اپنائے گئے؟ حتیٰ کہ ماریا بھی اس سختی پر پریشان لگ رہی تھی، حالانکہ وہ مخالف فریق میں تھی۔

کیا کوئی اور بھی ہے جو کچھ جانتا ہو؟ کچھ بھی؟ میں نے اگلے چوراہے سے مڑ کر ہائی وے سسٹن ایٹ پکڑی اور ٹاؤس کے رجسٹرار آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کلرک جو ڈیوٹی پر تھی، لگتا تھا نوے سال کی تو ہوگی: جھریوں بھرا چہرہ، چاندی جیسے بال اور مونے شیشوں والی عینک۔ بوڑھی ضرور تھی مگر ذہن ابھی بھی تیز تھا۔ جب میں نے اپنی زمین کا... پلاٹ میپ پرنٹ مانگا، تو اس نے دو منٹ کے اندر میرے ہاتھ میں حتما دیا، اور پھر میرے سوالات کا انتظار کرنے لگی۔ جیسے کہ وہ خود بھی کچھ جانتا چاہتی

ہو اور میری سوچ ٹھیک نکلی۔

پرنٹ آؤٹ میں ٹیٹائل فارم مکمل دکھایا گیا تھا۔ ارد گرد کا ناؤن شپ بھی پانچ میل کے دائرے میں۔ میں نے دیکھا کہ میکسیکلر و قبائلی علاقے کے کنارے پر ایک نئی لکیر کھینچی گئی ہے تو میں نے کلرک کی توجہ دلائی۔ ”یہ نیا لگ رہا ہے۔ یہ کیا ہے؟“

”یہ روڈ کمیشن کے پاس ایک التوا شدہ درخواست ہے، جس میں بیک کنٹری میں سے ایک سڑک بنانے کی اجازت مانگی گئی ہے، جو قبائلی زمین کو چھوتے ہوئے کریسٹوس پہاڑوں کے کنارے تک جائے گی۔ یہ سڑک ٹیٹائل فارم کی حد پر ختم ہوگی۔“ اس نے بتایا۔

”تو انہیں کسی نہ کسی طرح میری زمین سے گزرنا ہوگا؟“ میں نے سوال کیا۔

”اوہ، مجھے شک ہے۔“ اس نے ماتھے پر ہل ڈالے۔ ”یہ علاقہ جو یہاں نظر آ رہا ہے، وہ آپ کی زمین پر ایک گہری کھائی دکھاتا ہے۔ یہ کافی گہرا گڑھا ہے، ہے نا؟“

”جی، بالکل۔“ میں نے اثبات میں کہا۔ ”یہ تقریباً سو فٹ گہرا ہے۔“

”تو اس میں سے گزرنا مشکل ہی نہیں، شاید ناممکن ہوگا۔ اگر اسے چکر دے کر گزرنا چاہیں تو انہیں ان قبائلی زمینوں پر جانا پڑے گا جو میکسیکلر و اپاچی کے تاریخی مقام کے طور پر رجسٹرڈ ہیں۔ انہیں کبھی بھی ان زمینوں پر راستہ بنانے کی اجازت نہیں ملے گی، کبھی بھی نہیں۔“

”تو میری زمین اس سڑک کے اختتام پر ہے؟ ایک ایسی سڑک جو کہیں نہیں جاتی؟“

”نقشہ تو یہی کہتا ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”اور یہ سروے حالیہ ہے، صرف چند ماہ پرانا۔“

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ ”معدنی ذخائر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا میری زمین پر تیل، باکسائٹ یا کچھ اور قیمتی چیز ہو سکتی ہے؟“

”یہ زمین پہلے بھی جانچی جا چکی ہے، سر۔ کچھ سال پہلے ایک وائلڈ کیٹ کمپنی نے ریاست سے اجازت لی تھی اس علاقے میں تیل نکالنے کے لیے جانچ کرنے کی۔ مگر کچھ نہیں ملا۔ آپ کی زمین پر نہ مٹی ہے، نہ پانی، اور نہ ہی تیل۔ یہ علاقہ تو اتنا بیکار ہے جیسے چاند پر ایک گڑھا ہو۔ معذرت۔“ اس نے ہاتھ اٹھایا۔

”پریشان مت ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے بہت مدد کی ہے۔“

”میں نے آپ کا فون ٹریس کیا، سر۔ آپ ٹاؤس میں ہیں۔ کیا بات ہے؟“ اس کا انداز مشینی تھا۔

”میرا ایک معاملہ اسٹارک ہرسٹ انٹر پرائزز نامی کمپنی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ نام کچھ جانا پہچانا لگتا ہے جنہیں؟“

پس منظر میں کمپیوٹر کی بورڈ کی ٹک ٹک سنائی دی، پھر ایک طویل سیٹی جیسی گہری سانس۔

”خدا خیر کرے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”میں گھر آسا گیا۔“ کیا ہوا؟“

”یہ کمپنی شکاگو کی ہے، پوری طرح مافیا سے جڑی ہوئی۔ ایف بی آئی کی فہرست میں برسوں سے ہے لیکن ہم آج تک ان پر کچھ ثابت نہیں کر سکے۔ گواہوں کو دھمکیاں دیا ہے، کچھ غائب بھی ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کا ان سے پالا پڑا ہے، تو اسے بہت سنجیدگی سے لیجیے۔ یہ لوگ خطرناک ہیں۔“ اس کا سنجیدہ لہجہ بھی خطرناک تھا۔

”کیا امکان ہے کہ وہ مجھے پہچانتے ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا۔“ کیا آپ نے ان میں سے کسی سے براہ راست ملاقات کی ہے؟“

”جی ہاں۔ ایک وکیل خاتون اور دو مگن بردار۔ وکیل کا نام ماریا لویو، اور دوسرے دو غنڈے اسٹیفن اسٹین اور گارزا۔ گارزا کا پہلا نام نہیں معلوم۔“ میں نے جواب دیا۔

فون لائن خاموش ہو گئی، وہ شاید نام چیک کر رہا تھا۔ ”لوہو خاتون کے بارے میں بیورو کے پاس کچھ نہیں، وہ قانونی طور پر بالکل صاف نظر آتی ہے۔ باقی دونوں کرائے کے غنڈے ہیں، جن کے خلاف پرتشدد جرائم کا ریکارڈ ہے۔ اگر آپ نے ان سے واسطہ رکھا ہے، تو میرا خیال ہے وہ آپ کو نہیں جانتے، ورنہ۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں اب تک زندہ نہ ہوتا۔“ میں نے بات مکمل کی۔

”ڈیٹرائٹ مافیا نے بھی آپ کے سر کی قیمت لگا لی ہے، مسٹر بین۔ اور اگر اسٹارک ہرسٹ والوں کو ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ آپ کون ہیں، تو ان کے تعلقات کی وجہ سے وہ جلد ہی جان جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں سے کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔“

”نہیں! جب میں نے ڈیٹرائٹ مافیا کے خلاف

باہر آ کر میں نے ایک پارک بیچ حلاش کی اور بیٹھ کر پلاٹ میپ کو مزید فور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس میں کچھ بھی نیا نہیں تھا جو میں پہلے سے نہ جانتا ہوں۔ شروع میں، جب میں نے وہ دو جائیدادیں خریدیں، تو گھریبا اضافی زمین میں میری خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے صرف ورکشاپ اور عارضی قیام کی جگہ چاہیے تھی تاکہ میں اپنے قدم جماسکوں، اور یہ دونوں ایک ساتھ ہی فروخت پر تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ، جب میں نے گھر کو رہنے کے قابل بنانے کے لیے کام شروع کیے، تو مجھے وہ جگہ اچھی لگنے لگی۔ مجھے ٹینائل خاندان کے ہاتھ کا ہنر پسند آیا، لکڑی کے کام کی باریکی اور صفائی۔ جب اسے صاف کیا اور تیل لگا دیا گیا، تو یوں لگا جیسے یہ گھر ابھی کھینچے ہوئے ہی بنا ہو۔ یہ مکان تقریباً سو سال تک ریت کے طوقاٹوں اور میدانی ہواؤں کا سامنا کرتا رہا تھا۔ کچھ جدید تبدیلیوں کے ساتھ، یہ مزید سو سال کھڑا رہ سکتا تھا۔ یہ اب میرا گھر ہے، وہ واحد جگہ جو کبھی میری اپنی تھی۔ میری زندگی میں بہت سی پریشاناں آئی ہیں۔ میں پریشانیوں سے بھاگ کر ٹاؤس آیا تھا۔ لیکن اب میں مزید نہیں بھاگوں گا۔

میں کاغذات کو دیکھتا رہا لیکن کچھ خاص حاصل نہ ہوا، جب تک کہ میں آخری صفحے تک نہ پہنچا۔ وہاں ایک درخواست تھی، جس میں وہ معلومات تھی جو نقشے میں موجود نہیں تھی۔ یہ اس کمپنی کی طرف سے سڑک بنانے کی اجازت کی درخواست تھی جو ٹینائل کی گڑھے والی زمین پر ختم ہونے والی سڑک بنانا چاہتی تھی۔۔۔ ایک ایسی سڑک جو کہیں نہیں جاتی۔

”اسٹارک ہرسٹ انٹر پرائزز۔۔۔“ یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ نام نے تو کچھ نہ بتایا، لیکن کاروباری پتا نے مجھے چونکا دیا۔ نہ وہ ٹاؤس کا تھا، نہ نیو میکسیکو کا۔۔۔ بلکہ وہ شکاگو کا تھا۔ اور یہ بات فوراً میری توجہ منجھ لے گئی۔ آخر ایک شکاگو کی کمپنی ایسی سڑک کیوں بنانا چاہے گی جو ایک ویران گڑھے میں ختم ہوتی ہے؟

میں چند بلاک پیدل چل کر ایک جگہ پہنچا، وہاں سے ایک سستا فون خرید اور ڈیٹرائٹ فون ملایا۔

”اوہ براؤن روڈ ٹاؤس۔“ ایک مرد کی آواز آئی، جو جانی پہچانی لگی، حالانکہ ہم کبھی ملے نہیں تھے۔

”پتا ہے، میں کون ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، ہاں۔ مسٹر بین؟“

”تم آواز پہچاننے کے ماہر ہو۔“

تب تک تو نہیں، جب تک میرے پاس گتے مارنے کا آپشن باقی تھا۔

تم لڑائی کے ہر راؤنڈ میں ہار سکتے ہو، لیکن اگر تم اپنے قدموں پر جے رہو اور کُتے مارتے رہو، تو شاید تم وہ خوش نصیب گھونسا لگا دو جو سب کچھ بدل دے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا بندہ پہلے لگا دے، لیکن جب تک تم لڑتے ہو، امید باقی ہے۔ اور یہی میری واحد امید تھی۔

میرے پاس اب کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر میں منظر عام پر سامنے آیا، تو ڈیٹرائٹ مافیا مجھے ایک دن میں ڈھونڈ لے گا۔ اور پھر میری زندگی کے بچے کچھ دنوں میں مجھے صرف بھاگنا ہی ہوگا۔

میری واحد امید یہ تھی کہ کسی طرح ان گن برداروں کو سامنے لاؤں، تاکہ وہ خود ہی کو مجرم ثابت کر دیں۔

میری مشکل یہ تھی کہ میرے پاس اب وہ چیز نہیں تھی جو وہ چاہتے تھے۔ انہیں مجھے ٹینائل فارم سے نکالنے کے لیے بھیجا گیا تھا، اور اُن کی چالاک وکیل نے ایک ایسا راستہ نکالا کہ وہ جانکاہ کو کوڑیوں کے دام لے اُڑی۔ کھیل ختم۔ یا شاید ایک راستہ تھا۔ شاید میں بھی وہی چال ان پر آزماسکتا ہوں، جو اُن کی وکیل نے مجھ پر آزمائی۔ بس الٹی سمت میں۔

ٹھیک ہے، ہو سکتا ہے یہ منصوبہ پرنٹ نہ ہو لیکن میرے پاس یہی ایک موقع تھا.....

میں نے سارا منصوبہ دوبارہ ذہن میں دہرایا، وقت زیادہ نہ لگا۔ پھر میں نے ماریا کا دیا ہوا وزنگ کارڈ نکال لیا، نیا والا فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔

”میں ڈیولن بینن بات کر رہا ہوں، مس لوبو۔ میں صرف آپ کو مبارکباد دینے کے لیے کال کر رہا ہوں۔ آپ نے یقینی طور پر مجھے مات دے دی۔“ اس کی آواز سننے ہی میں نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ ہم معاملہ زیادہ منصفانہ طریقے سے طے نہ کر سکے، مسٹر بیچن۔ لیکن میں نے آپ کو خبردار کیا تھا۔“ اس کی سُرلی آواز ابھری۔

”جی، آپ نے کیا تھا۔ آپ کافی منصف رہیں، تو اب میں بھی کچھ منصفی دکھاؤں گا۔ چونکہ مجھے ٹیٹا ملی فارم چھوڑنا ہی ہے، تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ زمین اصل مالکان کو واپس دے دوں۔“

”یہ..... بہت فرخاندانہ ہے، مسٹر بین۔ کارمین سیتا
 ہلکر گزار ہوگی۔“ میں اس کی آواز میں خوشی محسوس کر سکتا تھا۔

مگوا ہی دی تھی، انہوں نے میرے اپارٹمنٹ کو آگ لگا دی تھی، میرے پڑوسی اور اس کی معذور ماں کو قتل کر دیا تھا۔ جب میں نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کی حفاظت کے لیے بجائے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن یہ جگہ اب میرا گھر ہے، مجھے کچھ دو، کچھ ایسا جس سے میں یہ جگہ بچا سکوں! کوئی طریقہ، کوئی موقع! میری آواز تیز ہوئی۔

لیکن فون پر موجود آدمی کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، سوائے ایک اطلاع کے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ”اسٹارک ہرسٹ انٹر پرائزز“ کا اصل کاروبار کیا ہے..... اور وہ سٹار ہاٹس منصوبہ نہیں تھا۔ وہ تھا زہریلے گھٹنے کو ٹھکانے لگانے کا۔

یعنی مہلک کیسائی زہر ملا فضلہ۔
 کہنت اس اسٹین نے تو پہلے دن ہی اشارہ دیا تھا۔
 ”یہ جگہ کوڑا کرکٹ ہے، دوست، لیکن یہ اس سے بھی بدتر ہو
 سکتی ہے اگر.....“

اور جمعی گاڑا نے اسے روک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے کاروبار کی گندگی ظاہر کر دیتا۔

بافیا کے ہاتھوں چلنے والا زہریلے فتنے کا کاروبار؟
سنان علاقے میں ایک زمین خرید لو، پھر چوبیس گھنٹے ٹرک
لا کر زہریلا مواد ایک گڑھے میں پھینکو، جو اتنا الگ تھلک ہے
جیسے چاند پر ہو؟ وہ جیڑڈ کے کھیت کو گندگی کے ڈھیر میں بدل
دیتے، پھر بہتے ہوئے نکل جاتے، اور ریاست کو جھوڑ دیتے
کہ وہ اس جہنم سے نئے جوہر پیچھے جھوڑ گئے۔

لیکن پہلے انہیں یہ گڑھا خریدنا ہوگا، جو کچھ ہی دن میں کارمین سیٹا سان میگل کی ملکیت بننے والا تھا، اور شاید وہ اسے وہ قیمت بھی نہ دیں جو انہوں نے مجھے دی تھی۔

کوئی شک نہیں رہا؛ اب تک تو وہ مجھے چالاکی سے
 نکلت دے چکے تھے۔ میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا
 کہ ٹیٹا ایل قارم اتنا قیمتی کیوں تھا..... بس عین وقت پر
 ہارنے کے لیے۔

اگر میرے پاس تھوڑی بھی عقل ہوتی، تو میرا اپنے ڈیڑاٹ وینڈلر کی بات مان کر یہاں سے نکل جاتا۔

”مفروض کی طرح بھاگو۔ کسی نئی جگہ سے آغاز کرو۔ شاید اس بار میامی یا ہوائی میں۔ کسی ایسی جگہ جہاں پانی ہو، اور بہت سارا۔“ اس نے کہا تھا۔

یقیناً، یہی عقلمندی ہوتی۔ لیکن ماریا لو بو نے مجھے مکمل طور پر مات دے دی تھی، تو صاف ظاہر تھا کہ میں اتنا ذہین نہیں تھا۔ اور میں ابھی ہار ماننے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔

اسب سے پہلے

ایک ہارکیس کے ایک آئل کے کوئیں میں آگ لگ گئی۔ آئل کمپنی کی انتظامیہ نے فوراً ہی آگ بجھانے والے ماہرین کو طلب کیا۔ ماہرین آئے لیکن آگ اتنی تیز تھی اور اس کے قطوں کی حدت اتنی زیادہ تھی کہ ماہرین کوئیں سے دوسرے فٹ دور ہی سے آگ بجھانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ ناامیدی کے عالم میں انتظامیہ نے ان ساتھی کارکنوں کو فون کیا جو بلا معاوضہ خدمت غلط کیا کرتے تھے۔ چھ ہی منٹ میں آگ بجھانے والی ایک قدیم ترین گاڑی فوراً پانی اور کھوکھڑی کرتی وہاں پہنچی اور کوئیں سے صرف پچیس فٹ قریب جا کر رک گئی۔ نصف درجن کارکن گاڑی سے نچے کودے پہلے انہوں نے ایک دوسرے پر پانی ڈالا پھر بھڑکے قطوں پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

آئل کمپنی کے پریذیڈنٹ نے اتنے قریب جا کر صرف پانچ منٹ کے اندر اندر خطرناک آگ پر قابو پالینے پر ساتھی کارکنوں کو دو ہزار ڈالر کا عطیہ پیش کیا۔

جب کارکنوں سے پوچھا گیا کہ وہ اس صلیے کا کیا کریں گے تو ان کے لیڈر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے تو ہم اپنی چھڑا گاڑی کے بریک ٹھیک کرائیں گے۔“

میں بدل جائے گا۔

لغت ہے! غصے میں آکر میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پہلے گھر کا آخری چکر لگانے چل پڑا۔ میں پرانے گھر میں ایسے گھوم رہا تھا جیسے کوئی ٹیٹا بل کا بھٹکا بھوت۔ کسی ترکیب کی تلاش میں، کوئی چال، کوئی موقع، جو مجھے آخری وار کا حق دے سکے۔

میں ایک کے بعد ایک خاموش کمرے سے گزرتا رہا، کچھ میں فرنیچر تھا، کچھ خالی تھے۔ جتنا کا ویران سلائی کمرہ، ایک لائبریری جس میں کتابیں نہیں تھیں، اور آخر کار میں بیٹھک، جہاں گائے کی کھال سے بنا صوفہ اور کرسیوں کا سیٹ ایک بڑے پتھرے فائر پلیس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کے اوپر ایک بھینس مارنے والی قدیم بندوق لٹک رہی تھی۔ ایک شارف کار ہائٹن۔ جو سو، نہیں بلکہ ڈیڑھ سو سال پرانی تھی، یہ بندوق شاید اس گھر سے بھی پرانی تھی، ممکنہ طور پر اس وقت یہاں لائی گئی تھی جب پہلے ٹیٹا بل خاندان کے لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ٹاؤس کا کوئی آئے تھے، نئی زندگی کی تلاش میں۔ اور انہیں محنت اور مشکلات کے سوا کچھ نہ ملا۔ ایسی زندگیوں جو میری زندگی سے زیادہ مختلف نہیں تھیں۔

”شاید نہیں، میڈم۔ میں یہ زمین اُسے نہیں دے رہا۔ میں اسے واپس دے رہا ہوں میکسیکلر واپچی قبیلے کو۔“ کچھ لمحوں کی ساکت خاموشی کے بعد..... ”کیا؟“ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”بالکل میں کر سکتا ہوں۔“ میں سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”قانونی پیچیدگیوں سے مجھے بے دخل کرنے میں آپ کو ایک سال لگے گا، لیکن میں قبیلے کی کنسل کو پانچ منٹ میں ملکیت منتقل کر سکتا ہوں۔ آپ قبیلے پر مقدمہ کر سکتی ہیں، لیکن سنا ہے کہ ٹاؤس کا کوئی نسل نا انصافی کے کیسز میں بہت حساس ہے۔“

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔ ”کیا چاہتی ہیں آپ، مس لوہو؟“ میں نے سوال کیا۔ ”منصفانہ سودا؟ تو پھر پہلی پیشکش پر واپس چلتے ہیں، چھ لاکھ ڈالر، ٹھیک؟ اسی پر بات ہو سکتی ہے، لیکن آپ کی بار ساری رقم مجھے پیش میں چاہیے۔ اگر آپ اتفاق کرتی ہیں تو ٹھیک ورنہ میں فارم جارہا ہوں سامان سینے۔“ ملکیتی دستاویز پوسٹ کرتا میرا آخری کام ہوگا، اس کے بعد یہ فارم ہمیشہ کے لیے میکسیکلر کا ہو جائے گا۔“

وہ جلدی سے بول اٹھی۔ ”میں بہتر پیشکش کی کوشش کروں گی، بس..... انتظار کیجیے، ٹھیک ہے؟ ہم ابھی بھی معاملہ سلجھا سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ٹاک۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا کرے گی، یا کس کی طرف ہے..... غالباً اپنی ہی۔ مگر ایک بات طے تھی: اب مجھے یہاں سے جانا تھا۔

میں فارم کی طرف روانہ ہو گیا..... اپنی زندگی کے پہلے اصل گھر کی طرف۔ پیکنگ کی فکر نہیں تھی، میری ساری چیزیں ایک سوٹ کیس میں پانچ منٹ میں آجائیں گی۔

اس کے بجائے میں پورچ پر موجود ایک پرانی جھولے دار کرسی پر بیٹھ گیا، دماغ صاف کرنے اور کچھ سمجھنے کی کوشش میں۔ یہ کرسی بوسیدہ سی تھی مگر اب بھی آرام دہ۔ غالباً یہ جیڑڈ نے اپنی بیوی بیٹا کے ساتھ بیٹھنے کے لیے خود بنائی تھی، سورج ڈھلنا دیکھنے کے لیے۔

یہ تقریباً سو سال پہلے کی بات تھی اور اب؟ فارم کی لمبی سڑک براہ راست گڑھے کی طرف جاتی تھی، تو ”اسٹارک ہرسٹ“ کے غنڈے یقیناً گھر کو بلڈوزر کے پہلا کچرا اسی کا بنا کر اس گڑھے میں پھینکیں گے۔

ٹیٹا بل کی محنت، خون اور ہنر صرف چند ٹوکوں کے لیے

پیشکش روکی، تو مجھے تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ شک سا ہوا، مسٹر بین، اس لیے میں نے ہماری سکیورٹی ٹیم کو کہا کہ تمہاری مکمل چھان بین کریں۔ انہوں نے تمہارا پرانا ریکارڈ نکال لیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اسٹارک ہرسٹ کے لوگ جان چکے ہیں کہ تم اصل میں کون ہو، اور تمہارے سر کی قیمت کے بارے میں بھی۔ تمہیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ اس کے انداز میں فکری اور یہ مجھے اچھی لگی۔

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ وہ بالکل درست تھی۔ میں بس مرنے ہی والا تھا۔ کیونکہ میں اس کے کندھے کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ ایک کالی کیڈی لاک کا ڈنٹی روڈ سے میری ڈرائیو میں مڑ رہی تھی، پھر درختوں کی لکیر پر رکی، اور وہاں سے گارزا کوڈکراترا، رائل کلس لیے جہاز یوں کی طرف دوڑا۔

اچانک قاصدے پر ایک چمک ابھری۔ اضطراری طور پر، میں نے ماریا کے بال پکڑے اور اسے زینوں پر نیچے بٹھکھینچ لیا، بالکل اسی وقت ایک گولی ہمارے پاس کی رینگ سے ٹکرائی۔

”اندرا!“ میں نے سرگوشی کی۔ دوسری گولی گھر کے اندر گھسی جیسے ہی ہم دوڑتے ہوئے لوگ روم میں پہنچے اور بڑے پتھر لیے فائر پیس کے پیچھے دبک گئے۔

”نچے رہو!“ خدا کی پناہ، وہ کیا کر رہے ہیں؟“ ماریا نے گھبرا کر پوچھا۔

”وہ مجھے مارنے آئے ہیں، میڈم، اور غالباً آپ کو بھی۔“ میں نے اسے اطلاع دی، جو اس کے لیے بالکل نئی تھی۔

”مجھے؟ لیکن کیوں؟“ ”اب تم بھی اُن کے لیے خطرہ ہو، وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔“

دھماکا! ایک اور گولی سامنے کی کھڑکی سے گزری، پردے کے چھتروے اُڑاتے ہوئے، اور شیشے کے ٹکڑے ہم پر برساتے۔ میں نے ماریا کے کندھے پکڑے اور اسے فائر پیس کی اوٹ میں بٹھادیا۔

”معذرت۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ لوگ میری بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔“

”خدا کے لیے!“ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ”ہمیں چھپ جانا چاہیے؟“

”اگر ہم چھپ گئے تو ان کے آنے کا پتا نہیں چلے گا۔“

میں ابھی برآمدے میں نکلا ہی تھا کہ ایک کار ہائی وے سے تیزی سے نکلتی ہوئی نظر آئی، میری لمبی ڈرائیو سے پر بجلی کی سی رفتار سے آتی ہوئی، اتنی دھول اٹھا رہی تھی کہ میں اسے واضح طور پر دیکھ نہ سکا۔ مگر دور سے بھی ماریا کی مرسلز اور اسٹین کی کرائے کی کیڈی لاک میں فرق بتا سکتا تھا۔ یہ گاڑی مرسلز تھی۔ یہ زوردار آواز کے ساتھ تنگ ڈرائیو سے پردوڑتی آئی، گھاس پر اتنی تیزی سے مڑی کہ اٹلنے ہی والی تھی۔ ماریا اچھل کر گاڑی سے نکلی، گاڑی ابھی تک جھول رہی تھی۔

وہ زبردست لگ رہی تھی۔ گہرے عنبالی رنگ کا پینٹ سوٹ اور میچنگ جوتے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح مکمل طور پر سنجیدہ۔ وہ بغیر رکے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ جب وہ آدمی سیڑھیوں تک پہنچی، میں کھڑا ہوا۔

”یہاں کیسے آنا ہوا؟“ ”میں۔۔۔ میں تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں۔“ وہ بدحواس سی لگ رہی تھی۔

”کس بارے میں۔۔۔؟“ میں چونکا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اسٹارک ہرسٹ کے دو آدمی تمہاری طرف آرہے ہیں اور یہ میری غلطی ہے۔“

”ایسا کیوں؟“ میں بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ”جب تم نے فون کیا، تو میں نے مسٹر گرہی سے بات کی۔“ اس نے میرے چہرے پر اُبھمن دیکھی تو وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاس، میں نے انہیں صورت حال سمجھائی کہ اگر تم نے جامدادیا پچی کو سل کو خنثل کر دی، تو ہم ہمیشہ کے لیے اسے کھودیں گے۔ وہ اسے کبھی واپس نہیں کریں گے، اور یہی تمہارا مقصد تھا، ٹھیک؟“ ”بالکل۔“ میں نے اتفاق کیا۔ ”اگر مجھے نہیں مل سکتی، تو اسٹارک ہرسٹ کو بھی نہیں۔ تو پھر؟“

”جب میں نے پرانی پیشکش بحال کرنے کی تجویز دی، تو اس نے بتایا کہ اب ہمارے پاس کلائنٹ کی نئی ہدایات ہیں۔۔۔ کہ ہم پیچھے ہٹ جائیں۔ وہ تم سے خود نہیں گے۔ اور جب میں نکل رہی تھی، تو اس نے گارزا اور اسٹین کو بلوایا۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تو تمہیں لگتا ہے کہ اُن کی میٹنگ میرے بارے میں تھی؟“

”اور کیا ہو سکتی تھی؟ اور ہے بھی۔ جب تم نے میری

ایسے طریقے ہوں گے کہ تمہیں ان سے محفوظ رکھ سکیں، جن سے تم چپ رہے ہو۔

”زیادہ تر تو بس چپے رہتا ہوتا ہے۔ اگر حالات خراب ہو جائیں، تو میں مارشلز سے رابطہ کر سکتا ہوں کہ مجھے کہیں اور منتقل کر دیں۔ بد قسمتی سے، یہاں اس جگہ یہ بھی ممکن نہیں۔“ میں نے بتایا۔

”ٹھیک۔ اور بغیر ہتھیار کے۔ وہ..... فائر پلیس کے اوپر بندوق ہے نا؟“ اس نے اوپر دیکھنے کی کوشش کی۔

”شارپس؟ وہ ایک پرانا ہتھیار ہے۔“ میں ہنسا۔

میری ہنسی پر اس نے مجھے گھورا تھا۔ ”تو کام نہیں کرتا؟“

”میڈم، وہ سول وار کے زمانے کا ہے! ابراہم لنکن، کیسبرگ؟ کچھ یاد آیا؟“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میرا سرت کھاؤ!“ وہ جڑا مان مٹی۔

”تو پھر چپ رہو۔“ میں نے کہا۔ کیا پاگل پن تھا۔ ان سے لڑنا..... ایک صدی پرانی بندوق سے..... یا پھر شاید، اتنا بڑا خیال بھی نہیں تھا۔

اس کی بوسیدہ حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ شاید یہ واقعی سول وار کے زمانے سے ہو۔ جب فوج نے اپنی شارپ رائفلز کو جدید ہتھیاروں سے بدل دیا، تو انہوں نے اضافی رائفلز صرف ایک ڈالر میں بیچ ڈالیں، اور آبادکاروں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ ان بھینسوں کے ریوڑوں کو مار ڈالیں جن پر فرسٹ نیشنز (مقامی قبائل) کا انحصار تھا۔ انہیں بھوکا مارنا ان سے لڑنے سے آسان تھا۔

ممکن ہے تب ہی جیرڈ کے والد یا دادا نے یہ بندوق خریدی ہو۔ ایک شارپ صرف ایک ڈالر میں؟ یہاں تک کہ ایک غریب کسان بھی اسے خرید سکتا تھا..... میں پلکیں جھپکے لگا۔

کیونکہ ٹیٹا مل خاندان ایک ڈالر بھی فضول خرچ نہ کرتا۔ ان کے لیے ایک ڈالر بھی معمولی رقم نہیں تھی۔ میں نے ان کا پورا گھر دیکھا تھا، مگر ایک بھی سجاولی چیز نہیں دیکھی۔ نہ کوئی گلدان، نہ کوئی پینٹنگ، نہ کتاب، نہ صلیب۔

ٹیٹا ملز کے پاس جو کچھ تھا، وہ صرف کام کے لیے تھا۔ تو شاید یہ صدی پرانی بندوق بھی۔ یہ شاید فائر پلیس پر سجا کر رکھنے کے لیے نہیں تھی بلکہ داخلی دروازے سے تین قدم کے فاصلے پر رکھی گئی تھی..... فوری استعمال کے لیے۔

فون یا 911 نہ ہونے کی وجہ سے ٹیٹا ملز کو ہر مسئلے کا

فی الحال ہم کافی محفوظ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ میرے پاس ہتھیار ہے یا نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

اس کی آنکھوں میں ابھی سی امید جاگی۔ ”تو کیا تمہارے پاس ہتھیار ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ اسی وقت دو مزید گولیاں کھڑکی سے آئیں، کمرے میں شیشے کے ٹکڑے بکھیرتی ہوئی اور ہم فائر پلیس کے پاس دب کر رہے۔

میں نے گہرا سانس لیا۔ ”یہ کسی سنگین ہتھیار کی آواز ہے..... غالباً 308، اور چلانے والا بہت ماہر ہے۔“

مار یا پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”اس نے پچھلی رات میری باڑ کو نشانہ بازی کے لیے استعمال کیا تھا۔“ میں نے وضاحت دی۔ ”وہ نشانے باز ہے۔“

”لیکن..... تم تو فوج میں تھے، ہے نا؟ تمہیں پتا ہوتا چاہیے کہ کیا کرتا ہے؟“ وہ کسی تسلی کی تلاش میں تھی۔

”بالکل۔ مجھے ان پر جوابی فائر کرنا چاہیے، انہیں غروب آفتاب تک روکے رکھنا چاہیے، پھر ہم اندھیرے میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن میرے پاس ہتھیار نہیں، اور اس کی رائفل میں اسٹار لائٹ اسکوپ ہے۔ ہم شاید سورج ڈھلنے تک فوج جا سکیں مگر اس کے بعد کوئی امید نہیں۔ وہ ہمیں اندھیرے میں شکار کر سکتا ہے۔“ میں نے اسے حالات کی سنگینی سمجھائی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

”خدا کی پناہ۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ جیب سے فون نکالا، اسکرین کو تھپتھپایا، پھر چہرے پر ناامیدی لیے دوبارہ تھپتھپایا۔

”یہاں سنگٹل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم ایک بیابان میں ہیں۔“

وہ فون پر تک تک کرتی رہی۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے جھنجھلا کر فون واپس جیب میں رکھا اور میری طرف مڑ گئی۔ ”تو پھر تم مدد کیسے مانگتے ہو؟“

”مدد؟“ میں نے ابرو اچکائے۔

”مجھے احمق مت سمجھو، بہن۔ تمہاری زندگی کی تاریخ صرف پانچ سال پرانی ہے۔ اگر تم مجرم نہیں ہو، تو ضرور کسی گواہ کے تحفظ کے پروگرام میں ہو، ہے نا؟“

”کچھ ایسا ہی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

اس نے بات جاری رکھی۔ ”تو ان کے پاس ضرور

سامنا خود کرنا پڑتا تھا۔ بھڑیے، جتے، بد معاش۔ اگر خطرہ دروازے پر آجائے، تو وہ یہاں بالکل تنہا تھے۔ جیسے ہم تھے۔

مجھے بندوق تک پہنچنے کے لیے لکڑی کے ڈبے پر چڑھنا پڑا۔ لیکن اوپر چڑھنے سے مجھے فائر پلیس کی منسل کے پیچھے چھپا یا گیا گولیوں کا کارٹن نظر آ گیا، بالکل بندوق کے نیچے۔

میں نے دونوں نیچے اتار لیے۔ بندوق بھاری تھی، مگر اس کا توازن بہترین تھا۔ میں نے بھی ایسی بندوق چلائی نہیں تھی بلکہ بھی قریب سے دیکھی بھی نہ تھی۔ لیکن یہ اتنی سادہ تھی کہ ایک بچہ بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔ مجھے اسے لوڈ کرنے اور چالو کرنے میں صرف دس سیکنڈ لگے، اور مزید تیس سیکنڈ میں میں سمجھ گیا کہ اسے حمل پوزیشن میں لانا ضروری ہے۔ اور جب میں نے یہ کر لیا۔ میں نے جیمبر چیک کرنے کے لیے چلا یا۔ وہ خالی تھا مگر بندوق اب بھی اتنی ہی مضبوط لگ رہی تھی جتنی بننے کے دن تھی۔ اتنی ہی سادہ بھی۔

گولیوں کا کارٹن تقریباً خالی تھا، صرف چار رہ گئی تھیں۔ میں نے کارٹن پر قیمت دیکھی۔ بیس ڈالر۔ جبرڈ کے وقت کے لحاظ سے یہ بہت مہنگی تھیں، تو مطلب یہ بعد کی بنی ہوئی تھیں، شاید ستر کی دہائی کی، یعنی یہ ایلرے نے خریدی ہوں گی۔ اور وہ بالکل نہیں تھا کہ ایک ناکارہ بندوق پر اتنی رقم خرچ کرتا۔ مجھے یقین تھا، یہ پرانی بندوق ضرور کام کی ہوگی۔

لیکن اگر یہ فائر کر بھی دے اور میرے منہ پر نہ پھٹے، تب بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کتنا درست نشانہ لگاتی ہے، اور صرف چار گولیوں کے ساتھ میں گارزا سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، جس کے پاس شاید درجن بھر گولیاں اور بہترین نشانے بازی کا ہنر تھا۔ کسی بھی فائرنگ کے مقابلے میں ہار جاتا۔

مار یا؟ میں نے اسے دیکھا۔ وہ پتھر لیے فائر پلیس کی پناہ میں بیٹھی گھٹنوں کو سینے سے لگانے مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے میرے سر پر سنگ آگ آئے ہوں۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“

”تمہارا مشورہ مان رہا ہوں، بس۔ اُن ہر فائر کر رہا ہوں۔“

”لیکن تم نے کہا تھا، یہ بندوق کام نہیں کرتی!“

”مجھے نہیں معلوم کہ یہ کام کرتی ہے یا نہیں، لیکن ہم ابھی پتا کرنے والے ہیں۔“ میں نے جیمبر میں کارتوس

ڈالا، پھر اسے بند کر دیا، بالکل اسی وقت جب ایک اور گولی کھڑکی کے فریم سے نکل گئی اور اسے آدھا اڑا گئی۔

بس بہت ہو گیا!

میں آہستہ سے کھڑکی کی طرف سرکا، شارپس رائفل کی نال کھڑکی کے کنارے پر رکھی، اور نشانے کی تلاش میں اسے گھمانے لگا۔ انتخاب آسان تھا۔ گارزا جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور غالباً ہماری پہنچ سے باہر، لیکن اشنن اب بھی کیڑی لاک میں احتیاط سے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا، تقریباً اپنی سینڈ گن کی ریخ میں۔ جیسے ہی وہ قریب آتا، گولی چلانا شروع کر دیتا، اور ہم کراس فائر میں پھنس جاتے۔ اس لیے انتخاب آسان تھا۔ میں اتنی دور سے آدی کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا، لیکن وہ گاڑی تو ہمیں سے بھی بڑی تھی۔

میں نے خود کو سنبھالا، نشانہ گاڑی کے ہڈ آرمنٹ پر مرکوز کیا، اور گولی داغ دی۔

”ہو دووم!“ نالی سے ٹپکنے والی آواز قیامت خیز تھی، بارود کا دھواں لمبے بھر کو میری نظر کے آگے چھا گیا لیکن جب دھواں چھٹا۔

کیڑی لاک سے بھاپ کا فوارہ نکل رہا تھا شارپس نے اس کی گرل میں سوراخ کر دیا تھا، بس میرے نشانے سے ایک دو انچ نیچے۔ خدا کی قسم، یہ پرانی بندوق صرف کام کی ہی نہیں، کام نشانے کی تھی۔

شروع میں مجھے اشنن نظر نہ آیا، لیکن پھر دکھائی دیا۔ اس نے گاڑی چھوڑ دی تھی اور ایسے بھاگ رہا تھا جیسے پیچھے آگ لگی ہو، سیدھا کھلی زمین سے ہوتا ہوا ایک اصطبل کی طرف۔ میری جوابی گولی سے شاید گارزا چونک گیا تھا، اور ایک لمبے کود پک گیا، لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے جلدی خود کو سنبھالا اور دھوئیں کی دیوار کے پیچھے سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس امید میں کہ کوئی گولی نشانے پر لگ جائے۔

اس کے پاس کافی گولیاں تھیں، اور میرے پاس صرف تین بچی تھیں۔ فی الحال تو ہم آمنے سامنے تھے، لیکن سورج ڈھلتے ہی حالات اس کے حق میں ہو جاتے۔ اسے اندھیرے میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

مار یا لکھڑاتی ہوئی اُٹھی۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ میں چلا یا۔

”یہ پاگل پن ہے!“ وہ غصے سے بولی۔ ”ہم دونوں ایک ہی کلاسٹ کے لیے کام کرتے ہیں، میں کم از کم بات تو کر سکتی ہوں۔“ اس کی بات حلق میں ہی دب گئی اسی وقت

کسی نچرنے لات ماری ہو۔ بارود کے دھومیں کے بارہ میں نے دیکھا کہ میل باکس دھماکے سے اڑ گیا، بھیسے گئے لیے بنی ہوئی گولی نے اسے چوراچورا کر دیا تھا، اور میرے خطوط ایسے بکھرے جیسے برف کے گلوب میں رنگین کاغذ۔

ایک ہل کے لیے سب کچھ جیسے رک گیا۔ پھر میل والی خاتون نے ایک دم ایک سیلر یٹر دیا، گاڑی کو اتنا تیزی سے موڑا کہ وہ تقریباً الٹ ہی گئی، پھر گرد اڑاتی ہوئی میری ڈرائیو دے سے نکل گئی۔ کاؤنٹی روڈ پر سب ہوتی ہوئی، بائیں طرف مڑی، اور آفت کے پار غائب ہو گئی۔

سب ٹھیک تھا، جب تک میں باریا کی طرف نہیں مڑا..... جو ہیکٹا میری طرف دیکھ رہی تھی، آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

”کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“ وہ چینی۔ ”تم کر کیا رہے ہو؟“

”کال کر رہا ہوں..... مدد بلائی ہے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”کیا..... کیسے؟“

”ہم فون نہیں کر سکتے، لیکن جیسے ہی میری میل لیڈی اونچی جگہ پہنچے گی، وہ ٹائن۔ دن۔ دن۔ دن پر ٹیکسٹ کرے گی، اور اسٹیٹ پولیس ہماری مدد کو آجائے گی۔“

”بشرطیکہ وہ غنڈے تمہیں پہلے گولی نہ مار دیں!“

”ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ میرا یہ خیال بھی غلط ثابت ہو سکتا تھا ایک تو میں نے اپنے فارم کے فاصلے کو نظر انداز کیا، اور دوسرے پچھلے علاقوں میں پٹرولنگ آفیسرز کی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک کاؤنٹی پولیس والا میل لیڈی کی شکایت پر آیا۔

آرام سے، اپنے پرانے بلیزر جیب میں، وہاں پہنچا، اسے علم بھی نہیں تھا کہ وہ ایک جاری گن فائٹ کے بیچ آکٹا ہے۔ ٹلیشیرز آن لیکن سائرین آف۔ شاید یہی بات اس کی جان بچا گئی۔ دونوں گن مین میری طرف دھیان دیے ہوئے تھے، اسے دیکھ نہ سکے جب وہ احتیاط سے کاؤنٹی روڈ سے ہٹ کر میری ڈرائیو دے میں مڑا، اور ٹوٹے ہوئے میل باکس کے سامنے گاڑی روک دی۔

گاڑی سے اتر کر اس نے اپنے جوتے کی ٹوک سے بکھرے ہوئے خطوط کو ہلایا، پھر جنگ کر میل باکس کے نیچے کچھ حصے کا جائزہ لینے لگا۔ غالباً یہ اس کا پہلا کرائم سین تھا۔ کم بخت، وہ تو ابھی بچہ ہی لگتا تھا ایک کاؤنٹی ڈپٹی جو بیڑ خریدنے کے بھی قابل نہیں لگ رہا تھا، اور اب پیشہ ور

ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے گھٹنوں کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر اسے نیچے مگرالیا، اس کا چہرہ میرے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر آ گیا۔ وہ دہشت سے سفید پڑتا چہرہ لیے مجھے تک رہی تھی۔

”ہوش میں آؤ، لیڈی!“ میں نے غراہٹ میں کہا۔ ”یہ لوگ بات چیت کرنے نہیں آئے۔ یہ کسی ہاؤسنگ پراجیکٹ کا معاملہ نہیں ہے، کبھی تھا ہی نہیں۔ ایک مافیا گروپ اس علاقے کو زہریلے فضلے کا گڑھا بنانا چاہتا ہے، اس کے علاوہ، میرے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے مجھے مار دیا، تو تم ایک کمزور کڑی بن جاؤ گی، اور وہ کوئی کڑی نہیں چھوڑتے۔ ہم یہاں ایسے غائب ہو جائیں گے جیسے نیٹا ہار غائب ہو گئے تھے۔“ میں رک گیا، دھیان سے سننے لگا۔ دور کہیں ایک ٹرک کا انجن گڑگڑاتے ہوئے قریب آ رہا تھا۔

میں نے سر اٹھایا..... ایک گاڑی کاؤنٹی روڈ پر آرہی تھی، جیسے ہی وہ بیرونی باڑ کے کنارے پر پہنچی، اس نے رفتار کم کی۔ ایک..... سرخ، سفید اور نیلی ڈیوری وین، جس کے پہلو پر USPS کا لوگو تھا۔

میل لیڈی۔ میں سمجھا وہ گزر جائے گی؛ مجھے شاذ و نادر ہی ڈاک آتی ہے..... لیکن لگتا تھا آج کچھ آیا تھا، کیونکہ وہ میری ڈرائیو دے میں مڑ گئی تھی اور جنگ پگھلنے لگی سے ہوتی ہوئی میل باکس کی طرف آرہی تھی، جو سڑک سے چند گز اندر تھا۔

پھر بھی، مجھے لگا وہ محفوظ رہے گی۔ اور ڈاک دے کر واپس چلی جائے گی.....

واپس مڑتی، اور چلی جاتی..... اور تقریباً ایسا ہی ہوا۔ وہ میل باکس کے قریب رکی، چند خطوط اس میں ڈالے، ڈھکن زور سے بند کیا، اور مڑنے لگی..... لیکن پھر ایک دم رک گئی۔

خدا خیر کرے! غالباً اس نے ڈرائیو دے کے بیچ میں کھڑی سیاہ کیڑی لاک کو دیکھ لیا تھا، جو زخمی جانور کی طرح بھاپ اگل رہی تھی۔ اور اگر اس نے مدد کرنے کی کوشش کی تو.....؟

سوچنے کا وقت نہیں تھا، صرف رد عمل ممکن تھا۔ میں گھٹنوں کے بل گر، شارپس دوبارہ لوڈ کی، رائفل کی نال کھڑکی پر رکھی، فاصلے کے مطابق نشانے کو ایڈجسٹ کیا، پھر گولی چلائی!

وزنی بدوق نے میرے کندھے کو پھر جھٹک دیا، جیسے

مدد بلانی چاہیے۔“

اس میں کچھ وقت لگا۔ خوش قسمتی سے میری میل لیڈی دوبارہ واپس آئی یہ دیکھنے کہ کیا ہوا، اور اسے دوبارہ روانہ کر دیا گیا تاکہ فون کر کے اصل مدد بلا سکے۔ نتیجتاً دو پولیس کاریں اور ایک ریپاسٹی پولیس کی وین آگئی۔

میرا معاملہ تھوڑا پیچیدہ ہو گیا۔ مجھے کھنٹوں سوال و جواب کے سلسلے سے گزرنا پڑا۔ کچھ سوالوں کے میں نے جواب دیے، کچھ کے نہ دے سکا۔ آخر کار اہتوں نے ڈیٹرائٹ فون کیا، میری صورت حال جانچی، اور غالباً مجھے فوری طور پر چھوڑنے کا حکم آ گیا۔

بد قسمتی سے، ٹاؤس میں میرا وقت ختم ہو چکا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں قاتل باہر نکلتے، میری پیٹھ پر پھر نشانہ ہوتا۔ میری واحد امید یہ تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاؤں اور ایک بار پھر اپنی شناخت بدل لوں۔

ماریا نے مجھے فارم پر چھوڑا تاکہ میں اپنی چند چیزیں اکٹھی کر سکوں۔ ہم دونوں زیادہ کچھ نہ بولے۔ ہم جانتے تھے کہ کیا ہو چکا ہے، اور اب کیا ہوتا ہے۔ افسوس کی بات تھی۔

فارم ہاؤس پر، میں چاہتا تھا کہ خالی کمروں کا آخری بار چکر لگا لوں، مگر میں نے خود کو روک لیا۔ یہ جاننا کہ یہ میرا آخری موقع ہے..... میرا دل توڑ سکتا تھا۔ اور مجھے اپنا دل صحیح سلامت چاہیے تھا، دوبارہ بھاگنے کے لیے۔

ماریا نے مجھے ٹاؤس کے گرے ہاؤس اسٹیشن چھوڑنے کی پیکش کی، لیکن جب ہم ڈرائیو سے پر جا رہے تھے، تو میں نے اس سے کہا کہ ذرا راز کے، میرے میل باکس کی باقیات کے پاس، تاکہ میں اپنی میل لے سکوں مگر جب میں کھنٹوں کے ٹل جھک کر کاغذات سمیٹ رہا تھا، تو مجھے ہنسی آگئی۔

کیونکہ وہ میل میری تھی ہی نہیں۔ وہ لفافے سب مرحوم ایلرے ٹیٹائل کے نام تھے۔ یا..... موجودہ مکین کے۔ اور کچھ وقت کے لیے، وہ ”موجودہ مکین“ میں تھا۔ اب نہیں۔

لیکن یہ ایک یاد دہانی بھی تھی کہ ایک دن، کوئی اور موجودہ مکین..... جو میں نہیں ہوں گا..... ایک ایسا خط پاسکتا ہے جو میرے مرے ہوئے نام کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ میرے لیے یہ ایک انتہا ہے، ایک یاد دہانی کہ زندگی مختصر ہے اور کچھ بھی باقی رہنے والا نہیں۔ اور یہی اس دنیا کا حق ہے۔

❖❖❖

قاتلوں کے ساتھ آنے سے سامنے تھا۔ اور اس کے پاس صرف ایک ونڈ گن تھی، وہ بھی ابھی تک ہولسٹر میں۔ احمق.....

”باہر کیا ہو رہا ہے؟“ ماریا نے پوچھا۔

”مدد مانگ رہی ہے۔ ایک لڑکا ہے، جسے کچھ اعزازہ نہیں

کہ وہ کس مصیبت میں آ گیا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن ہمیں فوراً کچھ کرنا تھا۔ اگر ان میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا، جو کھلی جگہ میں بے دھیانی سے گھوم رہا تھا تو.....

لحنت ہوا میں ایک دم اٹھا، دروازے کے دہانے پر آیا، اور گارڈز کی عمومی سمت میں ایک گولی چلا دی۔ دھوئیں کے بادل نے مجھے اس لمحے کے لیے ڈھک لیا، جس میں میں واپس اندر کودا اور دروازے کے پیچھے لڑھک گیا، گولیوں کی بارش میرے پیچھے آئی..... دونوں گن میں مجھ پر اتنے متوجہ تھے کہ انہیں پیچھے آتا ہوا ڈپٹی دکھائی ہی نہ دیا۔ اور وہ ڈپٹی جتنا نظر آتا تھا، اس سے زیادہ چالاک نکلا۔

جھکے جھکے وہ اپنی جیب کی طرف واپس گیا، اور ایک رائٹ گن نکال لایا۔ گارڈز کی پشت پر آکر، اس نے اسے ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ ایک لمحے کو لگا جیسے گارڈز گولی چلانے کی کوشش کرے گا، مگر اس کی 308 بولٹ ایکشن رائفل انٹی سمت میں نشانہ لے ہوئے تھی۔ اور ڈپٹی کے ہاتھ میں بارہ بور کی رائٹ گن تھی، جس کی ٹالنگن ٹیل جتنی بڑی دھمکی تھی۔ گارڈز نے نرمی سے ہتھیار نیچے رکھا، کھنٹوں کے ٹل بیٹھا، اور ہاتھ سر کے پیچھے جوڑ دیے۔

اسٹین اس وقت تک پستول سے گھر پر فائرنگ میں مصروف رہا، جب تک کہ اس کی گولیاں ختم نہ ہو گئیں۔ جیسے ہی وہ نیامیگزین تلاش کرنے کے لیے جھکا، اسی وقت اس کی نظر گارڈز پر پڑی، جو زمین پر جھکا ہوا تھا اور موت جیسی خطرناک بددھن کی ٹال اس کی گردن پر تھی۔ میرا نہیں خیال کہ اسے اندازہ ہوا ہو کہ ڈپٹی کتنا کم عمر ہے..... یہ احساس اسے تب ہوا، جب وہ اپنا ہتھیار پھینک چکا تھا۔ اور تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

”گھر میں جو بھی ہے!“ ڈپٹی چلا یا۔ ”ہاتھ اٹھا کر باہر نکلو.....“

”احق مت بنو!“ ماریا غصے سے بولی، اور ہاتھ کر پر رکھے باہر آگئی۔ ”میں ماریا لوہو ہوں، وکیل اور عدالت کی نمائندہ، ٹاؤس کا ڈپٹی سے۔ میرا موکل، ڈیولن بین، جس نے تمہاری جان بچائی، وٹنس پروٹیکشن میں ہے۔ ہمیں مزید

حباب

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفلیٹ کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھونٹ دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی بدولت اس کا لڑکپن اور جوانی عید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہو گئی۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان پتے نقش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحر بے کنار اپنے جہ میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نئے نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر مشکف ہوا کہ خالہ نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مشنریوں کا واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ اس کا زار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں منہ چہیں اس کی رنجیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شہریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جب ان مہرودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب اٹھ منڈے تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار، نون کی ہوش بُرا حیلہ سازیاں

گذشتہ افسانہ کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت منفری کا پیغام بر ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی فنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی ٹیلی فونان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہو گئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماسوں چیل کی طرف دیکھا۔ چیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے چیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماسوں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے چیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بد معاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیر و کار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کاسٹریٹ بھڑا تھا۔ دادا اور کاسٹریٹ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی چتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کاسٹریٹ نے جاسم کی زبان کو تھوڑا اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی لٹکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے چالاک لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک کینکسر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ چیل ماسوں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بد معاش تھا کہ وہ چیل میں بیٹہ کر بھی باہر کے معاملات کو چلا سکتا تھا۔ چیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو کی پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے مستند خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے چیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندہ بھر کے لیے چیل چیر کر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا چیل سے باہر جانا ناگوار رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہر حال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد چیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہر جیسے اس کا تعارف ہو گیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائننگ

اسٹلو سے حدود درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن وہ پردہ ڈرگنز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور توہم ریزیوں کے خواہیے مذہب کا مومن میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوہر کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت تاک موت سے ہلکانا کیا تھا۔ یہ سنی خیر ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ ٹائی شخص نے بڑے پراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی رری اسٹیلیٹی ٹی وی میں، ہماری معاونت پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا ڈیوڈ کا روتا ہوا پراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر بھی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیوڈ ایک استنبول ملاقات اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو خواہ کر کے جاسم کو اپنے رری اسٹیلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار جیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر مدد ملتی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے مدد ملنے کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں رری اسٹیلیٹی ٹی وی کے کنٹرکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست فرما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ رری اسٹیلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلانا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹرکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنائی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو اٹائٹیل کر کے ایک کروڑ شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعد ازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پراسرار اعزاز میں سیلر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروڑ شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بذریعہ جیپ قاہرہ پہنچا دیں گے جہاں پراسرار رری اسٹیلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے رری اسٹیلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجام دینے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا مکمل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جنرادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دوران سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورت حال سے ٹھنکے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ ملاحقین کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جشن ظلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جشن حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی باز یاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئین کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جشن حسنی کے دلائل پہنچ چکے تھے۔ جاسم نے پہلے ہی سے تمام منصوبہ ترتیب دیا اور ڈیوڈ کے کارندوں سے معرکہ آرائی کے بعد وہاں سے نکل جاتا ہے۔ ترکی سے نکل کے جاسم کی کارروائیاں جاری تھیں۔ اس نے اسرائیلی ٹیم کے ٹولے کو زبردست شکست پہنچائی تھی۔ یہ سب ٹیلی پوریشن کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ اٹھارے بھی ہر برے ٹیم میں اس کی مدد کی۔ وہ اسرائیلی کے ساتھ شپ پر سوار تھا۔ اسرائیلی اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طرح جاسم کو اپنے قابو میں کر لیں۔ اس کے لیے وہ پراسرار علوم کی ماہر براخا کو استعمال کر رہے تھے۔ اب تک جاسم اس کے ہر حملے کو ناکام بناتا آیا تھا۔ براخا اپنی حکمت عملی سے اسرائیلی اور جاسم کو کروڑ شپ پر لے آئی تھی۔ براخا کو یقین تھا کہ وہ جاسم کو اپنے ٹرائس میں لے چکی ہے مگر یہ اس کی محض خام خیالی تھی۔ جاسم نے اپنی اداکاری سے اسے فریب میں رکھا مگر اس کے باوجود اسرائیلی اپنی جان سے چلی گئی۔ جاسم اس کی موت کا سن کر پاگل ہو گیا۔ اس کے خون نے جوش ماما اور کروڑ پر سب کو بھانک مارے۔ اب اسے غزوہ کے علاقے میں پہنچنا تھا اور حاس کے قریبی لوگوں سے ملاقات کرنی تھی۔ جاسم نے غزوہ پہنچ کے اسرائیل کو کاری ضرب پہنچائی تھی۔ یہاں ابوہریران کے کہنے کے مطابق اسے حاس کے خاص لوگوں سے ملاقات کرنی تھی۔ اس کا شن سلطینیوں کا مدد کرنا تھا۔ جاسم کی ملاقات ابوہریران سے ہوئی۔ جس نے اپنے ساتھی افکار اور اس کی بیٹی بلو ماسے طویا۔ ان کے ذمے بھی اسرائیل کو شکست پہنچانا تھا۔ اب جاسم کا کام بڑھتا جا رہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ پیٹرک نے نالے والے انداز میں کہا۔ ”گھر پہنچ کر ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔“
”مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔“ اشہد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”وہ لوگ ٹوبان کو اپنی گاڑی کے اندر بٹھا چکے ہیں۔ ہمیں کم از کم ان کی گاڑی کا تعاقب ضرور کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کسی موقع پر بازی پلٹ جائے اور اس وقت ٹوبان کو ہمارے تعاون کی ضرورت پیش آجائے۔“
”ہرگز نہیں۔“ ہیری نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”جب تک میں کسی دلدوز دھماکے کی آواز نہ سن لوں، یہاں سے الوں گا بھی نہیں۔“

”ہیری! تمہیں ہیری کہتے ہوئے مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے کیونکہ میں کئی گھنٹے تک ٹوبان کو ہیری سمجھ رہا تھا۔“
اشہد نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایک بات ذہن میں رکھو کہ تمہاری اس چھوٹی سی گاڑی کی ڈکی میں اس وقت کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا ایک چرم بیگ موجود ہے۔ اتنی بھاری رقم کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ عین ممکن ہے کہ کوئی اصلی سمجھتی پولیس کار اُدھر آ نکلے اور ہم انہیں بتانے پائیں کہ یہ دولت ہم نے کہاں سے حاصل کی ہے۔“

مریا اور ہیری نے مذکورہ چرم بیگ اشہد کو فیٹ کی ڈکی میں رکھتے ہوئے دیکھا تو تھا لیکن وہ دونوں اس کے اندر کے احوال سے واقف نہیں تھے۔ بیگ کے اندر جھانک کر تو پیٹرک نے بھی نہیں دیکھا تھا تاہم جاسم کی زبانی اسے اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ اس بیگ میں ایک خطیر رقم موجود ہے جو کبھی عفران پر نگالی کی ملکیت ہو کر تھی۔

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“ ہیری نے بے یقینی سے اشہد کی طرف دیکھا۔ ”کیا واقعی اس بیگ کے اندر کرنسی نوٹ بھرے ہوئے ہیں؟“

”ہاں، یہی حقیقت ہے۔“ اشہد نے مختصر جواب دیا۔ ”ڈیڈ! کیا آپ کو بھی اس دولت کے بارے میں معلوم تھا؟“ مریا نے پیٹرک سے سوال کیا۔

”ہاں..... مگر اس وقت ہمیں اس چرم بیگ کے بجائے کسی اور شے پر توجہ دینا چاہیے۔“ پیٹرک نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کس شے پر؟“ مریا پوچھے بتانہ نہ سکی۔

”تم سب لوگ خاموش رہتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ ایک آواز کی آمد پر مرکوز کر دو۔“ پیٹرک نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”ایک ساعت ممکن دھماکے کی آواز کیونکہ ٹوبان جو کہتا

پولیس کی گاڑی میں سے برآمد ہونے والے ان دو وریدی پوکس اور سب افراد کے ایکشن نے جاسم کو ہٹا دیا تھا کہ ان کا پیچھے پوکس ڈیپارٹمنٹ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا چنانچہ اب یہ جاننا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ لوگ درحقیقت تھے کون اور وہ جاسم کو گاڑی سے باہر آنے کا کیوں کہہ رہے تھے۔ اس اہم جانکاری کے لیے جاسم نے ان کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔
”ہیری! یہ پولیس والے نہیں بلکہ میرے انجان کرم فرما ہیں اسی لیے وہ کن کے اشارے سے مجھے گاڑی سے باہر نکلنے کو کہہ رہے ہیں۔ سو مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا۔“ جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تم جب تک کوئی خوفناک دھماکا نہ سن لو، یہیں کھڑے رہنا۔ بعد میں تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔“
”اوکے باس!“ ہیری نے فرمانبرداری سے کہا اور پوچھا۔ ”تم نے دوبارہ کب اور کیسے ملاقات ہوگی؟“

”آج ہی رات کسی وقت۔“ جاسم نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔“ پھر گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اشہد سے کہا۔

”تمہارا سیل فون میں نے اس سیٹ کے نیچے ڈال دیا ہے۔ میرے جانے کے بعد تم اسے نکال لینا۔“

بات ختم کرتے ہی وہ گاڑی سے اس طرح باہر نکل آیا کہ اس نے رضا کارانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر رکھے تھے۔ ان میں سے ایک ”پولیس“ والے نے جاسم کو اپنی گن کے نشانے پر لے رکھا تھا اور دوسرے نے آگے بڑھ کر اسے سیدھی پھٹکڑی لگا دی۔ پھر وہ اسے اپنی گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔

”ہمیں ٹوبان کی مدد کرنا چاہیے۔“ اشہد نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”وہ تنہی پولیس والے بھلا ایسے کیسے لے جا سکتے ہیں۔“

”ٹوبان خود اپنی مرضی سے ان کے ساتھ گیا ہے۔“ پیٹرک نے شہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور جانے سے پہلے اس نے ہمیں یہ تسلی بھی دی ہے کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ وہ رات میں کسی وقت ہم سے ملنے آئے گا اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ان جعلی پولیس والوں سے بہ آسانی نمٹ سکتا ہے۔“

”ڈیڈ! آپ ٹوبان کے بارے میں اتنے وثوق سے بات کر رہے ہیں جیسے آپ پہلے سے اسے جانتے ہوں۔“ مریا نے ابھمن زدہ انداز میں کہا۔ ”یا اسے دیکھ کر آپ کو یاد آ گیا ہو کہ آپ بھی اس سے مل چکے ہیں یا آپ نے کہیں اسے دیکھ رکھا ہے؟“

ہے، وہ کر کے بھی دکھاتا ہے۔“
پہلی فیٹ کے اندر کبھی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

پولیس کی گاڑی میں کل تین افراد تھے یعنی دو تو وہ جو جاسم کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لائے تھے اور تیسرا ڈرائیور جس نے گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھال رکھا تھا۔ جاسم کو عقبی نشست پر ”سیٹڈوج“ بنانے کے بعد اس کے سر پر ایک ڈھیلا ڈھالا تھیلا پہنا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

جاسم کے سر پر وہ تھیلا چڑھانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے گرد و نواح کو دیکھ نہ پائے۔ یہ ان پولیس والوں کی بھول تھی۔ اگرچہ مذکورہ تھیلا جاسم کی آنکھوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے گردن تک آگیا تھا لیکن اس کپڑے کی دیوار نے اس کی دیکھنے کی صلاحیت کو کچھ طور پر چھیننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایشیاء کے چٹکار آئی ڈرائیو نے اسے اندھیرے میں دیکھنے کا اختیار دے رکھا تھا۔ سو وہ آنکھوں کے سامنے تھے ہوئے اس تھیلے کے پیچھے سے بھی دیکھ پاتا تھا۔

”تم نے مجھے ہتھکڑی لگا دی اور میرے چہرے پر یہ تھیلا چڑھا دیا ہے۔“ جاسم نے ڈرے سہے لہجے میں کہا۔ ”اور وہ بھی میرا تصور بتائے بغیر۔ پولیس والے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ کیا تم لوگ پولیس کے لہادے میں کوئی اور ہو؟“

”ہم پولیس والے ہی ہیں لیکن اس وقت غیر روایتی انداز میں کارروائی کر رہے ہیں۔“ جاسم کی دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ”بس، تمہیں ایک بندے کے حوالے کر کے اپنا انعام وصول کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اصلی پولیس والے بن جائیں گے۔“

”کوئی میری گرفتاری پر انعام بھی رکھ سکتا ہے، مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا۔“ جاسم نے اُنہیں زدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تو ایک مسکین عاجز بندہ ہوں۔ کار والوں نے مجھے پیدل چلتے دیکھ کر لفٹ دی تو میں اُن کی پہلی گاڑی میں بیٹھ گیا اور اب تمہارے ساتھ پتا نہیں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے پاس کا نام بتاؤ گے۔ میں یہ بھی جانتا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کو کتنا انعام ملنے والا ہے؟“

جاسم کے لیے ان کے چنگل سے لکنا ملک جھینکنے جیسا کام تھا۔ وہ کپڑے کا تھیلا یا اس کے ہاتھوں پر لگی ہوئی سیدھی ہتھکڑی نا دیدہ پرداز کے راسے میں ایک ذرا سی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی لیکن وہ دانستہ ان کے ساتھ بات چیت کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر اس کے اسرار اغوا کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ وہ اپنے اس ”مہربان“ سے آگاہ ہونا

چاہتا تھا۔

”ہمارا کوئی باس نہیں ہے۔“ جاسم کی بائیں طرف موجود شخص نے بتایا۔ ”بس ایک بندے نے ہمیں تمہاری تصویر دے کر یہ کام سونپا تھا۔ ہم صبح سے مینجمر کی سڑکوں پر اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ہی تمہاری تلاش میں سرگرداں تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی کہ تم ہمیں اس پہلی گاڑی میں بیٹھے نظر آ گئے۔ ہماری دن بھر کی دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ گئی۔ ہم اب تمہیں اس بندے کے حوالے کریں گے اور اپنا انعام لے کر ایک طرف ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم اس بندے کے بارے میں مجھے کچھ نہ بتاؤ جو تمہیں میرے عوض کوئی بھاری انعام دینے والا ہے۔“ جاسم نے نرم لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ”اس غیر قانونی خدمات کے صلے میں تمہیں کتنا انعام ملنے والا ہے؟“

”دس ہزار ڈالر؟“

”بس، اتنی تھوڑی سی رقم۔“ جاسم نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”اس سے زیادہ تو میں تمہیں میری ہتھکڑی کھولنے پر دے سکتا ہوں۔“

”تم کہاں سے دو گئے؟“ جاسم کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے پولیس والے نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ہم نے گاڑی میں بٹھانے سے پہلے تمہاری تلاشی لی تھی۔ تمہارے پاس ایک سیل فون اور چند ڈالر ہیں جو بمشکل دو سو بھی نہیں ہوں گے۔“

”وہ بندہ بہت ہی بے وقوف ہے جس نے تم گدھوں کو میری تلاش پر مامور کیا ہے۔“ جاسم نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔ ”حالانکہ یہودی عموماً اتنے احمق ہوتے نہیں ہیں۔“

جاسم نے آخری جملہ یہ چیک کرنے کے لیے ادا کیا تھا کہ ان پولیس والوں کو اس کام پر لگانے والے کہیں وہی لوگ تو نہیں جنہیں آج صبح اس نے عظیم جانی اور مالی نقصان کا تحفہ دیا تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ بندہ یہودی ہے؟“ دوسرے نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

اس کے اضطرابی سوال کے اندر چھپی تشویش نے فوراً سے چوشر جاسم کو بتا دیا کہ اس کا اندازہ صد فیصد درست تھا۔ جب جاسم اور راشد ظاہری آج صبح ابن بطوطہ از پورٹ سے نکلے تھے تو پہلے نیلے رنگ کی چار سیٹوں والی بچو نے اور بعد ازاں سرخ لینڈ کروزر نے ان کی مرسیڈیز بیئز کا تعاقب کیا تھا۔ مینجمر کے ڈسٹرکٹ ”کاسا باراتا“ کے قلب سے گزرنے

سمیت مرغ نامی سیارے پر "شفٹ" ہو چکی تھی لیکن اس کی یاد جاسم کی رگوں اور نسون میں لبو کے مانند دوڑ رہی تھی۔ جاسم دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسری جانب ایشیاء کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ ایک بادی مخلوق تھی اور جاسم کا مشاہدہ اور تجربہ تو یہی تھا کہ ایشیاء خاکی مخلوق یعنی انسان کی طرح جذباتی تو ہرگز نہیں تھی۔

"اور وہ وجہ کیا ہے؟" ایک پولیس والے نے پوچھ لیا۔

ایک جانب جاسم ان پولیس والوں سے بات چیت میں مصروف تھا اور دوسری سمت اس کا ذہن ایشیاء اور دوسری چیزوں کے بارے میں بھی لگا تار سوچ رہا تھا۔ سوچ کی رفتار، روشنی کی رفتار سے بھی کہیں زیادہ ہے چنانچہ یہ دونوں کام بخوبی ایک ہی وقت میں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔

"تم نے میرے پاس سل فون کا سراغ تو لگالیا لیکن اس کے باوجود بھی گدھے کے گدھے ہی رہے۔" جاسم نے تپانے والے انداز میں کہا۔ "آج کل لوگ اپنے اکاؤنٹ سے آن لائن بینکنگ کے ذریعے ملین اور بلین کا ٹرانسفر کر رہے ہیں۔ کیا میں تمہیں بیس، تیس ہزار ڈالرز کے فنڈز ٹرانسفر نہیں کر سکتا احتیو؟"

"اوہ..... اس طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا۔" دائیں جانب بیٹھے ہوئے پولیس والے نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ بائیں طرف والے نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم ابھی اپنے سل فون سے ہم سب کے اکاؤنٹس میں دس، دس ہزار ڈالرز ٹرانسفر کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں، یہ کون سا مشکل کام ہے۔" جاسم نے بے پروائی سے کہا۔ "بس چند من ہی تو پریس کرنا ہیں لیکن.....!"

جاسم نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس کے دائیں پہلو والے نے بے تابی سے پوچھا۔ "لیکن کیا؟" "اس کے لیے تمہیں میری ہتھکڑی کھولنا ہوگی۔" جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی میرے چہرے پر سے یہ تھملا بھی ہٹانا ہوگا تاکہ میں اپنے سل فون کو بآسانی آپریٹ کر سکوں۔"

انسان کی سرشت میں موجود یہ بڑی خامیاں زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں، آلا یہ کہ وہ اپنے نفس کو غلام بنالے۔ جب تک انسان اپنے نفس کا غلام بنا رہتا ہے، ان دونوں خامیوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ نمبر ایک، ڈر اور نمبر دو، لالچ۔ انسان اپنی زندگی کے ننانوے فیصد معاملات یا تو کسی خوف کی وجہ سے کرتا ہے اور یا پھر کسی طمع کے سبب۔

والی ٹیشل ہائی وے، روٹ ٹو پر جاسم اور راشد ظاہری نے اپنے متعاقبین کا جو شکر کیا تھا، وہ اس صحرا کی "یادداشت" میں محفوظ ہو چکا تھا۔ ان کا بیچا پکڑنے والے وہی بدبودار صہیونی تھے جنہیں چار پراسرار چابیوں کی تلاش تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں جاسم کے ذہن سے گزر گئے۔ اس نے پولیس والے کے استعارے کے جواب میں کہا۔

"مجھے ایسے معلوم ہے کہ اس دنیا میں یہودیوں کے سوا میرا اور کوئی دشمن نہیں ہے اور وہ بھی صہیونی یعنی انتہا پسند زائسٹ جو اپنی جنت کے لیے باقی دنیا کو جہنم بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہیں ہر قیمت پر گرگیر اسرائیل بنا کر رہنا ہے، چاہے اس کے لیے مشرق وسطیٰ کو آگ میں کیوں نہ جھونکنا پڑے۔"

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا نام ثوبان ہے اور تم ایک فلسطینی دہشت گرد ہو۔" ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم ہمارے ملک میں کسی بڑی تخریبی کارروائی کی نیت سے آئے ہو لہذا ہم تو ہر قیمت پر تمہیں ان کے حوالے کریں گے۔ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم مسلمان ہو یا وہ یہودی ہیں۔ ہم تو یہ کام دس ہزار ڈالرز کے لیے کر رہے ہیں۔ باقی جہاں تک تمہاری پیشکش کا تعلق ہے تو.....!" کمانی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

"یہ پیشکش بہت ہی کھوکھلی اور غیر دلچسپ ہے ثوبان! ہم تم پر بھروسہ نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارے تلے کچھ بھی نہیں ہے اور تم نے ہمیں "گدھے" بھی کہا ہے۔ سو تمہارے ساتھ کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔"

"میں نے تمہیں گدھا کہا، اس کی ایک خاص وجہ ہے میرے اغوا کارو!" جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس دوران میں جاسم اس کیونوس بیگ کی "چلمن" سے مسلسل اپنے گرد و نواح کا جائزہ بھی لے رہا تھا اور اس "گرد و نواح" میں گاڑی کا اندرونی اور بیرونی دونوں ماحول پوری طرح شامل تھے۔ کپڑے کے تھیلے نے اگرچہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چادری تان رکھی تھی لیکن مذکورہ چادر اتنی دبیز نہیں تھی کہ اس کے آر پار دیکھنا ناممکن ہو کر رہ جائے۔ باہر کے مناظر اسے اتنے دھندلے نظر نہیں آ رہے تھے جیسا کہ ایک عام انسان کو دکھائی دینا چاہیے تھے۔ جاسم کی اس ایک عام انسان پر فوقیت کا سبب ایشیاء کے آئی ڈراپس کا فیض تھا۔ ایشیاء، جاسم کو اس کرہ ارض پر چھوڑ کر اس کی اولاد

جاسم کے دماغ میں بائیس بیٹھے ہوئے پولیس والوں کو یہ پینکشن بڑی سہانی اور مسخانی ملی تھی۔ اگر وہ لوگ جاسم کو لے جا کر اس بندے کے حوالے کر دے۔ یہ تو ان تینوں کو مجموعی طور پر دس ہزار ڈالر کا انعام ملتا اور یہاں جاسم انہیں نفراؤنی طور پر دس، دس ہزار ڈالر دے دینے کی بات کر رہا تھا جو خاصا منافع بخش سودا تھا۔ سو وہ دونوں لالچ میں آکر جاسم کی ہیرا پھری سے "استفادہ" کرنے کو تیار ہو گئے تاہم خانہ پوری کے لیے انہوں نے اپنے تیسرے ساتھی سے پوچھ لیا۔

"تم کیا کہتے ہو بھائی؟ ٹو بان کی پینکشن میں دم تو نظر آ رہا ہے۔"

"ہاں، دم تو ہے اس بندے کی بات میں لیکن اس میں ایک قباحت بھی ہے۔" ڈرائیور نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ "اگر ٹو بان ہمارے اکاؤنٹس میں رقم ڈالے گا تو ان چیزوں کا جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ہم محکمہ ٹیکس کو کیسے مطمئن کریں گے کہ یہ دس ہزار ڈالر ہمارے پاس کہاں سے آئے ہیں۔ ہم سرکاری ملازم ہیں۔ ہم پر بدعنوانی اور رشوت ستانی کے سنگین الزامات لگ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں ملازمت کھونے اور جیل جانے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہاں، البتہ۔۔۔!" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات طے کر دی۔

"اگر ٹو بان ہمیں پیش میں بے کر دے تو ہم نہ صرف اس کی چھکڑی کھول دیں گے بلکہ اسے گاڑی سے بھی اتار دیں گے۔ اس کے بعد یہ جہاں دل چاہے چلا جائے۔ ہم نے ابھی تک اس کی دستیابی کے بارے میں بھی اوپر نہیں بتایا کہ اگر کوئی بھڑیلہ اسے آتی ہے تو ہم اس کے بارے میں سوچ سکیں۔"

ڈرائیور بھی اپنے نفس کے تابع تھا لیکن وہ ان دونوں کی طرح گدھا نہیں تھا۔ اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے علاوہ عیاری اور موقع پرستی بھی موجود تھی۔

"مگر اس کے پاس تو ڈیڑھ دو سو ڈالر سے زیادہ کیش فنڈ ہے۔" اس کے ایک ساتھی نے ہزاروں بھرے لچے میں کہا۔ "یہ ہم میں تیس ہزار ڈالر کیسے تقسیم کرے گا؟" "تو پھر اس معاہدے کو ایسا ہی چلنے دیتے ہیں جیسا کہ یہ ابھی چل رہا ہے۔" ڈرائیور نے حتیٰ انداز میں کہا۔ "تم دونوں جیسا سوچ رہے ہو، میں اس رسک کے حق میں نہیں ہوں۔"

نیچر کے ہوش کا نئی نینل میں آج رات جس نوعیت کا ہنگامہ ہونے والا تھا۔ اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا

جاسم کا تھمنا جاسم کو بخوبی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے "قدردانوں" نے شجر میں اس کی "خطرناک رات" کی فرض سے ان تین پولیس والوں کی طرح درج ذیل "مرئی فردوں" کو بھاری انعامات کا لالچ دے کر سرگرم عمل کر رکھا تھا لہذا ان اردلیوں کے شر سے محفوظ رہنے کی اشد ضرورت تھی۔ خصوصاً اس صورت میں بھی کہ پچھلے جاسم کے لیے اب کوئی بگاڑام باقی نہیں رہا تھا۔

"ابک بار پھر سوچ لو ڈرائیور بھائی!" جاسم نے اتمام حجت کے طور پر پوچھ لیا۔ "تم لوگ اس رقم کو کسی فیملی فرینڈ کی جانب سے ایک گفٹ بھی ظاہر کر سکتے ہو۔"

"نہا نے جو سوچا تھا، سوچ لیا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا پھر اپنے ساتھی سے کہا۔ "اوپر اطلاع کر دو کہ شکار ہمیں مل گیا ہے۔ ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔" "تو پھر جاؤ بھڑا میں۔" یہ کہتے ہوئے جاسم ایک جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جاسم کی اس میکائیکی حرکت نے ان بدعنوان پولیس والوں کو درط حیرت میں ڈال دیا پھر جاسم نے انہیں اس کیفیت سے باہر نہیں آنے دیا۔ اس کی خوش نصیبی کہ ان لوگوں نے اسے سیدھی چھکڑی لگائی تھی، یعنی اس کی کالٹیوں کو سامنے سے گرفت میں لیا گیا تھا۔ کھڑے ہوتے ہی جاسم نے اس تھیلے کو اپنے چہرے پر سے ہٹا دیا جو گرفتاری کے فوراً بعد اسے پہنایا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ڈرائیور کی گردن کو اپنی اسیر بانہوں سے کھلا دے میں لے لیا اور غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"ابھی تو میں نے تمہاری سانس کی آمد وشر اور زبان کی حرکت کے لیے اپنی گرفت قدرے ڈھیلی رکھی ہوئی ہے۔ اگر ایک منٹ کے اندر بری چھکڑی نہیں کھولی گئی تو میں تمہارا بیٹھا دبا کر ہیروئن کے لیے منڈا کر دوں گا۔"

"ٹو بان! ہوش کے ناخن لو۔" ایک پولیس والے نے منہ ریز لہجے میں کہا۔ "وہ ڈرائیور کڑا رہا ہے۔ آرا ایکسپرنٹ ہو گیا تو ہم سب بے بہت مارتے جا سکتے ہیں۔"

"اس دنیا میں کوئی بھی بے مقصد پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی بے موت مارا جاتا ہے مرا کئی گدھا" جاسم نے عمارت بھرے لہجے میں کہا۔ "جس کی موت آئی ہوئی ہے وہی دائمی رخصت پر جاتا ہے۔ میں نے جسٹس ایک منٹ کی جہالت دی تھی، اس میں سے پھر بیکٹر کر رہے ہیں۔"

ایسا بھی نہیں تھا کہ جاسم اس آہنی چھکڑی سمیت خود کو ٹیلی پورٹ نہیں کر سکا تھا لیکن وہ اس "میتھے باجے" کو وہاں

قلاں رو چہ شال۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پولیس والی گاڑی کا اسٹیرنگ سمجھا کر اسے ٹرک کے ”روبرڈ“ کیا اور آنکھیں بند کر کے کی لوٹ کا ترکا لگا دیا۔

”جھٹلی غولم عظیم عن نوادر۔۔۔!“

وہ ”لد اسپندا“ ٹرک بچا رہ اپنی لین میں آ رہا تھا۔ اس کے ڈرائیور کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، کوئی پولیس کی گاڑی یکا یک اپنی لین چھوڑ کر اس کے سامنے آ جائے گی۔ اس ناگہانی صورت حال نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے پوری قوت سے بریک لگا دی۔

ڈرائیور کا یہ فیصلہ اپنی جگہ درست تھا لیکن اس کے بریک لگانے تک، بہت دیر ہو چکی تھی۔ ٹرک رکا تو سرورگر پولیس کی گاڑی کو ایک خوفناک ٹکراؤ کے بعد۔۔۔ ٹل لوڈ ٹرک کا اپنا ایک مونیٹرم ہوتا ہے، پھر اگر وہ زیادہ اسے بڑے بھی آ رہا ہو تو اس مونیٹرم میں بھی کئی گنا اضافہ جاتا ہے۔ اس کے تدریجی مقابل ایک عام کار بھی۔ گویا یہ چوہے اور ہاتھی! آسنے سامنے سے ہوئے والہ ایک ہلاکت خیز ٹکراؤ تھا۔

بریک لگنے کے بعد وہ ٹرک تھوڑا دبا گیا، تھوڑا اباسی لہرانے اور ڈمک لگانے کے بعد بالآخر کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے رک گیا تھا لیکن پولیس والوں کی گاڑی کی ”سٹی پلیٹ“ ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹرک کی طوقانی ٹکر کھانے کے بعد وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں فضا میں ”اچھلی“ تھی اور دو تین گنا بازیاں کھانے کے بعد وہ سڑک پر الٹی گری گئی اور چست کے بل دور تک پھسلتی چلی گئی تھی۔ اس کی بدبختی کی کوئی یہاں پر ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ جیسے ہی رکی، اس کا فیل ٹینک ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ بلندی تک اٹھتے ہوئے سٹاک، آگ، پھرے ہوئے شعلوں نے اس گاڑی کو سواروں سمیت اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

یہ تصادم ایسا ہولناک اور دل دہلا دینے والا تھا کہ اس کی سماعت ٹھکن اور ہیبت طاری کر دینے والی آواز بپ، بلماٹا کے علاوہ مارش، کیپ اسپارٹل، اولڈ مدینہ اور فیٹنجر کے دیگر علاقوں میں بھی۔ نالی دی گئی۔ اس دشت، پہلی فیاٹ جا۔۔۔ وقوع سے زیادہ دور نہیں تھی لہذا اس کے اندر موجود چار انسانوں نے بھی وہ قیامت خیز دھماکا سماعت کیا تھا۔

”ٹوبان نے جو کہا تھا، وہ کر کے بھی دکھا دیا۔“ بیڑک نے معنی نیر انداز میں کہا۔

”اگر یہ بھاکا اسی پولیس کی گاڑی میں ہوا ہے تو ہمیں

سے اپنے ساتھ لے کر نکس جانا چاہتا تھا۔

”اس پاپٹل کی بات مان لو یا پھر اسے کوئی بارود۔“ ڈرائیور نے بجان انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر اس نے اسی طرح ہرا زخرا دیا پچے رکھا تو ازلی مجھ سے کوئی بڑا حادثہ ہو جائے گا جس کے بعد ہم تینوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا اور نہ اتفاق سے بچ بھی کیا تو باقی کی زندگی معذوری میں کیے گی۔“

”ٹوبان ہمارے لیے لائری کا کٹ ہے اس لیے ہم اسے گولی نہیں مار سکتے۔“ ایک پولیس والے نے جواب دیا۔ ”دراپڈر ڈرائیور انعام دینے کا وعدہ کرنے والے شخص نے تاکیدی کئی کہ یہ کینیڈین سلامت اس تک پہنچا چاہیے بلکہ گولی مارنا تو دور کی بات ہے، ہم اسے ایک معمولی سی خراش بھی نہیں پہنچا سکتے۔“

”تم لوگ وقت برباد کر رہے ہو۔“ جاسم نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ بچے ہیں۔“

”او ہمارا۔۔۔ اس کی ہتھکڑی کھول دو۔“ ڈرائیور نے فریادی لہجے میں اپنے ساتھیوں کو کوسا۔ ”کیوں خواخواہ حرام موت مرنا چاہتے ہو۔۔۔ وہ سامنے سے ایک۔۔۔ بڑا سا ٹرک۔۔۔ آ رہا ہے۔۔۔ اس خوف بھری فضا میں کہیں میں۔۔۔ اسٹیرنگ پر اپنا کنٹرول نہ کھو بیٹھوں۔ جو بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔۔۔ فارگ ڈیک!“

ڈرائیور کی منت سماجت اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے بھی مخالف سمت سے آنے والے ایک تیز رفتار ٹرک کو دیکھ لیا تھا۔ مذکورہ ٹرک پر کافی بلندی تک ڈرم لدے ہوئے تھے۔ اتنے فاصلے سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس قسم کے ڈرم تھے۔ وہ خالی تھے یا ان کے اندر کچھ بھرا ہوا تھا۔ صورت حال کا تقاضا یہی تھا کہ فی الفور ڈرائیور کی بات مان لی جائے۔

ایک پولیس والے نے تین واحد میں جاسم کی ہتھکڑی کھول دی لیکن جاسم نے اپنے بہن میں کوان سی بریانی دم پر لگا رکھی تھی، یہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ جاسم کے ہاتھ جیسے ہی آزاد ہوئے، اس نے ڈرائیور بیٹ کے اوپر سے ایک کراسٹیرنگ کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اب اس پولیس کی گاڑی کو جاسم ”ڈرائیو“ کر رہا تھا۔ ڈرمز سے بھرا ہوا وہ ٹرک بہت نزدیک، آچکا تھا۔ جاسم نے ایک ازبرجیو گرافک لوکیشن کو زیرِ لب دہرایا۔ ”سڑکھا عشاریہ بلا، بلا، بلا درجہ شرق اور چوبیس عشاریہ قلاں، قلاں،

چالاکیاں دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہر مسئلے کو چکی بجاتے میں حل کر لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ باتوانڈر کوڑ کوئی ٹریڈ ایجنٹ ہے اور یا پھر کسی سٹڈیکٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر کیف، وہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔

”مریائ! تم کیا کہتی ہو؟“ پیٹرک نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

”ٹوبان! اور اس کا درست معنی یعنی شکل بصارت امین انسانی شکل میں اللہ کے فرشتے ہیں۔“ مریائے نے نظم سے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ اللہ کے حکم سے انسانوں کی مدد کے لیے زمین پر آتے ہیں اور اپنا کام کرنے کے بعد واپس آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ آپ عفران کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں، مجھے بھی اسٹوفر کے چنگل سے بحفاظت نکال لیا گیا ہے۔ آپ کا وہ اہم پروگرام پیئوراما۔ پلس“ برے لوگوں کے ہاتھوں میں جانے سے بچ گیا ہے۔ آپ آج رات اس سافٹ ویئر کو وطن پرست اور فتنے دار لوگوں کے سپرد کرنے والے ہیں۔ ”جی ڈی ایس“ ہمارے لیے تاحیات تحفظ کا بندوبست کر دے گی اور یہ سب کچھ انہی دو انسان نما فرشتوں کے تعاون سے ممکن ہو پایا ہے اس لیے میں یہ بھی ہوں۔“ وہ نیچے بھر کے لیے رکی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”اب ٹوبان یا بصارت امین سے دوبارہ ہماری ملاقات نہیں ہوگی کیونکہ انہوں نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا ہے۔“

”مریائ! تمہارا یہ واقعاتی تجزیہ اپنی جگہ درست ہے۔“ پیٹرک نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن بہت کم عرصے میں جس ٹوبان کو میں بہت زیادہ جان پایا ہوں وہ آج رات کسی بھی وقت ہم سے ملنے ضرور آئے گا، چاہے ہماری یہ ملاقات ایک منٹ ہی کی کیوں نہ ہو۔“

پیٹرک کے اس حتمی بیان کے بعد جاسم کی ان سے دوبارہ ملاقات والے موضوع پر بات یا بحث کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی لہذا پہلی قیادت کے اندر خاموشی چھا گئی۔ اگلے دو منٹ میں وہ لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

پولیس والی گاڑی پوری طرح تباہ ہو گئی تھی اور اس کے اندر موجود وہ بدکردار تینوں پولیس والے جل بھن کر کباب بن چکے تھے۔ پولیس اور فائر بریگیڈ موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ پولیس نے ٹرک کے ڈرائیور کو گرفتار کر لیا تھا اور اس کا بیان لیا جا رہا تھا۔ فائر بریگیڈ والوں نے گاڑی میں لگی آگ کو تو بجھا دیا تھا مگر وہ ان تین پولیس والوں کو بچا نہیں پائے تھے۔

فورا وہاں پہنچنا چاہیے۔“ اشد نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ”ٹوبان بھی اسی گاڑی کے اندر موجود تھا۔ ہمیں اس کی خیریت معلوم کرنا ہوگی۔“

ہیری نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹوبان نے قدم قدم پر ہماری مدد کی ہے۔ اب ہماری باری ہے۔ اشد ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں اس کی مدد کے لیے دھماکے والی جگہ پر جانا ہوگا۔“

”میں تمہیں وہاں جانے سے روک نہیں رہا میرے بچو!“ پیٹرک نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن جائے حادثہ پر پہنچ کر ٹوبان سے آپ کی ملاقات نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس نے رات میں کسی وقت ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ زبان کا دھنی ہے۔ باقی جہاں تک مدد کرنے کی بات ہے تو.....“ لگاتی توقف کرنے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اس کی مدد کی ضرورت تھی اس لیے اس نے ہماری مدد کی۔ جب اسے ہماری مدد کی ضرورت ہوگی، ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“

اس دوران میں ہیری پہلی قیادت کو آگے بڑھا چکا تھا۔ پیٹرک کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کے جواب میں مریائے ٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔

”ڈیڈ! آپ ٹوبان کے بارے میں ہر بات اتنے وثوق سے کر رہے ہیں جیسے آپ اسے سالہا سال سے جانتے ہوں۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟“

”مطلب یہ ہے کہ ٹوبان پر تفصیلی بات کرنے کے لیے یہ جگہ اور وقت مناسب نہیں ہے۔“ پیٹرک نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”گھر پہنچ کر میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ ویسے میں اسے سالہا سال سے نہیں بلکہ گھنٹے، دو گھنٹے ہی سے جانتا ہوں لیکن یہ جانکاری بڑی فکر انگیز اور حیرت ناک ہے۔ ابھی میں خود بھی بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔“

”مجھے بھی ٹوبان سے ملے بمشکل دو، ڈھائی گھنٹے ہی ہوئے ہوں گے۔“ اشد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس نے قدم قدم پر مجھے حیران کیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ کوئی جادو جانتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو پلک جھپکتے میں اس طرح زیر کر لیتا ہے جیسے ہم کسی مچھر یا مگھی کو مار ڈالتے ہیں۔“

”ٹوبان کے بارے میں میری رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے۔“ ہیری نے معتدل انداز میں کہا۔ ”مریائے جب سے مجھے اس سے ملوایا ہے، میں اس بندے کی پھرتیاں اور

ہیں۔" یا ہونے فخریہ انداز میں بتایا۔ "لیکن آئندہ سال یعنی دو ہزار چوبیس میں ہم نے شام کو فتح کر کے وہاں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا ہے اور یہ کام بھی ہم اپنے زور بازو سے بہ آسانی کر لیں گے کیونکہ ہم اس کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہیں۔ اصل اور کڑا مرحلہ اس کے بعد کا ہے۔۔۔۔۔!" وہ سانس ہوا کر نے کی غرض سے تنہا پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اگلا نمبر دو ہزار پچیس میں ایران کا ہے۔ ایران کو فتح کرنے کے لیے ہمیں امریکا کی بھرپور مدد چاہیے ہوگی۔ گریٹر اسرائیل کے قیام کے لیے ہم نے لبنان، اردن، شام، مصر، سعودی عرب، عراق وغیرہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ باقی رہ جاتے ہیں ایران اور ترکی۔ اس وقت ترکی کے ساتھ ہمارے بہت اچھے سفارتی اور کاروباری تعلقات چل رہے ہیں۔ فی الحال اسے پھیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ سب میں تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں یا ہو۔" کاری نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی اور بیزار کن لہجے میں کہا۔ "نور آمد عا پر آؤ، میرے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔" "ہد ماتو! پاکستان کی طرح ایران کا ایشی پروگرام بھی ایک پہاڑی سلسلے کے اندر زیر زمین ہے۔" "تین یا ہونے کہا۔" "ان پہاڑوں کو پاش پاش کرنے کے لیے جتنے وزنی بموں کی ضرورت ہوتی ہے وہ دنیا میں صرف ایک ہی طیارہ لے کر جاسکتا ہے اور وہ بمبراز کرافٹ صرف امریکا بہادر کے پاس ہے۔ میں اس طیارے کی بات کر رہا ہوں جس سے چین اور روس ہر لمحہ خوفزدہ رہتے ہیں کیونکہ ان دونوں ممالک کے ایٹمک ری ایکٹرز اور دیگر جوہری پروگرام بھی پہاڑی سلسلہ جات میں انڈر گراؤنڈ ہی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم "بی ٹو۔ اسپرٹ بمبر" کی بات کر رہے ہو۔" ڈینیل کاری نے نمبرے ہوئے لہجے میں کہا اور پوچھا۔ "کیا تم اس امریکی ساخت حیرت انگیز اڑکرافٹ کی قیمت کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"دوبلین ڈالرز۔" یا ہونے جواب دیا۔ "امریکا کے پاس اس وقت تیس سے زیادہ "بی ٹو۔ اسپرٹ بمبرز" موجود ہیں۔"

"بی ٹو۔ اسپرٹ بمبر" بلاشبہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ایک ایسا صد فیصد اسٹیٹھ اڑکرافٹ ہے جسے سینتیس سال کی کڑی ریسرچ کے بعد بنایا گیا تھا۔ کسی بھی جدید جنگی ساز و سامان کی قیمت میں اس کی ریسرچ پر اٹھنے والا خرچہ بھی شامل ہوتا ہے اور اس "شمولیت" کا قسم اور حساب کتاب

پولیس والی گاڑی اور اس فلی لوڈڈ ٹرک کے پائین ہونے والے اس تصادم کے پس منظر سے صرف ایک شخص واقف تھا اور وہ بندہ اس وقت جائے وقوعہ سے ہزاروں کلومیٹرز کے فاصلے پر چاچکا تھا۔ اس جان لیوا حادثے کا ڈتے دار ٹرک کے ڈرائیور کو ٹھہرایا جائے گا یا ڈرائیور کے بیان پر یقین کرتے ہوئے واقعی شہادتوں کی روشنی میں اس ایکسیڈنٹ کو پولیس والوں کی لاقانونی غفلت کا نتیجہ سمجھا جائے گا، اس کا فیصلہ سر درست ہو نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆☆

دشمن انسانیت، مکروہ ظاہر، پلید باطن، رذالت مآب، نطفہ ناقصہ بقی اور گھناؤنے کردار کے مالک انسان نما بھیڑیے بنجائن مین یا ہو نے ہزار جتن کے بعد اپنے غیر اعلانیہ باپ ڈینیل کاری سے چند منٹ کی ٹیلی فونک گفتگو کا شرف حاصل کر لیا تھا۔

"ایسی کیا مشکل آرن پڑی کہ مجھے اس وقت ڈسٹرب کیا؟" ڈینیل کاری نے فحشی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہو۔ تمہیں وسیع اختیارات دیے گئے ہیں پھر بھی تم سے کام نہیں ہو پارہا۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ اب تم اس عہدے کے لائق نہیں رہے۔"

"میں بھادا! میں جانتا ہوں کہ آپ نے اسٹیٹ کے معاملات میں مجھے فری ہینڈ دے رکھا ہے اور میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنا کام بھی کر رہا ہوں۔" یا ہونے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن جب اسٹیٹ سے باہر کا کوئی ایشو سامنے آتا ہے تو مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ کام آپ کے سوا اور کوئی کر نہیں سکتا۔"

"اس وقت کس حوالے سے تمہیں میری ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟" کاری نے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ جانتے ہیں، اس دور میں دنیا کی اسی فوج کو سپر سمجھا جاتا ہے جس کی اڑفورس ٹکڑی ہو۔" یا ہونے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "اس وقت اسرائیلی اڑفورس امریکا کے بعد دنیا کی دوسری سپر فورس ہے لیکن میں نے کمانڈر ان چیف آف اڑفورس کے ساتھ مل کر آنے والے دو سالوں کی جو منصوبہ بندی کی ہے، اس کے لیے ہمیں ایک بار پھر امریکا کی طرف دیکھنا ہوگا۔"

ڈینیل کاری نے قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "تم کس منصوبہ بندی کا ذکر کر رہے ہو یا ہو؟"

"ہم نے اس سال اور اگلے سال فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ جو کرنا ہے اس کے لیے ہم خود ہی کافی سے زیادہ

کافی پیچیدہ اور باغ کی چولیس بلا دینے والا ہے۔ ”بی ٹو۔
اسپرٹ بجر“ کی کارکردگی کے مقابلے میں اس کی یہ قیمت دو
بلین ڈالرز (لگ بھگ چھ کھرب روپے) کافی مناسب رقم
ہے۔ سادہ زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں..... پیسے تو خرچ ہوئے ہیں
لیکن سوارا آگیا ہے۔“

”یابو۔ امیری ایک بات اچھی طرح اپنے ذہن میں
بٹھالو۔“ ڈیٹل کاری نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس خطے
میں اس وقت ہمارا ادا لین مقصد ”سلطنت داؤدی“ کا قیام
ہے۔ جب تک یہ سلطنت (گریٹر اسرائیل) اپنی اصلی، ماضی
والی سرحدوں کے مطابق وجود پذیر نہیں ہوگی، ہمارے مسیحا
وجہ کی آمد ممکن نہیں اور مسیحا آنے سے پہلے پوری دنیا پر
حکمرانی کرنے کا ہمارا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اپنی
منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہم نے دو ہزار چونتیس
کا ہدف مقرر کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا اتنی فیصد کام
ہو چکا ہے اور یہ کامیابی ہمیں امریکا کے تعاون سے حاصل
ہوئی ہے۔ آئندہ بھی ہمیں اس کی مدد کی ضرورت پیش آئے
گی۔“ وہ سانس درست کرنے کی غرض سے تھما بھر اپنی بات
آگے بڑھاتے ہوئے لڑلا۔

”یابو! یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ اس دنیا کا نظام
”چکونواور کچھ دو“ کے اصول پر چلتا ہے۔ سو اس تعاون کے
بالے میں امریکا بھی ہم سے کوئی بڑا تقاضا کرنے والا ہے۔
وہ اس وقت دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہے۔ اس کا نسل کا دفاع
کرنے کے لیے اسے ایک ناقابل تغیر زور بکتر کی ضرورت
ہے۔ پوری مغربی دنیا اور ہمارے توسط سے مشرق وسطیٰ کے
بڑے ممالک امریکا کے اتحادی بن چکے ہیں۔ سپر پاور کو صرف
چار ملکوں کی طرف سے خطرہ ہے یعنی روس، چین، شمالی کوریا،
انڈیا وغیرہ۔“

کاری تھوڑی دیر کے لیے رکا، دو تین گہری سانسیں
لیں اور سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ان تمام
ممالک کو ایک بحال کے طور پر متعال کرنا چاہتا ہے جو اس
سے دشمنوں کے راستے میں پڑتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی
میں امریکا، مصر، لبنان، اردن، عراق اور سعودی عرب سمیت
مقاتلہ ممالک کو اپنا ہمنوا بن چکا ہے۔ ایک آدھ سال میں وہ
تمام کو بھی فتح کر لے گا۔ گویا اس کی زرہ بکتر تیار ہو چکی ہے مگر
اس جنگی پہنچاؤ سے کاسب سے اہم حصہ ”خود“ ابھی باقی ہے اور
اس خود کا نام ہے..... ایران!“ اس نے ڈرامائی انداز میں
وقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”ایران کو فتح کرنے
کے بعد امریکا وہاں پر اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا چاہے گا

اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا کیونکہ ایران دنیا کا وہ واحد
اسلامی ملک ہے جس کے دستور کا اسلام ابھی تاخیر اور قیم نہیں
ہوا۔ ایران کی عسکری، سیاسی اور مذہبی قیادت کسی بھی حال
میں امریکا کے ہاتھوں کٹنے یا اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے
لیے تیار نہیں ہوگی اور ایرانی عوام بھی اپنے مفکروں کا ساتھ
دے گی۔ چنانچہ اس مشکل ہدف کو حاصل کرنے کے لیے
امریکا کو ہمارے کندھے کی ضرورت پیش آئے گی اور ہم اس
سلسلے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے کیونکہ اس خطے میں
ایران ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہم جی جان تے، امریکا
کی مدد کریں گے۔ سو امریکا ہمیں نہ صرف ”بی ٹو اسپرٹ
بجر“ دینے کے لیے مجبور ہو جائے گا بلکہ ایران کے ہیکٹر سٹری
اکٹریکری تباہی اور بربادی کے لیے وہ ”جی بی یو۔ نورنی تھری“
اور ”جی بی یو۔ فکٹی سیدن“ کنوینشل (نان نیوکلیر) بم بھی
فراہم کرے گا۔“

نویزدار آٹھ سو پچاس کلوگرام وزنی GBU-43 اور
تیرہ ہزار چھ سو کلوگرام وزنی GBU-57 بم کو تکنیکی زبان میں
ٹرپل بی (BBB) کہا جاتا ہے۔ یہ ”بٹر بٹر بم“ سخت
ترین زمین کے اندر دوسو سے تین سو فٹ کی گہرائی تک جانے
کے بعد پھٹتے ہیں اور اپنے ماحول کے پرچے اڑا دیتے ہیں۔
ایران کا جوہری پروگرام فارود (Fardow) کم و بیش اسی
گہرائی کی رینج میں آتا ہے۔

”یہ ہوگی ڈاٹ بات۔“ بے ساختہ ہنسن یا ہو کے منہ سے
اٹلا۔ ”پھر تو بہت مزہ آئے گا۔“

”ڈیٹل از وقت: اتنا زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں
ہے۔“ یاہو کی آواز سے پھٹتی مسرت و محسوس کرتے ہوئے
کاری نے سمجھہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”اس پروجیکٹ
میں امریکا کا ساتھ دینے کی ہمیں بھاری قیمت بھی چکانا پڑے
گی۔ ایران کا جوابی وار اسزیکل کا حلیہ بھی بکڑ سکتا ہے۔“
”مگر بڑا آپ ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں۔“
یاہو کی ساری خوشی یہ یک کافور ہو گئی۔ ”آپ ایسا تو نہ کہیں۔
ہم نے اسرائیل کو ناقابل شکست بنانے کے لیے بہت محنت کی
ہے۔“

”میں نے تو مستقل قریب کی ایک حقیقت بیان کی
ہے۔“ ڈیٹل کاری نے سمجھہ انداز میں کہا۔ ”یابو! تمہیں مجھ
سے کچھ پوچھتا ہے؟“

”گر وہ جال لعنت! اللہ علیہ کے لعن بردار خیلے ڈیٹل
کاری کی دانائی، زیادتی، ہم ذرا است اور دور اندیشی کی داد دینا
پڑے گی۔ ان وہ شیطان زادوں کی کم و بیش دو سال پہلے

امداد کے نام پر بھیک کا کھنکول جمع دیتا ہے۔ ایسے ملکوں کے عوام ساری زندگی اپنے حکمرانوں کے گناہوں کی سزا بھگتتے رہتی ہے لیکن.....! اس نے ذرا بالی انداز میں توفیق کیا پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”یا ہوا پاکستان کے بارے میں بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو جانا۔ خصوصی طور پر وہاں کی عوام کو بھی ہلکا نہیں لینا۔ جب کوئی بھی معاملہ اپنی حد پار کر کے حیثیت اور شریعت تک جانچنے تو یہ لوگ ایک عجیب سے جتن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ لٹکا رہے کم اور مارنے زیادہ ہیں۔ اب تم اگر بد معاش جاسم پاکستانی ہی کو لے لو۔ اس کے لگے ہوئے زخموں کو ہم ابھی تک چاٹ رہے ہیں۔“

فلن اس کے کہہ بن یا ہو، ڈیٹل کاری کی جھنجھلاہٹ کے جواب میں کچھ کہتا، لاکن بے جان ہو گئی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کاری نے خود رابطہ موقوف کیا تھا یا جاسم نے تصویق کی تھی کہ اس کی بوڑھی ہڈیوں کی ایسی خبریت ”تو چو“ کی تھی کہ اسرائیلی کے کرائم مشین سے مزید بات کرنے کی اس میں عیب نہیں رہی تھی۔

بچا من یقین یا ہو اس پرائیویٹ روم سے نکل کر اپنے آفس میں آ گیا جہاں اسرائیلی فضائیہ کا کمانڈر این چیف ٹومر بار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ لوگ کافی دیر سے وہاں بیٹھے لی۔ ٹو اپرٹ بھر کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور ٹومر بار ہی کے ایما پر یا ہو، کاری سے بات کرنے پرائیویٹ روم میں گیا تھا۔ ان دونوں نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

”ٹومر! سرنے گرین سگنل دے دیا ہے۔“ یا ہو نے خوشخبری سننے والے انداز میں کہا۔ ”جب امریکا، ایران کے جوہری پروگرام ”قارو“ کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہماری خدمات حاصل کرے گا تو تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔“

سیجر جنرل ٹومر بار کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نہ مٹی جیسے یا ہونے اسے کی تعلیم حق کی نوید سندی ہو۔

☆ ☆ ☆

جاسم نے مضمون ”لینڈنگ“ کے بعد آٹھ کھولی تر خود کو فریئر ٹاؤن میں پایا۔ یہ اس کا اپنا شہر کراچی تھا۔ اس کی نگاہ کے سامنے تھوڑے قاصدے پر ”گلی برج“ شروع ہو رہا تھا۔ یہ پل فریئر ٹاؤن کو کلفٹن کے رہائشی اور کمرش ایریا سے جوڑ دیتا تھا۔ وہ اس وقت مین پل کے آغاز پر کینٹ اسٹیشن کے نزدیک کھڑا تھا۔ وہ رات کا سماں تھا اور پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق رات کے دس بجے والے تھے۔ منجھڑ اور کرناٹنا

ہونے والی ٹیو فونک گفتگو کو آج یعنی ایس جون کی رات جب دہرائے۔ لپہ قلم بند کیا جا رہا ہے تو امریکا میں موجود میر۔ ایک استہانی معجز ذرائع کا ٹیکسٹ پیج موصول ہوا ہے جس میں اظہارِ دیدی تھی ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی امریکا ریڈسٹ حروری کے ایک اڑتیس سے دو ”ٹو اپرٹ“ اور دو ”ٹیوٹنگ“ کرسی۔ فورڈی ”سلس“ نے تمام تر جنگی سازوسامان کے ساتھ اڑان بھری ہے۔ یہ ہزاروں اڑتیس اڑتیس کے ایک ہر۔ ایہ اسلامی ملک کی ایک غصہ اڑتیس پر لپٹ کر گریں گے۔ واضح رہے کہ ڈی۔ ٹو اپرٹ بھر جیٹ وینٹر سلسل پیش نہیں گھنٹے تک پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے فیوز ٹینک اسے گیارہ ہزار کلومیٹر تک اڑان میں مدد دیتے ہیں۔ مزید پرواز کے لیے فضا ہی بھر رہے ہوئے ان ٹینک کو ری فل بھی کیا جاسکتا ہے اور یہ ٹینک کام ”ٹیوٹنگ“ کے سی۔ فورڈی ”سلس“ کرتا ہے۔ جب یہ ڈائجسٹ آپ کے ہاتھ میں پہنچے گا اس وقت تک لی۔ ٹو اپرٹ، بھر تھی یہ وحشی عنقریب بارود کے پھول برسا کر کیا کچھ نکل چکا ہوگا، اس بارے میں فلن از وقت اندازہ لگاتا دھواں بگڑ چکا ہے۔

”ہدایت“ یا ہونے ڈیٹل کاری کے سوال کے جواب میں پوچھا۔ ”آپ نے جن رومز اور شاخوں کو ریا کے ساتھ ہی انڈیا کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیا امریکا، انڈیا اپنا حلیف نہیں سمجھتا؟ کیا اسے خدشہ ہے کہ انڈیا کی بھی وقت اس کے حربہ ممالک کی صف میں جا کر اٹھوگا؟“

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ کاری نے اثبات میں جواب دیا۔ ”انڈیا کی معیشت بڑی تیزی سے پھول پھیل رہی ہے۔ جن ممالک کی اکادمی مضبوط ہوتی ہے انہیں ان کی مرضی کے خلاف زیادہ دیر تک دبا کر نہیں رکھا جاسکتا اور امریکا کو انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔ سو وہ انڈیا کی وفاداری پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”انڈیا کے مقابلے میں پاکستان کی معیشت کا بہت بڑا حال ہے۔“ یا ہو نے کہا۔ ”اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”پاکستان کی معیشت کو تباہ و برباد کرنے میں کفیدی کردار امریکا ہی کا ہے۔“ اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”ہاں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے وہاں کی اشرافیہ اور صاحب اقتدار لوگوں کی کو اپنا آلہ کار کیوں نہ بنایا ہو۔ امریکا جن ممالک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے، انہیں اپنا دست و نگر بنانے کے لیے ان کے ہاتھ میں

کے مقامی وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔

اچانک ایک رکشا اس کے نزدیک آ کر رکا اور ڈرائیور نے پوچھا۔ ”صاحب! کہاں جاؤ گے؟“

”تمیں کوار.....!“ بے ساختہ جاسم کے منہ سے نکلا۔

”بیٹھ جاؤ صاحب!“

”کرا یہ بتاؤ؟“

”دوسروں سے دے دینا۔“

جاسم کے حساب سے وہ مناسب پیسے مانگ رہا تھا لیکن وہ اپنی وقتی مجبوری کو بخوبی سمجھتا تھا۔ سو رکشا کے اندر بیٹھنے سے پہلے اس نے ڈرائیور سے استفسار کیا۔

”اگر میرے پاس روپے نہ ہوں تو؟“

ڈرائیور نے چٹکیں جھپکا کھیں اور کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

اگر تمہاری جیب میں پیسے نہیں ہیں تو پھر بات کیسے بنے گی؟“

”میرے پاس پیسے تو ہیں مگر روپے نہیں ہیں۔“

ڈرائیور خاصا سمجھ دار تھا، ترنت بولا۔ ”تم یہ کہہ رہے ہو

کہ تمہارے پاس کسی اور ملک کی کرنسی ہے؟“

”ہاں، بالکل۔“ جاسم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”میں تمہیں ڈالر میں کرایہ دے سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔“ ڈرائیور نے زیر لب مسکراتے

ہوئے کہا۔ ”ایک ڈالر سے زیادہ جتنے مرضی دے دینا۔“

رکشا ڈرائیور خاصا کائیاں اور موقع شناس تھا۔ اس نے

اپنے بتائے ہوئے کرائے سے کچھ زیادہ ہی کا تقاضا کر دیا

تھا۔ بہر کیف، جاسم رکشا کے اندر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے بغیر

ٹرانسپورٹ کے کہیں بھی جانا ناممکن تھا لیکن وہ اتنے

تھوڑے سے فاصلے کے لیے ٹکی پوریشن کی سائنس کو زحمت

دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

آج صبح میرا سے ملنے کے بعد سے وہ نہ چاہتے ہوئے

بھی ناجیہ کے بارے میں سوچتے لگا تھا اور اس کا سبب تھا ناجیہ

کی نئی شناخت ”ماریا عظیم الدین“..... میرا نے اسے بتایا تھا

کہ بعض لوگ اس کے نام کا تلفظ ”ماریا“ کرتے ہیں۔ بس بھی

سے اس کا دھیان بار بار ماریا عظیم الدین کے اوپر سے گزر کر

ناجیہ کی سمت چلا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب رکشا

ڈرائیور نے جاسم سے اس کی منزل کے بارے میں پوچھا تو

بے اختیار اس کی زبان سے ”تمیں کوار“ نکل گیا تھا۔ ناجیہ

شناخت کی تبدیلی سے پہلے تمیں کوار کے نزدیک ایک کثیر

المنزل رہائشی بلڈنگ کے نقشہ قلم پر ایک لکڑی اپارٹمنٹ

میں رہتی تھی اور اب بھی وہ ماریا عظیم الدین کی نئی شخصیت کے

ساتھ اسی اپارٹمنٹ میں قیام کرنے والی تھی۔ ناجیہ سے ماریا

اور جاسم سے ٹوبان تک کے سفر کو پہلے تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

اپنے مظلوم باڈر میں پر پہنچنے کے بعد جاسم نے ڈرائیور

کو پانچ ڈالر کا ایک نوٹ تھا کر خوشی خوشی رخصت کر دیا اور

مذکورہ بلڈنگ کے نیچے یعنی سامنے والے حصے میں مٹی دکانوں

کی جانب بڑھ گیا۔ اگرچہ اس کا دل ناجیہ کو دیکھنے کے لیے جھل

رہا تھا مگر سر درست وہ اس سے لٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ فی

الحال اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ناجیہ سے ایک بھر پور

ملاقات کر سکے۔ یہ کام پراسرار چابیوں کا بھیڑا منٹ جانے

کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے جاسم کو دو، تین دن

کے انتظار کی زحمت سے گزرنا تھا۔

وہ پہلے بھی کئی بار اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں آ چکا تھا

بلکہ یہاں قیام بھی کر چکا تھا۔ وہ ان تمام دکانداروں کو اچھی

طرح جانتا تھا اور وہ بھی اسے پہچانتے تھے مگر جاسم باری کی

حیثیت سے اور..... اب وہ ٹوبان قاسم تھا۔ ہر کسی کے لیے

ایک اجنبی شخص۔

جاسم، ناجیہ کی سن گن لینے کے لیے بیکری والے کے

پاس چلا گیا اور اس سے کہا۔ ”میرا نام فرید ہے۔ میں تین سال

کے بعد کراچی آیا ہوں۔ اس بلڈنگ کے پانچویں فلور پر

میرے ایک جاننے والے رہتے تھے۔ اس کا نام غفار دادو تھا

اور وہ.....!

”کافی عرصہ پہلے ان کا قتل ہو گیا تھا۔“ بیکری والے

نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ کسی پرائیویٹ جھیل کے

پروڈیوسر تھے۔ آپ انہی کا پوچھ رہے ہیں نا فرید صاحب؟“

”جی..... جی ہاں۔“ جاسم جلدی سے اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام

ناجیہ تھا۔ کیا ناجیہ اب بھی اسی اپارٹمنٹ میں رہتی ہے؟“

”نہیں صاحب!“ بیکری والے نے نفی میں گردن

ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”غفار صاحب کی موت کے کچھ

عرصے بعد ناجیہ بی بی کہیں چلی گئی تھیں پھر ان کے کسی رشتے

دار نے یہ اپارٹمنٹ کرائے پر چڑھا دیا۔ اس کے بعد

اپارٹمنٹ کو فروخت کر دیا گیا۔ اب اس اپارٹمنٹ کی نئی مالکین

ڈاکٹر ماریا ہیں۔ وہ یورپ کے کسی ملک سے ڈاکٹری کی تعلیم

حاصل کر کے آئی ہیں۔ میری بیکری سے دو دکان چھوڑ کر وہ اپنا

کلینک بناری ہیں جہاں وہ سویٹوں کی مدد سے مریضوں کا

علاج کریں گی۔ وہ اس طریقہ علاج کو.....!“ بات ادھوری

چھوڑ کر وہ ابھین زدہ انداز میں سوچنے لگا۔

”اکیو پچھر.....!“ جاسم نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، ہاں..... مجھے یاد آگیا۔“ وہ جلدی بولا۔ ”یہی، یہی۔“

”اکیو پچھر اور اکیو پریٹر..... یہ دونوں چینی طریقہ علاج ہیں۔“ جاسم نے کہا۔

”کیا آپ بھی ڈاکٹر ہیں؟“ بیکری والے نے سوال کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مجیب اللہ ہے۔“ جاسم، مجیب اللہ کو جانتا تھا لیکن اس نے شناسائی کا اظہار کرنے کے بجائے معتدل لہجے میں جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

”ڈاکٹر صاحب! افسوس کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔“ مجیب اللہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں تاجیہ بی بی اور اس کے کسی بھی رشتے دار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔“ پھر وہ جانے کے لیے مڑا اور الوداعی انداز میں کہا۔ ”اللہ حافظ!“

جواباً مجیب اللہ نے بھی اسے خدا حافظ کہہ دیا۔ جاسم بیکری سے نکل کر ایک جانب چل پڑا۔ یہ جان کر وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ تاجیہ نے مستقل بنیادوں پر وہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گویا کسی بھی وقت اس سے ملاقات کی جاسکتی تھی۔

تھوڑا آگے آنے کے بعد وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس ایونیو پر مڑ گیا اور جیب سے سیل فون نکال کر زین باقر سے رابطہ کیا۔ اس وقت یروشلم میں شام کے سوا سات بجے تھے۔ دوپہری گھنٹی پر زین باقر نے کال ریسیو کر لی اور بوجھل آواز میں استفسار کیا۔ ”پیارے پوتا جان! تم خیریت سے تو ہو؟“

”جی دادا جان!“ جاسم نے جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”پھر آنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟“ زین باقر نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔“

”آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے یہ نادیدہ سفر نہیں کر سکتا۔“ جاسم نے کہا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ زین باقر نے سپاٹ آواز میں کہا۔

جاسم کو واضح طور پر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو..... ”ڈیڑھ ہوشیار پوتا جان! میں سب سمجھتا ہوں۔ تم دنیا والوں

سے اپنی اصلیت چھپا سکتے ہو، مجھ سے نہیں۔“

”میں آ رہا ہوں دادا جان...“ جاسم نے کہا۔ ”لیکن کیا براہ راست بلو ما کے گھر پر پہنچنا مناسب ہوگا؟ آج میں دوپہر میں جس افراتفری کے عالم میں وہاں سے نکلا تھا، وہ سب سلی بخش نہیں ہے۔ ایسٹ بینک اولڈ یروشلم کے ہر حصے میں مجھے تلاش کیا جا رہا ہے۔“

”پوتا جان! تم نے یہودیوں کے ساتھ جو ہاتھ کیا ہے، اس کے بعد تم ان کے لیے ”موسٹ وائنڈ پرسن“ کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔“ زین باقر نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تم ایسا کرو کہ ابھی اس قبرستان میں آ جاؤ جہاں میں تمہیں لے کر گیا تھا۔ پھر جب رات اپنا اچھا خاصا سفر طے کر لے گی تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر بلو ما کے پاس جاؤں گا۔“

جاسم نے کہا۔ ”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“

”کیا میں تمہیں قبرستان کی لوکیشن بھیج دوں؟“ زین باقر نے معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔

”دادا جان“ کا سوال یہ ظاہر انتہائی سادہ اور عام سا تھا لیکن اس کی معنویت پوری طرح جاسم پر چل رہی تھی۔ وہ جاسم کو جتنا جانتا تھا کہ اسے معلوم ہے، یہ ”نادیدہ کود پھاند“ اس روحانی شخصیت کے توسط سے نہیں ہے بلکہ تم خود اس سائنس میں مہارت رکھتے ہو..... وغیرہ۔

یہ موقع کسی نئی بحث کو چھیڑنے کے لیے قطعاً موزوں نہیں تھا اور ویسے بھی زین باقر نے ڈائریکٹ اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کے ٹیلی پورٹیشن والے راز سے آگاہ ہو چکا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ جاسم نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ قبرستان کی پین لوکیشن مجھے بھیج دیں۔ میں تھوڑی دیر میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ زین باقر نے کہا۔

”پین لوکیشن“ کی مدد سے کسی بھی جگہ پہنچنا کوئی وقت طلب کام نہیں ہے لیکن یہ کسی ایک علاقے یا کسی ایک شہر کے اندر آمد و جام کا معاملہ نہیں تھا۔ جاسم اس وقت اپنے ہوم ۲ ڈون کراچی میں تھا اور زین باقر کی معلومات کے مطابق وہ ”منجربہ“ میں تھا۔ ہر دو صورت میں یہ قاصد ہزاروں کلومیٹرز پر محیط تھا اور اس دوری کو ہلکے جھپکتے میں مسخر کرنا ٹیلی پورٹیشن کے بغیر ممکن نہیں تھا لہذا پین لوکیشن اس شخص کے لیے ایک بیکاری شے تھی جو ٹیلی پورٹیشن تھا۔

☆☆☆

جاسم اور اس کا بھتیجا دادا زین باقر کنگ سائز میز میں

ہے۔؟“ زمین باقر سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا تو جام نے مڑجھکس لہجے میں پوچھ لیا۔

”عبدالرحمن کی اتنی قیمت کو میں نے نہایت ہی رازداری کے ساتھ باب الرحمہ میں دفن کرا دیا ہے۔“ زین باقر نے جواب دیا۔ ”اور ایک عقلی تدفین ماؤنٹ آف اولیوز میں بھی کر دی گئی ہے جس کے مطابق، کفر کے اندر اچھڑکی لاش تھی۔ اگر کام کو میں نے اپنی صفائی اور احتیاط کے ساتھ کروایا ہے کہ میری اس کارروائی کی خبر کسی کو نہیں ہوئی، عقلی قبر پر اشکار کے نام کا کنبرا اور اصلی قبر پر عبدالرحمن کے نام کا پتھر لگا دیا جائے گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ جاسم نے ایک لمحہ ذرا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو واقعی بہت میز حاذر وقت طلب کام تھا۔“ پھر اس نے تھکے لہجے میں ”وہا جان! بلو کا کیا حال

”اس کا حال بہت زیادہ خراب نہیں ہے۔“ زمین باقر نے غم زدہ لہجہ میں بتایا۔ ”ایک ماہ کا علاج کے موثری مرض نے ہم سب کو اس کی دائمی جدائی کے لیے وقتی طور پر تیار کر دیا تھا۔ پھر بنو ما ایک پختہ ذہن اور ہمت والی لڑکی ہے۔ اشکار کی موت پر اس نے خود کو ٹوٹنے اور بکھرے ٹکڑے بننے دیا۔ جب تم اس سے ملو گے تو اس کے اعصاب کی مشہور ٹی اور ببادری کا چھمس بھی چھین ہو جائے گا۔“

جاسم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
 زمین باقراہتی جگہ سے اٹھا اور دیوار گیر الماری کے اندر
 سے ایک چھوٹا سا بیگ نکال لایا۔ وہ دوبارہ جاسم کے سامنے
 آ بیٹھا اور مذکورہ بیگ کو کھول دیا۔ جاسم گہری دلچسپی سے اسے
 دیکھنے لگا۔

زمین باقر نے بیگ کے اندر سے دو لٹا فے نکالے جن میں سے ایک پر دمشق اور دوسرے پر بغداد میں پایا جا حلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ رشت، شام کا اور۔ میں پایا یا ایچوپیا کا صدر مقام ہے۔ ایچوپیا کو زمانہ قدیم میں "اے سی سینیا" یا "جیشہ" بھی کہا جاتا تھا۔ وہی جیشہ جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ملک تھا اور اسی نسبت سے وہ "بلال حبشی" کہلاتے تھے۔ محمد صلی اللہ وسلم کے ساتھ بلال حبشی کی عقیدت، اطاعت، محبت اور عشق کسی بھی مسلمان کی یادداشت سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر مسلمان کے حافظے کا لازمی حصہ ہے۔

”ہوتا جان! تمہاری تیسری مہم یعنی تیسری چابی کے حصول کا حلقہ دمشق سے اور چوتھی چابی کا ماسکو میں ایسا کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ان افغانوں کے اندر دونوں مہمات کے

پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ مذکورہ میٹریس
 ابراہیم گورکن کے کمرے کے ایک کونے میں بچھا ہوا تھا۔
 جاسم گزشتہ رات بھی اپنے ”دادا“ کے ہمراہ وہاں آچکا تھا جب
 زین باقر نے اسے زیر زمین جانے کا وعدہ (سرنگ) کی طلسمانی
 ”سیر“ کرائی تھی۔ اس وقت عمر رسیدہ، مگر خفیہ اور ہڈیوں کا
 ڈسماجیہ گورکن نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید زین باقر نے جاسم
 کی آمد سے پہلے ہی اپنے اس مخدوش اور مشکوک صحت کے
 مالک دوست کو ابھر ابھر کر دیا تھا اور جاسم کی دانت میں یہ
 ٹھیک ہی ہوا تھا کیونکہ ابراہیم کی موجودگی میں جاسم خود کو
 میر سکون محسوس نہیں کرتا تھا۔ ابراہیم کی آنکھوں میں ایسی
 ویرانی اور سناٹا تھا کہ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا، ہزاروں
 سال پہلے کا کوئی مردہ اپنی قبر سے نکل کر یا ایک آپ کے
 سامنے آ گیا ہو۔

مجموعہ اور قیصر سے جہانگیر کو اس کے دو دربار میں زمین پانچ لکھ آواز میں کہا۔ "اشکار کی تدفین کے حوالے سے ہمیں کافی مشکل سے گزرنا پڑا ہے اور اس کا سبب تھا، اشکار کا مسلمان ہونا۔"

یہاں پہنچے ہی جاہم نے اشکار کی موت پر دین یا قمر سے رسم اشعار تعزیت نبھاتے ہوئے اپنے گھرے رنج و غم کو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

”ان کا اصل نام عبدالرحمن اور وہ ایک یہودی افغان کی حیثیت سے اپنی بیٹی حنیہ (بلو ما) کے ساتھ جوش کو ارٹھ میں رہ رہے تھے۔“ جاسم نے منہ بھر کر کہا۔ ”یہ سنا تو پیش آنا ہی تھا اور ادا جان۔۔۔ کوئلہ جوش اور مسلم قبرستان ایک تو نہیں ہو سکتا۔۔۔“

”مسلمانوں کی تدفین کے لیے یروشلم کا سب سے بڑا قبرستان ”مقبرة باب الرحمة“ مناسب ہے۔ جسے سادہ الفاظ میں ”باب الرحمة“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قبرستان الاسٹین گیٹ سے شروع ہو کر مسجد اقصیٰ کی شرفی دیوار کے ساتھ کافی آگے تک پھیلا ہوا ہے۔ ”باب الرحمة“ کے اندر تاجہ بنی اللہ وسلم کے قریبی ساتھیوں، درجنوں صحابہ کرام، دیگر شہداء اور مسلم اسکالرز کی قبریں موجود ہیں۔“ زمین باقر نے پھر ایاز میں بتایا۔ ”جبکہ یہودیوں کے لیے ایک الگ وسیع و عریض قبرستان ہے جو ”ماؤنٹ آف اولیوز“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فلسطین کی تاریخ کا سب سے قدیم اور بڑا قبرستان ہے جو ”شی آف ڈیڈ“ کے مرکز میں واقع ”ماؤنٹ آف، اولیوز“ کے گرد و گرد واقع ہے۔ یہاں تک آباد ہے۔“

”تو پھر آپ نے بلو ما کے بابا کو کٹر قبرستان میں دفن کیا

ہوں؟

زمین باقر نے فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ دو ایک تک جاسم کی آنکھوں میں دیکھتا چلا گیا۔ جاسم کو یوں محسوس ہو رہا تھا، زمین باقر اپنی نگاہ کی مشین سے اس کے دماغ کا "ایم آر آئی" کر رہا ہو۔

"اگر یہ تمہارے بس میں ہے تو....." زمین باقر نے اپنی پراسرار خاموشی کو سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ توڑتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تو تجربہ کر کے دیکھ لینا۔"

زمین باقر نے اگرچہ جاسم کو من مانی کی اجازت دے دی تھی لیکن اس کے اندر سے یہ واضح تھا کہ جاسم کے لیے ایسا کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ثابت ہوگا۔

"ہلومامی طرف کب جاتا ہے؟" جاسم نے پوچھا۔

"قبل اس کے کہ زمین باقر جواب دے، جاسم کے سبب فون میں تھر تھراہٹ جاگ اٹھی۔ اس نے اپنے فون کو سائیکلٹ موڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس "تھر تھراہٹ" کے باعث جاسم کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کو زمین باقر نے کماحقہ "سمجھ" لیا تھا۔

"کال۔۔۔ لو پوتا جان!" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سبب پر کوئی غیر اہم فون تو آئی نہیں سکتا۔"

جاسم نے اپنی جیب میں سے سب فون نکال لیا اور جب ڈیسے پر نگاہ ڈالی تو پتا چلا، دوسری جانب ہیری تھا۔ جاسم نے اس کی کال پک کر نہ ہوئے دھیسے لہجے میں کہا۔

"ہیلو..... ہیری! تمہاری طرف خیریت ہے نا؟"

"ہی! ایس (جیزل ڈائریکٹریٹ فار سرورینٹس) والے انفلیکٹرک کے ساتھ اندر میٹنگ کر رہے ہیں۔" ہیری نے بتایا۔ "سوچا، میں تم سے تھوڑی گپ شپ کر لوں۔"

"ہیری! اس وقت میں بھی ایک اہم میٹنگ میں بیٹھا ہوا ہوں۔" جاسم نے کہا۔ "سوری، میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

"اوکے بس!" ہیری فرمانبرداری سے بولا۔

"ہیری! ایک فوری خیال کے تحت جاسم نے پوچھ لیا۔

"ان لوگوں کو نورات نوچنے آنا تھا نا.....؟"

"ہاں۔۔۔ اور اس وقت ساڑھے نو بج رہے ہیں۔"

ہیری کے جواب نے جاسم کو اپنے سب فون کا کھاک دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجہً اور یروشلیم کے مقامی وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ ہیری نے غلط نہیں کہا تھا۔ جاسم کا سب فون رات ساڑھے دس بجے اوقات بتا رہا تھا۔ زمین باقر کے ساتھ

حوالے سے مکمل تفصیلات موجود ہیں۔ "زمین باقر نے مذکورہ لفافے جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"بعض معنی خیز آیات تمہیں دمشق اور عدیس ابابا سے بھی مل جائیں گی۔ کل تم نے دمشق والی جانب کرنا ہے اور پھر یروشلیم عدیس ابابا والے کام کو نمٹانا ہے۔ یہ دونوں لفافے میں تمہیں ایک ساتھ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج رات مجھے یروشلیم سے باہر جانا ہے۔ واپسی کب ہوگی، اس بارے میں، قبل از وقت میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایک ہفتہ، ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد تم کہیں بھی جا۔ نے کے لیے آزاد ہو گے۔"

"اوہ....." جاسم نے انجمن زدہ نظر سے اپنے منہ بولے دادا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کی غیر موجودگی میں بے جاری ہلومام کا کیا ہوگا۔ اس کے بابا کو مٹی میں اترے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں اور..... سب سے بڑی بات یہ کہ..... میں تیسری اور چوتھی چابی کس کے حوالے کر دوں گا.....؟"

"پوتا جی! انسان اس دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اسے تنہا ہی واپس بھی جانا پڑتا ہے۔" زمین باقر نے پُرسوج انداز میں کہا۔ "اس لیے، ختمی کی بیسائیکلوں والی زندگی سے دور رہنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جو لوگ اپنی بد آپ کے تحت جینا سیکھ لیتے ہیں، ان پر اگر غم کا ماؤنٹ ایوریٹ بھی اوندھ جائے، وہ منہ سے شکایت نکالے بغیر اس بوجھ کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن تین چار زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ باقی جہاں تک تیسری اور چوتھی چابی کی بات ہے تو....." لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"اس کے بارے میں تمہیں عدیس ابابا سے رہنمائی مل جائے گی۔"

"آپ کی بات سے تو میری سمجھ میں یہی آرہا ہے دادا جان کہ....." جاسم نے گریہ کرنے والے انداز میں سوال کیا۔ "کل دمشق والی چابی حاصل کرنے کے بعد پوسٹل تک یعنی چوتھی چابی کے حصول تک میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں.....؟"

"ہاں..... تم ایسا سمجھ سکتے ہو۔" زمین باقر نے گول مول جواب دیا۔

"تو کیا....." جاسم اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "میں تیسری اور چوتھی چابی والی دونوں مہمات کو ایک ہی دن میں یعنی کل ایک ساتھ سرانجام دے سکتا

بات چیت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔
 ”ٹھیک ہے ہیری!“ جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔
 ”میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کرتا ہوں۔“

”باس!.....!“ ہیری نے حیرت بھرے لہجے میں
 پوچھا۔ ”کیا تم ٹینجر میں نہیں ہو؟“
 ”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو ہیری؟“ جاسم نے بے
 ساختہ پوچھا۔

”اس لیے کہ تمہارے نمبر کے ساتھ کسی اور شہر اور ملک
 کا ڈائلنگ کوڈ آ رہا ہے۔“

جاسم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
 ”ٹینجر کا کنٹری کوڈ ”ٹوون ٹو“ ہے۔“ ہیری نے کہا۔
 ”اور تمہارے نمبر کے ساتھ ”ٹائن سینون ٹو“ آ رہا ہے جو کہ
 عزرائیل کا کنٹری کوڈ ہے؟“

جاسم معاملے کی تہ میں اتر گیا۔ جب وہ اولگا عرف
 اگیل کی معیت میں سینٹ ہیلینا کے جنت نظیر شہر جیس ٹاؤن
 میں رہتے اور سنگین روز و شب گزار رہا تھا تو ان دنوں بھی اس
 کی ٹیلی پورٹیشن اسی نوعیت کے مکمل کھلایا کرتی تھی۔ وہ جب بھی
 اولگا سے دور ہوتا تو وہ جاسم سے اسی قسم کے سوال کیا کرتی تھی
 جیسے ابھی ہیری کر رہا تھا۔ اولگا نے بعد ازاں اسلام قبول کر لیا
 تھا اور جاسم نے اس کا اسلامی نام ”آمنہ“ رکھا تھا لیکن افسوس
 کہ آمنہ بہت جلد اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس کی تربت دنیا
 کے انتہائی جنوب میں واقع ایک ننھے سے جزیرے ”کوڈل
 آئی لینڈ“ میں ہے۔ آمنہ کی تجسیم و شخصیت جاسم نے خود اپنے
 ہاتھوں سے کی تھی۔

یہ تمام تر جگر پاش خیالات پلک جھپکتے میں جاسم کے
 ذہن سے گزر گئے اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل و دماغ
 ڈیٹل کاری کے لیے غم و غصے سے بھر گیا۔ آمنہ کی حسرت ناک
 موت کا ذرے دار بھی نسل بعد نسل لین ڈیٹل حرامی تھا۔
 ”باس! کیا تم لائن پر ہو؟“ ہیری نے جاسم کی پراسرار
 خاموشی کے جواب میں پوچھا۔

”ہاں!..... بالکل..... میں تمہیں سن رہا ہوں۔“ جاسم
 نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے کنٹری کوڈ کے
 بارے میں ابھی جو کچھ کہا ہے، وہ نیٹ ورک پر ابلم ہو سکتی
 ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔“ ہیری جلدی سے بولا۔
 ”ایک خاص بات اور بھی ہے باس!“

”وہ کیا؟“ جاسم نے پوچھا۔
 ”تمہارے ہونٹ کانفی ٹینٹل والے دوست بصارت

امین نے ایک اور لغزندیہ ہے۔“
 جاسم نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کیا ہے اس لفافے
 میں؟“

”میں نے کھول کر نہیں دیکھا باس!“ ہیری نے
 معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”لفافے کے اوپر تمہارا نام اور
 انوی ٹیشن لکھا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے ہیری!“ جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔
 ”تم وہ ”انوی ٹیشن“ لے کر آدھے گھنٹے میں مون شاٹنگ مال
 پہنچو۔ میں تمہیں فوڈ کورٹ میں مل جاؤں گا۔ میری مینٹک
 یہیں پر چل رہی ہے اور..... اب تم مجھے کال نہیں کرنا۔ سمجھ
 گئے؟“

”سمجھ گیا باس!“ ہیری ترنت بولا۔

جاسم نے سل فون جیب میں رکھا اور زین باقر کی
 جانب متوجہ ہو گیا۔ زین باقر نے بھی اپنا سل فون کان سے لگا
 رکھا تھا۔ جاسم اس کے فابریغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔
 ”ہاں!..... ٹوبان سے میری تفصیلی ملاقات ہو گئی
 ہے۔“ زین باقر کسی کو بتا رہا تھا۔ ”وہ تمہارے پاس رات پارہ
 اور ایک بچے کے درمیان پہنچ جائے گا اور صبح تک وہیں رہے
 گا۔“

زین باقر چند لمحات تک دوسری طرف کی بات سن رہا
 پھر ”شب بخیر“ کہہ کر سیلوں پر رابطہ موقوف کر دیا۔

”آپ بلوما سے بات کر رہے تھے نا؟“ جاسم نے
 اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”ہاں۔“ زین باقر نے مختصر جواب دیا۔

”دادا جان!“ جاسم نے شاک لہجے میں کہا۔ ”آپ تو
 مجھے اپنے ساتھ بلوما کے گھر لے کر جانے والے تھے پھر
 پروگرام میں یہ تبدیلی کس لیے؟“

”وقت اور حالات کے ساتھ انسان کے پروگرام
 بدلتے رہتے ہیں میرے پیارے پوتے!“ زین باقر شفقت
 بھرے لہجے میں بولا۔ ”تم قسلی کے ساتھ ٹینجر والی پارٹی
 فرمائو، اس کے بعد بلوما کے پاس چلے جانا۔ وہ صبح تک تمہارا
 انتظار کر لے گی۔ وہ بڑی صابر و شاکر اور برداشت والی لڑکی
 ہے۔“

زین باقر کے آخری دو جملوں نے جاسم کو چونکنے پر
 مجبور کر دیا۔ آج دوپہر میں جب وہ دوسری پراسرار چابی بلوما
 کے سپرد کرنے جوٹس کوارٹر میں واقع اس کے گھر گیا تھا تو جاسم
 کو وہ بڑے دو مینٹک موڈ میں نظر آئی تھی۔ مختلف موضوعات پر
 بات کرتے ہوئے حسد (بلوما) نے ڈھکے چھپے الفاظ میں

”میں سمجھ گیا دادا جان!“ جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔
 ”گڈ..... ویری گڈ!“ زین باقر نے سناٹھی لہجہ میں کہا۔
 ”مجھے اپنے پوتے پر فخر ہے..... یو آر گرینٹ!“
 جاسم نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

”مون“ شاپنگ مال دن کے گیارہ بجے سے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا اور اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ جاسم اور ہیری مال کے نوڈ کورٹ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔

”آدھا گھنٹا پہلے فون پر ہماری بات ہوئی تھی اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس وقت مینجر میں نہیں بلکہ عزرائیل میں ہوں۔“ جاسم نے ہیری کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ”لو، اب میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ کیا کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ محض تیس منٹ میں عزرائیل (اسرائیل) سے جب لگا کر مینجر کے مون شاپنگ مال میں پہنچ جائے؟“

”یہ ناممکن ہے باس!“ ہیری عداوت آمیز لہجہ میں بولا۔ ”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں کہ وہ ”نیٹ ورک ایرر“ ہی تھا اور میرے ایسا کہنے کے پیچھے شاید پیٹرک انکل کی سناٹا ہوئی کہانی کا بھی ہاتھ تھا۔ جی ڈی ایس والوں کے آنے سے پہلے انہوں نے تمہارے بارے میں ایک سنسنی خیز کہانی سنا لی تھی۔“

”کیسی کہانی؟“ جاسم نے چونکے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

”پیٹرک انکل کا کہنا ہے کہ تم فلسطینی مجاہد ہو۔“ ہیری نے جواب دیا۔ ”تم نے پچھلے کچھ عرصے میں یہودیوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ لوگ تمہیں پورے عزرائیل میں تلاش کر رہے ہیں۔ وہاں کامیڈیا تمہارے بارے میں لکھ رہا ہے اور ٹی وی چینلز پر بھی تمہاری ہی نیوز چل رہی ہیں۔“

یہ بات جاسم کی سمجھ میں آگئی کہ پیٹرک اس کی ذات کے حوالے سے اتنے اعتماد کے ساتھ بات کیوں کر رہا تھا۔ اس نے یہ ساری معلومات ٹی وی اور سوشل میڈیا وغیرہ سے حاصل کی تھیں۔ وہ ایک منفرد نوعیت کا سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ رات دن انٹرنیٹ سے اس کا تعلق رہتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے کسی اور ذرائع سے بھی جاسم یعنی ٹوبان کی کٹڈ ٹی نکال رکھی ہو۔“

”میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔“ جاسم نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تمہارے انکل نے میرے

جاسم کے لیے اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ جاسم عورت کو سمجھنے کا جو عیار تو نہیں تھا لیکن بلوما کے دل میں اس کے لیے پیار و دلا رکی جو کھیر یک رہی تھی، اس کی خوشبو تک رسائی حاصل کرنے میں جاسم کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اپنی گفتگو کے آخر میں بلوما نے بڑی لگاؤ کے ساتھ اپنے صابر و شاکر اور ثابت قدم ہونے کا اظہار بھی کیا تھا..... ”اگر تمہارا کچھ ٹھیک نہیں ہے اور تمہیں آنے میں دیر ہو سکتی ہے تو کوئی بات نہیں، میں رات بھر تمہارا انتظار کروں گی۔“

اور اب زین باقر بھی بلوما کی ذات کے حوالے سے کچھ اسی قسم کی بات کر رہا تھا۔ یہ جس رات کا ذکر خیر تھا، وہ شروع ہو چکی تھی۔ جاسم کو چپ دیکھ کر زین باقر نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

”کیا ہوا پوتا جان..... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟“

”غلط تو نہیں مگر میرے لیے عجیب و غریب اور ذہن کو الجھن میں مبتلا کر دینے والا ہے۔“ جاسم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ کیسے بھلا؟“ زین باقر نے پوچھا۔

”آپ نے میری طرف کی بات سنی ہے۔“ جاسم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کیا پتا کہ دوسری جانب کون تھا اور ”انوی ٹیشن“ سے اس کی کیا مراد تھی۔ آپ نے فوراً یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ ادھر مینجر میں میرے اعزاز میں کوئی زبردست پارٹی ہونے والی ہے جس میں میری شمولیت ضروری ہے..... بلا، بلا، بلا۔“

”مجھے کیا پتا۔“ زین باقر، جاسم کے بیان کے ایک پس پر زور دیتے ہوئے ساٹ آواز میں بولا۔ ”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے کچھ پتا نہیں تو یہی ٹھیک ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے دادا جان!“

”پوتا جان! تم نے دانستہ مجھ سے اپنے حوالے سے جو کچھ چھپا رکھا ہے، کیا میں نے کبھی تم سے اس بارے میں سوال کیا؟“ زین باقر نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ جاسم نے پوری قطعیت کے ساتھ نفی میں گردن ہلا دی۔

”بس تو سمجھ لو کہ تمہاری طرح میں نے بھی تم سے کافی کچھ چھپا رکھا ہے۔“ زین باقر نے نرم لہجہ میں کہا۔ ”ہم دونوں کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ ایک دوسرے کے معاملات کی ٹوہ میں نہ رہیں اور اپنے کام کو آگے بڑھانے پر توجہ دیں۔“

بارے میں غلط نہیں کہا۔ یہودیوں سے میری چپقلش چل رہی ہے۔ بہر کیف..... وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”تم پچھ لو گے میری؟“

”میں ڈنکر چکا۔“ میری نے بتایا۔ ”البتہ کافی پی سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میرے لیے سینڈویچ اور اپنہ ایسے کافی کا آرڈر کر دو۔“ جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اور اس سے پہلے یصارت امن والا لفافہ مجھے دیے دو۔“

میری نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ میری نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس لفافے کے اوپر ٹوبان کا نام اور انویٹیشن کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ جاسم نے لفافہ کو کھولا تو اندر سے مختصر تحریر والا ایک پرچہ برآمد ہوا جس پر رائڈ ظاہری نے لکھا تھا۔

”آج رات گیا۔ بجے ہوئے کانٹی نیٹر کے کانفرنس ہال کے ساتھ والے میزب روم میں پانچ افراد کی ایک اہم ملاقات ہو رہی ہے۔ ہول کے ریسپشن پر تمہارے لیے ایک لفافہ رکھا ہوا ہے جو میری کو اٹھانا ہوگا کیونکہ اس لفافے پر اسی کا نام درج ہے۔“

اس دوران میں میری نے کھانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ جاسم نے راش ظاہری کے رقعے کو کھڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد اس کا ایک خناسا گولا بنا کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور میری سے پوچھا۔

”تی ڈی ایس والوں کے ساتھ میزک کے مذاکرات کیسے رہے.....؟“

”انتہائی کامیاب۔“ میری نے بتایا۔ ”انکل نے ”پیوڈراما۔ پلس“ ان کے سپرد کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے تاحیات انکل اور سریا کی حفاظت کا یقین دلایا ہے۔“

”یہ تو اچھا ہو گیا.....“ جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تم لوگوں نے دھماکے کی آواز سنی تھی؟“

”ہاں، سنی تھی اور ہم جائے وقوعہ پر بھی گئے تھے۔“ میری نے جواب دیا۔ ”تسل یا اصلی پولیس والے اپنی گاڑی سمیت نذر آتش ہو گئے تھے اور ٹرک ڈرائیور کے بیان کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس معاملے کی تحقیق کرنے والے پولیس آفیسر کے مطابق، ٹرک کے ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہلاکت سینے والے بد قماش پولیس والوں نے خود ہی ٹرک کے سامنے آکر اسے ٹکر ماری تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ پولیس

والے فٹہ کی حالت میں تھے یا پھر سستی میں..... بہر حال، وہ تینوں اس جگہ پر ہی لٹنے لگے تھے۔“

”ٹرک پر لدے ہوئے ان ڈرموں میں کیا تھا؟“ ایک فوری خیال کے تحت جاسم نے میری سے پوچھ لیا۔

”ریفائن کوکنگ آئل.....“ میری نے بتایا۔ ”یہ تو اچھا ہوا کہ اس حادثے میں وہ ڈرم ٹرک سے ٹپے نہیں گرے ورنہ وہاں ایسی خونخاک آگ بھڑک اٹھتی کہ جس پر قابو پانا آسان نہ ہوتا۔“

جاسم نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”میری انم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ”پاس! ان پیسوں کا کیا کرنا ہے جو تم بیگ میں بھر کر لائے ہو؟“ میری نے ایک اہم سوال کیا۔

”وہ رقم چار افراد میں برابر تقسیم ہو گی۔“ جاسم نے دونوں انداز میں کہا۔ ”میٹرک، مریا، اشہد اور میری۔ یعنی تم۔“

”اور تمہارا کیا؟“ میری نے، سوالیہ نثر سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے اس میں سے ایک ڈالر ہی نہیں چاہیے۔“ جاسم نے حتیٰ لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے پاس.....؟“ ”ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”تم یہ بات جا کر خود میٹرک انکل سے کہو.....“ میری نے ضدی لہجے میں کہا۔ ”وہ گھر میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”میرے سامنے کئی ایک اہم کام لائن آپ ہیں۔“ جاسم نے نظریے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سورنا..... آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔“

”مگر تم نے گاڑی سے نکلنے وقت وعدہ کیا تھا کہ آج رات کسی وقت تم ملنے آؤ گے۔“ میری نے پاٹ آواز میں کہا۔ ”ٹوبان! کیا تم اپنے وعدے کا پاس نہیں کر دو گے.....؟“

”اپنے ذہن پر زور دو گے تو تمہیں یاد آ جائے گا۔ کیونکہ یہ چند گھنٹے پہلے ہی کی تو بات ہے۔“ جاسم نے ایک ایک لفافہ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے دو بارہ ملنے کا وعدہ تم سے کیا تھا میری، انکل میٹرک سے نہیں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خود تمہیں ڈھونڈ لوں گا اور دیکھ لو۔ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں باتوں میں تم سے جیت نہیں سکتا۔“

”اور مر یا کا کیا.....؟“ جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور اس راستے میں موت ہر لمحہ زندگی کی تاک میں رہتی ہے۔“

”جب میں نے اپنے آپ کو بھالایا ہے تو وہ بھی خود کو کسی نہ کسی طرح سمجھائی لے گی۔“ وہ چٹائی لےجے میں بولا۔

”میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

ہیری کی باتوں میں کچھ ایسا تھا جس نے جاسم کو اس پر توجہ دینے کے لیے مجبور کر دیا۔ ”اے۔“ نے ہیری کے چہرے پر نگاہ جما کر مطمئن انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے، ہم ڈاکٹر کا نئی نینٹل بنا رہے ہیں۔“

”کیا تمہارے دوست نے ڈنر پر بلایا ہے؟“

”اگر وہ انویٹیشن ڈنر سے متعلق ہوتا تو میں یہاں بیٹھ کر سینڈویچ سے اپنا معدہ نہیں بھر رہا ہوتا۔“ ہیری کے سوال کے جواب میں جاسم نے کہا۔

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ ہیری اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

جاسم نے کھانے کا بل ادا کیا پھر وہ دونوں پہلی فلیٹ میں بیٹھ کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”ہوٹل کا نئی نینٹل“ ایک وسیع و عریض سطح چٹان کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ منجھڑ کا پہاڑی علاقہ تھا جس کے بیشتر حصے کو انسانی کاوشوں نے ”سیدانی“ بنا لیا تھا اور اس کے بعد بحیرہ روم تک ریت ہی ریت تھی۔ اس ہوٹل کے ہر مقام سے بحیرہ روم کا دلکش نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

کانٹی نینٹل ایک حقیر سی اسٹار ہوٹل تھا اور یہ عمارت قومی ورثے کی حیثیت کی حامل تھی۔ اسے میونسپلٹی شان بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کل تین فلور تھے۔ سینکڑوں تھرو فلور پر وہاں ٹھہرنے والے مہمانوں کے لیے چھن آرام دہ اور پُر آسائش کمرے بنے ہوئے تھے جبکہ فرسٹ فلور پر مختلف ریسٹورانٹ، کیفے ٹیریا، کانفرنس ہال اور متعدد میٹنگ رومز موجود تھے اور انہی میں سے ایک میٹنگ روم میں کوئی خاص ایجنس میٹنگ ہونے جا رہی تھی۔

جب جاسم اور ہیری مذکورہ ہوٹل پہنچے تو گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ جاسم کی ہدایت پر ہیری نے پہلی فلیٹ کو ہوٹل کے باہر ایک سائڈ پر لگا دیا تھا۔

”تمہیں ہوٹل کے ریسپشن تک جانا ہوگا۔“ جاسم نے ہیری سے کہا۔ ”وہاں پر تمہارے نام کا ایک لفافہ رکھا ہے۔ وہ لفافہ لے کر میرے پاس آ جاؤ۔“

”تو ملی اور شیے میں لڑائی کر کے دیکھ لو۔“

”میرا اثر اب نہیں ہوا۔۔۔۔۔“ ہیری نے بے ساختہ کہا۔

”کیا اثر اب نہیں ہوا؟“ جاسم نے زیراب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”دماغ۔۔۔۔۔“ ہیری نے جھٹا ہر آئینہ لہجے میں جواب دیا۔

”غصہ ٹھوکر دو یا رام میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ جاسم نے اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں کہا۔

”میں آج صبح ہی سے مسلسل بھاگ دوڑ اور مار مار مار میں مصروف ہوں اس لیے خود کو ریلکس کرنے کے لیے فیسی مذاق تو بڑا ہے۔ اگر تمہیں جڑا لگا ہو تو میں معذرت خواہ اور۔۔۔۔۔ ڈوٹ ڈری انکل میزک سے

میں ابعد میں کسی وقت تفصیلی ماقامت کر لوں گا۔“

”میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں لیکن اے۔۔۔۔۔ وہ جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔

”ایک مجاہد کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی ایک ایک انر اپنے مشن کے لیے وقف ہوتی ہے۔“

”تمہاری ان باتوں سے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ جاسم نے کہا۔ ”تم ایک مجاہد کی حقیقت سے واقف ہو۔“

”ٹو بان امیں عیسائی ہوں اور تم مسلمان!۔“ ہیری نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں مانتا ہوں کہ ماضی میں ہمارے درمیان بہت سی خوفناک جنگیں ہو چکی ہیں لیکن اب حالات بہت مختلف ہیں۔ اس وقت یہودی ہم دونوں کے دشمن ہیں۔

ان بد بختوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی ماننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ یسوع صبح علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل کے آخری نبی تھے۔ ہماری مقدس انجیل میں آپ کے نبی کی آمد کا ذکر موجود ہے۔ یہودیوں نے یہ دشمن بلکہ پورے فلسطین میں ہم پر جو ظلم ڈھائے ہیں، وہ سب تاریخ کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ تو کیوں نا۔۔۔۔۔“ وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تنہا پھر بڑے عزم سے بولا۔

”تو کیوں نا ہم مل کر ان کہنے یہودیوں کا اینٹ سے اینٹ نبھا دیں۔ میں مانتا ہوں کہ میں لڑائی بھڑائی سے دور رہنے والا انسان ہوں لیکن نیچے یقین ہے کہ تمہاری راہنمائی میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ میٹرک کی بازیابی والے معاملے میں تم نے مجھے اس راستے کی چاٹ لگا دی ہے۔ میں کسی بھی مرحلے پر تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ ہیری کے خاموش ہونے پر جاسم نے پوچھا۔

وہ بے دھڑک بولا۔ ”مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔“

اد کے۔۔۔۔۔ ہیری نے فرمانبرداری سے کہا۔
 اس سے بھی پہلے ہیری واپس آ گیا اور مذکورہ
 لفافہ لاکر جاسم کو دے دیا۔ جاسم نے فوراً سے چوستر لفافہ کھولا
 اور اس کے اندر دو خط پڑھا۔ ظاہری نے لکھا تھا۔

”عجب متن! جب پیغام رسانی میں اجنبی لوگوں کی مدد
 لینا پڑے تو فیکٹس کو محفوظ رکھنے کے لیے فکر کے ساتھ تھوڑی
 جھیر جھار ضروری ہو جاتی ہے۔ وہ بااثر امریکی شخص تیسرے ہی
 فلور پر میرے کمرے سے تھوڑے فاصلے پر کمرانبر تین ہزار
 سات میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ ایک بدبودار یہودی ہے اور اس کا
 نام نل ہارپر ہے۔ یہ صیہونی امریکا سے ایک خاص کام کے
 سلسلے میں یہاں پہنچا ہے۔ ٹھیک گیارہ بجے وہ ایک میٹنگ روم
 میں چار اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرے
 گا۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی یہ میٹنگ کتنی دیر تک چلے گی تاہم
 مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ لوگ غزوہ اور ویسٹ بینک کے مسلمانوں
 کی بے رحمانہ قتل کشی کے لیے کسی بھی تک منصوبے کو قائل
 کرنے والے ہیں۔ یہ میٹنگ اسرائیل سے باہر اس لیے رکھی
 گئی ہے کہ تم ان کے اس مقصد کو سبوتاژ نہ کر سکو۔ ان کے خیال
 کے مطابق تمہارا آج کل اسرائیل اور فلسطین میں بہت آنا جانا
 لگا ہوا ہے اور وہ پراسرار چابی حاصل کرنے کے بعد تم یروشلم جا
 چکے ہو مگر تم تو یہیں پر ہو۔۔۔۔۔ ایک بات اور۔۔۔۔۔ میں نے سرخ
 لینڈ کروزر کے گھائل شخص کے سامنے جو بیان دیا تھا، ان
 نامرادوں نے میرے ان الفاظ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔
 ان کا خیال ہے کہ ایک چابی تو تم لے کر یروشلم چلے گئے ہو اور
 ویسکی دوسری چابی میرے پاس ہے چنانچہ مجھے چھاپنے کے
 لیے موساد کے پانچ ایجنٹ یہاں موجود ہیں۔ دو ہوٹل کے اندر
 اور تین ہوٹل کے باہر۔۔۔۔۔ جب نل ہارپر کی میٹنگ ختم ہوگی تو
 موساد کے یہ پانچوں ایجنٹس مجھ پر یلغار کریں گے۔ کیا کہتے
 ہو۔۔۔۔۔ وقت تم اور مقابلہ سخت ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟ کیا یہ بد بخت
 کسی ایسے شخص کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اس
 وقت ہوٹل کے اندر موجود ہی نہیں۔۔۔۔۔“

راشد ظاہری کے اس طویل مراسلے میں بہت کچھ
 نادیدہ اور بین السطور بھی تھا۔ جاسم اگرچہ ہر جملے کو بہت سمجھ
 لینے کا دعوے دار تو نہیں تھا لیکن یہ بات اچھے سے اس کے لیے
 پڑ گئی تھی کہ ظاہری ہوٹل میں موجود تھا یا نہیں تاہم اسے ہر حال
 میں اس مشن کا حصہ بننا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ظاہری کو ایک
 نہیں، تین تین خط لکھنے کی بجائے ضرورت تھی۔ آج صبح صحرائی
 مہم کو نمٹانے کے بعد وہ جاسم سے یہ کہہ کر غائب ہو گیا تھا۔
 ”ٹوبان! مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ تم سے کل

ملاقات ہوگی۔۔۔۔۔ دشمن میں۔“

ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد جاسم نے ہیری سے کہا۔
 ”اب تم واپس چلے جاؤ۔ یہاں سے آگے مجھے اکیلے ہی سفر
 کرنا ہوگا۔ تمہارا کھرجانا ضروری ہے۔ وہاں مر یا تمہارا انتظار
 کر رہی ہوگی۔“

”میں واپس جانے کے لیے تمہارے ساتھ نہیں آیا
 ہوں ٹوبان!“ ہیری نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”میں ساری
 کشتیاں جلا چکا ہوں باس۔۔۔۔۔“

”ہوٹل کے اندر بہت خطرہ ہے ہیری۔۔۔۔۔“ جاسم نے
 سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”موساد کے تربیت یافتہ
 ایجنٹس میرے دوست بصارت امین پر حملہ کرنے والے
 ہیں۔ مجھے اس کی حفاظت کے لیے فوراً اندر جانا ہوگا۔“

”مجھے نہیں ہمیں۔۔۔۔۔“ ہیری نے ایک ایک لفظ پر دباؤ
 ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں مل کر بصارت امین کو رہا کر
 کریں گے۔“

”تو ٹھیک ہے پارٹنر۔۔۔۔۔“ جاسم نے فیصلہ کن انداز
 میں کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔ ہم ہوٹل کے اندر جا رہے ہیں۔“

قبل اس کے کہ وہ دونوں پہلی فیٹ سے باہر نکلتے،
 پرانے ماڈل کی ایک لمبی چوڑی امریکی ساختہ گاڑی ان کی چوٹی
 سی فیٹ کے آگے تھوڑے فاصلے پر آ کر رکی۔ اگلے ہی لمحے
 مذکورہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک عجیب الحالت
 شخص برآمد ہوا۔ جاسم اور ہیری اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ کیا شے ہے۔۔۔۔۔؟“ ہیری نے حیرت بھرے لہجے
 میں کہا۔

جاسم اس ”شے“ سے غائبانہ طور پر متعارف تھا اور اس
 تعارف کا وسیلہ اشتار بنی تھی۔ جب وہ دونوں ”ایریا۔ فنٹی
 ون“ کے ایک زنگ آلود کنٹینر میں ملے تھے تو اشتار نے جاسم
 کو اس شے کے بارے میں بتایا تھا۔

”یہ ٹوٹاف ہے۔۔۔۔۔“ جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں
 جواب دیا۔ ”اسے زرخیز اور مادہ انسانی یعنی عورت کے باہمی
 جنسی ملاپ سے تیار کیا گیا ہے۔ اس طریقہ تولید کو ”اختلاط غیر
 نفساں“ کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔“

جاسم کے جواب نے ہیری کو ناقابل بیان دہشت اور
 وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بھٹی ہوئی خوف بھری آنکھوں
 سے ٹوٹاف کو دیکھ رہا تھا۔

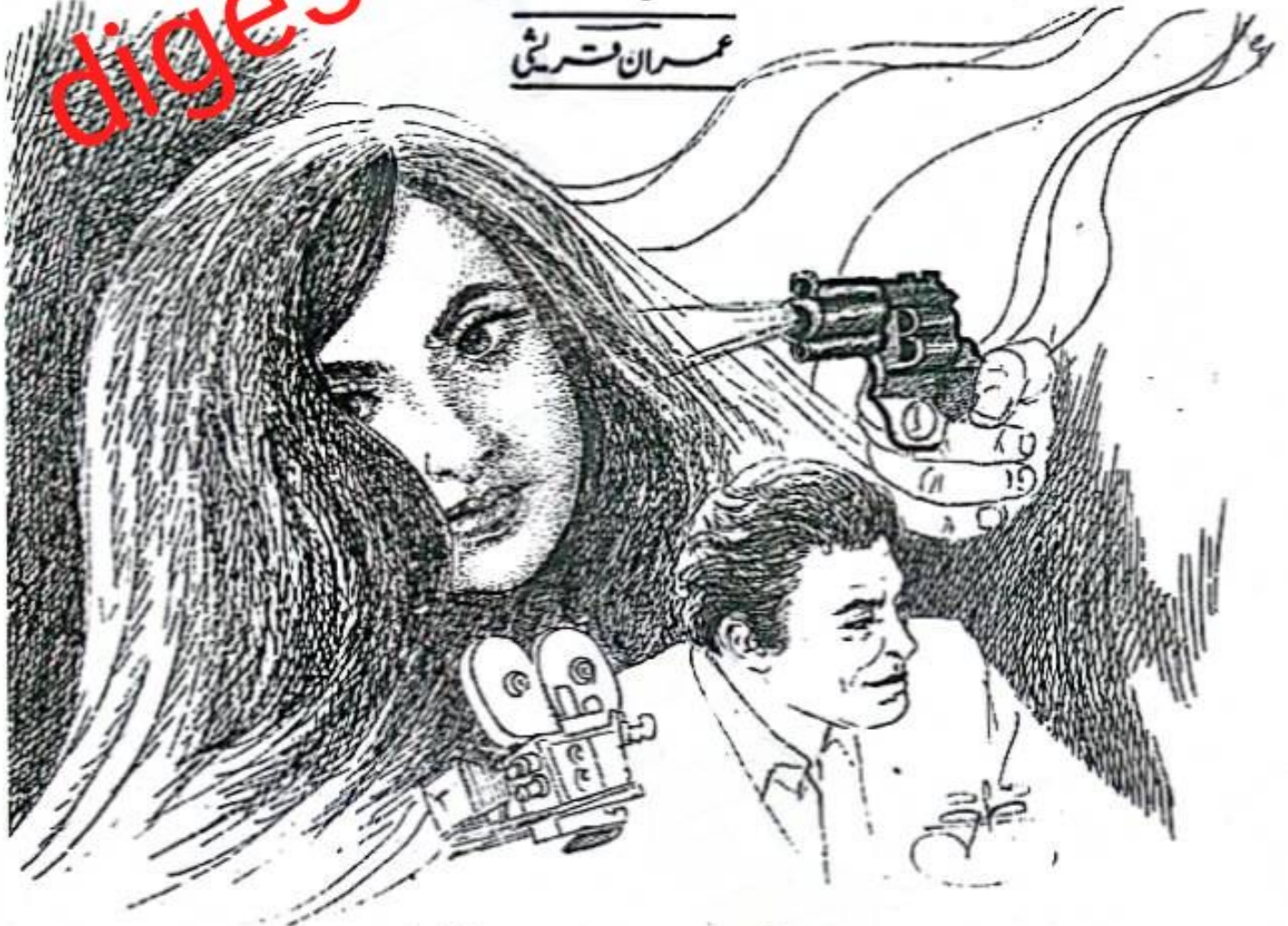
حیوت و تجسس کی تہ میں چھپی اس
 داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

بعض لمحے بڑے بے اختیار ہوتے ہیں... جو سوچا نہیں
وتا، وہ سرزد ہو جاتا ہے... وہ بھی بے اختیار لمحوں کی
رہبر آچکے تھا... محبت کی شدت عروج پر تھی... مگر
ہمت و جرات کے فقدان نے اسے بے بس کر دیا تھا... طلب
بڑھتی جا رہی تھی اور وہ خود بے پور ہوتا جا رہا تھا...

محبوب کے گرد پروانے کے مانند ریش میسرے خورے، اماش کا عجیب ماجرا

طلب گار

عمران تشریشی



رتز چھے نینوں والی مجھے بچپن سے پسند تھی۔ اُس کا
نام نائلہ تھا اور چونکہ میرے ماموں کی لڑکی تھی اس لیے ہمیں
لٹے ملانے کے لیے آزادی حاصل تھی۔ لیکن ان ملاقاتوں کا
کیا فائدہ جن کے زور ان میری بولتی ہی بند ہو جایا کرتی تھی۔
میں اسے بس گنگی باندھے دیکھتا رہتا اور وہ بولتی رہتی۔ میں
سال کی عمر میں جب وہ میرے حواسوں پر طاری ہونے لگی تو
میں نے اس کی تصویر اپنے بٹومے میں لگا لی۔ ایک بچے کے
بچے بھی رکھ لی اور حد تو یہ کہ ہاتھ روم میں آئینے کے پیچھے بھی

چھپا دی۔ اب یوں ہوتا تھا کہ جب صبح سو کر اٹھتا تو سب سے پہلے عینکے کے نیچے سے اس کی تصویر نکال کر کتنی لمبا دیر دیکھتا رہتا تھا اور پھر ہاتھ روم میں شیشہ پٹا دیا کرتا تھا۔ وہ جھم سے میرے سامنے آ جایا کرتی تھی۔ کالج میں بھی وہ میری جیب میں ہوتی تھی۔ پتھر کے دوران شادی میں نے بھی بکسری کے ساتھ مضمون پر توجہ دی ہو۔ اس لیے اسٹرٹل ہوا جایا کرتا تھا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میری قلم توجہ نائلہ پر مرکوز تھی لیکن کبھی بھی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ حال دل اسے سناسکتا۔ میں اون پر ہنستا ہوں کہ وہ جب بھی میرے سامنے آتی تو میری بوتلی بند ہو جاتی تھی۔ وہ مجھ سے جو بھی پوچھتی میں اس کا الٹا جواب دیتا۔ نجانے اسے دیکھ کر میں اتنا بوکھلا کیوں جاتا تھا۔ وہ میری بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھا کر مجھے خوب بے عزت کیا کرتی۔ کیلن میں پروا نہیں کرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی پرستش کرنے لگا تھا اور وہ بھی اسی قائل۔۔۔۔۔ میں اس کا حلیہ بیان کرتا ہوں۔ اس کے بال نہ زیادہ لمبے تھے اور نہ ہی چھوٹے تھے۔ بس درمیانے تھے۔ جن کا رنگ ڈارک براؤن تھا۔ وہ درمیان سے مانگ نکالتی تھی اور زیادہ تر بالوں کو کھلا چھوڑ دیتی تھی۔ ہاتھ کشادہ اور ناک ستواں تھی۔ ہونٹ پتلے اور قد لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں ہرئی۔ اے اتھم موٹی از رکافی حد تک تر چھی تھیں۔ اس لیے جب میں اس سے حیاوں میں بات چیت کرتا تھا تو اسے ترجیحے نیوں دانی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کتنی خوب صورت تھی۔ مجھے ہمیشہ دھڑکا اگر رہتا تھا کہ کہیں کوئی اسے مجھ سے چھین کر نہ لے جائے۔ اس لیے میں نے ہمت کر کے اسی سے بات چیت کی۔ وہ چپ ہو کر رہ گئیں۔ میں نے خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کیا۔

مجھے نائلہ بہت اچھی لگتی۔ لیکن تمہارے والد کو وہ پسند نہیں ہے۔ وہ تمہاری شادی اپنی بہن کی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں اور شاید انہوں نے بات چیت بھی کر لی ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر اس میں رد و بدل ممکن نہیں ہوتا۔ وہ پتھر پر لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے تمہیں ان کے فیصلے کے آگے سر جھکانا ہی ہوگا۔

میری آنکھوں کے سامنے نجلہ کا چہرہ گھوم گیا جو میری پہچانی لڑکی تھی۔ اب اس کا حلیہ بھی ماحول فرما لیجئے۔ وہ ہمیشہ اپنے بالوں میں سرسوں کا تیل لگا کر رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں لیکن نائلہ کی طرح تر چھی نہیں تھیں۔

اور ان میں بھی وہ کاہل لگا کر رکھتی تھی۔ ماک بھڑی اور ہونٹ بس مناسب تھے۔ قد چھوٹا اور جسم فربہ تھا۔ وہ نہ نہ کرتے رہنے بھی قطعی خوب صورت نہیں تھی اس لیے میں دل تمام کر رہ گیا۔ کہاں نائلہ اور کہاں نجلہ۔۔۔۔۔ اگر وہ میری بیوی بن جاتی تو میں شادی سے پہلے ہی خودکشی کر لیتا۔ کیونکہ والد صاحب کے فیصلے سے اخراج کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ جو بات منہ سے نکال دیا کرتے۔ تھے پھر اس سے بٹنے کو اپنی توہین کر دانتے تھے۔ والدہ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ بھی اتنی ہی مجبور تھیں جتنا کہ میں تھا اس لیے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تاہم میں نے دل نہ ہاتھ کر لیا تھا کہ والد صاحب سے بات ضرور کروں گا۔ اگر نائلہ میرے ہاتھ سے نکل جاتی تو میں تمام زندگی تڑپ تڑپ کر گزارنے پر مجبور ہو جاتا۔ شاید میں خودکشی بھی کر لیتا۔ کیونکہ میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف نائلہ تھی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں زندہ رہ کر کیا کرتا اور کتنی عجیب بات تھی کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے چاہتی بھی یا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ تاہم ابھی تک میں کسی حد تک مطمئن تھا۔ اگر وہ مجھے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی تو شاید میں بولنے والے طوطے کی طرح بات چیت کرنے لگتا۔ مجھے ابھی تک اس قسم کا کوئی بھی خدشہ لاحق نہیں تھا۔ رہن والد صاحب کی بات۔۔۔۔۔ تو ابھی تک انہوں نے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں ان سے بات چیت کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے فیصلے کو حتمی صورت دے دیے تو پھر تمام دنیا مل کر بھی انہیں اپنے فیصلے سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ چند دن پہلے میں نے خواب بھی دل دہلا رہے دلا دیکھا تھا۔ اس کی شادی ہرمن تھی اور میں چیت کے اوپر ہی ہوئی چارپائی پر بے سندھ پڑا تھا۔ نیچے حرن میں دھوم دھڑکا باری تھا۔ شہنائی بجن رہی تھی اور عورتیں ناچنے گانے میں مصروف تھیں۔ مجھے ان سب کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا دل تو خون کے آلسورہ رہا تھا اور پھر سیزمیاں چڑھ کر ذائدہ میرے پاس آئیں اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

”میرے ساتھ نیچے چلو۔۔۔۔۔ تمہارے ماموں نے نکاح کے لیے پرگداہوں میں تمہارا نام نکھوا دیا ہے۔ وہاں چل کر دیکھنا کرو۔“

میں نے زور سے پیچ ماری اور اٹھ کر چیت سے نیچے چلا نک لگا دی۔ نیچے گرنے پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری

طلب گار

بہت خیال رکھ گی۔ تاہم آزاد طبیعت کی مالک ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ گھر بنانے میں تمہارا ساتھ دے گی اور پھر ماں باپ جو فیصلہ کرتے تھے وہی دلا دے گا۔ لیکن بہتر ہوتا ہے اگر، لیے تاکہ کا خیال دل سے نکال دو۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن آزاد وطن میں دب کر رہ گئی۔

والد صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ ”لیکن ابھی ان باتوں پر بحث کرنا فضول ہے۔ ابھی تو تم اپنے مستقبل، توجہ دو۔ میں نے امریکا میں اپنے دوست سے تمہارے مستقبل کی بات چیت کی ہے۔ وہ جلد ہی تمہیں امریکا بلا لے گا۔ اگر تم نے وہاں چند کورس کر لیے تو وہ تمہیں نوکری بھی دلا دے گا اور ایک دفعہ تمہیں وہاں نوکری مل گئی تب تمہیں وہاں کی شہریت بھی بد آسانی مل جائے گی۔“

والد صاحب چند لمحوں کے لیے چپ ہوئے۔ میں باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے نکلنے سے جا ہوتا پڑتا اور میں ایسا بالکل بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ لیکن والد صاحب کو تو کسی بھی بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔ کسی اور کی بات سننا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ اس لیے دوبارہ ہم مکالمہ ہوئے۔

اپنے شائق کارڈ کی کاپی مجھے دے دو۔ میں جلد ہی تمہارا پاسپورٹ خواہ دوں گا۔ لیکن خدا کے واسطے امریکا جا کر کوئی ایسی سببی حرکت نہیں کرنا اور نانہ کو بھول جانا۔ جب کورس مکمل کرنے کے بعد تمہیں نوکری مل گئی تو نجمہ کو بہاد کر اپنے ساتھ ہی امریکا لے جانا۔ اس لیے اپنے آپ کو دماغی طور پر تیار کر لو اور فضول چکرز میں پڑنے کی کوشش مت کرو۔“ انہوں نے دوبارہ کتاب اٹھائی اور بیک لگا کر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بات مکمل ہو گئی ہے اس لیے میں کمرے سے باہر جاسکتا ہوں۔

میں نے ایک دفعہ پھر بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے بے بسی کے ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے نجمہ سے شادی کرنا ہی تھی۔ لیکن چھ ماہ کے بعد جب مجھے نوکری مل جاتی تھی میرے پاس ابھی کچھ وقت موجود تھا۔ میں اسے استعمال کر کے تاکہ کو حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی اس صورت میں ممکن تھا۔ جب وہ میرا ساتھ دیتی۔ ورنہ میں تاکہ ٹوئیاں مارنے کے سوا اور کچھ نہیں کر

سکتا ہوں؟ گویا کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ درد کی تیز ہیر جسم کے اندر سے ہوتی ہوئی دماغ تک چلی گئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا تمام جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور ہاتھوں کی مٹھیاں اٹھتی ہوئی تھیں۔ میں نے کچھ کے پیچھے ہاتھ ڈال کر نانہ کی تصویر باہر نکالی اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”میں کل والد صاحب سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مانیں گے نہیں۔ پھر بھی میں کوشش ضرور کروں گا۔ مجھے بس صرف تمہارا ساتھ چاہیے اور ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہاری مرضی کیا ہے۔ اگر تم نے انکار کر دیا تب میں کیا کروں گا؟ لیکن میں ایسا سرجوں ہی کیوں۔ مجھے تم سے ابھی امید رکھنی چاہیے۔ تم ضرور یہاں کرو گی اور ہم دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو گی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے تصویر کے اندر تر جھے نیوں زلی طرہ یہ انداز میں مسکرا دی ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میرے ارادوں پر مسکرائی یا پھر بے وقوفی پر اس کی تھی۔ جو بھی تھا میں اس کے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔“

☆ ☆ ☆

اگلے دن میں نے ہمت بائیں اور والد صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ وہ کتاب کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ ایسا حالت میں ان میں اور بھوکے شیر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جسے بیٹے بھر بھوکا رہنے کے بعد ڈیکار فیہ پ ہوا ہو۔ میں نے فوراً کئی کتڑا کر کمرے سے باہر نکلنے کی تاہم کوشش کی لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اس کی سرد آواز سنائی دی۔

”راہیں یہاں آؤ۔۔۔۔۔“

میں جہاز تھا وہیں رک گیا پھر مرے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا والد صاحب کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ انہوں نے نہ کتاب ایک جانب رکھی اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں کسی ریورس طرح بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے ارادوں کا دروازہ پڑتی۔ محسوس ہونے لگی۔ میں ان سے بات چیت کرنے میں جھجک رہا تھا تو پھر نانہ سے بات لینے لڑتا۔ وہ معاملہ اس سے بھی دشوار گزار تھا۔ بہر حال ابھی تو میں پہلے مرحلے میں ہی پھنسا ہوا تھا۔

والد صاحب بیک اٹارتے ہوئے بولے۔ ”تمہاری والدہ۔ نہ کل تمہارے متعلق مجھ سے بات کی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ تاکہ کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں ہے اس کے مقابلے میں نجمہ سبھی ہوئی گمریلو ٹرکی ہے۔ وہ تمہارا

سکتا تھا اور اس کے لیے مجھے ناکہ سے بات چیت کرنا ہی تھی۔ والد صاحب کے کمرے میں جو بھی ہوا، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں شاید ہی ناکہ سے بات کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر سکوں۔ لیکن مجھے ہمت تو بہر حال پیدا کرتی تھی۔ ورنہ شاید میں ہاتھ ملتا رہ جاتا۔

والد صاحب کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے بایک نکالی اور ناکہ کے گھر کی طرف چلا آیا۔ ماموں اور ممانی شاپنگ کے لیے باہر گئے تھے اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میرے پاس اس سے بات چیت کرنے کا بہترین موقع تھا۔ اگر اب بھی حال دل اس کے سامنے بیان نہیں کر پاتا تو پھر میرے لیے اسے بھلا دینا ہی بہتر ہوتا۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ ترجمے نینوں والی۔ انتہائی خوب صورت اور پُرکشش۔ میرے اوپر دوبارہ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے مجھ سے چائے کے متعلق پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔

تب کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ”ڈیڈی سے ملنے آئے ہو۔ وہ مٹی کے ساتھ ماہانہ راشن لینے قریبی مارکیٹ کی طرف گئے ہیں، کچھ دیر میں آجائیں گے، تم انتظار کر لو۔“

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے وہ سامنے آتی تھی تو مجھے کیا ہو جاتا تھا۔ دماغ ساتھ دینا ہی چھوڑ دیتا تھا۔ سب کچھ دھندلا ہو جاتا تھا اور مجھے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ میں کیا بات کروں۔ مجھے اپنے دوست کی ایک نصیحت یاد آئی۔ کسی کو اپنے اوپر اتنا حاوی نہیں کرو کہ وہ تمہارے دماغ پر اختیار حاصل کر لے۔ اگر بحالت مجبوری کوئی تم پر حاوی ہو جائے تو آنکھیں بند کر کے اسے چند گالیاں دو۔ اس کا جو اختیار تم پر مسلط ہو گا وہ ختم ہو جائے گا۔ پھر آنکھیں بند کر کے اپنے دل کا حال اس کے سامنے بیان کر دو۔ تمہیں کوئی بھی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کا چہرہ پردہ سمیٹیں پر بدستور موجود رہا۔ ترجمے نینوں والی مجھے بُری طرح گھور رہی تھی۔ میرا حوصلہ دوبارہ متزلزل ہونے لگا اور میں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اس کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اب میرے پاس اس کے سوا اور کوئی حل موجود نہیں تھا کہ میں مخالف جانب چہرہ کر کے دل کا حال بیان کروں۔ میں فوراً اٹھ کر کمرے میں بنی ہوئی کھڑکی کی طرف آ گیا۔ اس کے دوسری جانب لانا تھا۔ جس میں خوش رنگ پھولوں کے پودے جا بھاگے ہوئے تھے۔ درختوں پر

چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور نرم گرم دھوپ ماحول کا حصہ کر کے ہوئے تھی۔ میں کتنی ہی دیر ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور پھر جب میری دماغی کیفیت معمول پر آنے لگی تو کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے الفاظ ترتیب دیتے لگا۔ میں نے اپنے دوست کے کہنے کے مطابق اسے دو تین گالیاں بھی دیں۔ پھر جب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے حصار میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو میں نے با آواز بلند اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ڈیڈی میری شادی نجمہ سے کروانا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی اس لیے میں نے صاف انکار کر دیا اور انہیں دو ٹوک لہجے میں بتا دیا کہ میں اگر شادی کروں گا تو صرف تمہارے ساتھ کروں گا اور اگر میرے فیصلے کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو ہو سکتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔ تمہارا میرے ارادے کے متعلق کیا خیال ہے؟“ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یقیناً فطری شرم و حیا آڑے آرہی تھی اس لیے اب آگے بھی مجھے ہی مزید کچھ کرنا تھا۔

میں نے مڑتے ہوئے ناکہ کی جانب دیکھا اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ نہ جانے کب کی کمرے سے باہر جا چکی تھی اور میں پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ سب کیے کرائے پر پانی پھر کر رہ گیا اور میری ہمت نے ایک دفعہ پھر جواب دے دیا۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ کچن میں تھی۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ ”ارے کہاں چل دیے۔ میں تمہارے لیے چائے بنا رہی ہوں، پی کر جانا۔“

میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ہمت ایک دفعہ پھر جوان ہوئی۔ ابھی تک میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ وہ میرے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ اگر ماموں اور ممانی آجاتے تو پھر مجھے دوبارہ ایسا موقع نہیں ملتا۔ اس لیے دوبارہ ہینگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جلد ہی چائے کی پیالی لے کر کمرے میں آئی اور اسے میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے سب معلوم ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے کیا جذبات ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پھر مجھے پسند نہیں کرتے۔ میں تمہارا دل توڑنا نہیں چاہتی ہوں۔ لیکن کیا کروں اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اور پھر اس کے متعلق تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ تب بھی تمہارا دل چکنا چور ہوگا۔ میں شادی کرنے والی ہوں۔“

میرے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں پتھر کا بُت

بلند خودی

افغانیوں کے ایک لیڈر امین جان نے افغانستان کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ جنگ میں اگر ہم جیت گئے تو یہ بھی روٹی اپنی گھست تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ یہی کہیں گے کہ جنگ میں ہم دوسرے نمبر پر رہے۔

مقابلہ

ایک بڑی فرم نے اپنے ملازمین کو پیش کی کہ وہ لوگ دفتر کے اخراجات کم کرنے کے طریقے بتائیں۔ جس ملازم کا طریقہ سب سے اچھا اور قابل عمل ہوگا اسے پانچ سو روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔
پانچ گھنٹے کے مقابلہ میں کہہ کر جیت لیا کہ انعام کی رقم سو روپے سے زیادہ نہیں ہوتی چاہیے۔

کراچی سے شہزاد احمد خان کی جیت

کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں امریکا جا کر اسے بے آسانی بھلا سکتا تھا۔ اگر وہ شادی کر بھی لیتی تو مجھے معلوم نہیں ہوتا۔ والد صاحب نے ثقت کے عالم میں رقم کا بندوبست کیا اور میں نے اگلے ماہ رخت سفر باندھا۔ جانے سے قبل میں ماموں اور ممانی سے ملنے کے لیے ان کے گھر آیا۔ تب ناکہ سے بھی سرسری ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت مزید بڑھ گئی۔

ممانی نے بتایا۔ اگلے مہینے ناکہ کا نکاح ہے اس لیے وہ بہت خوش ہے۔

میں سمجھ کر رہ گیا۔ میرے دل کے کسی کونے میں وہی ہوئی چنگاری نے دوبارہ شعلہ شمع کر دیا۔ میں نے بیدردی کے ساتھ اسے مسل کر بچھا دیا اور مسکراتے ہوئے ممانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر میں امریکا نہیں جا رہا ہوتا تو شادی میں شرکت ضرور کرتا۔ لیکن ویزا آچکا ہے۔ اس لیے مجھے جلد ہی ملک کو خیر باد کہنا ہوگا۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔“ ممانی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعائیں دیں اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھ رہنے کے بعد واپس گھر آ گیا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے میں امریکا چلا آیا۔ مجھے انٹرویو پر صدیقی صاحب نیے کے لیے آئے تھے۔ وہ پچاس سے

پانچواں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ تاہم اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”اس کا نام طاہر ہے۔ وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا ہے۔ مکی اور ڈیڈی بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ ہم جلد ہی شادی کر لیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ سب برا لگ رہا ہوگا لیکن میں مجبور ہوں۔ تمہارے لیے اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ میری مانگو تو تم بھی کسی سے شادی کر لو۔“

معاملہ میری قوت برداشت سے باہر ہو گیا اور میں اس کی مزید بات سننے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ میرے پیچھے لپک کر آئی لیکن مجھے اب مزید کوئی بات چیت نہیں کرنی تھی اور میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اس لیے میں اپنی بائیک کی طرف چلا آیا۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے ہاتھ کو بیدردی کے ساتھ جھٹک دیا اور بائیک کو اسٹارٹ کر کے کوشی سے باہر لے آیا۔ وہ دروازے میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آخری دفعہ پیچھے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور تیزی کے ساتھ بائیک کو آگے بڑھا دیا۔ یہ میری اور اس کی آخری ملاقات تھی۔ گھر آنے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں جا کر اس کی تمام تصاویر باہر نکال کر انہیں آگ لگا دی۔ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اپنے کلاس فیلو کو مجھ پر ترجیح دی تھی۔ میرے سر سے محبت کا بھوت یک دم اتر گیا اور اس کی جگہ نفرت نے لے لی۔ میرے دوست کے پاس ایک رپوالور تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ اسے گولی مار دوں گا۔ لیکن آپ سب میری ہمت کو ملاحظہ فرمائیے کچھ ہوں گے۔ میں ایسا کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ میرے اسی دوست نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسے اجرتی قاتل کو جاننا ہے جو رقم لے کر کسی بھی آدمی کو ٹھکانے لگا دیتا ہے لیکن معاوضہ بھڑا لیتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”تقریباً کتنا۔۔۔؟“

اس نے بتایا۔ ”پانچ لاکھ۔۔۔ وہ بھی خشکی۔“ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے پاس اتنی رقم موجود نہیں تھی۔ مجبوراً اسے گولی مار کر ختم کر دینا مجھے بہتر دکھائی دینے لگا۔ میں اسے کسی اور کی دلہن بننے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اپنے اندر ہمت پیدا کرنی تھی۔ لیکن اگلے دن ہی والد صاحب نے مجھے کاموں میں ایسا الجھایا کہ میں نے وقتی طور پر ناکہ کو بھلا دیا۔ میرے کاغذات جمع ہوئے۔ فیس ادا کی گئی اور جلد ہی مجھے پاسپورٹ مل گیا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسٹار کیا۔ اس لیے چھ مہینے کا ویزا لگ گیا۔ میں نے ناکہ کو قتل

اوپر کے بیٹے میں قدم رکھ چکے تھے۔ انتہائی لاخراور کمزور جسم کے مالک تھے۔ ان کی حالت بہت دترتوں دکھائی دیتی تھی۔ کپڑے بھی کافی حد تک بوسیدہ تھے۔ تاہم ان کے پاس مہنگی گاڑی تھی۔ جسے وہ آن لائن کسی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی میں بیٹھا کروڑوں فیٹ پر لے آئے۔ فلیٹ کی حالت بھی مندرشہ تھی۔ مگر۔۔۔ نے وجہ پوچھ کر تو انہوں نے بتایا۔

”کثرت شراب نوشی کی وجہ سے دونوں گرو۔۔۔ تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے میں علاج بھی اجتماعی نہیں کروا رہا ہوں اور کس کے لیے علاج کرواؤں۔ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ بیوی کو جب میری بیماری کے متعلق معلوم ہوا تو وہ انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ تاہم کبھی کبھی فون کر کے خبریت دریافت کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ مجھے ہر ماہ کے آخر میں ملتی بندھی رقم اسے بھجوانی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ میرے لیے صدق دل سے زما کرتا ہے کہ میری موت واقع نہ ہو۔ ورنہ اسے رقم ملنا بند ہو جائے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا اس نے آپ سے طلاق لے لی ہے یا پھر یہاں کے رواج کے مطابق بغیر شادی کے اس کے ساتھ رہ رہی ہے؟“ یہ ایک بے محاسن سوال تھا جو سوچے سمجھے نتیجہ میں نہ پہنچا تھا۔

مدتی، صادقہ۔۔۔ نے جواب دیا۔ ”میں نے طلاق نہیں دی۔ اس لیے وہ۔۔۔ سے ماہانہ خرچ بھجواتا پڑ رہا ہے۔ وہ اس کی ریکل بن کر رہ رہی ہے اور دن رات میرا خون چوس رہی ہے۔“

مجھے ان کے حالات زندگی کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا۔ امریکا میں تقریباً ہر انسان نفسی کے ترواب میں پھنسا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سب کی ایک ہی کہانی تھی۔ بہر حال کھانے کے دوران صدیقی صاحبہ نے مجھے بتایا کہ مجھے تقریباً تین مہینے کا کورس کرنا ہوگا۔ اس دوران میں وہ میرے لیے نوکر کا بندوبست کر لیں گے۔ تاہم اس سے پہلے شہریت حاصل کرنے کے لیے دوڑ دوپ کرنا ہوگی جس کا آغاز وہ جلد ہی کر دیں گے۔

مگر نے اثبات میں سر ہلایا اور اگلے دن سے قریبی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس کے بعد زندگی کا یہاں جس تیزی سے ساتھ گھومتا تو اس کے ساتھ ہی میں بھی چکر بن کر رہ گیا۔ صبح انسٹی ٹیوٹ اور شام کو صدیقی صاحبہ کی ٹیکسی چلاتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ دن کیسے گزر جاتا تھا۔ نلے مہینے مجھے والدہ کا خط ملا۔ جس میں انہوں نے بتایا کہ

نانکھ نے شادی کر لی ہے اور جس لڑکے کے ساتھ کی ہے، وہ اس کے قاتل بھی نہیں ہے۔ خطا ہے۔ اچھا، سہو! نے اس کی تصویر بھجوائی تھی۔ نہ جانے۔۔۔ یہ طاہر میں ایسا کیا دکھائی دیا تھا جس نے اسے شادی پر مجبور کیا تھا۔ والدہ نے تصویر صرف اس لیے بھجوائی تھی کہ ندر طاہر سے ہر لحاظ سے بہتر تھا اور نانکھ نے اس سے شادی کر کے جمادات کا مظاہرہ کیا تھا یا پھر اس نے یہ سب میری رضا میں کیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کچھ اور بڑھ گئی ورنہ میں نے اپنے آپ کو کام تک محدود کر دیا۔ اسے ماہ والدہ صاحب کو بارٹ ایک ہوا اور وہ وفات پا گئے۔ چونکہ میں پڑھائی چھوڑ کر واپس نہیں جاسکتا تھا اس لیے ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ والدہ اب اکیلی رہ گئی تھیں اور ان کا تقاضا تھا کہ میں ملک واپس آ جاؤں۔ لیکن دل پر زخم کھانے کی وجہ سے میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ والدہ صاحبہ کی پیشین گوئی والدہ کی گزشتہ ماہی نور ہاتھ۔ میرے جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور پھر میکا قاتل کا سلسلہ شروع ہوا۔ طاہر کا ایکسیڈنٹ ہوا اور موت پر ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔ والدہ نے مجھے بتایا۔ قصور سراسر سامنے۔۔۔ آنے والی گاڑی کے ڈرائیور کا تھا۔ وہ نشے میں دھست تھا اس لیے پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہے اور اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ یقیناً اسے پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔ مجھے یہ خبر سن کر نہ جی ہوئی نہ رند ہی افسوس ہوا۔ میں نے دل میں ارادہ کیا کہ نانکھ کو فون کروں گا۔ لیکن میں نے فون نہیں کیا اور دن تیزی کے ساتھ گزرتے چلے گئے پھر اگلے ماہ مجھے ایک مزید دھچکا لگا۔ میں صبح سوکر تھا تو صدیقی صاحبہ رات کے کسی پہر حیات قاتی۔۔۔ کو جکڑ کر چکے تھے۔ میرا تمام کام اچانک ہی بڑ گیا۔ کورس مکمل ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا اور میرے پاس تین مہینے کا ویزا موجود تھا۔ چونکہ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا اس لیے میں ٹیکسی رات کے وقت چلاتا تھا۔ تاہم انکم اچھی خاصی ہو جاتی تھی اور پھر والدہ صاحبہ کی جانب سے خط موصول ہوا کہ طاہر کے قاتل کو رہا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ نانکھ نے اسے معاف کر دیا تھا۔ یہ خبر میرے لیے غیر متوقع تھی۔ میں نے دوبارہ نانکھ سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایک دفعہ پھر بات نہیں کر سکا اور پھر اگلے ہفتے مجھے اس کا خط ملا، لکھا تھا۔

”ڈیئر کزن!“

یقیناً تمہیں خط دیکھ کر حیرت ہو رہی ہوگی۔ شاید تم مجھ سے نفرت بھی کرنے لگے ہو گے۔ لیکن نفرت کی وجہ اب ختم

زیر لب کہا۔

”ترجیحے خینوں والی میں داپس آ رہا ہوں۔“ امریکا میں ویسے بھی میری دال گنتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی اور اگر مجھے ناکمل مل جاتی تو پھر مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پچاس کروڑ کی رقم اچھی خاصی رقم تھی۔ تاہم میں نے حتیٰ فیصلہ ملاقات کے بعد پر چھوڑ دیا اور اگلے بچے کو رس مکمل کرنے کے بعد ملک داپس آ گیا۔ والدہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ انہیں تنہائی کا سانپ ڈس رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ فون کی کمرے میں اٹھیں اور امریکا کو خبر باد کہنے پر زور دینے لگیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر ناکمل سے بات چیت جاری رکھنا ہوگی۔ تب شاید میں امریکا واپس نہ جاؤں لیکن اگر ناکمل متفق ہو تو میں یہاں کسی صورت بھی نہیں رہوں گا اور آپ کو بھی ہر اہلے جاؤں گا۔

والدہ نے سکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اس عمر میں امریکا جا کر کیا کروں گی۔ کافی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ اگر تم داپس نہیں آئے تو تمہارے ماموں کے گھر چلی جاؤں۔ اب مجھ سے کیا رہا نہیں جاتا۔“

میں نے انہیں دنا دیا کہ ”اٹھ بہتر کرے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں یہیں ٹھہرا ہوا جاؤں۔ تب تمام مسئلے ہی حل ہو جائیں گے۔ میں نے امریکا میں ٹیکسی ہلا کر چھا خاصا کمایا ہے۔ اس لیے اگر یہاں بھی رہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔“

والدہ چپ ہو گئیں۔ اگلے دن میں نے ماموں اور ممانی سے ملاقات کی۔

ماموں نے اُداس لہجے میں بتایا۔ ”ناکمل کو لوگوں کی نظر کھائی۔ اس نے ظاہر سے شادی کر کے زندگی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا تھا اور چہرہ پہلے اس نے سب اہل سندر بر واقع وسیع و عریض کوئی بھی ناکمل کے نام کر دی تھی۔ دراصل ان کی محبت چہرہ دنوں کی پیداوار نہیں تھی۔ وہ دونوں اسکول کے دور سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ محبت منگم مگم ہوتی چلی گئی اور پھر انتہا پر پہنچنے کے بعد اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔“

مجھے ماموں کی آواز سنائی دینی اچانک ہی بند ہو گئی۔ میرا دل ایک دفعہ پھر ٹوٹ گیا تھا۔ ناکمل جھوٹ بہت مہارت سے بولتی تھی۔ اس کا خط اس وقت بھی میری جیب میں موجود تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے والد کے کہنے پر اس نے انکار کر دیا اور

بزدلی ہے۔ ظاہر کی عاداتی موت نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ اس کے ساتھ شادی کرنا زندگی کی سب سے بڑی غلطیوں میں سے ایک تھی۔ وہ مجھ پر شک کرتا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا لیکن میں نے خلی مزاجی کے ساتھ اسے برداشت کیا۔ گاڑی کے حادثے میں تمام قصور دوسرے ڈرائیور کا تھا۔ اس لیے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یقیناً اسے بھائی کی سزا ہوتی لیکن وہ بہت اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور مجھے ظاہر کے مرنے کا رتی بڑا بر بھی افسوس نہیں تھا۔ اس لیے جب مزم کے گھر والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے تیس کروڑ کی رقم دینے کی بات چیت کی تو میں نے پچاس کروڑ کا تقاضا کر دیا۔ چونکہ جیل میں موجود لڑکا ان کا اکوٹا لڑکا تھا۔ اس لیے انہوں نے فوراً حامی بھری۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کا لڑکا بچاؤ کی پڑچھ جاتا۔ ایک طرح سے ان کی کمزوری میرے ہاتھ آ چکی تھی اس لیے میں نے کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دراصل میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میرے پاس ٹکڑی رقم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں نے تمہارا رشتہ ٹھکرا کر بہت بڑی غلطی کی۔ اس لیے میں نے پھوپھی سے تمہارا ایڈریس لیا اور اب تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ صرف یہ بتانے کے لیے میں نے یہ سب کچھ تمہارے والد کے اصرار پر کیا تھا۔ وہ ہماری شادی کے خلاف تھے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمہیں انکار کر دوں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور تمہاری والدہ یہاں اکیلی ہیں۔ انہیں تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ جلدی ملک واپس آ جاؤ۔ پھوپھی کے ساتھ میں بھی تمہاری منتظر ہوں۔

”اٹھ انا۔“

میں نے حیرت اور خوشی کے بھرے ملے جلے احوال کے ساتھ خط پڑھا اور واپس بیک جانے کے متعلق سوچا۔ میرے غور کرنے لگا۔ وہ اب بھی میرے دل کے گوشے میں کھینچا ہوا ہے۔ محبت بھی قسم نہیں ہوتی۔ اس کی شدت میں گھبراؤ آ جاتا ہے۔ تاہم چونکہ اس نے میرا دل بہت بیداری کے ساتھ توڑا تھا۔ اس لیے میں نے اسے بھلائے کی پوری کوشش کی تھی اور یقیناً اس تمام معاملے میں اس کا قصور بھی زیادہ نہیں تھا۔ والد صاحب نے اسے ضرور انکار کرنے کے لیے کہا ہو گا۔ جب اس نے مجھ کو ظاہر سے شادی کر لی ہوگی۔ میرے دل میں ایک دفعہ پھر اس کے لیے جیسی محبت جنم لینے لگی اور میں نے مسکراتے ہوئے

ظاہر سے شادی بحالتِ مجبوری کی۔ لیکن اب ماموں بتا رہے تھے کہ وہ اسکول کے دور میں بھی ظاہر کو پسند کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری حیثیت گاڑی کی اس اپٹنی جیسی تھی جسے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ظاہر کی ہلاکت کے بعد نائلہ کو شادی تو کرنا ہی تھی۔ لیکن بیوہ ہونے کے بعد اچھا رشتہ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بحالتِ مجبوری مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے ماموں سے رقم کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بتایا۔

”اچھی رقم نہیں ملی ہے۔ وہ پچیس کروڑ پر بضد ہیں اور نائلہ پچاس کروڑ کا تقاضا کر رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ بات بنے گی۔ میں نائلہ کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں کہ پچیس کروڑ لینے کے لیے رضامند ہو جائے۔ لیکن وہ مان نہیں رہی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے شوہر کی جان کی قیمت اتنی کم نہیں کہ کوئی یہ آسانی دے دے۔“

ماموں اور بھی نہ جانے کیا کچھ بتا رہے تھے۔ لیکن میرے دل میں نائلہ کے لیے دوبارہ نفرت پیدا ہونے لگی۔ وہ نہ صرف جھوٹی اور دھوکے باز تھی بلکہ دولت کی پجاری بھی تھی۔ اسے نہ ہی مجھ سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی اپنے شوہر سے محبت تھی۔ اس کی نگاہوں میں صرف پچاس کروڑ کی اہمیت تھی یا پھر اسے معتبر بننے کا شوق تھا۔ ملزم کے ماں باپ اس کی منت زاری کر رہے تھے۔ اور وہ فرعون بنی بیٹھی انہیں دھتکار رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی مجھے اس سے ملاقات تو کرنی ہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے اور جھوٹ کیسے بولتی ہے۔ اس لیے کچھ دیر ماموں کے گھر بیٹھنے کے بعد ان سے اجازت لے کر باہر آ گیا۔ انہوں نے مجھے ساحل سمندر پر واقع کوٹھی کا ایڈریس بتا دیا۔ جہاں وہ نوکروں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور کو ایڈریس بتانے کے بعد پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ محبت کے قابل نہیں تھی۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ مخالف پارٹی کی کمزوری میرے ہاتھ میں آ چکی ہے۔ اس لیے اس نے کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یعنی وہ کمزوری سے فائدہ اٹھانا بخوبی جانتی تھی اور میری محبت بھی کمزوری کی طرح اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ٹیکسی نے مجھے جلد ہی مطلوبہ ایڈریس پر اتار دیا۔ یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ جس کی حالت مخدوش تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی تو دروازہ نوکر نے کھولا اور مجھے لے کر بینک روم میں آ گیا۔ یقیناً اسے نائلہ نے میرے

متعلق بتا دیا ہوگا۔ وہ وہاں میری منتظر تھی۔ میں نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس کا جسم بھر گیا تھا اور چہرے پر کھٹکھٹکی تھی۔ یعنی اسے کئی بات کا کوئی غم نہیں تھا۔ وہ خوش باش تھی۔ اس نے وارنسی کے عالم میں میرا استقبال کرتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ پھوٹنے بجھنے بتا دیا تھا کہ تم ملک واپس آ رہے ہو۔ یقیناً تمہیں میرا اخل مل گیا تھا اور یہ فیصلہ تم نے اس کے بعد ہی کیا ہوگا۔“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں، میں چند دن یہاں رہنے کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں مجھے نوکری مل گئی ہے۔“ میں نے جھوٹ کہا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اب میرے لیے مٹی کے پتلے سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میں دوبارہ سرد لہجے میں ہم کلام ہوا۔

”یہاں آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ امی کو ساتھ چلنے پر آمادہ کر لوں۔ لیکن وہ وہاں جانا نہیں چاہتی ہیں اور میں انہیں زبردستی وہاں لے جانا نہیں سکتا اس لیے شاید وہ ماموں کے پاس رہیں۔“

نائلہ اپنی دماغی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میں تمہیں چائے پیئے بغیر جانے نہیں دوں گی۔“ وہ راہداری میں جا کر نوکر سے بات کرنے لگی پھر جلد ہی واپس آ کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نے خط میں تمہیں بتا دیا تھا کہ میں نے ظاہر سے شادی بحالتِ مجبوری کی تھی۔ کیونکہ تمہارے والد نے مجھ پر زور دیا تھا کہ میں تمہیں انکار کر دوں۔ ورنہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ بات بات پر مجھ پر شک کرتا تھا۔ میں اس سے بدظن تب ہوئی جب اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ تب بھی شاید میں درگزر کر دیتی لیکن اس نے اچھا خاصا تشدد بھی کیا۔ اس واقعے کے بعد میں سنجیدگی کے ساتھ طلاق کے متعلق سوچنے لگی۔ لیکن انہی دنوں وہ حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اب نہ ہی وہ ہے اور نہ ہی تمہارے والد۔ تم ملک واپس آ جاؤ۔ پھر تمہاری اشد ضرورت ہے۔ وہ بیمار رہتی ہیں۔ ان کی تیمارداری کرنے والا کوئی تو پاس ہونا چاہیے۔ مجھے پچاس کروڑ کی رقم مل چکی ہے اور اس کوٹھی کی قیمت پانچ کروڑ ہے۔ اس کے علاوہ ظاہر کا بینک بیلنس بھی اچھا خاصا

طلب گار

لے آؤں گی۔ تم نے شادی کے متعلق انہیں بتایا۔ انہیں نے ضرور تمہیں منع کیا ہوگا؟“

مجھے اس کا افسردہ ہونا بہت اچھا لگا۔ اس نے مجھے بہت دکھ دیے تھے۔ اس لیے میں کسی حد تک اذیت پسند ہو گیا تھا۔ میں نے بتایا۔ ”ای سے میں نے شادی کی بات نہیں کی۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں یہ اچھا نہیں لگے گا اور میں ان کا دل نہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ واپس آنے کے بعد بتا دوں گا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

نانکھ چپ ہو گئی اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھے رہنے کے بعد گھر آ گیا۔ میں نے اس سے اچھی خاصی بات چیت کی تھی جبکہ پہلے اس کے سامنے بیٹھتے ہی میری بولتی بند ہو جایا کرتی تھی اور پھر اس رات والدہ نے مجھے اس کے ایک اور جھوٹ کے متعلق بتایا۔ طاہر کو کاروبار میں نقصان ہوا تھا اور رقم کی اشد ضرورت تھی۔ اس لیے رقم حاصل کرنے کے لیے اس نے کوٹھی کو گروی رکھ دیا تھا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں رقم بھی نہیں تھی۔ ورنہ وہ کوٹھی کو گروی کیوں رکھتا۔ وہ جھوٹ پر جھوٹ بول کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے سبق دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور اگلے دن بی بی اپنے اس دوست سے ملاقات کی جو اجرتی قاتل کو جانتا تھا۔ میرے پاس اب رقم موجود تھی اور میں نانکھ کو قتل کروا سکتا تھا۔ آپ شاید حیران ہو رہے ہوں گے کہ اتنی سی بات پر میں اسے قتل کرنے کے متعلق سوچنے لگا تھا لیکن میری نظروں میں یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے مجھ پر طاہر کو فوقیت دی تھی۔ حالانکہ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی مجھ سے کم تھا۔ اب بھی وہ صرف مجھ سے شادی کر کے اپنی زندگی کو مستحکم کرنا چاہتی تھی۔ اسے اب بھی مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت مزید بڑھ گئی اور میں نے اپنے دوست سے اجرتی قاتل کا نمبر لے لیا۔ لیکن اس سے بات نہیں کی۔ کسی کو قتل کرنا کوئی آسان بات نہیں اور اگر قتل ہونے والا شخص رشتے دار ہو تو پھر بات ناممکن بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے اس سے اچھا خاصا بدلہ لے لیا تھا۔ اس نے شادی کی بات کرنے میں پہل کی تھی اور میں نے انکار کر کے اس کی انا کو جبری طرح کچل کر رکھ دیا تھا۔ تو پھر اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ آدمی سے زیادہ مرچکی تھی۔ باقی اسے وہ اذیت مار دیتی جو میں اسے دے کر جانے والا تھا۔ میں نے فون نمبر پھاڑ دیا اور دو دن بعد کی سیٹ شخص کروائی۔ والدہ نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس لیے میں نے انہیں ماموں کے

ہے۔ لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہ سب صرف تمہارے لیے کر رہی ہوں۔“

اس کی بات درمیان میں رہ گئی اور نوکر چائے کے ساتھ لوازمات سے بھری ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں میز سجادی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ نانکھ نے آگے بڑھ کر چائے کا کپ اٹھا کر میرے ہاتھوں میں پکڑایا۔

میں نے چسکی بھری اور طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”تم جھوٹ بہت اچھا بول لیتی ہو۔ نہ ہی تمہیں پچاس کروڑ کی رقم ملی ہے اور نہ ہی تم میری محبت میں گرفتار ہو۔ طاہر تم سے محبت کرتا تھا لیکن چونکہ تمہارا ہم بدلہ نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی تمہارے دل سے اتر گیا۔ میں یہاں آنے سے پہلے ماموں سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم طاہر کو اسکول کے دور سے پسند کرتی تھیں اور اس سے شادی تم نے اپنی مرضی سے کی تھی تو پھر بیچ میں، میں کہاں سے آ گیا۔ دراصل تم نے مجھے ہمیشہ استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اب بھی شاید یہی کرتی لیکن ماموں اور ممانی سے ملاقات کے بعد تمہارا پول کھل گیا۔“

نانکھ حیرت بھرا چہرہ لیے سب کچھ سن رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر استہزاءیہ لہجہ میں بولی۔ ”تمہیں سب کچھ غلط بتایا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں اسکول کے دور میں طاہر کو پسند کرتی تھی لیکن اچھے دوست کی طرح۔ ہمارے درمیان محبت بھرا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ دراصل وہ پڑھائی میں بہت لائق تھا اس لیے مجھے اس کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اس ضرورت کو شاید ڈیڈی نے غلط رشتے کا نام دے دیا۔ میں ان سے بعد میں بات کروں گی۔ پچاس کروڑ کی رقم مجھے واقعی ابھی تک نہیں ملی ہے لیکن وہ اکاؤنٹ نمبر بے گتے ہیں۔ اس لیے جلد رقم منتقل ہو جائے گی۔“

میں نے چائے کا کپ ختم کیا اور میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال جو بھی سچ یا جھوٹ ہے۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں چند دنوں کے بعد امریکا جانے والا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں شادی کر لوں۔ مجھے پیشگی کی اشد ضرورت ہے اور وہ مجھے شادی کے بغیر نہیں مل سکتی۔ میری تم سے درخواست ہے کہ میرے بعد والدہ کا خیال رکھنا، میں جلد انہیں بھی وہاں بلا لوں گا۔“

نانکھ کے چہرے کے تاثرات میں تغیر پیدا ہوا۔ وہ سکتے کے عالم میں کافی دیر مجھے دیکھتی رہی پھر افسردہ لہجہ میں بولی۔ ”پچھو کی تم فکر نہ کرنا۔ میں انہیں اپنے ساتھ یہاں

گھر بھجوا دیا۔

☆ ☆ ☆

میں امر کیا آگیا۔ اگلے پچھلے میں نے پشٹانی کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس کا حصول اتنے آسان نہیں تھا۔ اس میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔ تاہم میرے وکیل نے مجھے ورک پر مت دلادیا اور میں نے خون ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹری میں کام شروع کر دیا۔ یہاں سے مجھے غنی تنخواہ ملتی تھی۔ وہ میں وکیل کی نذر کر دیا کرتا تھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد میری والدہ سے فون پر بات چیت ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ نالکہ شادی کر رہی ہے۔ میرا خورن کھولنے لگا۔ اس نے دوسری دفعہ میرا دل توڑا تھا۔ حالانکہ ہمارے درمیان کوئی وعدہ یا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ دن انتظار نہیں کیا تھا۔ دو شادی کے لیے بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی صرف ایک ماہ ہی تو گزرا تھا۔ اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ بہر حال والدہ نے مزید بتایا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اگر وہ نہ تھکے تو نہ ملے۔ واپس آ جاؤں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا اور انہیں دلدادہ بننے کے لیے بتایا کہ میں کچھ دنوں کے بعد واپس آنے کی کوشش کروں۔ لیکن صرف چند دن کے لیے اور ہو سکا تو انہیں اسے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے فون پر کہہ دیا۔ یہاں ان کا علاج کر دیا گیا۔ انہوں نے فون پر کہہ دیا۔

میں افسردہ ہو گیا۔ نالکہ کی وجہ سے میری ماں مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ اس کے خلاف میرے دل میں نفرت مزید بڑھ گئی۔ میں نے اپنے دوست کا نمبر لیا اور اس سے ایک دفعہ پھر قاتل کا نمبر لینے کے بعد رابطہ کیا تو کچھ دیر کے بعد دوسری جانب سے کرخت آواز سنائی دی۔

”ہوم ڈیپارٹمنٹ۔۔۔ کہیے آپ کو کیا مسئلہ درپیش ہے۔ ہم اسے حل کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

میں نے رد لکھ میں پوچھا۔ ”کیا یہ نمبر محفوظ ہے۔“

میرے سوال کے ساتھ جوابات کرنا چاہتا ہوں۔ ”آپ بے فکر ہو کر رہیں۔ یہ نمبر بالکل محفوظ ہے۔ اس فون کال کو میرے دفتر ہمارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔“

میں نے اسے بتایا۔ ”میرا جی محبوبہ کو قتل کر دیا چاہتا ہوں۔ اسے قتل کر دے گا۔ وہ تمہارے اکاؤنٹ میں قاتل ہے۔“

آواز سنائی دی۔ ”مجھے پانچ لاکھ کی رقم دے دو۔“

رقم کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتے ہی میں تمہاری محبوبہ کا کام

تمام کر دوں گا۔ تاہم جو بھی فیصلہ کرنا اچھی طرح سوچ کر کرنا۔ معاہدہ طے ہو جانے کے بعد دوبارہ فون نہیں ہوگا۔“ اس نے مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھوا دیا اور میں نے اسے بتایا کہ میری محبوبہ کا نام نالکہ احسان ہے۔ وہ ساحل سینا کی کونسی نمبر سترہ سترہ رہتی ہے۔ اس کے ہمد میں نے قاتل کے ساتھ اس کا طبع بیان کر دیا۔ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”کیا اس کی تصویر دستیاب ہو سکتی ہے۔ ہم اس کے مطابق پتہ میں کسی اور کو قتل نہ کر دیں؟“

اس کی بات میں وزن تھا۔ کام مکمل ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا دوست کل اسے تصویر ارہال کر دے گا۔

دوسری جانب سے سمجھ بھگتے سمجھ میں بتایا گیا۔ ”لیکن یہ سب رقم ملنے کے بعد ہوگا۔ اس سے پہلے میں کچھ نہیں کروں گا۔“

میں نے اسے یقین دہانی کرائی کہ ”فون بند کرنے کے بعد فوراً بعد رقم ملے گا۔ اکاؤنٹ میں منتقل کر دوں گا۔ لیکن اگر اس نے دھوکا دینے کی کوشش کی تو ملک میں میری اچھی خاصیت جان بچان ہے۔ وہ بچ کر بھاگ نہیں سکے گا۔“

دوسری جانب غصے بھرے انداز میں ریسورس کر دیا گیا اور میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے کے بعد میں نے اپنے ہی دوست کو جیسا کہ مجھے قاتل کا نمبر دیا تھا۔

اسے کہا۔ ”وہ والدہ کے پاس ملے اور میرا والد نے بٹے کے بعد نالکہ کی تصویر حاصل کرنے کا سونپ دے آئے۔“

میں نے معاملے کے منتقل پوچھنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دیا کہ بعد میں تفصیل کے ساتھ بتا دوں گا۔ اس وقت میں نہیں۔“ اور فون پرز کرنے کے بعد پانچ لاکھ کی رقم قاتل کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کے لیے بینک کی طرف چل دیا۔

میں اب بالکل بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نالکہ نے میرے ساتھ جو بھی کیا تھا، اس کی سزا اسے ملنا ہی چاہیے تھی۔ میں نے جتنی فیصلہ کر لیا تھا اور اب مجھے پشیمانی کے لیے

تک و دو کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ لڑکی سے شادی کرنے کے بعد اس سے طلاق لے لوں گا۔ اسی لڑکیاں یہاں لاکھوں کی تعداد میں مل جاتی

تھیں۔ جو کچھ رقم لینے کے بعد پھر میرج کرتی تھیں اور پھر بعد میں شوہر سے طلاق ہو جاتی تھیں۔ بہر حال میں نے رقم

مطلوبہ اکاؤنٹ میں منتقل کر دی اور کچھ دیر بعد مجھے میرے دوست کا فون موصول ہوا کہ اس نے نالکہ کی تصویر حاصل



گے کہ قدرت میرے ساتھ بہت کبیر قسم کا مذاق کرنے پر
بری طرح تکی ہوئی تھی۔ وہ خط والدہ صاحبہ کا تھا۔ میں نے
جب اسے کھولا تو پڑھنے پر ہم کا دھماکا ہوا اور میرا سب کچھ
تباہ ہو کر رہ گیا۔ میں آپ کو خد سنا سنا ہوں۔ لکھا تھا۔

”میرے پیارے بچے!

تمہیں شاید آخری خط لکھ رہی ہوں۔ میری طبیعت
بہت خراب ہے۔ جب تمہیں خط موصول ہوگا تو شاید میں
اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔ جانے سے پہلے کچھ سچائیوں پر
سے پردہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔
کچھ دن پہلے نائلہ میرے پاس آئی تھی اور اس نے اصرار کیا
تھا کہ میں تمہیں اس کی جھوٹی شادی کی خبر دوں۔ تاکہ تم اس
سے بات چیت کرنے کے لیے ملک واپس آ جاؤ۔ میں خود
بھی یہی چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم اس سے دور پردہ اب
بھی محبت کرتے ہو۔ اس لیے اس کی شادی کاٹن کر تڑپ کر
واپس آنے کی کوشش کرو گے۔ میں نے خبر تم تک پہنچا دی۔
لیکن تم واپس نہیں آئے۔ وہ اب بھی تمہاری منتظر ہے۔ خدا
کے لیے واپس آ جاؤ۔ اگر میرے لیے نہیں تو اس کے لیے
ہی آ جاؤ۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا
چاہتی تھی لیکن تمہارے والد صاحب نے اسے مجبور کیا تھا کہ
وہ تمہیں انکار کر دے اور کسی اور کے ساتھ شادی کر لے۔
اس نے جلالت کے عالم میں طاہر سے شادی کر لی۔ اور طاہر
نے اس کی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اگر حازہ نے میں اس
کی موت واقع نہ ہوتی تو شاید وہ نائلہ کو مار دیتا۔ اس نے
مرنے سے پہلے اپنا سب کچھ گردی رکھ دیا تھا۔ لیکن اب
نائلہ کے اکاؤنٹ میں طاہر کے قاتل کی جانب سے پچاس

کرنے کے بعد قاتل کو بھجوا دی ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں اسے
مل جائے گی اور یہ کہ اس نے تصویر کے پیچھے ایڈریس کے
علاوہ میرا نام بھی لکھ دیا ہے تاکہ قاتل کو معلوم ہو جائے کہ
تصویر میری جانب سے ارسال کی گئی ہے۔ میں نے فون
رکھ دیا۔ اب میں فارغ ہو چکا تھا اور مجھے نوکری کے علاوہ
اور کچھ نہیں کرنا تھا۔

وہ ہفتہ کیسے گزرا، میں آپ کو بتا نہیں سکتا ہوں۔ بس
میں شش و پنج میں مبتلا رہا۔ کسی کو سزا دینے کے لیے یہ
ضروری نہیں تھا کہ اس کی زندگی کو چھین لیا جائے۔ لیکن اب
کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ معاہدے پر اشرار کی اتنی مہر پانچ
لاکھ کی رقم قاتل کے اکاؤنٹ میں منتقل ہونے کے بعد لگ
چکی تھی اور اس سے اغراف اب ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں اب
اپنے فیصلے پر تادم تھا۔ اس وقت جذباتی ہو کر میں نے قاتل کو
فون کر دیا تھا اور اب جب حالات کچھ نارمل ہوئے تو مجھے
افسوس محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنے اسی دوست کو فون کیا
جس نے مجھے قاتل کا نمبر دیا تھا اور اسے بتایا کہ میں
معاہدے کو منسوخ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس نے بھی مجھے لگا
سا جواب دیا کہ اب یہ ممکن نہیں۔ رقم منتقل ہونے کے بعد
واپس نہیں مل سکتی۔ اب نائلہ کو مل ہو جائی ہو گا۔ میں نے
فون رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ یہ مجھ سے مجھے کے عالم میں کیا
فلطی سرزد ہو گئی تھی۔ مجھے اتنی سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا
چاہیے تھا۔ اس نے شادی ہی تو کر۔ نہ کی کوشش کی تھی اور وہ
اس کا حق تھا۔ تاہم پہلے اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا۔ میں
بچ اور بھوت کے گرداب میں پھنس کر اسے گنوا بیٹھا تھا پھر
بہنے کی رات آ گئی۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ یہ رات
انہی طوین ہو جائے کہ صبح ہی نہ ہونے پائے۔ لیکن اس سے
کیا ہو جاتا۔ مرنا تو اسے تھا ہی۔ اور موت بھی غیر فطری تھی
جبکہ قصور دار میں تھا۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ نیند
میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پہلے رات کا ایک بچا اور
پھر نورانی دو بج گئے۔ میں سوئیں نہ سکا۔ اس رات جھلی دفعہ
میں نے شراب پی اور تین بجے سے پہلے بے سدھ ہو کر
زمین پر گر گیا۔ رات گزر گئی اور ساتھ میں میری زندگی
بھی۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے
میں نے زندہ لاش کی صورت اختیار کر لی ہو۔ میرا کام کرنے
کا دل نہیں کہتا تھا۔ میں نے فون کر کے آفس سے بعض
لے لی اور سٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ دد بچے کے قریب
ڈور بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تو سامنے کوریئر کھڑا تھا
اس کے ہاتھ میں میرے لیے ایک خط تھا۔ آپ یقین کریں

کروڑ کی خلیفہ رقم منتقل کر دی گئی ہے۔ میں ایک ماں ہونے کے باوجود بھی تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اس سے شادی کر لو۔ اور ہمیشہ کے لیے ملک واپس آ جاؤ۔ نائلہ کے علاوہ میں بھی تمہاری منتظر ہوں۔ ایک دفعہ پھر بتا دوں کہ اس نے تمہارے جانے کے بعد شادی نہیں کی۔ وہ آج بھی تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔ جلد واپس آ جاؤ۔

تمہاری والدہ۔“

میرے ہاتھوں سے خلع چھوٹ کر نیچے گر گیا اور سر میں زور کا چکر آیا۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ غیر متوقع طور پر ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اگلے دن ہی نوکری چھوڑ دی اور واپسی کی ٹکٹ کروالی۔ پھر مجھے ماموں کا فون موصول ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ والدہ کی موت واقع ہو گئی ہے اور اگلے دن دوپہر کو ان کا جنازہ ہے۔ میں نے ماموں سے درخواست کی کہ اگر وہ مغرب تک میرا انتظار کر لیں تو میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔

ماموں بولے۔ ”اگر تم شام تک نہیں آئے تو عشا کے بعد ہم میت کو دفن کر دیں گے۔“ میں نے فون رکھ دیا۔ میری سیٹ شام کی فلائٹ میں ریزرو تھی۔ مجھے تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا سب کچھ تیار و برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے فلیٹ کا کرایہ ادا کیا اور شام کی فلائٹ پکڑ کر ملک واپس آ گیا۔

☆☆☆

ماموں کے گھر میں کھرام مچا ہوا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون تعزیت کے لیے آ رہا ہے اور کون واپس جا رہا ہے۔ بس قیامت کا سماں تھا۔ دو تین دن یونہی گزر گئے۔ پھر میں اپنے گھر آ گیا۔ اب مجھے روہ کر نائلہ کا خیال آ رہا تھا۔ اگر اسے قتل کر دیا گیا تھا تو پھر ماموں اور ممانی کو مجھے بتانا چاہیے تھا لیکن انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے دوست کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے نائلہ کے متعلق دریافت کیا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ چند دنوں کے لیے ملک سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے اسے کچھ بھی خبر نہیں ہے کہ اس کے پیچھے بعد میں کیا ہوا۔

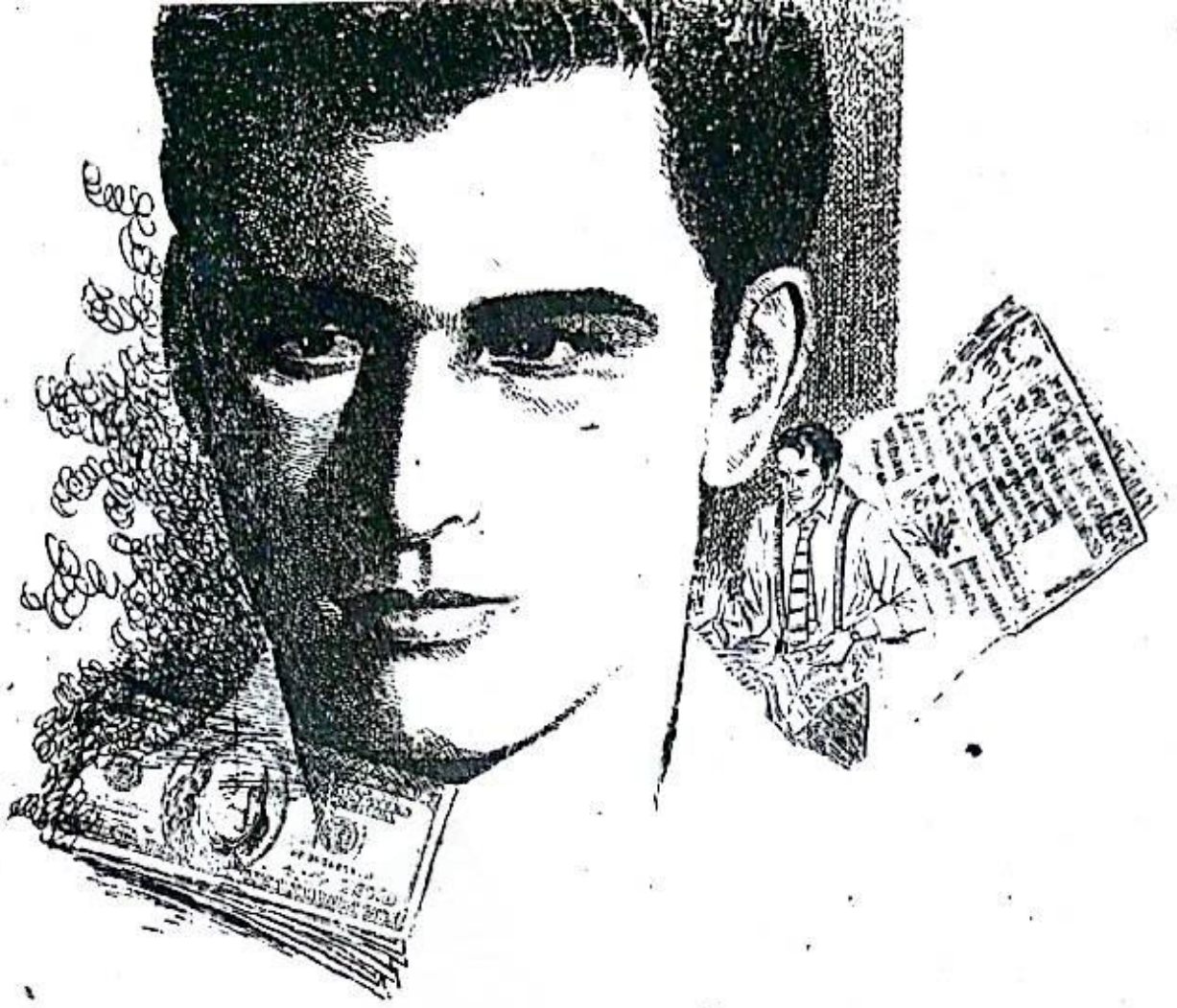
میں نے اس سے کہا۔ ”وہ جلد از جلد معلوم کر کے بتائے کہ نائلہ زندہ ہے یا پھر قتل کر دی گئی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے والدہ کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ میں یہاں سے دور چلے جانا چاہتا تھا لیکن امریکا سے میں بدخون ہو گیا

تھا۔ وہاں منتقل ہونے کی کوشش نے مجھے ماں سے دور کر دیا تھا اور میں بیماری کے دنوں میں ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکا تھا۔ تاہم میرے پاس کافی رقم جمع ہو گئی تھی۔ میں گھر کو بیچ کر بے آسانی کسی اور شہر میں منتقل ہو سکتا تھا۔ یہاں پر والدہ کے علاوہ نائلہ کی یادیں بھی تھیں جو مجھے جینے نہیں دیتیں۔ میں انہیں نہیں دفن کرنے کے بعد دور چلا جانا چاہتا تھا۔ شام کو میرے دوست کا فون آیا اور اس نے مجھے جو کچھ بتایا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آیا۔ شاید آپ کو بھی یقین نہ آئے۔ میں کتنی ہی دیر ریسیور پکڑے اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور پھر جب میرے دوست کی آواز کالوں میں گونجی تو ہڑبڑا کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ وہ میرے خاموش ہو جانے پر پریشان ہو کر خیریت دریافت کر رہا تھا۔

میں نے اسے بتایا۔ ”مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا۔ اس لیے وہ مجھے معاملے کے متعلق دوبارہ بتائے۔“ اس نے مجھے جو کچھ بتایا، وہ آپ بھی سن لیجیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں جب اجرتی قاتل کے ٹھکانے پر پوچھ کچھ کے لیے گیا تو وہاں حالات بدل چکے تھے۔ اس کے وسیع و عریض مکان کو گرایا جا رہا تھا۔ کیونکہ زمین قبضے کی تھی۔ میں نے قریب کھڑے ہوئے تماشاخیوں سے معاملے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ پچھلے جمعے کو قاتل کو ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ غیر متوقع طور پر مر گیا۔ چونکہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور مکان کو گرا دیا گیا ہے۔“ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بخت کی رات نائلہ کو قتل کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا اور جمعے کی رات کو قاتل کی موت واقع ہو گئی۔ تو پھر اس کا مطلب تھا کہ نائلہ زندہ تھی تو پھر ماموں کے گھر میں میری اس سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں عورتوں کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ میری ملاقات تو ممانی سے بھی نہیں ہوئی تھی اور چونکہ میں نائلہ سے ناراض تھا اس لیے اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور میں نے ریسیور رکھنے کے بعد نائلہ کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے کال ریسیو کی اور میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے ملاقات کے لیے آ رہا ہوں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی خوشی تھی جو مجھے نصیب ہوئی تھی اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اہتمام کے ساتھ تیار ہونے لگا کیونکہ ترے مینوں والی میری منتظر تھی۔

❖❖❖



مفرور

ڈاکٹر حامد حسن

اسلامی ذہن کو سمجھنا آسان نہیں... ایک ایسے ہی شخص کی یاد... جس کا ذہن ہمہ وقت کسی نہ کسی منصوبے کی منت میں الجھا رہتا تھا... وصال کی ہوس تھی... طلب کا شہہ تھا جس نے اس کا حشر تمام کر دیا تھا...

سفاک مجرم کی قید سے فرار ہو جانے والے مفرور جوان کا معاملہ

جس طرح دنیا فانی ہے اسی طرح ابلاغیات کی دنیا میں 'خبر' بھی فانی کہلاتی ہے۔ چاہے وہ سوشل میڈیا ہو، پرنٹ میڈیا یا میڈیا کی کوئی بھی قسم، ایک خبر کی زندگی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کرائم رپورٹر ڈینی جاسن جانتا تھا کہ گیارہ وحشت ناک قتل کرنے کے باوجود جیسفری ڈامر ہفتے کے سات دن تک خبروں کی زینت نہیں رہ سکتا۔ اب ڈامر اس کے فتنے لگا تھا تو وہ کوئی ایسا نگینہ تلاش چاہ رہا تھا جو اخبار کے پہلے صفحے کی زینت بن سکے اور یہ نگینہ ٹریسی

جاسوسی ڈائجسٹ 159 جولائی 2025ء

ایڈورڈ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہو لا۔

”پچاس ڈالر کا کیا کرو گے؟“ اس کے لہجے سے لالچ لپک رہا تھا۔ ”وینے کس سے یہاں اخباری رپورٹرز کا میلنگ رہا ہے۔“

ڈینی دوسرے رپورٹرز کا کہن کر حیران ہو گیا کیونکہ اسے پچھلے تین چار گھنٹوں میں ایک بھی رپورٹر نظر نہیں آیا تھا۔

”تو کیا کوئی رپورٹر ایڈورڈ سے ملے گا ہے؟“ اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”وہ کہاں، وہ تو کس سے فرار ہو گیا ہے۔ میں تو ڈامر کی بات کر رہا ہوں۔ جب سے وہ گرتا ہوا ہے، یہاں رپورٹری رپورٹر پھر رہے تھے۔“ جانسن نکر وہ منی کے ساتھ ہوا ڈینی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی اہمیت جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

”مجھے یہ بتاؤ ایڈورڈ سے کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے؟“ ڈینی نے فحشی سے سوال کیا تو وہ مشکل ہوا بیلا۔

”پچاس ڈالر.....!“ ڈینی نے پچاس ڈالر اس کی طرف بڑھائے تو وہ..... لورا، پھوٹ کر اپنی جینز میں ٹھونکتا ہوا ہوا۔

”میں جانتا ہوں کہ ایڈورڈ شراب کے نشے میں کہاں ہے، جوش پڑا ہوگا۔ وہ دو سال پہلے یہاں آیا تھا۔ شاید کسی لڑکی کو تنگ کرنے یا چھیڑنے پر اسے سزا ہوئی تھی۔“ ڈینی نے ایک سیسے میں فیہ نہ کیا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے ہوا۔

”بدمیرا نمبر لو اور ایڈورڈ کو براپیٹام دے دو کہ ایک ہزار ڈالر کے عوض میں اس کی کہانی سننے کو تیار ہوں۔ اگر وہ دیکھی رہے تو مجھے سے رابطہ کرے۔“ اسے یقین تھا کہ دولت سے کچھ بھی خریدا جاسکتا ہے اور پھر دو گھنٹوں بعد ہی اس نے ہوٹل میں ٹرٹسی ایڈورڈ کا فون ریسیو کیا جو تھوڑے سے رتو بدل کے، ساتھ یعنی پانچ سو ڈالر ایڈورڈ اس اور پانچ سو ڈالر انٹرویو کے بعد لینے پر راضی ہو گیا۔ اسے بھی اپنی کہانی سنانے کی ہمدید ہے چھٹی تھی۔

ڈینی نے ٹکا گواپے آفس رابطہ کر کے پورا صورت حال بتادی۔

اگلی صبح ایک نوٹوگر فراس کے ہوٹل پہنچ گیا۔ ڈینی نے فیصلہ کیا تھا کہ ایڈورڈ کی کہانی آپ جتنی کے طور پر ترتیب دی جائے گی اور اس آپ جتنی کے دوران ایڈورڈ کی غیر رسمی نوٹوگرافی کر جائے گی۔ سزاؤں بچے تک اس نے

پہلا دن اخبار ڈامر کی خبروں سے تقریباً بھرا ہوا تھا۔ انہی خبروں میں ایک جھوٹی سی خبر ٹرٹسی ایڈورڈ کے فرار کی تھی۔ ڈینی کے نزدیک یہ ایڈورڈ ہی تھا جو ایک ہفتے بعد پہلے صفحے کی زینت بن سکتا تھا۔ ورنہ ڈامر تو چند دنوں کا ہوا تھا۔ اس ڈامروں کی تفصیلات ابھی معلوم ہو رہی تھیں۔ کیونکہ اس کے اپارٹمنٹ سے ملنے والے اعصاب سے متاثرین کی شائستہ کاٹل جاری تھا۔ تقریباً تمام رپورٹرز یا تو ڈامر سے ملنے کے پھر میں تھے یا پھر منتقلین کے دروازے انٹرویو کر رہے تھے۔

ٹرٹسی ایڈورڈ وہ شخص تھا جو ڈامر کے اپارٹمنٹ میں نئی کھینے گزرا کر اس کی زینت، ناک گرفت سے فحش نکلتا تھا۔ ڈینی کے نزدیک ایڈورڈ کا صورت کی آغوش میں گزرا ہوا وقت ہی پہلے صفحے کی زینت بن سکتا تھا اس لیے وہ ایڈورڈ کی تلاش میں اس علاقے میں جا پہنچا۔

بار میں سٹگن۔ پینے کی ناکام کوشش سے ایویس ہو کر وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک ڈاکے نے اس کا راستہ روک لیا۔ دو پیگ اور پانچ ڈالر کے عوض وہ ڈینی کو ٹرٹسی ایڈورڈ کے اپارٹمنٹ لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

یہ نچلے طبقے کی کلرڈ افسل آبادی تھی جہاں زبہ نہ لکڑی کے دو منزلہ اپارٹمنٹس کے درمیان کچھ ہینڈ ٹرائٹس موجود تھیں۔ ڈاکے نے ڈینی کو ایک خستہ حال اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچایا اور ثبوت کے طور پر ٹرٹسی ایڈورڈ کے نام کا نیل باکس دکھا کر چلتا ہوا۔ تین چار گھنٹے انتظار کے باوجود ٹرٹسی ایڈورڈ وہاں دکھائی نہ دیا تو ڈینی نے ارد گرد گزرنے والوں سے پوچھنے کا ٹھانی۔ اس دوران اسے علاقے کی تفصیلات سے مل آگئی ہو چکی تھی اور وہ کسی معمولی اچھے یا آوارہ لڑکوں سے کچھ پوچھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک مینے شارت کے کتھن میں وردی پوش خاکروب نظر آیا جو اسے مناسب معلوم ہوا تو وہ پچاس ڈالر کا نوٹ نکال کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”میں کافی دیر سے آپ کو ایڈورڈ کے اپارٹمنٹ کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور پتا نہیں کہ آپ یا تو ٹرٹسی ایڈورڈ ہیں یا کوئی رپورٹر؟“ ٹکی جینز، بے بازو شرٹ اور بڑی سی توند والے جانسن نامی خاکروب نے پچاس ڈالر کا نوٹ ہمدید سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹرٹسی ایڈورڈ سے کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے؟“ ڈینی نے سوال کیا تو وہ اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتا ہوا

فوٹو گرافر کے ساتھ مل کر تمام تیاریاں مکمل کر لیں۔

☆☆☆

ایڈورڈ پانچ فٹ پانچ انچ کا سٹول آدمی تھا جس کا وزن ڈیڑھ کے اندازاً ۷۰ کلو کے مطابق اتنی کلو کے ٹک ہٹک ہو گا۔ جب وہ ہوٹل پہنچا تو سفیدی شرٹ، پیٹ، جوگر، ہار جی ڈکن ٹیبل کی جڑی اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہائیکر، سان کا ہے اور ایک فوجی کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جوان بھی تھا جسے اس نے جیری کے نام سے متعارف کرایا۔ ایڈورڈ نے آتے ہی ناشتے، کافی اور مگریت کا مطالبہ کیا۔ جب کمرے کے دوسرے حصے میں فوٹو گرافر اپنے غلی اسکو پک حد سے کی مدد سے اس کی تصویریں بنانا ہوا تھا۔

ایڈورڈ ایک سلجھا ہوا اور سیرھا شخص تھا۔ وہ اس وقت بلیٹ کے ہال کمرے میں بیٹھتے تھے۔ میز پر کافی کے کپ، انش ٹری، اخبار اور ٹیپ ریکارڈرز رکھے تھے۔ ساتھ ٹیبل پر ایڈورڈ اور جیری کے ماف۔ کردہ ناشتے کے خالی برتن موجود تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک بڑائی وی تھا جس پر خبروں کا ایک جھیل ہے، آواز چل رہا تھا۔

ڈینی کا ٹیپ ریکارڈر ایڈورڈ کو سو ڈالر کے پانچ نوٹ دینے کے بعد چلتا شروع ہو گیا۔

”ابتداء سے شروع کرو، ایڈورڈ!“ ڈینی نے کہا۔ ”جو کچھ تمہیں یاد آئے، کہہ ڈالو۔ اگر کچھ رہ گیا تو ہم بعد میں پوچھ لیں گے۔“

ایڈورڈ نے نوٹوں کو رول کر رہے ہوئے چیٹ کی جیب میں ٹھوسا اور کرسی کی پشت سے ٹک کر گہرے سانس لینے لگا۔ مانتے ہاتھوں میں سگریٹ، منہ لالے ہوئے اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر سوچوں کے مڑبڑنے الفاظ کا روپ دھارنے لگے۔

”میں دو دن سے سو نہیں سکا!“ ایڈورڈ کے الفاظ کمرے میں گونجے۔ ”مجھے اب ہر ایک یقین نہیں ہو رہا کہ یہ سب سنا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے ایک شیطان کی آنکھوں میں اپنے بے بھابک موت رکھی ہے۔“ اس نے بیک اور گہری سانس لی اور بولا۔

”یقین کرو مجھے خدا نے اس شیطان کے پنجے سے نکالا ہے۔ میں ابھی تک مبہوت ہوں۔ جب بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں رات بھر لگتی لگتی دھماکی دیتی ہے اور میں پیچھے میں شربازہ، گھبراہٹ کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔“ وہ ایک

لمحے کو رکھا اور سگریٹ کے دو تین تھرے کش لیتے لگا۔

”میں شاپنگ مال میں تھا جب مجھے ڈاٹر مار اور پارٹی کے لیے بلانے لگا۔“ ایڈورڈ ڈبیر سارا حواں اگرا ہوا بولا۔ ”ہم سب کھلے، الے اسے باسے ہیں۔ لیکن کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ پاگل بھی ہے۔ میرے لیے بگو وہ ایک عام شخص تھا۔ ہم نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ چلی ہے، اور وی کا شکار ہے۔ اگر ایسا داتا تو اس کے سامنے اسے کبھی برداشت نہ کرتے۔ لوگ، ایسے کسی شخص کو یہاں چھکنے نہیں دیتے۔“

”بارہا علاقہ خنڈوں اور بد معاشوں کا ہے لیکن جنسی بے راز روی، خاص طور پر، جنس پرستی تو کبھی کو بول نہیں ہے۔ میرے خیال میں کسی کو علم میں تھا کہ وہ اگر ابد عادت کا شکار ہے تو وہ شاید زندہ ہی نہ رہتا۔“ ایڈورڈ نے آخری جملے پر زور دیتے، اے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ ”نیکہ، بیٹی اس کے تجربے پر حیران ہو رہا تھا۔“

”ہم کچھ لڑکیوں کے ساتھ جھیل پر چل کر پارٹی کریں گے بس!“ ڈامر نے کہا تھا، میرے پاس سو ڈالر ہیں میں شراب خرید لیتا ہوں۔ میں راضی ہو گیا۔ ”ایڈورڈ کدھے اچکا تا ہوا بولا۔“ کیونکہ مجھے آئیڈیا اچھا لگا تھا۔ گرمی کے سخت موسم میں جھیل کنارے ایسی جگہ تھی۔ اسے ازار ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے جا کر شراب بھی لے لی۔ ڈامر نے کہا کہ اسے اپنے اپارٹمنٹ میں کچلے، بدلنے ہیں، اس کے بعد چلتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنی بیٹی کی دلدی میں تھا۔“

اسی وقت دو روزے پر دسکے ہوئی اور لچاتی طور پر انٹرویو کر گیا۔ پورا ایڈورڈ کی اور سگریٹ لایا تھا۔ میرے کے جانے پر اپنی کرسی کی طرف واپس آتے ہوئے ڈینی کو یقین ہو گیا کہ ایڈورڈ اپنی رکات کے سطلے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ ایڈورڈ، معلوم تھا کہ ڈامر اسے کس لیے اپنے اپارٹمنٹ لے کر جا رہا ہے۔ مام زخم اسے اس اس ضرور تھا کہ اسے سانحہ لے جانے کا شہدہ رہا ہے۔ یہ بزر بات ہے کہ اسے اپنے سے پیلا، والے گیارہ ٹوکوں کا علم نہیں تھا۔ جو ڈامر کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں گئے تھے۔ اگلے کچھ گھنٹوں میں ڈینی کا یہ انداز اور رات ثابت ہوا۔

جب ڈامر شاپنگ مال میں ایڈورڈ سے ملا تو اسے معلوم تھا کہ ایڈورڈ نیگ اس سے ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کے بعد یہاں آیا ہوا ہے۔ لیکن شاپنگ مال میں دونوں ہی ایک دوسرے کے انجام سے بے خبر تھے۔ ڈینی یہ سوچ رہا تھا کہ ایڈورڈ بھی کسی بے راہ روی کا شکار ہے۔ یقیناً وہ ڈامر کی شراب و شہابیہ کی آخر کے پس پردہ ارادوں سے

جولائی ۲۰۲۵ء

باخبر بھی تھا۔
واپس کرسی نہیں ہو کر ڈینی، ایڈورڈ اور جیری کو کافی
ایڈیل کر اس میں ڈیر ساری چینی ڈال دیکھنے لگا۔ چینی اور
کریم ڈال کر انہوں نے آپس میں جھجھکرائے اور چینی کس
کرنے لگے۔

”کافی گرمی ہو رہی تھی!“ ایڈورڈ نے نئے لائے
پکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر ساگاتے ہوئے کہا۔
”سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں
رہتا ہے۔ لیکن پہلی نظر میں مجھے وہ جگہ اچھی لگی تھی۔ ہم دو
منزلہ اپارٹمنٹ کی عقی میز میوں تک پہنچے تو عجیب سی بو نے
ہمارا استقبال کیا۔“
”اف! کتنی بو ہے؟“ میں نے کہا تو ڈامر نے
سیورج کی خرابی کا کہہ کر توجہ ہی نہ دی۔

ہم ہال میں پہنچے تو سزاند نے میرے گلے کو جکڑ لیا۔
ایڈورڈ کا چہرہ شکن آلود ہو گیا۔ ”میں نے اسے کہا کہ جلدی
سے بوتل اٹھاؤ اور نکلویہاں سے۔ جواب میں وہ بولا، ٹھیک
ہے، میں خود بھی مشکل محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے سیورج
والوں کو گالیاں بھی دیں۔ گٹروں کی غلاقت کے بارے
میں اچھی طرح علم ہونے کے باوجود میں اس وقت، اس پر
تصنیم کر بیٹھا۔“ ایڈورڈ نے اپنی کرسی پر آگے جھکتے ہوئے
کہا۔ اس کی آواز ڈرامائی انداز میں دھیمی ہو گئی تھی۔ ڈینی کو
احساس ہوا کہ وہ سب اس بیان سے مسکور سے ہو رہے
تھے۔ نو نو کر افر تو بولنا بھول کر بیڈ کے کونے پر بیٹھا سب
کچھ سنے جا رہا تھا۔

”اس کے چھوٹے سے یونگ روم میں اے سی کی
جھنڈناٹ گونج رہی تھی۔ گہرے رنگ کے پردے کمرے
کو باہر کی روشنی اور گرمی سے پاک کیے ہوئے تھے۔ ہم نے
کاؤچ پر بیٹھ کر بیڑ کی بوتل کھول لی۔ خوش رنگ مچھلیوں کا
ایک چھوٹا سا ایکویریم اس اندھیرے کمرے میں تازگی
بخش تھا۔“ ایڈورڈ نے ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔
”میری آنکھیں اس اندھیرے میں اچھی طرح دیکھنے لاق
ہوئیں تو مجھے دیواروں پر درزشی نوجوانوں کی تصاویر نظر
آئیں۔“ ایڈورڈ کا لہجہ چانک تیز ہو گیا۔ ”میرا خیال تھا کہ
ڈامر جلدی سے کپڑے بدلے گا تو ہم نکل جائیں گے۔
کیونکہ وہ بڑی ناگوار سی بو بھی جو بہت برائتاڑ دے رہی تھی۔
ڈامر نے بتانا شروع کر دیا کہ یہ ساری تصاویر اس
لیے لگائی ہیں کہ وہ بھی ایک جم کا ممبر ہے۔ ویسے وہ واقعی
درزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے بازو سڈول اور سخت تھے۔

ہم دونوں کا کاؤچ کے مختلف سروں پر بیٹھے تھے۔ لیکن چھوٹے
کاؤچ کی وجہ سے ہمارے درمیان اتنا فاصلہ نہیں تھا۔ اس
نے مچھلیوں کے بارے میں بتانا شروع کیا اور اپنے فوج
کے دنوں کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ایڈورڈ کی آواز پھر
سے خوابناک ہونے لگی۔

”اگر بیڑ کا لالچ نہ ہوتا تو میں اتنا تو بور ہو ہی چکا تھا
کہ اسے پیٹ ڈالنا بلکہ میں یہی سوچ بھی رہا تھا۔“ ایڈورڈ
کی آواز میں غصہ چھلکنے لگا۔ ”لیکن وہ اتنا تیز تھا کہ مجھے نہ دو
قدم آگے چل رہا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے
پلک جھپکتے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور اسی لم
میری چھاتی پر عین دل کے نیچے، بغل میں تیز دھار خنجر کی
نوک بھی چبھنے لگی۔“ ایڈورڈ نے اضطرابی طور پر اپنے دل
پر ہاتھ رکھا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔

”وہ بولا۔ اگر میرے کہنے پر عمل نہ کیا تو میں تمہیں
جان سے مار دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ کہنے لگا۔ میرے لیے
نئی بات نہیں، میں پہلے بھی کئی لوگوں کو مار چکا ہوں اور تمہیں
بھی..... چنگی بجاتے ہوئے بولا۔ ایسے ہی مار دوں گا!“
ڈینی کو ایڈورڈ کی فکر ہونے لگی کیونکہ اس کی سانس تیز
اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ڈینی کی نگاہیں اس کی تہا کو زدہ
انگیوں پر تھیں جو کپکپانے لگی تھیں۔ اس نے تھوڑا وقفہ کرنے
کا کہا تو ایڈورڈ نے انکار کر دیا۔

☆☆☆

”وہ ایک عسکری خنجر تھا، بھاری بھر کم، سیاہ دستے اور
لبے سے دودھاری چمک دار پھل والا خنجر!“ ڈینی، ایڈورڈ
کی یادداشت اور بیانے کی قوت سے متاثر ہو گیا۔ کیونکہ
اس سے اس کا اپنا کام آسان ہو رہا تھا۔

”اس کی دھار اس قدر تیز تھی کہ بال کی کھال تک
اتار سکتا تھا۔ میں اس خنجر کی شکل اور اس کا احساس کبھی نہیں
بھول سکتا۔“ ڈینی کو لگا جیسے وہ بھی نہیں بھلا پائے گا۔

”سب کچھ نہایت تیزی سے ہوا تھا کیونکہ وہ نہ صرف
تجربہ کار تھا بلکہ یقیناً کئی بار مشق بھی کر چکا تھا۔ میں ہاتھ میں
بیڑ کا گلاس پکڑے مچھلیوں کے ذکر پر انہیں دیکھنے کے لیے
گھبراؤں چنگ! پلک جھپکتے میری کلائی میں ہتھکڑی اور خنجر کی
نوک میرے جسم میں تھی۔ اپنا سینہ دیکھنے پر مجھے خنجر کی نوک
کے نیچے شرٹ بھی خون آلود ہوتی نظر آئی۔“ اس نے اپنی
شرٹ کے نیچے موجود پٹی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”اچانک اس کی آنکھیں مدھوش ہونے لگیں۔“
ایڈورڈ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”شاید خون کی جھلک

نے اس میں یہ تبدیلی بپا کی تھی۔

واپس آ کر ڈینی نے ایڈورڈ سے سوال کرتے ہوئے

سلسلہ جوڑا۔ اس ساری صورت حال میں تم مدد کے لیے کیوں نہیں چلائے؟ حالانکہ وہ عمارت گنجان آباد جگہ میں ہے۔ کیا تم نے چھپنے کی کوشش بھی کی تھی؟

ایڈورڈ کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ”میرے زخم سے خون بہنے لگا تھا۔“ اس نے بولنا شروع کیا۔ ”وہ خنجر بلیڈ سے بھی زیادہ تیز تھا۔ تمہیں علم ہونا چاہیے کہ جس جگہ وہ خنجر لگا وہاں مجھے اٹھارہ ٹانگے لگے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے چوں کرنے پر بھی وہ خنجر میرے سینے میں کھوپ کر مجھے مار دے گا۔“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پھر سے بولا۔ ”ڈامر نے مجھے کھڑا ہونے کو کہا اور پھر مجھے ہتھکڑی

ڈینی نے ٹیپ ریکارڈر پر نظر ڈالی۔ وہ اس انٹرویو کا ایک بھی لفظ مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فونو گرافر کھڑا ہو کر پوز دیکھنے لگا۔ جبری بھی پوری طرح متوجہ ’مزید‘ جانے کو بے تاب تھا۔

”پہلے تو میں اس کا سامنا ہی نہ کر سکا۔“ ایڈورڈ جو شیلے انداز میں بولا۔ ”لیکن پھر ہمت کر کے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ جیسے کہ میں اس شیطان کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ یہ ڈامر، مال میں ملنے والا آدمی نہیں تھا بلکہ ایک شیطان تھا۔ جس کی آنکھیں ہی اس کے قاتل ہونے کا بتا رہی تھیں۔

”میں جانتا تھا کہ میں مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی کہ یہاں پھیلی ہوئی کسی گٹر کی نہیں تھی، یہ موت کی بو تھی!“ ایڈورڈ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ڈینی کو بے اختیار سوچنا پڑا کہ کہیں ڈامر اس کی پشت پر تو نہیں آ گیا۔

”وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“ ایک لمحے کو تو مجھے لگا میں بہت بڑا ہی قوی ہوں۔“ اس نے آخری الفاظ بڑی تیزی سے ادا کیے۔ ”لیکن اگلے ہی لمحے احساس ہوا کہ اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سارا وقت موت کو سونگھتا رہا تھا اور وہ اب بھی میرے سینے پر خنجر جمائے میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔“

”میں نے مارشل آرٹس کی ٹریننگ لی ہوئی تھی اور جانتا تھا کہ اپنا خیال کیسے رکھتا ہے۔ لیکن وہ ایسا شیطان تھا کہ اس نے مجھے میرا دوسرا بازو ہلانے تک نہ دیا۔ بس کہتا رہا ’تمہیں مار دوں گا، شاباش دوسرا بازو آرام سے آگے لے آؤ‘ تاکہ وہ اس میں بھی ہتھکڑی لگا سکے۔ لیکن میں ممکن حد تک مزاحمت کر رہا تھا، لڑ رہا تھا۔“ وہ لاشعوری طور پر اپنے بازو کو اسی طرح ہلاتا ہوا اپنے جسم میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک احساس ہونے پر وہ رکا اور بولا۔

”ڈامر بڑے بیٹھے لہجے میں میری ہی موت کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔“ اسی لمحے فون کی گھنٹی نے کمرے میں موجود چاروں افراد کو ڈامر کے اپارٹمنٹ سے واپس حال میں متوجہ کیا۔ ڈینی نے جلدی سے فون اٹھا لیا۔ ایڈیٹر صورت حال کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

چند لمحوں میں ڈینی نے مختصر آیتا یا اور شام تک رپورٹ کرنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔ ایڈورڈ اور باقی دونوں افراد اس دوران خود کو سنبھالنے لگے۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سال کے لیے 12 ہزار سالانہ بشمول جرنل تک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے

بیرون ممالک کے لیے رسالہ 50,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا اشرف عباس

0334-5498977

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 یکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ - کراچی

سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف لے چلا۔ خنجر اب بھی میری بغل میں گھسا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا بھی کہ "میں مزاحمت نہیں کر رہا، مجھے تکلیف مت پہنچاؤ" لیکن وہ کوئی بات سنے بغیر مجھے اس دروازے کی طرف لیتا گیا کہ جہاں بیت ناک منظر میرا منظر تھا۔ "ڈینی دل ہی دل میں التجائیں کرنے لگا، تفصیل بتاؤ تفصیل!" اور ایڈورڈ نے اسے مایوس نہیں کیا۔

"بیڈ روم میں ادا سی اور خوف چھایا ہوا تھا۔ سر می دیواروں پر مردوں کی عریاں تصاویر آویزاں تھیں جن میں وہ مختلف حرکات میں مشغول تھے۔ میں نے ایسی چیزیں زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ لیکن میں زیادہ دیر تک نہ دیکھ پایا۔" ایڈورڈ نے کہا۔

"میرا ذہن خنجر سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا پھل آگ میں تپا ہوا لگ رہا تھا۔ اس پر جب بھی نظر پڑتی، یہ پہلے سے بڑا اور خوفناک محسوس ہوتا۔ اس دوران ڈامر کا ردیو عجیب سا ہورہا تھا۔ وہ کبھی سرشاری میں کراہنے لگتا تو کبھی سرد مزاج ہو جاتا۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر سے شیطانیت کا لبادہ اوڑھ کر مجھے دھمکانے لگتا کہ وہ مجھے مار کر میرا گوشت کھائے گا۔ وہ بار بار مجھے کہتا کہ کسی پر اعتماد نہ کرنا، لوگ اعتبار کے قابل ہی نہیں ہوتے۔" ایڈورڈ کا بیان کھانسی کی وجہ سے رک گیا۔ اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا، ذرا منہ بتایا اور اوپر دیکھنے لگا۔ ڈینی کو اس کی آنکھیں خوابیدہ سی محسوس ہوئیں جیسے وہ کسی اور دنیا میں گم ہو۔

"بیڈ روم میں قدرے تاریکی تھی جسے ایک کونے کا چھوٹا سا بلب اور دوسرے کونے میں موجود ٹی وی دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔" ایڈورڈ نے تفصیلات تازہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹی وی پر کوئی جادوگر اپنے کمال دکھا رہا تھا۔ ڈامر نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہ آج تک کی سب اچھی فلم ہے۔" اور مجھے ہنسی آنے لگی کہ یہ شخص خود کو بڑا فلم بین سمجھتا ہے۔"

"کمرے کی کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور مجھے ان پردوں کی رسی کے ساتھ سیکیورٹی الارم لگے دکھائی دیے۔ اس کمرے سے الارم بجائے بغیر کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ میں بڑی طرح پھنس چکا تھا۔ کیونکہ اس کمرے سے فرار واقعی ناممکن تھا۔ بیڈ شیٹ پر ایک بہت بڑا داغ تھا۔ میرے خیال میں یہ خون تھا جو اب گہرے بھورے رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔" ایڈورڈ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ "مجھے لگا میں حوصلہ ہار جاؤں گا۔ کمرے میں پھیلی بدبو، ٹی

وی سے آنے والی آوازیں اور ڈامر، یہ سب میرے ذہن پر سوار ہو رہے تھے۔ مجھے چکر سے آئے اور میرا سر گھومنے لگا۔ اچانک مجھے کچھ نظر آیا، بیڈ کے نیچے سے جھانکنا ہوا ایک ہاتھ! "خوف کے مارے ایڈورڈ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس لیے وہ ڈینی کا بے تابی سے فوٹو گرافر کو اشارہ کرنا نہ دیکھ سکا۔

"مجھے پورا ہاتھ نظر آ رہا تھا، تھوڑے سے بازو کے ساتھ صرف ہاتھ! پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ حقیقی ہوگا لیکن یہ کسی دکان سے خریدا ہوا پلاسٹک یا برکا ہاتھ نہیں بلکہ اصلی ہاتھ تھا۔ میں چیخنا چاہتا تھا لیکن ہمت ہی نہیں تھی۔ صرف تھوک نکل کر رہ گیا۔"

"اتنے میں ڈامر کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی، 'مرد نہیں! میں ہوں نا تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔' یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر پر زور بڑھا کر میرا زخم مزید گہرا کیا اور میں گندے بیڈ پر بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔"

سب کی نگاہیں ایڈورڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ "بیڈ کے ساتھ ہی چھوٹی سی الماری موجود تھی۔ ڈامر نے ذرا سا جھک کر اس کی دروازہ کھولی جس میں ایک انسانی کھوپڑی موجود تھی۔"

"ادھ خدا یا!" جبری کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ اس پورے وقت میں پکلی بار بولا تھا۔ وہ سگریٹ پیچیک کر کھڑا ہوا اور ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔ "میں اس سے زیادہ کچھ نہیں سننا چاہتا!"

ڈینی نے بے پروائی کا اظہار کیا اور ایڈورڈ سے بولا۔ "پھر کیا ہوا؟"

ایڈورڈ نے پلکیں جھپکائیں اور اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔

"ڈامر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کھوپڑی کو اٹھائیوں سے سہلانے لگا اور بولا۔ "تم دیواروں پر موجود کافی جوانوں سے ملنے چلتے ہو بلکہ ان سے بہتر جسم رکھتے ہو۔" ایڈورڈ نے یہ الفاظ کافی تفاخر سے ادا کیے تھے۔

"اب وہ مجھے بار بار احساس دلا رہا تھا کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ جیسے وہ کسی لڑکی سے گفتگو کر رہا ہو۔ میں دہشت زدہ ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ کوئی ایسا لمحہ تلاش کر رہا تھا کہ جس سے مجھے فرار کا موقع مل سکے۔ مجھے علم تھا کہ یہ

بندہ جذبات سے مغلوب ہو رہا ہے۔“

”پھر ڈامر بولا۔“ مجھے دوسرا ہاتھ بھی ہتھکڑی میں جکڑنے دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ مجھے تمہاری کچھ تصویریں چاہئیں بس۔“ وہ مجھے قائل کرنے لگا۔ ایک بار، چند تصویریں بنانے دو بس، اس کے بعد میں تمہیں جانے دوں گا۔“ میں اس لئے مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس سارے وقت میں وہ مجھے دھیرے دھیرے سہلا بھی رہا تھا۔ میری ٹانگیں، میری کمر، میرا سر اور میں جواب میں بس باتیں کیے جا رہا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کہ کسی طرح اس کا دھیان بنائے رکھوں اور اسے وہ کچھ نہ کرنے دوں جو وہ سوچے ہوئے ہے۔ اس نے ہتھکڑی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد خنجر سے میرے جسم کو مزید سہلا دیتا۔“ ایڈورڈ نے خنجر کے ڈکر پر ایک اذیت بھری سسکاری لی۔“

”میں نے کہا نا کہ میرا یقین کرو میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔ میں نے اسے چکر دینا چاہا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کو وہی کرنا ہے جو کچھ اس نے سوچا ہوا ہے۔ وہ میری کسی بات میں نہیں آ رہا تھا۔ بولا۔“

”تم ضد کر رہے ہو، کرتے رہو۔ آخر تمہیں ہمیشہ کے لیے میرے پاس ہی رہنا ہے، تو کرتے رہو!“

”اس لئے مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے خنجر میرے پیٹ کے نچلے حصے پر رکھا اور دبا دبا دینے لگا۔“

”ہر کچھ دیر بعد وہ اس الماری کی دراز کھولا، کھوپڑی کو سہلاتا اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔“ ٹریسی ایڈورڈ کی آواز ایک بار پھر شکستہ ہونے لگی۔ ”وہ شاید کسی فیصلہ کن لمحے سے گزر رہا تھا۔ حالانکہ یہ کام وہ کئی مرتبہ کر چکا تھا۔ پھر اس نے الماری کے ایک خانے سے کچھ تصویریں نکالیں جو مرے ہوئے جوانوں کی تھیں۔ ان کے جسم گٹنے سڑنے لگے تھے۔ ڈامر کہنے لگا۔ ”تم ایسی حالت میں بہت شاندار نظر آؤ گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے خنجر دوبارہ میرے سینے پر بغل کے پاس رکھا اور مجھے لیٹنے کا حکم دیا۔“

ایڈورڈ کپکپاتی آواز میں گویا ہوا۔

”میں کمر کے بل لیٹا تو اس نے آہستہ سے جھک کر میرے سینے پر اپنا کان رکھ دیا اور بولا۔ ”میں تمہارے دل کو دھڑکتا سنا چاہتا ہوں کیونکہ اسے میں نے سب سے پہلے کھانا ہے۔“

”اوہ.....!“ ڈینی بے اختیار چونک اٹھا۔ اسے اپنی کہانی کی ہیڈ لائن (شہ سرخی) مل گئی تھی، ”قاتل میرا دل

کھانا چاہتا تھا!“

ڈینی نے معذرت کی اور ٹیپ چیک کرنے کے بہانے ٹیپ ریکارڈر پر جھک گیا۔ ٹریسی ایڈورڈ نے پھر سے اپنا بیان شروع کر دیا۔

”میں نے ڈامر سے کہا کہ مجھے واش روم جانا ہے، اگر وہ مجھے جانے دے تو میں واپس آ کر اپنے پکڑے خود اتاروں گا تا کہ وہ تصویریں بنا سکے۔ میں اس طرح صرف وقت لینا چاہ رہا تھا، ورنہ اب میں نے خود کو مردہ تصور کر لیا تھا۔“

digest library.com

”ابا کھ روم میں بھی اس سے نجات نہ مل سکی۔ وہ ہتھکڑی پکڑے، بغل میں خنجر لگائے میرے ساتھ نکلی رہا۔ فارغ ہونے پر اس نے میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی میری شرٹ کے بٹن کھولنے شروع کر دیے۔ میں نے اس کا ساتھ دینے والا تاثر دینے کے لیے اسے ایک اور بیڑ پینے کی فرمائش کر دی۔ وہ فریج کی طرف گیا اور دو بیڑ لے کر پلٹا، ہتھکڑی سے ہی پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ وہ کچن بھی شدید گندہ ہو رہا تھا۔ برتن ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور ہر طرف عجیب و غریب چیچپاہٹ تھی۔ وہ بیڈ روم کی طرف جانے لگا تو میں بول اٹھا۔

”تو جگ روم میں کافی ٹھنڈ ہے وہیں چل کر بیٹے ہیں۔“ میں دیکھ رہا تھا کہ اب اس کا خنجر اتنی شدت کے ساتھ نہیں چھو رہا تھا۔ شاید اسے نشہ ہونے لگا تھا۔“ ایڈورڈ کے لہجے میں پکلی بار امید جھلکنے لگی تھی۔ ”وہ اب بھی مجھے یہی باور کرا رہا تھا کہ میں بہت حسین ہوں اور ایک خوب صورت جسم کا مالک ہوں۔ لیکن اس نے ابھی تک کوئی جنسی وار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے لاشوں کو اپنے پاس رکھنے کا شوق ہے۔ کیونکہ ان میں کسی حرکت یا احتجاج کی طاقت نہیں ہوتی۔ تب میں سمجھا کہ وہ ساری جنسی لذت بھی بعد میں لیا کرتا ہے۔“ ایڈورڈ نے ایک جھرجھری سی لی۔

”ہم واپس کاؤچ پر پہنچ گئے اور میں وہاں ایسے سکون سے بیٹھ گیا جیسے اپنے ہی گھر میں موجود ہوں۔ لیکن میں ہر دوسرے سیکنڈ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔“ ایڈورڈ اپنی کرسی میں آگے کی طرف جھک آیا۔ اس نے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے اور سیدھا ٹیپ ریکارڈر میں بولا۔

”ڈامر نے کہا تھا کہ وہ مجھے ایسی چیزیں دکھائے گا جو میں نے پہلے بھی نہیں دیکھیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے نشہ تو نہیں ہوا اور پھر بولا۔ ”میں تو سارا دن پیتا رہتا ہوں!“ میں

کا شکر ادا کرنے لگا جس نے مجھے شیطان کے بچے سے رہائی دلائی تھی۔ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ مجھے اُس وقت اپنا بچوں کی طرح رونا سسکنا تک نہیں بھول سکتا۔“ ایڈورڈ نے ایک ٹھٹھی سیسائی بھری اور بولا۔

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں زندہ ہوں اور اُن لوگوں کے لیے افسوس ہے جو مجھ سے پہلے اس اپارٹمنٹ میں جا کر واپس نہ پلٹ سکے۔ میں جانتا ہوں کہ خدا نے مجھے اس شیطان کے خاتمے کے لیے ہی وہاں بھیجا تھا۔ میری تقدیر میں تھا کہ اسے میں ہی انجام تک پہنچاؤں۔“

☆☆☆

ڈینی نے ٹرکی ایڈورڈ کا بیان ختم ہونے پر اس سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بعض اوقات کہانی ہی سب کچھ بتا دیتی ہے، کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ٹرکی ایڈورڈ کی ہولناک کہانی نے اس ہوٹل کے کمرے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت خوف کی نذر کر دیا تھا۔ اب چھ منٹ سے خاموشی کا راج تھا اور اس خاموشی میں ہر فرد سنا کی گئی کہانی کے سحر سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ڈینی نے کچھ نوٹس اپنے پیڑ پر ڈالے اور پھر پانچ سو ڈالرز کے نوٹ ایڈورڈ کے حوالے کر دیے۔ اس کے کام کی مکمل ادائیگی ہو گئی تو وہ نوٹ اپنی جیب میں رکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ جبری اور اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو.....“ ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ ہزار ڈالرز میں اپنے نفسیاتی علاج پر استعمال کرتا۔ تمہیں کسی بہتر نفسیات کی ضرورت ہے۔ ورنہ تم واقعی سو نہیں پاؤ گے۔“ ڈینی کو اس کی حالت کا مکمل ادراک ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے، جب ڈینی کی رپورٹ اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تو ٹرکی ایڈورڈ کی تصویر اخبار کی پیشانی پر آویزاں تھی۔ پورے امریکا کے ہر شہر اسٹور اور مارکیٹ میں رنگین تصاویر اور شہ سرخیاں چھپ چھپ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ ٹیکساس کے شہر اسٹور میں چھٹی پر آئے ایک جاسوس نے ٹرکی ایڈورڈ کا چہرہ دیکھتے ہی شکر کا سانس لیا۔ وہ دو سال سے ایک لڑکی کو زیادتی کے بعد قتل کر دینے والے اس چہرے کی کھوج میں تھا۔ وہ فوراً سب کچھ چھوڑ کر آفس کی طرف بھاگا کیونکہ اس کا مفروضہ قاتل اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔

❖❖❖

نے، بس ہلکا سا شرور ہے۔ جواب دیا تو اس نے آہستہ سے گھٹکتا ہوئے آگے پیچھے جھومنا شروع کر دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ مدھوش ہو گیا ہو۔“

”وہ ویسے ہی مجھے مارنے والا تھا تو میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اسے اسی کام سے روکنا ہے۔ وہ مجھے بچر کھونپنے والا تھا یا جو بھی، مجھے بھانسنے کی کوشش کرنی تھی۔ ہر دو صورت میری موت تھی تو میں زندگی کا چانس کیوں نہ لیتا؟“

”سامنے والی کھڑکی کا راستہ انکو ریم نے روکا ہوا تھا اور ہاتھ روم میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ میں بیڈ روم میں واپس جانے والا نہیں تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے باہر نکلا جاسکتا ہے۔ میں نے ایک بار پھر ہاتھ روم جانے کا کہا تو اس بار اس نے مجھے خود ہی کاؤچ سے اٹھنے کا کہا۔ مجھے لگا یہی بہترین موقع ہے۔ میں نے اپنے بیگ پر ہاتھ ڈالا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ اتنی جلدی نہ اٹھ سکا۔“

”دروازے پر پہنچتے ہی میں نے کٹڈی پر ہاتھ ڈالا اور قسمت سے وہ کھل بھی گئی۔ اسی لمحے ڈامر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے تیزی سے مڑ کر ایک گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ ساتھ ہی میری لگ نے اسے اچھال کر پیچھے پھینکا۔ اس کی چیخ سننے کی میں نے کوشش ہی نہیں کی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا تو یہ اس کا قصور تھا۔“ ایڈورڈ دانت پیستا ہوا بولا۔

”میں پورا زور لگا کر نیچے بھاگا، اوپر آتے دو چار لوگوں سے ٹکراتا اور ان کے ”کیا ہوا؟“ کو نظر انداز کرتا، ایک لمحے میں عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جھکڑی سیسٹ گی میں بھاگتا چلا گیا۔ اتفاق سے مجھے پولیس کی کار آتی نظر آئی تو میں نے دور سے ہی چلا بنا شروع کر دیا۔“

”ایک شخص مجھے مارنا چاہتا ہے بچاؤ!“ ڈینی نے سوچا، شاید یہ پہلی بار تھا کہ جب ٹرکی ایڈورڈ نے پولیس سے مدد مانگی تھی۔

”وہ مجھے واپس اس عمارت میں لے گئے اور ہم ڈامر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے دروازہ ایسے کھولا جیسے کبھی کچھ نہیں ہوا۔ لیکن جیسے ہی پولیس والوں نے کمرے میں جھانکا، ڈامر کا مقبرہ تیار ہو گیا۔“ کہانی کا اختتام ہونے لگا تھا اس لیے ایڈورڈ کے آخری کلمات ادا ہونے تک ڈینی نے اپنے نوٹس اور فونو گرافر نے کمرے کو سنبھالنا شروع کر دیا۔

”بعد ازاں میں پولیس کار میں کاہتا ہوا بیٹھا اور خدا

لہو کا سراغ

عبدالرب بھٹی

کہا جاتا ہے کہ بیوقوف دنیا کی خاک چھاننے کے بعد جو کچھ دیکھتا ہے... عقل مند اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس سے کہیں زیادہ دیکھ لیتا ہے... صلاحیت کا سرچشمہ غالباً کام ہے... محنت کا گاڑھا پسینا... چالاک... عیار اور ذہین... وکیلوں کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے... جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ میں منٹوں میں بدل سکتے ہیں... مگر کچھ باصلاحیت وکیل بھی ہیں جو کسی صورت اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے... غدالت اور وکیلوں کے گرد گھومتی ایک ایسی کہانی... قاتل و مقتول سامنے تھے مگر یہ گناہ تھے... ان کا جرم یہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے شناسا تھے۔

قاتل کی تلاش میں سرگرداں ایک وکیل کی ہوشیا ریاں

میرے والد نے ایڈووکیٹ شفیق کے ساتھ بطور اپرنٹس لگوا دیا تھا۔ تب میرے ابو حیات تھے۔ بوڑھے والدین کے علاوہ، میرے کاندھوں پر ایک جوان بہن قدسیہ کی بھی ذمے داری آن پڑی تھی۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔

میں جس دیوانی مقدمے کا ذکر کر رہا تھا، وہ بالو بیگم نامی عورت کے مکان سے ان کے غاصب اور بدطینت کرائے داروں کو نکالنے یا پوں کہہ لیں ان سے مکان کا غاصبانہ قبضہ چھڑانے کا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ بالو بیگم ایک... پختہ العمر بیوہ خاتون تھیں۔ ان کی ایک جوان بیٹی رابعہ بھی تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کا دنیا میں اللہ اور ایک دوسرے کے سوائے کوئی نہ تھا۔ کچھ عرصے قبل ان کے شوہر کا ایک

وہ دیوانی مقدمے کا ایک روایتی کیس تھا۔

اس کیس کو میں نے خالصتاً اپنے زوردار دلائل اور انڈی مرق ریزی سے جیتا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس سے قبل ایڈووکیٹ شفیق شاہ کی مدد میرے ساتھ شامل رہتی تھی۔

میں گزشتہ چند سالوں سے جونیئر کی حیثیت سے ان کے زیر سایہ کام کر رہا تھا۔ ایڈووکیٹ شفیق شاہ، میرے والد حسین بخش کے گھرے اور پرانے دوست تھے۔ میرے ابو حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ کلرک تھے۔ تب تک میں نے اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بننے کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے تھے۔ بی اے، ایل ایل بی، کرنے کے بعد

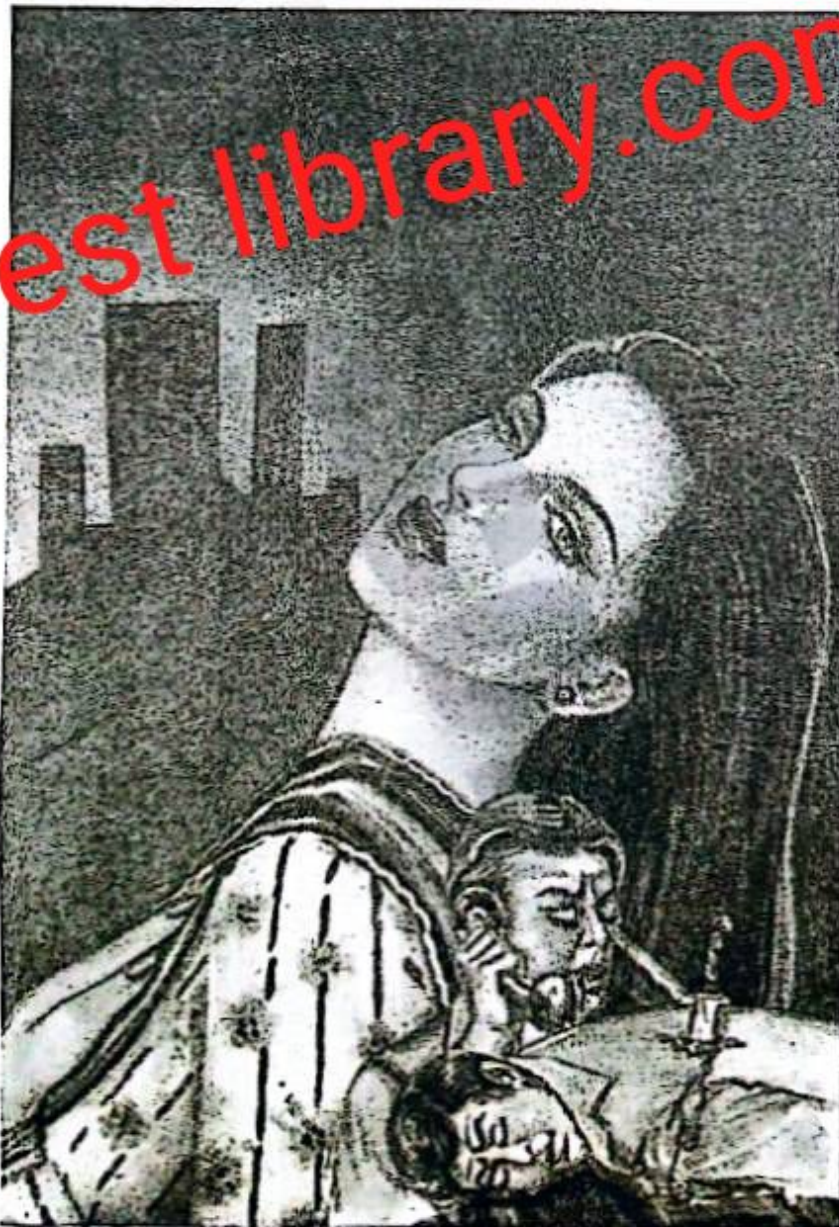
لہو کا سراغ

بن گیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بیوہ بالو بیگم اور اس کی جوان بیٹی رابعہ کا دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ بالآخر تنگ آ کر ایک دن خود ہی یہ مکان اس کے ہاتھ اودنے پونے داموں بیچنے پر مجبور ہو جائیں گی لیکن بالو بیگم بڑی باہمت، حوصلہ مند عورت ثابت ہوئیں۔ انہوں نے فوراً ایڈووکیٹ شفیق شاہ سے مدد چاہی تو انہوں نے فوراً یہ کیس میرے حوالے کر دیا۔

یوں میں نے ایک چیچک سمجھ کر یہ کیس لے لیا اور بالآخر چند مہینوں میں بالو بیگم کا مکان ان کے بد طبیعت کرائے دار آصف خان سے چھڑوا کر ہی دم لیا۔ دونوں ماں بیٹی اس قدر خوش ہوئیں کہ مجھے ان دونوں معصوموں کے چہروں کی خوشیاں دیکھ کر کچھ معنوں میں اندازہ ہوا تھا کہ اصل خوشی کیا ہوتی ہے، جو اس وقت ان کی مدد کر کے میرے دل کو بھی محسوس ہوئی تھی اور یوں جب ایڈووکیٹ شفیق شاہ کو میرے ”پانی“ کا اندازہ ہوا تو انہوں نے باقاعدہ فوجداری کے مقدمے بھی مجھے سونپنا شروع کر دیے تھے۔ میرا باقاعدہ

جانکاہ حادثے میں انتقال ہو گیا تو دونوں ماں بیٹی کی کفالت کا واحد سہارا مکان ہی رہ گیا تھا۔ اس کی اوپری منزل سے خاطر خواہ کرایہ آ جاتا تھا۔ چونکہ مکان اچھے علاقے میں تھا اس لیے معقول کرائے سے دونوں ماں بیٹی کی ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو جاتی تھی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک رہا، مگر ان دونوں ماں بیٹیوں کی جان اس وقت عذاب میں پھنس گئی۔ جب کرائے دار آصف خان کی نیت میں فتور جاگا، وہ دراصل ان دونوں ماں بیٹیوں کو تنگ کر کے ان سے یہ مکان اودنے پونے دام خریدنا چاہتا تھا۔

جب بالو بیگم نے تنگ آ کر انہیں مکان خالی کرنے کا کہا تو بد طبیعت آصف خان نے فوراً کورٹ سے ”اسے آرڈر“ لے لیا عذر پیش کیا کہ وہ دل کا مریض ہے اور ابھی مکان خالی کر کے دوسری جگہ شفٹ ہونے کی ”سکت“ نہیں رکھتا، وغیرہ۔ یوں اب وہ کرایہ بھی کورٹ میں جمع کروانے لگا۔ دونوں ماں بیٹیوں کو تنگ کرنا اب اس کا روز کا معمول



digest library.com

دھننے کے علاوہ کیشن بھی مقرر کر دیا گیا۔

ایڈووکیٹ شفیق شاہ کا دفتر (جمیئر) شہر کی ایک معروف شارع پر تھا، جو کورٹ روڈ سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں ایک روز کسی گیس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ شفیق صاحب ہائی کورٹ گئے ہوئے تھے۔ سیکریٹری روپلی فون اینڈ کرنے میں مصروف تھی۔

اچانک مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے فائل سے سرائٹا کر سامنے دیکھا۔ صاحب شفیق کو دیکھ کر فوراً ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور میں ہمیشہ کی طرح اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس "احترام" میں میری ذاتی اور غیر معمولی دلچسپی کا عنصر بھی غالب تھا۔

"تشریف رکھیں، مس صاحب!..." میں نے محبت پاش نظروں سے اس کی من موہنی صورت دیکھتے ہوئے کہا تو وہ حسب دستور بے مروتی سے بولی۔

"میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ ڈیڈ کدھر ہیں؟"

میں اُس کی بے اعتنائی سے صرف نظر کرتے ہوئے بولا۔ "شاہ صاحب تو کورٹ گئے ہوئے ہیں۔ کیا سیکریٹری روپلی نے نہیں بتایا تمہیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تو وہ قدرے بُرا مان کر رواجی غرور سے بولی۔

"مسٹر جونیر! میں کوئی کلائنٹ نہیں ہوں۔"

اس کا مجھے "جونیر" کہنا ایک پرانی عادت تھی، جو غالباً عادت سے زیادہ اس کے غرور کی وجہ ہوگی مگر میں پھر بھی اس کا بُرا نہیں مناتا تھا۔ میں بدستور خوش خلقی کو اپنے دل کی ملاوت آمیزی میں گھولتے ہوئے بولا۔

"آپ... تشریف رکھیں پھر... شاہ صاحب آنے والے ہوں گے، کیونکہ کورٹ کا ٹائم ختم ہی ہوا چاہتا ہے۔"

وہ میری بات سن کر چند لمحے تذبذب کا شکار رہی۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر میری میز سے ذرا دور بیٹھ گئی اور میں بھی بہ ظاہر دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گیا لیکن میرا اٹھا ہوا اسی کی طرف مبذول ہو گیا تھا اب۔۔۔۔۔

صاحب! ایڈووکیٹ شفیق شاہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ شفیق شاہ نے کچھ مصروفیت یا کچھ یہ سوچ کر بھی کہ سوتیلی ماں جانے صبا کے ساتھ کیا سلوک کرے، دوسری شادی نہیں کی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی صبا... کی بڑی ناز و نعم میں پرورش کی تھی شاید ان کے بے جالاؤ پیار نے صبا کو خود سر اور منہ پھٹ بنا ڈالا تھا۔ میرے تجرباتی نظریے کے

مطابق اس میں احساس محرومی کا بھی دخل تھا۔ صبا نے نو عمری ہی میں اس محرومی کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

میں چونکہ صبا کے اس "الئے" سے واقف تھا اس لیے میں اس کی کسی بات کا بُرا نہیں مناتا تھا، بلکہ غصے اور سرکشی میں وہ مجھے اور بھی اچھی لگتی تھی اور مجھے منہ زور گھوڑیوں کو سدھانے میں مزہ بھی تو آتا تھا۔

بلاشبہ صبا ایک سرد قامت، نرم و نازک لڑکی تھی۔ بادی انکھر سے اس کی من موہنی سی صورت دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ اس کے اندر خود سری اور تندرکوت کوٹ کر بھرا ہوگا۔ صاف ستھری ملائم ہنسا داغ جلد، ستواں ناک، گدش آنکھیں اور کسی دیران جنگ کی جھیل پر نکلے اداس چاند سا چہرہ... غرض وہ معصوم اور سوگوار حسن کا ایک عجیب سا احراز تھی۔

جہاں تک میرا معاملہ تھا، مجھے وہ شروع دن سے ہی اچھی لگی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل مجھے کسی لڑکی نے متاثر نہیں کیا تھا۔ بس کوئی ایسی بات تھی کہ میں صبا کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن یہ ایک طرف محبت ہی تھی ابھی۔۔۔۔۔

"آپ کے لیے کچھ منگواؤں؟" میرا مطلب ہے کوئی چائے یا کافی؟" میں نے فائل سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!..." وہ بدستور روکھے لہجے میں بولی۔

"صبا!..." میں نے اس بار خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مخاطب کیا۔ وہ میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھنے لگی۔

"میری بات کا بُرا نہیں منانا... پتا نہیں کیوں مجھے آپ پر بہت ترس آتا ہے۔"

مجھے پورا یقین تھا کہ ترس اور ہمدردی جیسے الفاظ اسے بُری طرح بھڑکا دیا کرتے تھے، مگر میں نے دیکھا اس کے چہرے سے ایسی کسی برہمی کا عنصر عیاں نہ ہوا اور وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"... کیوں مسٹر جونیر! مجھ پر ترس کھانے کی کوئی خاص وجہ؟"

"پتا نہیں کیوں صبا! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ بلاوجہ خود کو اندر ہی اندر کسی عذاب سے دوچار رکھتی ہیں۔ حالانکہ آپ کی عمر ایسی آگ میں جل کر خاکستر ہونے کی تو نہیں ہے۔"

میں نے شاید اس کی دکھتی رنگ چھیڑ دی تھی۔ آج میں نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ اس کے "اندز" کو چھیڑوں گا، کیا پتا وہ اپنا رویت مجھ سے بدل ڈالے۔ میری دوست بن کر اپنے

”مسٹر جونیر! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کسی بھی قسم کے اندرونی و بیرونی عذاب سے دوچار نہیں ہوں، بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تم ضرور کسی انوائسٹ کا شکار ہو۔ ام آئی رائٹ؟“

میں اس کے سوال پر بھونچکا... رہ گیا۔ شاید میں اس موقع کا ہی فکرت تھا اور بر ملا میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا اظہار کر ڈالا۔

”کون ہے وہ بد قسمت؟“ حسب سابق صبا نے طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”بد قسمت تو خیر نہیں ہے، تاہم بتائے دیتا ہوں، وہ آپ ہو۔ آئی لائیک یو۔ صبا!“ تب ہی میں نے دل کی گہرائیوں سے اس کی طرف دیکھ کر محبت پاش لہجے میں کہا۔

”بہت حوصلے والے لگتے ہو۔“

”میں دل والا بھی ہوں۔“

”مسٹر جونیر! اتنے اونچے خواب مت دیکھو۔ ورنہ منہ کے بل نیچے آن گرو گے۔“ رفته رفته اس کی فطری رعونت لہجے میں عود کر آنے لگی۔ لیکن میں نے بھی کب ہمت ہارنا سیکھا تھا۔

”میں اپنی تعبیریں حاصل کرنا جانتا ہوں مس صبا۔ اور منہ کے بل گرنے والے کم ہمت لوگ ہوتے ہیں، بلند حوصلے والے نہیں۔“

”اچھا۔ تو پھر کم از کم ایک بات تو میری بھی دھیان میں رکھ ہی لو تم۔ کہ میرے خوابوں کے شہزادے تم نہیں ہو بلکہ وہ کوئی اور ہے۔ چلتی ہوں اب۔“ وہ جیسے میری سماعتوں میں پھسلا ہوا سیسہ انڈیل کر جانے لگی۔ میرے دل کو جیسے دھچکا لگا تھا

اسی دوران شفیق صاحب آگئے۔ صبا اپنے پاپا کے چیمبر کی طرف بڑھ گئی۔ میں سر جھکا کر قافل میں مستغرق ہو گیا لیکن میری زخمی نظریں ٹوٹنے کی کڑیوں کو سمیٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

مجھے اس سے پہلے بھی صبا کی گفتگو نے دکھ نہیں پہنچایا تھا، جو مزاج پار میں آئے کہ معداق میں اس کی ہر بے رحمی اور بے اعتنائی کو سچے اور ڈھیت عاشق کی طرح سہتا چلا آیا تھا مگر آج اس نے یہ کہہ کر۔۔۔ میرے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر ڈالا تھا کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔

تاہم میں نے تب بھی خوش فہم عاشق کی طرح خود کو

اندر کا کوئی دکھ شیز کرے اور جس سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

”معاف کرنا، میں صرف آپ کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے یہ سب کہہ رہا ہوں۔ بس، جو مجھے محسوس ہوا وہ میں ٹوک نہ پاؤں پر لے آیا۔

میں نے دیکھا۔ میری بات نے اسے ایک لمحے کے لیے عجیب سی خاموشی میں غلطاں کر ڈالا۔ میں جانتا تو تھا کہ صبا ایسی نمی نہیں جیسی نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے اوپر سخت مزاحی اور نخوت کا خول چڑھا رکھا تھا۔

”تمہیں۔۔۔ کیسے اندازہ ہوا۔۔۔ میرے اندر کے عذاب کا۔۔۔ مسٹر جونیر! اور کیا ہی اچھا ہو کہ تم اس عذاب کے بارے میں بھی مجھے آگاہ کر دیتے۔ جسے تم نے میرے اندر محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔“

اس نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ بھی شامل تھی۔

”یہ ہر وقت کا قصہ۔۔۔ خود کو سپر ہیرو سمجھنے کا جنون۔۔۔ یہ عذاب نہیں تو اور کیا ہے۔ اس سے دوسروں کا تو کچھ نہیں بگڑتا بلکہ خود اپنا خون ہی جلتا ہے۔“

میں نے گہری نظروں سے اس کے من موہنے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے پہلی بار یوں لگا جیسے، پتھر نے معمولی سا پگھلنا شروع کر دیا ہو۔ صبا نے میری بات کو غور سے سنا تھا۔ پر کوئی جواب دیے بغیر اس نے ایک گہری اور نا آسودہ سی ہکاری لے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔

میں نے شاید اس کے اندر کو چھنچھوڑ ڈالا تھا۔ میں نے فوراً انٹرکام پر سیکریٹری کو کمر ماگرم کافی لانے کا کہا۔

”یہ اچھا کیا تم نے۔۔۔ کافی منگوا لی۔ تمہاری گفتگو نے اچانک ہی جانے کیوں میرے اندر کافی کی طلب جگا دی تھی۔“ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”صبا! پلیز، خود کو اس آزار والی کیفیت سے باہر نکالو۔ زندگی کو انجمائے کرو، اس کے رنگوں سے محبت کرو۔ دیکھو، پھر آپ کے بے چین دل کو کس قدر راحت ملے گی۔“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر بڑی رسائیت سے چوٹ کی اور وہ بے ساختہ اور غلاف توقع میری بات پر کلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی ہموار قطار نے میرے دل پر تیار پر جیسے بجلیاں ہی گرا دیں۔ وہ ہل میں تولہ ہل میں ماشہ تھی۔ اس کا آج مجھے اور اک ہور ہاتھا۔

قسطی دی کہ ہو سکتا ہے صبا نے جلانے کے لیے مجھ سے یہ جھوٹ بولا ہو۔ یوں بھی شفیق صاحب کو آج واقعی آنے میں بہت دیر ہوگئی تھی ورنہ صبا اتنی دیر تک کبھی میرے ساتھ نہیں بیٹھی تھی۔ بہر کیف..... ان کے آنے کے بعد صبا پہل بھر بھی میرے پاس نہیں بیٹھی تھی۔

کیس کی فائل پڑھنے میں اب میری یکسوئی نہیں رہی تھی حالانکہ یہ بات میری فطرت کے بالکل خلاف تھی۔ میں..... پوری توجہ اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہتا تھا لیکن جب سے مجھے صبا سے محبت ہوئی تھی۔ میرے دل کو نا معلوم سی بے چینی لگی رہتی تھی۔

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا۔

آج شفیق صاحب کے ساتھ میں بھی کورٹ گیا تھا۔ وہاں ساتیس بھگتا نے کے بعد انہوں نے مجھ سے آفس چلنے کو کہا۔

”تیور میاں! بس اب باقی کا کام کل نمٹائیں گے۔ چلو چلتے ہیں۔ میں نے حاصل خان کو وقت دے رکھا ہے۔“
حاصل خان کے نام پر میں ذرا ٹھٹھا، پھر کورٹ کے زینے سے اتر کر باہر احاطے میں کھڑی شفیق صاحب کی کار کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”سر.....! یہ حاصل خان وہی تو نہیں..... مون انٹرپرائز ڈوالے.....“

”ہاں، وہی ہیں.....“ انہوں نے کہا اور کار کا دروازہ کھولنے لگے۔ میں بھی حذب سا ہو کر سر دست چپ رہا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ حسب معمول میں نے ہی سنبھالی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ میں نے حاصل خان کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا لیکن میرے اندر کڑید سے ہوئی تھی۔

ملاقات کا مقصد ظاہر ہے کہ کوئی کیس ہی ہو سکتا تھا۔ میں کار چلاتا ہوا مین شارپ پر آگیا۔ ہمارا دفتر زیادہ دور نہ تھا۔ دفتر پہنچ کر ایڈووکیٹ شفیق صاحب نے مجھے کسی کلائنٹ کی ضمانت کے کاغذات تیار کرنے اور اگلے روز اسے کورٹ میں جمع کروانے کی ہدایت کی پھر آخر میں بولے۔

”تیور میاں! یہ کام ذرا جلدی نمٹالو۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ آئے تو تم بھی میرے ساتھ کمرے میں موجود ہو۔“ میں ان کے اصرار پر قدرے چونک کر بولا۔

”سر! کیا حاصل خان کسی کیس کے سلسلے میں یہاں آ رہا ہے؟“

”ظاہر ہے بھئی، اور کیا کرنے آئے گا؟“ انہوں نے پھٹکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”مگر.....“ میں کچھ کہتے کہتے رکا۔

”اس مگر کو ابھی رہنے دو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں کیا کھلبلی مچ رہی ہوگی۔ بس تم اسے میری مجبوری سمجھ لو کہ میں حاصل خان جیسے شخص کو وقت دے بیٹھا ہوں۔“ شفیق صاحب نے کہا اور پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں اُن کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی..... ضمانت کے کاغذات تیار کرنے لگا پھر اسے فائل کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ شفیق صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔

شفیق صاحب کا یہ دفتر..... تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ خود شفیق صاحب کا دوسرا میرا تھا جبکہ تیسرا انتظار گاہ کے طور پر مستعمل تھا اور وہیں سیکریٹری روپی کی ریسپشن ٹیبل تھی۔

میں جیسے ہی شفیق صاحب کے کمرے میں پہنچا تو سیکریٹری نے آکر حاصل خان کی آمد کی اطلاع دی۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک مٹھے ہوئے قد و قامت کا شخص گرے گلر کے سفاری سوٹ میں اندر داخل ہوا۔ یہی حاصل خان تھا۔ مون انٹرپرائز کا روپ رول..... عمر پچاس بچپن کے درمیان تھی۔ رنگت سانولی اور سر کے بال نیلا ہٹ مائل سفید تھے۔

اس نے گرم جوشی کے ساتھ شفیق صاحب سے مصافحہ کیا پھر جیسے چاروٹا چار مجھ سے بھی ہاتھ ملانے کے بعد میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

”خان صاحب! میں شعیب صاحب کی معرفت آپ کو وقت دینے پر مجبور ہوا ہوں۔ ورنہ تو آج کل میں اس قدر مصروف ہوں کہ کسی نئے کیس کو ہاتھ میں لینا تو کجا سننے کا بھی وقت نہیں ہے میرے پاس.....“ شفیق صاحب نے گہمیر لہجے میں حاصل خان سے کہا تو وہ عجیب سی مسکراہٹ تلے ان سے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

”جناب شفیق صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہے، دراصل مجھے اس پورے شہر میں آپ جیسا قابل اور کہنہ مشق کوئی وکیل بچھائی ہی نہیں دیا تھا۔“

”جی.....! کیسے، لیکن ایک بات کا خیال رہے.....“ شفیق صاحب نے مزید وقت ضائع کیے بغیر گہری ستانت سے کہا۔

”میں اپنی فیس سے زیادہ کیس کی نوعیت دیکھ کر

”نہیں، وہ مفروضہ ہے ابھی.....“ حاصل خان نے بتایا۔

”پھر تو آپ کو یہاں آنے کے بجائے سب سے پہلے متعلقہ تھانے جا کر اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی چاہیے تھی اور مفروضہ طرز کے گرفتار ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ شفیق صاحب نے کہا تو حاصل خان نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں، لیکن قاتل ابھی تک روپوش اور مفروضہ ہے۔ درحقیقت قاتل کی پشت پناہی کرنے والے اس کے بھی خواہوں کی تعداد کچھ کم نہیں، بلکہ مجھے تو یہ پورا گینگ لگتا ہے۔ بہر حال..... وہ اب قاتل کی قتل از وقت گرفتاری ضمانت کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سو اس سلسلے میں وہ لوگ پانی کی طرح روپیہ بہا رہے ہیں۔ لہذا میں چاہتا ہوں.....“

”میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گیا خان صاحب!“ شفیق صاحب جیسے وقت بچانے کی غرض سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ ”آپ چاہتے ہیں کہ اس کی قتل از وقت گرفتاری کی ضمانت نہ ہو سکے۔“

”ایگزیکٹو.....!“ حاصل خان جیسے اچھل کر بولا۔

”ایک بات بتائیں.....“ شفیق صاحب نے کہا۔

”جی.....“

”آپ..... نے ابھی کہا کہ آپ کے منجر طاہر فراز نے دولت کے لالچ میں آپ کی بیٹی ارم کا قتل کیا..... یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی..... ہے۔ ذرا وضاحت کریں گے، آخر دولت کے لالچ سے قتل کا کیا تعلق بنا ہے؟“

شفیق صاحب نے بالآخر وہی سوال کیا جو میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا۔ میں سردست شفیق صاحب کی ہدایت کے مطابق سامع بنا بیٹھا تھا اور خاموشی سے کچھ اہم اور ضروری پوائنٹس نوٹ کرتا جا رہا تھا تا کہ بعد میں تفصیلاً شفیق صاحب اور میں ڈسکس کر سکیں۔

”طاہر فراز نے میری بیٹی ارم کو اپنی جھوٹی محبت کے دام میں پھنسا لیا تھا۔“ حاصل خان نے کیس کی صراحت شروع کرتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔

”میرے بڑے بھائی محبت خان کے ناگہانی انتقال کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی ارم میری سرپرستی میں آگئی تھی مگر بعض مفاد پرست لوگوں کے ورغلانے پر وہ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگی لیکن میں نے اپنی بیٹی سمجھ کر اسے معاف کر

اسے ہاتھ میں لیتا ہوں..... اگر اس کیس میں کسی مظلوم کی حق تلفی کا ذرا بھی پہلو مجھے محسوس ہوا، میں اسے رد کر دوں گا۔“

”ارے شفیق صاحب! آپ تو قاتل وکیل ہیں۔ آپ چاہیں تو سیاہ کو سفید کر دیتے ہیں۔“ حاصل خان مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر ایک نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد شفیق صاحب کی طرف دیکھا تو وہ اس کی مستفسرانہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”یہ میرا اسٹنٹ ہی نہیں عزیز بھی ہے، یہ ہمیشہ میرے ساتھ موجود رہتا ہے۔ آپ بات کریں.....“ حاصل خان نے ایک گہری ہکاری خارج کی اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو شفیق صاحب کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اسے کھولا تو ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ بڑے بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ شفیق صاحب نے ایک سرسری نگاہ بریف کیس پر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر بریف کیس بند کر دیا پھر پہلے سے زیادہ کبھیر اور کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے حاصل خان کی طرف رخ کر کے بولے۔

”خان صاحب! میں نے تو سلیس اردو میں آپ کو اس بارے میں بتا دیا تھا لیکن شاید آپ سمجھے نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو سیاہ کو سفید کر دیں، بلکہ میں تو ایسا خزانہ وکیل ہوں کہ بعض مرتبہ اپنے ہی کلائنٹ کے گلے پڑ جاتا ہوں، آپ بات کریں اور اس بریف کیس کو نیچے کر لیں۔“

شفیق صاحب کے دو ٹوک اور کھرے لہجے پر حاصل خان خاصا جزبز ہوا مگر پھر اس نے خاموشی سے بریف کیس اٹھا کر نیچے آہنی کرسی کے ساتھ زمین پر ٹکا دیا۔ اس کے بعد... گفتگو کا آغاز کیا۔

”میری کمپنی مون انٹرپرائزز کا ایک ایکسپورٹ منیجر طاہر فراز تھا۔ میں نے اسے ایک ملازم سے زیادہ اولاد کی طرح سمجھا تھا مگر اس نمک حرام نے میرے ہی گھر میں سینڈھ لپکائی اور دولت کے لالچ میں اس نے میری یتیم اور معصوم بیٹی ارم کا قتل کر ڈالا۔“ اتنا بتا کر وہ لمحہ بھر کو چپ ہوا۔ میں اور شفیق صاحب بہ غور اس کی روداد سن رہے تھے۔

”کیا قاتل پکڑا گیا.....؟“ شفیق صاحب نے حاصل خان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

دیا۔۔۔ اور کہنی کے نصف شہر میں اس کا جتنا حق ہوتا تھا باقاعدگی سے اس کے اکاؤنٹ میں جاتا۔ آپ نے تو اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا کہ مجھے اپنے بڑے بھائی کی موت کا ذمے دار قرار دیا گیا تھا۔ بہر حال، میں نے اشاروں کنایوں اور بعض حالات میں بزرگانہ ڈانٹ ڈپٹ سے ارم کو سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ظاہر سے ملنا جلنا ترک نہیں کیا، بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا، ظاہر ایک روز بیچ پر واقع اپنے ایک لکڑی اپارٹمنٹ میں ارم کو لے گیا وہاں اس کی نیت میں فتور آگیا۔ اس نے تنہائی پاتے ہی ارم کی عزت سے کھینچنے کی کوشش چاہی۔ ارم نے جب ظاہر کا یہ بھیاںک روپ دیکھا تو فوراً اپنی عزت بچانے کے لیے جتن کرنا شروع کر دیے مگر کب تک۔۔۔ بالآخر وہ مردود شیطان ظاہر اپنے گھناؤنے کھیل میں کامیاب ہو گیا تو اس نے ارم کی نفرت کا اندازہ کر کے اور اپنا جرم چھپانے کے لیے اس معصوم کو قتل ہی کر ڈالا۔ یہ سب بتانے کے بعد حاصل خان روہانسا ہو گیا اور اپنی آنکھوں میں آنی نمی پونچھنے کے لیے سوٹ کی جیبیں تھپتھپانے لگا کہ شفیق صاحب نے میز پر رکھے شو پیپر باکس سے ایک ٹشو نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا اور ساتھ ہی کن اکھیوں سے میری طرف بھی دیکھا جیسے یہ زبان نظر مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ ”تیور میاں۔۔۔ غور کرو ذرا اس مگر مجھ اور اس کے آنسوؤں پر۔۔۔“ میں نے بھی ہولے لے کر جنبش دیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ایک بات کی سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔“ شفیق صاحب بولے۔ ”جب ظاہر کو پورا یقین تھا کہ ارم اس کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس چکی ہے تو اس سے شادی کر کے وہ اپنے دولت مند بننے کا خواب بہ آسانی پورا کر سکتا تھا، پھر اس نے ارم کو قتل کر کے اپنے ہی پاؤں پر کھپاڑی کیوں ماری؟“

”جناب! انسان کو شیطان بننے میں دیر ہی لگتی ہے۔“ حاصل خان بولا۔۔۔ جو ان مرد اور خوب صورت عورت، پھر تنہائی، ایسے میں۔۔۔“ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

”ادکے۔۔۔ میں سمجھ گیا۔“ شفیق صاحب بولے پھر پوچھا۔ ”ظاہر نے ارم کو۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی بیٹی کو کس طرح قتل کیا تھا؟“

”گھانٹ کر۔۔۔“

”ارم کی طبیعتی رپورٹ۔۔۔ یعنی کیا یہ قتل کر لی گئی کہ آیا قاتل نے اس کی پہلے عزت لوٹی پھر اسے گھانٹ کر قتل کر ڈالا۔۔۔“

”جناب شفیق صاحب! اس میں طبیعتی رپورٹ کی کیا ضرورت تھی؟ طرم کو وہاں آس پاس کے لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے۔۔۔ ارم کے ساتھ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے اور۔۔۔ جرم کرنے کے اسے وہاں سے نکلنے دیکھا تھا۔“

”ہوں۔۔۔“ شفیق صاحب نے ایک طویل اور مرسوج ہمکاری بھری۔ ”ٹھیک ہے، اب آپ شعیب صاحب کے ریفرنس سے آئے ہیں، میں کوشش کرتا ہوں کہ قاتل کی قتل از گرفتاری ضمانت منسوخ ہو جائے۔“

”بہت بہت شکریہ شفیق صاحب! مجھے پورا یقین تھا کہ آپ ہی یہ کر سکتے ہیں۔ فی الحال آپ اتنا کر دیں، اس کے بعد یقیناً آپ کے لیے کیس پر کام کرنا اور بھی آسان ہو جائے گا۔“ حاصل خان ایک دم خوش ہوتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے بعد مزید تھوڑی دیر۔ ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کے بعد فیس ملے ہوئی اور وہ چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی شفیق صاحب نے خاموشی کے ساتھ اپنا سر ریرالونگ چیئر کی نرم وگداز پشت گاہ سے لگا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ کسی بھی پیچیدہ کیس کے بارے میں تفصیل سننے کے بعد اسی طرح کرسی کی پشت گاہ سے اپنا سر لگائے آنکھیں موند لیتے تھے۔ پھر میرے ساتھ ڈسکشن کرتے۔ اس لیے میں نے سب سے پہلے انٹرکام پر روٹی کو چائے لانے کا کہا اور خود بھی ایک پیڈ پر ”بعد از گفتگو“ ضروری پوائنٹ نوٹ کرتا چلا گیا۔

ذرا دیر بعد چائے آگئی۔

”سرا مجھے تو یہ کیس ہی دو نمبر لگتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد جب شفیق صاحب آنکھیں کھول کر

چائے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے ان کی طرف دیکھ کر

”ہاں۔۔۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک ہے۔۔۔“ وہ گوگو

سے لہجے میں بولے۔

”مگر۔۔۔ ظاہر کا فرار ہونا اسے مجرم بنا رہا ہے۔

ویسے تمہارے خیال میں اس کیس میں کتنی سچائی ہو سکتی ہے۔

ظاہر فراز قتل کر سکتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ یہ حاصل خان خود نمبر دو اور کرپٹ

انسان ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پہلے اس نے

اپنے بڑے بھائی محبت خان کو قتل کر دیا تاکہ بلا شرکت

غیر سے کاروبار کا مالک بن جائے پھر جب اس کی بیٹی ارم

حلق میں اٹکنے لگی تو اس نے اسے بھی چالاکی سے مرداد یا اور

مجھ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔
بہر کیف..... اس دن پہلی پیشی تھی۔

میرا نمبر تیسری ہیئرنگ کے بعد آیا۔ کرائے عدالت متعلقہ افراد سے پُر تھا۔ دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ یہ میرے لیے پہلا موقع تھا کہ میں استغاثہ نمٹا رہا تھا۔ وکیل صفائی ایک سینئر وکیل تھا۔ شفیق صاحب کا تقریباً ہم عمر ہی ہو گا وہ، نہ صرف یہ بلکہ ان کا دیرینہ حریف بھی تھا۔

اس نے بڑی طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر استہزاء سے انداز میں ہلکی سرگوشی میں کہا۔

”کیوں میاں..... کیا شفیق صاحب تھک گئے ہیں جو اب تمہارے جیسے چوزے کو ادھر پھڑپھڑانے کے لیے بھیج دیا۔“ میں بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

”واری صاحب! شفیق صاحب نے کیا ٹھننا، بس ذرا انہوں نے اب اونچے معیار کے حریفوں سے پنگا لینا شروع کر دیا ہے۔ جبکہ نچلے درجے کے مرغوں کے لیے مجھ چوزے کو مرغابنے کی ٹریننگ دے رہے ہیں۔“

میری جوابی کارروائی پر وکیل صفائی وارٹی بن گئیں جھانکتے اپنی جگہ کی طرف کھسک گئے۔ ذرا دیر بعد جج صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے کیس سے متعلق صراحت پڑھنے میں ذرا دیر لگائی پھر سر اٹھا کے گھبر آواز میں ”ہوں“ کہا اور تیس شیشوں کی فریم والی عینک کے عقب سے گہری متانت لیے ہوئی آنکھوں سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا۔

”جی۔“

جج صاحب کا اشارہ پا کر ہی وکیل صفائی نے کہنا شروع کیا۔

”جناب والا! میرے موکل طاہر فراز ولد فراز احمد کے خلاف قتل کی سازش کی گئی ہے۔ اس کا اب تک پچیس سالہ ماضی بے داغ اور کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جرم سے بالکل پاک ہے۔ جس کی گواہی شہر کے معززین بھی دیں گے، جو یہاں موجود ہیں، جناب والا کی اجازت سے میں انہیں وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہوں گا۔“

”یور آئر.....!“ میں نے آغاز دلائل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”میرے دوست فاضل وکیل ملزم طاہر فراز کے بے داغ ماضی کی گردان کر کے کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ جبکہ می لارڈ! جرم، جرم ہوتا ہے، چاہے وہ کوئی عادی مجرم کرے یا شریف آدمی..... کیونکہ پہلا جرم ہی انسان کو ہمیشہ

اپنا جرم اپنی ہی کمپنی کے منجر طاہر فراز کے سر تھوپ دیا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بیٹے! ابھی قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں۔“ شفیق صاحب ہلکی سی تادیب کرتے ہوئے بولے۔ ”شعب، میرا صرف دوست ہوتا تو میں یہ کیس کبھی نہ لیتا۔ لیکن شعب کی حیثیت میرے لیے دوستوں سے بھی بڑھ کر محسنوں کی سی ہے، خیر، اگر کیس جھوٹا نکلا تو.....“

اچانک شفیق صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ”جہیں..... میں پھر بھی شعب کی وجہ سے شاید یہ نہیں کر سکتا۔ بجز اس کے کہ میں اس کیس سے دست بردار ہو جاؤں۔“ شفیق صاحب نے کہا۔ پھر اس کے بعد ہم ضروری امور کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

☆☆☆

حاصل خان..... کچھ اچھی شہرت کا مالک نہ تھا لیکن اثر و رسوخ بہت رکھتا تھا۔ اچھے اثر و رسوخ کی بنا پر اس کی داغ و دار شہرت، اس کے مخالف لوگوں کے کھاتے میں چلی گئی تھی۔ جیسا کہ اسے اپنے بڑے بھائی محبت خان کی حادثاتی و ناگہانی موت پر ڈرتے دار ٹھہرایا گیا تھا مگر ثبوت نہ ہونے اور اچھے اثر و رسوخ کی وجہ سے وہ صاف بچ نکلا تھا۔ اخبارات اور سوشل میڈیا میں اس کی ساری روداد پڑھی تھی۔

بعض لوگ اپنے پروفیشن میں ضرورت کے تحت آتے ہیں جبکہ ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جو ایک جذبے اور سچے مقصد کے تحت اپنے پروفیشن کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ جذبہ اور مقصد ملک و قوم اور معاشرے سے ایسے کالے لوگوں کا صفایا کرنے کا ہوتا ہے۔ ایڈووکیٹ شفیق صاحب اور میں ہم دونوں ایسے ہی عزم کے پروردہ تھے۔ بے شک وکالت ہماری روزی روٹی کا ذریعہ تھا مگر اللہ جانتا تھا کہ ہم نے کبھی اپنے پروفیشن سے بددیانتی نہیں کی تھی۔ حق دار کو اس کا حق دلایا تھا بلکہ ہم بعض اوقات تو اپنے ہی کلائنٹ کے بھی گلے پڑ جاتے تھے۔ جب وہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ہمیں ”آزمانے“ کی کوشش کرتا۔ جذبے اور مقصد کی راہ ہمیشہ پُر خار ہوتی ہے۔ ... میں اور شفیق صاحب اسی راہ کے راہی تھے۔

☆☆☆

حاصل خان والا کیس شفیق صاحب نے کئی طور پر میرے سپرد کر دیا تھا۔ جس پر حاصل خان نے اعتراض کیا تھا مگر شفیق صاحب نے اسے قلی دیتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ

کے لیے اس راہ پر گامزن کر دیتا ہے اور پھر سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ.....

”آئیچیکشن یور آئر.....“ اچانک وکیل صفائی نے اعتراض اٹھایا

”آئیچیکشن اور رول.....“ جج صاحب نے اس کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے میری طرف گہمیر نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا مجھے دلائل جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

”تھینک یو لی لارڈ!“ میں نے مؤدبانہ کہا اور پھر شروع ہو گیا۔

”اگر..... طاہر فراز بے گناہ تھا یا اسے قتل کی اس سنگین سازش میں پھنسا دیا گیا تھا تو پھر اس نے راہ فرار اختیار کیوں کی.....؟ اس کا فرار ہونا ہی اسے مجرم و قاتل ثابت کرتا ہے۔ یو آئر.....“

”آئیچیکشن یور آئر.....“ اس بار وکیل صفائی پر زور لہجے میں اچھا جا بولا۔

”آئیچیکشن سسٹم.....“ اس بار جج صاحب نے اس کا اعتراض منکوح کر لیا تھا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

”یہ کوئی ضروری نہیں لی لارڈ کہ موقع واردات سے میرے موکل کا فرار ہونا اسے مجرم ثابت کرے..... اس طرح کی گناہوں کی سازش کے سامنے اچھے بھلے شریف و سادہ لوح انسان کا یہ فطری رد عمل ہوتا ہے، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس کیس کی ہیزنگ تک میرے موکل طاہر فراز کی ضمانت کی جائے تاکہ وہ اپنے تحفظ کے حق کو استعمال کر سکے.....“

”لی لارڈ!“ اچانک میں نے کہا۔

”یہ کوئی چوری چکاری یا معمولی نوعیت کا دیوانی مقدمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سنگین جرم، قتل کی واردات ہے اور پولیس کو ملزم کے خلاف وقوعے کے مبینہ ثبوت ملے ہیں۔ لہذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ وہ ضمانتوں کے چکروں میں پڑنے کے بجائے جلد سے جلد باقاعدہ سماعت کا آغاز کرتے ہوئے مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے۔“

دوسری پیشی میں ملزم طاہر فراز کی ضمانت قتل از گرفتاری کی درخواست منسوخ کر دی گئی۔ میرے لیے دیوانی مقدمے کے بعد فوجداری مقدمے میں یہ دوسری بڑی کامیابی تھی لیکن جانے کیوں، اس کامیابی پر مجھے کچھ خوشی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کیس..... حاصل خان جیسے

کرپٹ انسان نے سوچا تھا مگر اللہ گواہ تھا کہ ہم نے یعنی ایڈووکیٹ شفیق صاحب اور میں نے یہ کیس حق دار کو حق دلانے کے لیے ہی لیا تھا اور دل میں یہی تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر ملزم طاہر فراز بے گناہ ہوا تو اس کیس سے فوراً دست برداری اختیار کر لیں گے، مقصد صرف یہی تھا کہ اصل مجرم کو قرار واقعی سزا ہو۔ البتہ حاصل خان خوش تھا۔

”انکل! کیا آپ بھی وہی محسوس کر رہے ہیں جو میں کر رہا ہوں۔“ میں نے بالآخر شفیق صاحب سے پوچھا۔ میرا دل بوجھل سا تھا۔ وہ مجھے ”بیٹا“ کہنے لگے تھے اسی لیے میں بھی انہیں ”انکل“ کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

”ہاں..... اگر یہ کیس ہمیں حاصل خان جیسا شخص نہ دیتا تو.....“ انہوں نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”ویسے کیا یہ ضروری تو نہیں کہ، حاصل خان کی بیٹی ارم کے قتل کا ملزم طاہر فراز بے گناہ ہو.....؟ کیونکہ معاملہ بھی تو ایک جیم مگر امیر کبیر اور بے گناہ لڑکی کے قتل کا ہے۔“ میں نے جیسے اپنے اندر کی بے چینی اور بوجھ کو گویا کم کرنے کی غرض سے ایک تاویل پیش کی تو شفیق صاحب دھیرے دھیرے اپنے سر کا ثباتی جنبش دینے لگے۔

☆☆☆

اب ملزم و مفرد طاہر فراز کی گرفتاری تک یہ کیس سردست ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں اس دن گھر پر ہی رہا تھا۔ طبیعت جانے کیوں کام پر آج ناکل نہیں ہو رہی تھی۔ میری بہن قدسیہ کالج گئی ہوئی تھی۔ ابو اپنی پنشن اور ریٹائرمنٹ کے کاغذات وغیرہ کے سلسلے میں اے جی آفس گئے ہوئے تھے۔ امی نے ناشتے کے بعد مجھے ایک کپ چائے اور دی پھر میرے سر پر مٹا بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے رونا جی نظر سے کہا۔

”بیٹا تیمور! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کل سے کم صم ہے ہو۔ چلو میں تمہیں ڈاکٹر اختر کے پاس لے چلوں۔“ ڈاکٹر اختر کا کلینک ہمارے محلے میں ہی تھا۔

”نہیں امی جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ویسے ہی آج ذرا کام پر جانے کو جی نہیں چاہا۔ یوں بھی آج کل کام کا بوجھ ذرا کم ہی ہے۔ پتا نہیں لوگوں نے جرم کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے یہ بات یونہی ازراہ تفسیر کہی تھی کہ امی کی تسلی ہو سکے کہ میں ٹھیک تھا۔

”اے تو بہ کرو بیٹا! کیا تم یہ دعوائے کہتے ہو کہ.....“

”امی جان.....! میں تو یونہی آپ کو چھیڑ رہا تھا۔“

میں نے فحس کر کہا۔

لبہ کا سراغ

سادہ نقوش کی گھریلو اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ بالونیکم نے لب کشائی کرتے ہوئے کہا شروع کیا۔

”بیٹا! اللہ تمہیں جیسا رکھے۔ تم پہلے ہی ہم پر ایک احسان کر چکے ہو۔ اب پھر تمہیں تکلیف دینے آگئے ہیں۔ اس بھری دنیا میں اللہ کے بعد ہمارا آسرا تم ہی ہو بیٹا!“ اس نے بہ مشکل اپنی رقت پر قابو پایا اور آنسو پونچھے۔

”اللہ ہی سب کا آسرا ہے۔ آپ بتائیں، کیا بات ہے؟ مجھ سے جو ہوسکا میں آپ کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ میں نے انہیں حوصلہ دیا تو وہ بہ مشکل کہنے لگیں۔

”میں طاہر فراز کے سلسلے میں آئی تھی۔“ اس نے بتایا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا اور پوچھا۔

”کیا وہی طاہر فراز تو نہیں جس نے مون لائٹ ایئر پرائزز کے مالک حاصل خان کی جیم جیمینی ارم کا قتل کیا۔“

”اس نے یہ قتل نہیں کیا ہے۔۔۔۔۔ بیٹا۔“ بالونیکم نے دہکی لہجے میں میری بات کا منہ ہونے کہا۔ ”وہ بہت شریف لڑکا ہے۔ اس کے خلاف یہ سازش کی گئی ہے۔“

”ایک منٹ۔۔۔۔۔ آپ یہ بتائیں گی کہ طاہر فراز کا آپ لوگوں سے کیا رشتہ ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو رابعہ کے چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی مگر تب بالونیکم نے بتایا۔

”وہ میرا ہونے والا داماد اور میری بیٹی رابعہ کا معیتر ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔“ میرے منہ سے نکلا۔ تاہم میرے ذہن میں لمحہ بھر کو اس سوچ کا جھماکا ضرور ہوا تھا کہ۔۔۔۔۔ طاہر اگر ”مستکی شدہ“ تھا تو پھر ارم کے ساتھ اس کا نام کیوں نہی کیا گیا تھا؟ خیر، یہ تو بعد کی باتیں تھیں جو ابھی پردے کے پیچھے تھیں۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ حاصل خان نے یہ کیس تمہارے سپرد کیا تھا اور۔۔۔۔۔ اور تم ہی نے اس کی ضمانت قتل از گرفتاری منسوخ کروائی تھی۔“ بالونیکم روہانے لہجے میں بولتی رہیں۔ ”مگر بیٹے! میں قسم کھا سکتی ہوں کہ طاہر فراز میرا دیکھا بھلا لڑکا ہے۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا، میں اب کیا کروں؟ بس، مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ آپ تمہارے پاس ہے تو میں فوراً یہاں چلی آئی۔“ ان کی بات سن کر چہلے کے لیے تو میں بھی ابھن آمیز خاموشی میں ڈوب سا گیا۔

”شریر۔۔۔۔۔“ امی جان محبت سے مسکرائیں اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

دن کے ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ ہمارا گھر دو کمروں اور ایک مختصر سے صحن پر مشتمل تھا۔ یہی بہت تھا کہ اپنی چھت تھی۔ امی باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا تھا۔ عجیب سی کسلندی طبیعت پر غالب تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ امی دروازے کے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند بولیں۔

”کون ہے؟“

”ظہیر بیٹے امی! میں دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔“ تب تک میں صحن میں آچکا تھا۔ امی ذرا پرے ہو گئیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور۔۔۔۔۔ سامنے دو خواتین کو دیکھ کر جبری طرح ٹھنک گیا۔

☆☆☆

دونوں خواتین نے برقع نما چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ چہرے نقاب میں تھے۔ باقی آنکھوں کی طرف کے گوشے واضح تھے، لیکن جب ان دونوں کو باوجود اس کے کہ میں پہچان گیا تھا، قدرے حیرت آمیز انداز میں چونک کر بولا۔

”آ۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ خیریت۔۔۔۔۔ آئیں۔۔۔۔۔ تشریف لائیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں انتہائی احترام سے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ دونوں اندر آ گئیں۔ مجھے حیرت تھی، کیونکہ مجھے یاد تھا۔ میں نے ان کے دیوانی مقدمے کا جو کیس لیا تھا۔ یہ جیت چکی تھیں۔ یہ بالونیکم اور رابعہ تھیں۔ ماں بیٹیاں۔ جن کا مکان میں نے بدطینت کرائے داروں کے قبضے سے چھڑایا تھا۔

میں نے انہیں صحن میں ہی دھری دو کرسیوں پر بٹھا دیا تھا۔ امی جان بھی پاس ہی کھڑی انہیں بگتی رہیں۔ ان دونوں ماں بیٹیوں نے نقاب ہٹائے تو میں ان دونوں ماں بیٹیوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چونک سا گیا۔ نہ جانے اب انہیں کون سا مسئلہ درپیش تھا۔

میں نے ازراہ اخلاق انہیں روایتی انداز میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے اللہ کے حکم سے پہلے بھی آپ کی مدد کی تھی۔ ان شاء اللہ اب بھی وہی مجھے آپ کی مدد کی توفیق بخشے گا۔ آپ مسئلہ بیان کریں۔ کیا پھر کوئی معصیت آن پڑی ہے؟“

رابعہ نے سوگوار نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔ وہ ایک

کہ..... تم اپنی طرف سے بھی ذاتی طور پر اس کیس کی سچائی
ڈھونڈنے کی کوشش کرو گے اور اگر تمہیں یقین ہو گیا کہ طاہر
بے گناہ ہے تو.....“

”تو پھر یہ کیس میرے بجائے شفیق صاحب اُس کے
حق میں لڑ سکتے ہیں۔“ میں نے فوراً سے کہا۔ ”اتنی مدد کا
وعدہ تو میں آپ سے کر ہی سکتا ہوں۔“ یہ سن کر ان دونوں
ماں بیٹیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

”بس بیٹا! ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے پورا
یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔“ بانو بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

”لیکن..... میں آپ کو پھر بھی یہی مشورہ دوں گا کہ
طاہر کو اپنی روپوشی ترک کر کے از خود گرفتاری دے دینی
چاہیے۔“ میں نے آخر میں کہا۔ ”ویسے کیا ابھی تک طاہر نے
آپ سے کوئی خفیہ رابطہ تو نہیں کیا؟“ یہ سوال میں نے رابعہ
سے کیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس کے بعد وہ دونوں
ماں بیٹیاں اس کے بغیر ہی رخصت ہو گئیں۔

”تو یہ بیٹے! اس قسم ان بے چاری ماں بیٹیوں کے
لے کچھ کر سکتے ہو تو ضرور کرنا۔“ ان کے جاتے ہی امی جان
نے مجھ سے کہا تھا۔ جواب میں، میں نے مسکراتے ہوئے
فرمانبرداری سے سر ہلادیا۔

☆☆☆

رکشے والے نے مجھے کمرشل علاقے کی سروس روڈ پر
اتار دیا۔ اسے فارغ کر کے میں نے کثیر الحزب بلڈنگ کو سر
اٹھا کر دیکھا۔ جس کی پیشانی پر بڑے بڑے حروف میں
مون انٹر پرائز لکھا تھا۔

میں عمارت کے گراؤنڈ فلور میں داخل ہو گیا۔ یہاں
سے مجھے حاصل خان کا آفس فلور نمبر تین معلوم ہوا اور میں
لِفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں حاصل خان کے
شاہانہ طرز کے آفس میں داخل ہو رہا تھا۔

سامنے جہازی سائز کی میز کے عقب میں بڑی سی
ریوالونگ چیئر پر حاصل خان میرا ہی منتظر تھا۔ وہ تنہا تھا اور
یکریٹری نے اسے پہلے ہی میری آمد کی اطلاع دے دی
تھی۔

”آخاہ..... تیمور صاحب! زہ ہے نصیب..... آئیے،
آئیے۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی پُر تپاک انداز میں استقبال
کرنے کے لیے اٹھا اور گرجوٹی سے میرے ساتھ معائنہ و
معافہ کرنے کے بعد مجھے بیٹھنے کا کہتے ہوئے توصیفی انداز
میں مزید بولا۔

”بھئی واہ..... نوجوان! ہم تو تمہارے قائل ہو

مسئلہ یہ تھا کہ شفیق صاحب، طاہر فراز کے خلاف یہ
کیس لے چکے تھے اور اس کی مہانت تو میں نے ہی نہ
ہونے دی تھی۔ ان حالات میں اب میں بانو بیگم کی بھلا کیا
مدد کر سکتا تھا۔ لہذا بولا۔

”دیکھیے، خاتون! آپ کو تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ ہم
یہ کیس لے چکے ہیں۔ اب طاہر فراز کے خلاف استغاثہ،
ایک دم ہی صفائی کا کیس لے لے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس
کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہم ان وکیلوں میں سے نہیں
ہیں کہ جموٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ ہم اپنے
طور پر بھی اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کریں گے کہ
اس کیس میں کس حد تک سچائی ہے۔ اگر طاہر فراز بے گناہ نکلا
تو شفیق صاحب خود ہی اس کیس سے ہاتھ اٹھالیں گے۔“
میں نے دوسرے انداز میں اسے تسلی دینی چاہی تھی۔ مگر وہ
دورں نہ مٹی میری بات پر مزید مایوس اور دشمنی نظر آنے
لگیں۔ میں نے دوبارہ ازراہ تشفی کہا۔

”ویسے ایک بات آپ کو بتا دوں۔ طاہر فراز کا
روپوش ہونا، اسے بہ ذاتِ خود مجرم ثابت کرنے کے لیے
کافی ہے۔“ میری صاف بات پر رابعہ نے پکلی بارلب
کشائی کرتے ہوئے کہنا چاہا۔

”وہ..... وہ..... طاہر.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا
تھا کہ اس کی ماں نے اسے کہنی سے ٹپو کا دیا۔ میرے ذہن
میں جھماکا ہوا۔ یعنی کہ رابعہ یا اس کی ماں بانو بیگم کو معلوم تھا
کہ طاہر فراز کہاں روپوش ہے یا اس کا ان سے خفیہ رابطہ تھا۔
بہر کیف بانو بیگم نے گھبرائی ہوئی نظروں سے میری طرف
دیکھا اور بولیں۔

”بیٹے! یہ تو پاگل ہے..... طاہر فراز ایک سیدھا سادہ
شریف لڑکا ہے، نل جیسی سوچی سمجھی سازش میں گرفتار ہو کر
اس نے بوکلا ہٹ میں ایسی حرکت کی ہے۔“

”دیکھیے خاتون.....!“ میں نے ذرا کھٹکھا کر کہا۔
”اگر آپ کو معلوم ہے کہ طاہر کہاں ہے تو میرا تو مشورہ یہی
ہے کہ اسے نصیحت کریں کہ وہ از خود اپنی رضا کارانہ گرفتاری
پیش کر دے..... کیونکہ یہ اس کے کیس کا ایک انتہائی کمزور
پہلو ہے۔ مگر نہ اس پر کورٹ نے فردِ جرم لاگو کر دی تو پھر
ساری عمر وہ خود کو کڑی سزا سے نہ بچا سکے گا۔“ میں نے
دانت کڑے لفظوں کا سہارا لیا تھا۔ میں نے دیکھا، میری
بات پر دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے ست ہو کر رہ گئے اور
وہ حذبذب نظر آنے لگیں۔

بانو بیگم ایک دم بولیں۔ ”بیٹے..... اتم نے ابھی کہا تھا

لہو کا سراغ

اور اصل مجرم کو کبھی فرار نہ کر رہا ہوں گا۔" میرا خیال تھا حاصل خان ذرا "نیچا" ہو جائے گا لیکن اس کے برعکس وہ اپنی ڈھٹائی اور ضرور پر جمار ہا۔ بولا۔

"تم..... اس طرح..... خود کو ایک جہال میں ڈالو گے بر خوردار.....!" اس کے لہجے میں مجھے سفاک سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں خاموشی سے کمرے سے نکلا تو اچانک کسی کود کد کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ..... صاحبی.....

وہ ایک خوب روٹو جوان کے ساتھ ہنسی مسکراتی ہوئی حاصل خان کے آس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جو خوردوٹو جوان اس کے ہمراہ تھا، اسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ حاصل خان کا بیٹا، جنید تھا۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب صبا کی بھی نگاہ مجھ پر پڑی تھی اور مجھے وہاں دیکھ کے ایک دم ذرا چونکی بھی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک انداز بے رخی کے ساتھ جنید کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

جنید کے ساتھ اسے دیکھ مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کو کسی نے ٹپکی میں جکڑ لیا ہو۔ حاصل خان کے بیٹے جنید کے ساتھ..... صبا کو دیکھ کر پہلے تو مجھے چند لمحوں کے لیے یخین ہی نہیں آیا تھا، مگر حقیقت ایک کریمہ صورت کی طرح اپنی واضح جھلک دکھا چکی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے تو اپنی جگہ ٹھک سا کھڑا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

میرے دل و دماغ میں سانس سانس ہو رہی تھی۔ باہر آ کر میں یونہی اپنے خیالوں میں گم سرور روڈ پر خالی اندھنی کی کیفیت میں آگے بڑھا جا رہا تھا۔ صبا کے وہ برق پاش الفاظ ابھی تک میرا دل و جگر جلا رہے تھے، جب اس نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ کوئی اور ہے۔

"تو کیا صبا..... کے خوابوں کا شہزادہ..... جنید تھا؟ ایک انڈر ورلڈ مافیا سے ریکٹ کا سربراہ، حاصل خان کا بیٹا....."

"نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔ کیا صبا کو ان دونوں باپ بیٹوں کے کالے کرتوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟" چلتے چلتے بے ساختہ میرے منہ سے جھنجھلاہٹ آمیز سی خود کلامیہ بڑبڑاہٹ ابھری۔ یہ رقابت کی آگ تھی یا کچھ اور..... مگر اتنا ضرور تھا کہ میرے دماغ میں آتش فشاں اُبلنا شروع ہو گیا تھا۔

اگر میں صبا کو جنید کے علاوہ کسی اور اجنبی کے ساتھ دیکھ لیتا تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا..... اس کی وجہ یہ تھی کہ جنید جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ حاصل خان کا بیٹا تھا۔

مجھے..... واقعی تم نے اس مردود اور سفاک قاتل طاہر فرازی کی ضمانت منسوخ کروا کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔" پھر ایک لمحہ متوقف ہونے کے بعد جلدی سے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا کیا ہو گے؟"

"جی کچھ نہیں، شکریہ..... میں دراصل اس کیس کے سلسلے میں چند ضروری باتیں پوچھنے آیا تھا۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں..... ہاں پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟" کہتے ہوئے اس نے ہاتھ واپس منہ لیا۔

"میں دراصل آپ کے پاس اس لیے آیا تھا کہ جائے واردات کو ایک نگاہ دیکھ سکوں....." یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی نظریں حاصل خان کے چہرے پر مرکوز کریں۔ وہ میری بات پر پہلے تو ذرا گڑبڑایا پھر کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

"ارے بھئی..... یہ کام تم پولیس کے لیے چھوڑ دو..... وہی بہتر طور پر کر سکتی ہے یہ....."

"خان صاحب! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے کام کرنے کا انداز دوسرے دیکھ لوں ہے بہت مختص ہے۔ میں اپنے طور پر طاہر کے بارے میں یہ سلی کر لیتا چاہتا ہوں کہ آیا وہ واقعی قاتل بھی ہے اور اس سے متعلق شاید کچھ ایسے شواہد مجھے مل جائیں جو اسے عدالت میں قرار واقعی سزا دلوانے میں تاخیر کا سبب نہ بن سکیں۔" کہتے ہوئے میں بدستور کھوجتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر گاڑے رکھیں۔ وہ قدرے خشک لہجے میں بولا۔

"دیکھو، بر خوردار! تم طاہر کی ضمانت منسوخ کروا چکے ہو، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے طاہر کو مجرم تسلیم کر لیا ہے۔ اب بھلا تمہارا ان چکروں میں پڑنے سے کیا مطلب؟" میں اس کی عیار اندھٹائی پر ایک لمحے کو ششدر سا رہ گیا۔ میرے اندر ٹھٹھک سی پیدا ہو گئی۔ پہلی بار مجھے پچھتاوے کے ساتھ اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس ہونے لگا کہ کیا میں ایک بے گناہ کے ساتھ نا انصافی کا مرتکب ہوا ہوں؟ مجھے اپنے اس شبے کی تصدیق ہوتی محسوس ہو رہی تھی کہ طاہر کو پھنسانے کی سازش اور اصل قاتل کو بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"ٹھیک ہے خان صاحب!" میں نے پھر اٹھتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔ "اگر آپ تعاون نہیں کرتے تو کوئی بات نہیں۔ اگر میں نے اپنے طور پر تفتیش کی اور مجھے ظاہر بے گناہ محسوس ہوا تو پھر میں اس کا پورا پورا دفاع کروں گا۔"

”بیٹا.....! حاصل خان کے ساتھ دشمنی ہمیں پہنچی پڑ سکتی ہے.....“ انہوں نے پُرسوج لہجے میں کہا اور میں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے تو میرے ساتھ مل کر اس معاشرے سے کالی بھیرٹوں کو پاک کرنے کا عزم کیا تھا؟“ میری بات پر شفیق صاحب نے اپنے چہرے سے نفیس فریم کی عینک اتار کر میز پر رکھی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

”بیٹے.....! میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، کیا تم میرا بار نہیں اٹھا سکتے.....؟“ شفیق صاحب کے لہجے میں عجیب کمزور پن تھا۔ میں نے جوش و عقیدت سے کہا۔

”انکل.....! میں نے کب انکار کیا ہے، میں نے سب کچھ آپ ہی سے تو سیکھا ہے، میں مرتے دم تک آپ کے ساتھ ہوں اور انکل انتہائی معذرت کے ساتھ، انسان بوڑھا ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے آدرش، اس کے عزائم اور حوصلے بوڑھے نہیں ہوتے.....“

”ہاں بیٹا! تم درست کہتے ہو لیکن بیٹا اس معاشرے میں رہتے ہوئے ہماری بھی مجبوریاں ہوتی ہیں کچھ..... ان بڑے بڑے مگر مچھوں سے لڑنے کے لیے میدان کارزار میں اترنے کے لیے پتھر کا دل اور لوہے کا جگر چاہیے لیکن بیٹا، ہمارے دل اور جگر پر ہمارے اپنوں کی محبت کی موم بھی چڑھی ہوتی ہے، بات اپنی زندگی تک اگر محدود ہو تو قسم رب کائنات کی میں بوڑھا آدمی بھی، حاصل خان کو ناکوں پہنے چودادوں اور آف تک نہ کروں مگر بیٹے! جب میں اپنی معصوم بیٹی صبا کی طرف دیکھتا ہوں تو میں ڈھنڈھ لگتا ہوں، کیونکہ اس کا دنیا میں میرے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے، بالکل اسی طرح تم بھی اپنے بوڑھے ماں باپ اور ایک جوان بہن کا واحد سہارا ہو، ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان سے ان کا حق چھینیں، حاصل خان جیسے بزدل لوگ، سب سے پہلے ہماری انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہمیں جھکنے اور اپنے کالے راستوں سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اب بولو..... کیا میں غلط ہوں؟“ شفیق صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

میں ان کی بات کا مطلب سمجھتا تھا۔ واقعی ہمارے بیروں میں جذباتی رشتوں کی زنجیریں چڑھی ہوتی تھیں۔ معاشرے کی کالی بھیرٹیں بے پناہ اثر و رسوخ اور طاقت کی مالک تھیں، جولا قانونیت کا بازار گرم کرنے کے باوجود بھی بڑے دھڑلے سے رقص طاغوتی میں محو رہتے تھے۔ اندھا قانون ان کا کچھ نہیں لگاڑ سکتا تھا، جبکہ ان کے مقابلے میں

پولیس آج تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں حاصل کر سکی تھی۔ جنید خان خود بھی کچھ کم نہ تھا۔

مجھے اب اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے اب ان دونوں باپ بیٹے کی جڑوں میں اترنا تھا۔ یہ دونوں معاشرے کے ناسور تھے، مگر جب میں یہ سوچتا کہ حاصل خان تو میرا کلائنٹ ہے اور میں نے ایک حد تک اس کی مدد بھی کی ہے۔

میں نے خود کو نسلی دینی چاہی کہ اس میں میرا بھی براہ راست کوئی تصور نہیں، ایڈووکیٹ شفیق صاحب یہ کیس خود ہی لینے پر مجبور ہوئے اور بعد میں انہوں نے یہ کیس مجھے سونپ دیا تھا، لیکن مجھے جیسے ہی اس بات کا شک ہوا جو ابھی حاصل خان سے ملاقات کے بعد مزید پختہ ہو گیا تھا کہ اس کیس میں اتنی سیجائی نہیں ہے جتنی کہ حاصل خان نے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

”دیری ٹائرس تیمور بیٹے!“ شفیق صاحب نے میری آج کی کارگزاری سننے کے بعد توصیفی لہجے میں کہا۔

”میں اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ تاکہ اپنے محسن دوست شعیب کو اس کیس سے ہاتھ اٹھانے کا جواز پیش کر سکوں..... کیونکہ میں نے پہلے ہی اسے یہ بات گوش گزار کر دی تھی کہ مجھے اگر ڈرہ برابر بھی شک ہوا تو میں اس کیس سے ہاتھ اٹھا لوں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر، انکل! آپ اس کیس سے ہاتھ اٹھا لیں، میں ابھی مزید اپنے طور پر مہم جوئی جاری رکھوں گا اور ارم مرڈر کیس کو اپنے تئیں حل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”لیکن بیٹا! تم استغاثہ لڑتے لڑتے..... وکیل صفائی کس طرح بن سکتے ہو؟“

”آپ ظاہر کے حق میں یہ کیس لڑیں سر.....! سارے حقائق میں اکٹھے کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا رہوں گا۔“ میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ جب سے میں نے صبا کو جنید کے ساتھ دیکھا تھا، میرے اندر لاوا پک رہا تھا اور تہیہ کر لیا تھا میں نے کلمہ ایک دن صبا کے سامنے ان دونوں باپ بیٹے کے مکروہ چہروں کو بے نقاب ضرور کروں گا۔

میری بات پر شفیق صاحب چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں بالونیٹلم کی آمد کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔



آسمان سے گرنا سمجھو میں اٹکا

ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے، تم اپنی طرف سے بھی تفتیش جاری رکھو، جب باقاعدہ پیشیوں کا آغاز ہو جائے تو وکیل صفائی بن جانا..... میں کوئی نہ کوئی شق تمہیں ڈیکلیٹ کروا دوں گا۔“ انہوں نے مشورہ دیا اور میں کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔

☆☆☆

حاصل خان کی ڈھکی چھپی دھمکی سے میں مرعوب تو کیا ہوتا بلکہ التامیرے اندر ایک مہر عزم سرکشی نے سرا بھارا تھا۔ میں نے ایڈووکیٹ شفیق صاحب کے توسط سے اپنے تعلقات کا دائرہ کار پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر جہاں داد سے ملاقات کی۔ اس نے میرے ساتھ مکمل تعاون کیا اور مجھے ”بیج دیو“ کے اس ہٹ کا پتا سمجھا دیا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ میں اپنی پرانی سی بانیگ پر دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہاں پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ میں یہاں دوسری بار یا تیسری بار آیا تھا لیکن اس بار میں بہت طویل وقفے سے آیا تھا۔

اس سے پہلے یہاں چند الگ تھلگ ہٹس کے سوا ویرانی سی ہوا کرتی تھی۔ البتہ پرائیویٹ گاڑیوں میں لوگ ایک اکلوتی سڑک پر سفر کر کے یہاں گھومنے یا پکچک منانے آتے تھے مگر اب یہاں ”بیج ہٹس“ کے علاوہ..... باقاعدہ رہائشی اپارٹمنٹس کی بلڈنگیں بھی مختلف ناموں سے بن چکی تھیں اور خاصے کشادہ ڈیلن روڈ بھی بن گئے تھے۔ مقامی لوگوں کی خاصی چہل پھل بھی دیکھنے میں آتی تھی۔ مختلف ڈپارٹمنٹس اسٹور..... اور دن یونٹ بجٹلے بھی تعمیر ہو چکے تھے۔

بہر کیف مجھے اپنا مطلوبہ ہٹ ڈھونڈنے میں کچھ خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مذکورہ ہٹ، ذرا الگ

میری اور ایڈووکیٹ شفیق صاحب کی حیثیت ہی کیا تھی؟ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ..... جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے، مضبوط عزم و حوصلے کے مالک انسان، اللہ پر بھروسہ کر کے اپنا سفیڈ شجاعت..... بجز بیکراں کے سپرد کر دیا کرتے ہیں۔ ابھی تو انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی لاڈلی بیٹی صبا، حاصل خان کے بیٹے جنید کے ساتھ دوستی میں منسلک ہو چکی تھی اور میں ابھی انہیں یہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔

”کیا سوچتے گئے بیٹا.....؟“ مجھے سوچوں میں غلطیاں پا کر وہ شفقت سے بولے۔ میں اپنے خیالات سے چونکا اور کہا۔

”میں سوچ رہا تھا اکل کہ راجو حق پر چلنے والوں کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہے تو پھر کیا ممکن نہیں۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اللہ رب العزت سیدھی راہ پر چلنے والوں کی ضرور مدد کیا کرتے ہیں، لیکن بیٹا! میں نے کہا تھا کہ ہمیں پھر اس کی آزمائشوں کے لیے بھی تیار رہنا ہو گا۔“ ان کی بات پر میں کبھی انداز میں اپنا سر ہلانے لگا، پھر حتیٰ لچھے میں بولا۔

”اکل! میں اب شاید حاصل خان کا کیس نہ لڑ سکوں.....“

”دیش گڈ، تم چھوڑتے ہو تو میں بھی ان سے معذرت کر لوں گا۔“ انہوں نے بھی فیملہ کن لچھے میں کہا۔

”لیکن اکل! آپ کو طاہر فراز کی صفائی کے سلسلے میں تو کیس لینا ہی پڑے گا۔“

”وہ تو تم خود بھی لے سکتے ہو.....“

”مگر میں تو استغاثہ.....“ میں کچھ کہتے کہتے رکا۔

”کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ملزم ابھی تک روپوش

ہائس کے نام کی ایک کثیر الحولہ بلڈنگ بھی نظر آئی، جس میں ان گنت لکڑی رہائشی اپارٹمنٹ تھے۔ میں سامنے بنے دو ہائس میں سے ایک نسبتاً قریب واقع ہٹ کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرا ہٹ غیر آباد تھا۔ ویسے بھی سیزن نہیں تھا جو یہاں آکر لوگ رہتے۔ البتہ دوسرے ہٹ میں مجھے کسی ٹیلی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ ہٹ کے باہر بچے بال سے کھیل رہے تھے اور وہیں ایک جانب دھلے ہوئے کپڑے بھی آگنی پر سوکنے کے لیے جھولتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک چھوٹی سی کار بھی نظر آرہی تھی۔ میں بایک سے اتر کر سب سے پہلے بچوں کی طرف بڑھا۔ بڑے بچے کی عمر آٹھ نو سال کی ہوگی۔ جبکہ چھٹی کی عمر پانچ چھ سال کے قریب۔

”جینا..... تمہارے ابو گھر پر ہیں؟“ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ بلاؤں؟“ وہ معصومیت سے بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لڑکا کھیلنے کے انداز میں دوڑتا ہوا ہٹ کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس طرح ہاتھوں کے پتکے بنائے دوبارہ نمودار ہوا جیسے ہوائی جہاز کی طرح فضا میں پرواز کرنے والا ہو۔ اب اس کے عقب میں ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس شخص بھی چلا آ رہا تھا، اس کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہوگی۔ وہ میری طرف دیکھتا ہوا قریب آیا۔ میں نے خوش اخلاقی سے مسکرا کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام تیمور سجاد ہے۔ میں ایک وکیل ہوں۔“ اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔ ”میں خفیہ پولیس کے لیے بھی فری لانسر کام کرتا ہوں۔“

”جی کیسے..... آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں تاکہ میں آپ کو مخاطب کر سکوں؟“

”جی ہاں، میرا نام احمد قرہ ہے۔“

”بہت شکریہ احقر صاحب۔“ میں نے خوش خلقی سے کہا۔

”آپ وہ سامنے والا ہٹ دیکھ رہے ہیں۔“ کہتے ہوئے میں نے جائے وقوعہ والے ہٹ کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... دیکھ رہا ہوں۔“

”جی ہاں، میرا نام احمد قرہ ہے۔“

”بہت شکریہ احقر صاحب۔“ میں نے خوش خلقی سے کہا۔

”آپ وہ سامنے والا ہٹ دیکھ رہے ہیں۔“ کہتے ہوئے میں نے جائے وقوعہ والے ہٹ کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... دیکھ رہا ہوں۔“

تھک واقع تھا، جو ساحل سمندر سے خاصا قریب بھی تھا۔ ہٹ کے چاروں طرف باڑھ سی پھٹی گئی تھی اور دو پولیس والے وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا پھر انسپکٹر جہاں داد کا حوالہ دے کر ایک سپاہی کو لیے اندر داخل ہو گیا۔

یہ ہٹ صرف دو لکڑی کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک سنگ روم کے طور پر مستعمل تھا جبکہ دوسرا بیڈ روم۔ قتل کی واردات..... سنگ روم سے شروع ہو کر بیڈ روم تک منج ہوئی تھی۔ سپاہی سے جب میں نے پوچھا تو وہ جیسے طوطے کی طرح رٹے رٹائے انداز میں سبق پڑھنا شروع ہو گیا۔

اس نے ایک ایک تفصیل اس طرح بتائی جیسے خود وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے اکتا کر خود ہی جائزہ لینے کا ارادہ کیا اور اس سے درخواست کی۔

”تم ذرا مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو، تاکہ میں اپنے طور پر بھی جائزہ لے سکوں۔“ میری بات پر وہ ذرا حذبذب ہوا پھر ساحل سی خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سب سے پہلے سنگ روم کی طرف آیا اور انتہائی باریک بینی سے ایک ایک شے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں فیملی صوفہ کے علاوہ بید کی چار کرسیاں بڑی تھیں۔ شیشے کے باپ والی ایک میز بھی درمیان میں رکھی تھی۔ یہ سب بے ترتیب مجھے دکھائی دیں۔ فرش پر دبیز قالین بھی بچھا ہوا تھا۔

میں اپنے پاؤں میں فنگر پرنٹ اتارنے والا مخلول ساتھ لایا تھا جسے میں نے جلدی جلدی اتارا تاکہ باہر موجود پولیس والے میری اس حرکت کو نہ دیکھ سکیں، یہی کام میں نے بیڈ روم میں بھی کیا۔

یہاں ایک مسمری تھی اور بس۔ میں یونہی، بیڈ کے نیچے ذرا جھکا تو مجھے ایک بٹن پڑا ملا جو یقیناً قاتل کی شرٹ سے ٹوٹ کر اس وقت گرا ہو گا جب مقتولہ ارم نے مزاحمت کی کوشش کی ہوگی۔ میں نے بٹن کو غور سے دیکھا۔ وہ عام سا بٹن نہیں تھا بلکہ قیمتی شرٹ کا فینسی اسٹائل کا ناٹن میٹلک بٹن تھا۔ میں نے اسے اپنے پاؤں میں محفوظ کر لیا اور پھر دونوں پولیس والوں کا شکریہ ادا کر کے بایک پر آگے بڑھ گیا۔

ذرا آگے جا کر میں رک گیا پھر بایک پر بیٹھتے وقت میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں جائے وقوعہ والی جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی موجود اس ہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں دو ہائس آمنے سامنے تھے۔ ان سے آگے..... ”مہرین

دولوں کی حیثیت چشم دید گواہان کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ جھپٹے پھر پوچھا۔

”آپ ان کے بارے میں یہ بات اتنے یقین کیسے کہہ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ میری مسز کی نئی دلہن سے دوستی ہوئی تھی اور پھر ہمارا ایک دو بار ان کے ہاں آنا جانا بھی ہوا۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر یقیناً آپ کو ان کا پتا بھی معلوم ہوگا، کیونکہ اب تو وہ جا چکے ہیں شاید یہاں سے۔“ میری بات پر اس نے اپنا سر کھجایا پھر گوگو سے لہجے میں بولا۔

”مجھے تو نہیں معلوم، لیکن شاید میری مسز کو پتا ہو، اگر آپ تھوڑا انتظار کریں تو میں جا کر ابھی پوچھ آتا ہوں۔“

”بالکل، بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں لوٹا تو میں نے دیکھا اس کے چہرے پر کچھ اچھن آئیز پریشانی کے آثار تھے اور ساتھ ہی میں نے اس کے ہٹ کے دروازے کو بھی

تھوڑا سرکتے اور عقب سے کسی نسوانی چہرے کی جھلک بھی دیکھی۔ میرے ہونٹوں پر بے تاثری مسکراہٹ لمحہ بھر کو ابھری تھی۔

”وہ..... میری مسز ان کا پتا بھول بیٹھی ہیں اور لکھتا بھی یاد نہیں رہا تھا۔“ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

میں سمجھ گیا، بیوی نے کسی ڈر سے اپنے شوہر نامدار، جواب ”نامدار“ ہی نظر آنے لگا تھا کو ان کا پتا دینے سے منع کر دیا تھا اور ساتھ ہی اسے بھی اپنی طرف سے کچھ

”نصیحت“ فرما ڈالی تھی۔ یہی نہیں اس کی بیگمیلی جیسی صورت سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ بیوی نے اسے گھر کا بھی

ہوگا۔

”دیکھو..... میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ میں تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا مگر انسانی ہمدردی کی خاطر

اگر تم میری مدد کر سکتے ہو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اور اس بد نصیب انسان پر احسان بھی ہو جاتا جو بے گناہ مرنے والا

ہے اور نہ جانے پھر اس کی بددعا یا ”آہ“ کسی کو کھا جائے۔“ میں نے ایک بار پھر جذبات کا سہارا لیتے ہوئے اس

سے کہا تو اس نے ایک نظر مڑ کر اپنے ہٹ کی طرف دیکھا۔ دروازہ اب بند ہو گیا تھا۔ پھر وہ مجھ سے ذرا سرگوشیا نہ لہجے میں بولا۔

”آپ ایسا کریں..... ادھر ”مہرین ہائش“ میں

”تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہاں چند روز پہلے ایک قتل کی واردات ہو چکی ہے۔“

”جی، بالکل، چند روز سے یہاں پولیس وغیرہ جمع رہنے لگے ہیں۔“

”جب یہ واردات ہوئی کیا آپ اپنے اسی ہٹ پر موجود تھے؟“

میرے یہ پوچھنے پر اس کے چہرے کے تاثرات کچھ متغیر سے ہوئے۔ میں نے فوراً زراہ نفسی کہا۔

”اجہ صاحب! آپ بے فکر رہیں، یہ گفتگو ہم دونوں کے درمیان راز ہی رہے گی، دراصل ایک جرم کے پیچھے اصل مجرم کوئی اور ہوتا ہے اور بسا اوقات ہم جسے مجرم سمجھ

رہے ہوتے ہیں وہی درحقیقت قربانی کا بکرا ہوتا ہے۔ آپ مجھ سے تعاون کریں گے تو آپ کی مہربانی ہوگی اور آپ کا یہ احسان مجھ پر نہیں بلکہ ایک بے گناہ کو پھانسی چڑھنے سے

بچانے والا اور پوری انسانیت پر ہوگا۔“

”ہاں، میں اس شام گھر پر ہی تھا۔“ اس نے میری گفتگو کا اثر لیتے ہوئے بالآخر کہا۔

”یہ واردات کس وقت ہوئی تھی؟“

”نہی کوئی پانچ، چھ بجے شام میں ہوئی تھی۔“

”آپ نے ہٹ میں آنے والے جوڑے کو دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

”واردات کے وقت آپ نے کوئی چیخ سنی تھی؟ یا پھر صحن واردات کے وقت آپ کو پتا چلا تھا کہ اندر کیا ہوا ہے؟“

”دیکھیں جی، یہ تو جگہ ہی ایسی ہے کہ یہاں آ کر ہر کوئی ایک دوسرے میں گمن رہتا ہے۔ پھر اندر ہٹ میں کیا ہوا، کون آیا گیا، کسی نہیں معلوم ہوتا۔“

”کیا آپ نے کسی کو اس ہٹ میں آتے جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا؟“

”نہیں.....“ احمد نے کہا پھر لمحہ بھر سوچ کے آگے بولا۔ ”دیکھیے وکیل صاحب! یہ جو سامنے والا ہٹ دیکھ رہے ہیں جو خالی پڑا ہے۔“ اس نے قریب ہی سامنے والے ہٹ کی طرف اشارہ کیا اور میں نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

”اس ہٹ میں ایک لوبیا ہٹا جوڑا رہتا تھا، اس نے اس ساری واردات اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھا تھا، میرا خیال ہے، اگر آپ کا ان دونوں نئے لوہے میاں بیوی سے رابطہ ہو جائے تو یہ آپ کو بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔ بلکہ ان

راجہ کولڈ کارنر کے صمد بھائی سے مل لیں، وہ اختر حسین کا دوست تھا۔ آپ کو ان کا ایڈریس بتا دے گا وہ، یہ ہٹ بھی اسی نے لے کر دیا تھا، انہیں.....“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی بانیگ پر سیدھا راجہ کولڈ کارنر پر آیا۔ وہاں صمد بھائی نامی شخص سے ملا۔ میں نے اس بار معلقات اس سے اختر حسین کا دوست بن کر پتا پوچھا تو اس نے ایک نئی رہائشی اسکیم گل ہیون کا پتا اور فلیٹ نمبر بتایا۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سروس روڈ کراس کر کے جیسے ہی میں شارع عام پر آیا تو اچانک میں نے اپنے تعاقب میں ایک کار کو دیکھا، اس کا رنگ گرے تھا اور اپنے پیچھے ماڈل کی گاڑی تھی۔ میں نے اسے اپنے وہم پر محمول کیا لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی تعاقب میں تھی۔ میں نے بانیگ کے ونڈل پر لگے مرر پر نظریں ڈالتے ہوئے اپنا راستہ بدل لیا۔ اب میں سوچنے لگا کہ آیا ایسی صورت میں مجھے اپنی مطلوبہ منزل کی جانب سفر جاری رکھنا چاہیے یا پھر..... اچانک میرے ذہن رسامیں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔ میں نے بانیگ روک دی اور تعاقب کار پر توجہ دیے بغیر بانیگ کی پیڈرول ٹینک کا ڈھکن کھول کر یوں دیکھنے لگا جیسے فیول کی مقدار چیک کر رہا ہوں۔

حقائقین کی کار بھی ذرا قاصطے پر رک چکی تھی۔ میں نے کسی بہانے سے مڑ کر کارسواروں کے چہروں کا جائزہ لیا اور پھر روانہ ہو گیا۔ کار میں تین افراد تھے۔ اس بار میں نے ذرا پھرتی دکھائی تھی۔ من شارع پر آتے ہی میں نے اپنی بانیگ کی رفتار تقریباً فل اسپیڈ تک کر دی اور جان بوجھ کر رداں رداں ٹریفک کے درمیان سے جگہ بناتا تیز رفتاری سے لٹکا چلا گیا۔ میرا ارادہ انہیں جیل دینے کا تھا۔ یوں میں اپنی سی کوشش میں کامیاب رہا۔ میں نے کار کی نمبر پلیٹ بھی ذہن نشین کر لی تھی لیکن میرے اندر کھد ہدی پیدا ہونے لگی کہ آخر یہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ کچھ اندازہ تو تھا ہی، تاہم..... یہ کام میں نے الگ وقت پر رکھا اور اپنی مطلوبہ منزل کی طرف دوبارہ گامزن ہو رہا۔

اگلے نصف گھنٹے بعد میں گل ہیون کی بلڈنگ کے فلیٹ نمبر نمبریں پر دستک دے رہا تھا۔ ایک ستائیس، اٹھائیس سالہ خوب رو سے نوجوان نے دروازہ کھولا۔

”آپ اختر حسین صاحب ہیں؟“ میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی اختر حسین ہوں۔ آپ کی

تعریف؟“ اس نے شائستہ لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی ابھی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے جیب سے اپنا وزینگ کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

”میرا نام تیور سجاد ہے۔ میں ایک وکیل ہوں۔ سب سے پہلے آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا پولیس سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور میں اپنے کلائنٹ کے ایک کیس کے سلسلے میں خالصتاً اپنے طور پر کچھ معلومات اکٹھی کر رہا ہوں۔ آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

میری بات پر نوجوان اختر حسین ذرا چونکا پھر اس کے چہرے پر ابھرن آمیز بیزاری کے تاثرات ابھرے۔ ”مگر..... مجھ سے آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میرا خیال ہے یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ وہ نوجوان قدرے تذبذب کے بعد مجھے اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ گوجھوٹا تھا لیکن اس کی تزئین و آرائش بڑی نفاست سے کی گئی تھی، جو بلاشبہ خاتون خانہ کے سکھراپے کی رہن منت تھی۔ ایک صوفے پر میں براجمان ہو گیا۔ اختر حسین اندرونی کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اسے پکار کر کہا۔

”جناب اختر صاحب! آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں، بس چند باتیں پوچھنی ہیں۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔“ وہ لوٹ کر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”جی، میں اور میری بیوی۔“ ”بس، آپ دو ہیں؟“ ”جی ہاں۔“

”اچھا.....“ میں ذرا کھنکھار کر دوبارہ مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”آپ اس سے پہلے بیج دیو کے ہٹ میں بھی رہ چکے ہیں۔“ میں نے براہ راست یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ جھوٹ نہ بول سکے اور اسے اندازہ ہو جائے کہ میں پوری معلومات رکھنے کے بعد ہی یہاں آیا ہوں۔

”آں..... ہاں.....“ اس نے متاثر ہو کر کہا۔ ”وہاں آپ کے کسی دوست احمد قمر صاحب کا بھی ہٹ تھا جو آپ کے ہٹ کے بالکل سامنے تھا؟“ میں اسے گھیرنا چاہتا تھا اپنی معلومات کے دباؤ میں تاکہ یہ کسی قسم کی دروغ بیانی سے کام لینے کی کوشش نہ کر پائے۔ حسب توقع

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں اور مارے جوش کے رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے ان تینوں کا حلیہ پوچھا۔

نبیلہ نے بتایا۔ ”ایک خاصا لمبا تڑنگا اور سانولے رنگ کا تھا، اس کے بال کرلی تھے، باقی اس کے دونوں ساتھی پست قامت تھے۔“

”ہوں.....“ میں نے پُرسوج ہکاری بھری۔ مجھے اب یقین ہو گیا تھا کہ طاہر بے گناہ تھا، لیکن ایک بات کی کھٹک ضرور میرے اندر ابھری تھی۔ یہ وہی کھٹک تھی جو اس وقت میرے اندر ابھری تھی جب طاہر کی منگیترا رابعہ اور اس کی ماں بانو بیگم اس کی یعنی طاہر کی بے گناہی وغیرہ کے سلسلے میں میرے ہاں آئی تھیں۔ اب نبیلہ کے تصدیق کرنے پر یہ کھٹک میرے اندر اور سوا ہو گئی تھی کہ طاہر اگر ایک ”مظنی یافتہ“ شخص تھا تو ارم کے ساتھ اس ہٹ میں ”چہ معنی.....؟“ میں اس کیس کو اب تک جتنا آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنا تھا نہیں..... کچھ نہ کچھ گڑبڑ مجھے طاہر فراز کے کردار میں بھی نظر آنے لگی تھی۔

میں نے مزید چند ضروری سوالات پوچھے اور اس نئے نویلے جوڑے کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

digest.library.com

”بھئی برخوردار.....! تم نے تو ”ارم مرڈر کیس“ تقریباً حل ہی کر ڈالا.....“

ایڈووکیٹ شفیق صاحب نے خاصی دلچسپی اور پُرتجسس سے لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں اس وقت ان کے پرائیویٹ جمیئر میں موجود تھا اور اس نئے نویلے جوڑے سے ملنے والی ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر چکا تھا۔ ”لیکن انکل! مقتولہ کے چچا حاصل خان پر شیعہ کے ساتھ ساتھ کچھ گڑبڑ مجھے طاہر کے کردار میں بھی محسوس ہوتی ہے۔“ میری بات پر وہ چونک کر مجھے ہنسنے لگے۔ پھر میں نے انہیں بانو بیگم اور رابعہ کے بارے میں بھی بتایا۔ شفیق صاحب نے سنا تو بھویں اُچکا لیں۔ بولے۔

”اوہ.... اس کا مطلب ہے کہ معاملہ تو واقعی گمبیر ہے۔“

”جی انکل!“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے مزید اور باتوں کا بھی ابھی کھوج لگانا ہوگا، لگتا تو مجھے ایسا ہی ہے کہ طاہر کی کسی جانے انجانے کی غلطی سے اصل قاتل نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش چاہی ہے۔“

چکروں میں پڑنا نہیں چاہتے، لیکن ہمارا ضمیر بھی نہیں مانتا کہ ہم یوں خاموش بیٹھے رہیں۔“ وہ بولی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سانس لی لہجے میں کہا۔

”ایگزیکٹو..... آپ کے بیچ بولنے اور تعاون کرنے سے نہ صرف اصل قاتل گرفتار ہو جائے گا بلکہ ایک بے گناہ بھی پھانسی کے پھندے سے بچ جائے گا۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں، آپ کا نام سیخڑ راز میں رکھوں گا، اس طرح میں اصل قاتل تک پہنچنے کی بھی کوشش کروں گا۔“ میری بات سن کر نبیلہ نے ایک نگاہ اپنے شوہر اختر حسین کی طرف دیکھا پھر بتانے لگی۔

”جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہوگا ہماری شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔ ہم چند راتوں کے لیے ساحل سمندر کے ایک ہٹ میں کرائے پر رہنے لگے تھے۔ ہمارے سامنے والا ہٹ خالی تھا۔ ہمارے ہٹ میں آنے کے اگلے ہی دن میں نے ایک نوجوان جوڑے کو دیکھا، آپ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق وہ دونوں طاہر فراز اور ارم ہی تھے۔ وہ پانچ اور ساڑھے پانچ کا درمیانی وقت ہوگا کہ میں نے ایک گرے کلر کی ٹویٹا کار کو ہٹ کے سامنے رکھتے دیکھا۔“ اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی تو میں گرے کلر کی ٹویٹا کار پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ غالباً وہی کار تھی جس نے یہاں آتے ہوئے میرا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نمبر میں نوٹ کر چکا تھا۔ بہر کیف..... سرِ دست میں خاموشی سے اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

وہ بتانے لگی۔ ”اس کار کے اندر سے تین افراد خاصی عجلت میں برآمد ہوئے اور ہٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ مجھے ان کی حرکات و سکنات خاصی مشکوک معلوم ہوئیں۔ میں اپنے ہٹ کے ایک کمرے کی کھڑکی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ان تینوں کو اندر داخل ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اچانک گولی چلنے کی آواز ابھری۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر میں نے ان تینوں کو خاصی عجلت میں ہٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ جب یہ تینوں اپنی کار میں براجمان ہو گئے تو ذرا ہی دیر بعد طاہر بھی بوکھلا ہٹ میں باہر ان کے پیچھے بھاگا، مگر وہ تینوں کار بھاگا کر فرار ہو گئے۔ طاہر بہت پریشان نظر آ رہا تھا، پھر وہ دوبارہ ہٹ میں داخل ہوا، ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پولیس کی ایک موبائل سائرن بجاتی وہاں آن پہنچی، میں نے دیکھا کہ پولیس اس لڑکی ارم کی لاش اور طاہر کو ہتھکڑیاں ڈالے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ لاش کو دو سپاہیوں نے اٹھا رکھا تھا۔“

تیار کر لیں۔

اب میں اپنی بانیک پر بیٹھا سیدھا بانو بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچا تو دونوں ماں بیٹیاں مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ میں نے انہیں کچھ سلی تو دی لیکن یہ بھی کہا کہ اس سنگین معاملے میں طاہر کی پوزیشن بھی مشکوک ہونے لگی ہے۔ اس پر میں نے پہلے ان دونوں ماں بیٹیوں کا بالخصوص رابعہ کا رد عمل نوٹ کرنے کی کوشش چاہی۔ میں نے محسوس کیا کہ بانو بیگم تو نہیں البتہ رابعہ کچھ زبردستی نظر آنے لگی۔ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی تو میں نے دونوں لہجے میں براہ راست رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے تو اسی روز حیرانی ہوئی تھی جب آپ اپنی امی کے ساتھ میرے گھر مدد کے لیے آئی تھیں۔ تاہم اس وقت اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی تھی مگر میرے ذاتی اور مصدقہ ذرائع سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ طاہر فراز بھی وقوعہ والے روز وہاں موجود تھا تو مجھے کچھ عجیب لگا، کیا آپ کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی؟“

رابعہ نے ایک نگاہ ماں پر ڈالی، جواب اس نئی صورت حال سے پریشان نظر آنے لگی تھی، اس کے بعد رابعہ نے مجھ سے نگاہیں ملاتے ہوئے جواب میں کہا۔

”طاہر اکثر ارم کے بارے میں مجھ سے ذکر کیا کرتا تھا، میں یہی سمجھتی تھی کہ وہ ایسا مجھے چھیڑنے یا جلانے کے لیے کہتا ہے، کیونکہ میں اس پر بہت بھروسہ کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں، لیکن ایک روز وہ بہت پریشان تھا۔ وجہ پوچھنے پر اس نے ارم کا ذکر چھیڑ دیا، تب مجھے بھی تشویش ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس کی بجٹی جو ایک یتیم گھر مال دار لڑکی ہے، اس میں خصوصی دلچسپی لینے لگی ہے۔ ابتدا میں تو سب معمول ہی کی طرح لگا لیکن رفتہ رفتہ وہ جب اس کے گلے کا ہار بننے لگی تو طاہر پریشان ہو گیا، کیونکہ وہ بالآخر پاس کی بجٹی بھی اور کاروبار میں شریک پارٹنر بھی، یوں ایک لحاظ سے وہ بھی اس کی پاس ہی تھی۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اس طرح اسے اپنی اس اچھی خاصی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے جو اسے بڑی مشکلوں اور بھاگ دوڑ کے بعد مل سکتی تھی۔“

رابعہ یہاں تک بتا کر چپ ہو رہی۔ میں ہونٹ بیچنے اس کی سنا رہا، بانو بیگم اپنی پیشانی لٹے لگیں۔ ماحول پر یکا یک اندیشوں بھری ایک سوگوار سی خاموشی طاری ہو گئی

”تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔“ شفیق صاحب بولے۔ ”اب طاہر کا پرآمد ہونا اور اس کا بیان اور بھی ضروری ہو گیا ہے، کیونکہ کل کے سارے شواہد ابھی اسی کے خلاف جاتے نظر آ رہے ہیں۔“ یہ کہنے کے بعد ان کے چہرے پر یک دم فکر کے گہرے سائے نمودار ہو گئے اور وہ چپ ہو رہے۔

”کیا ہوا انکل؟ کوئی بات پریشان کن ہے؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ اب تم استغاثہ کا کیس لڑتے لڑتے ایک دم وکیل صفائی کی طرف ٹرن کر گئے ہو۔“ ”یہی تو ہمارے مشن کا لوگو ہے انکل!“ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ”کہ اگر ہمارا کلائٹ بھی مجرم ثابت ہوا تو وہ بھی سزا سے نہیں بچ پائے گا اور یہ ہم پہلے ہی اپنے کلائٹ کو یاد کر دیتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، اس کی مجھے کوئی پریشانی نہیں مگر حاصل خان کی فیس کا کیا ہوگا؟“

”وہ آپ اُس کے منہ پر دے ماریں اور صاف صاف بتا دیں کہ ہماری ”وارنٹک“ کے باوجود انہوں نے ایک جھوٹا کیس ہمیں کیوں سونپا؟“ میں نے کہا۔ ”فیس واپس کرنا کوئی مسئلہ نہیں لیکن مسئلہ کچھ اور پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے۔“ وہ پُر فکر لہجے میں بولے۔ ”مسئلہ اس کی ناراضی کا ہوگا، اور وہ بھی ایسے میں جب کیس الٹا اس کے خلاف چلے گا۔“

”ہوتا پھرے، ہم اپنے مقصد سے کیوں ہٹیں؟“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ البتہ ان کے چہرے پر ایک اسرار بھری خاموشی سی طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

میرے پاس جائے وقوع سے حاصل کیے گئے فکر پرشس موجود تھے جو میں نے ”ارم مرڈر کیس“ پر کام کرتے ہوئے تفتیشی افسر: پٹر جہاں داد اور پولیس وغیرہ کی نظروں سے چوری چھپے ہٹ سے حاصل کیے تھے۔ ساتھ ہی وہ نان میٹلک (non metallic) بن بھی تھا میرے پاس، جس کے بارے میں میرا قوی خیال تھا کہ وہ قاتل کی ٹیس کا بن ہی ہو سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں موجود اس وقت ان چیزوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے، فکر پرشس کو ایک بڑے دائرے میں لٹو پیر پر رکھ کر پھر آفٹ پیر پر اس کے بعد رنگین لکیر کھینچ کر انہیں واضح کیا اور چار پانچ کا بیاں

دینے لگے۔ پھر بولے۔

”بہر حال، مجھے تم نے بہت متاثر کیا ہے، میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم ظاہر کے حق میں یہ کیس لڑتے تو یقیناً کامیابی حاصل کرتے، مگر تمہارے استغاثہ میں آنے کی وجہ سے۔“

”کوئی بات نہیں سراسر آپ جو ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے ہاتھ مضبوط کروں گا اس کیس کے سلسلے میں۔ آپ بس اصل قاتل کو جتنہ داری تک لے آئیں اور میں در پردہ رہ کر اس کیس کے سلسلے میں آپ کے ہاتھ مضبوط کرتا رہوں گا۔“ میری بات پر دارنی صاحب نے مجھے ایک بار پھر بے اختیار گلے سے لگا لیا۔

اب ہم دونوں بیٹھ کر ظاہر کی سب سے پہلے ضمانت پر رہائی کے لیے آپس میں ڈسکشن کرنے لگے اور ساتھ ہی میں اپنے طور پر آئندہ کی حکمت عملی پر بھی سوچ بچار کرنے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن ایڈووکیٹ شفیق شاہ کے ہاں پہنچا اور انہیں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ مجھے یہ سب کرتے ہوئے افسوس بھی ہوا تھا اور صبا بھی یاد آئی تھی، کیونکہ وہ انہی کی بیٹی تھی، لیکن میں اپنے اصولوں سے سمجھتا نہیں کر سکتا تھا۔ ضمیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور میں اس کا قیدی نہیں بننا چاہتا تھا۔

”میں جانتا تھا تم ایسا ہی کرو گے۔ مگر میرا ایک مشورہ یاد رکھنا۔ دریا میں رہ کر حاصل خان جیسے مگر چھوٹوں سے ہیر دانش مندی کا کام نہیں ہوتا۔“ وہ بولے۔

میں نے حیرت اور صدمے سے شفیق صاحب کی بلند و بالا شخصیت کی عمارت کو ڈھتے دیکھا اور کتنی سے استہزاء یہ کہا۔

”میں سب جانتا ہوں ایڈووکیٹ شفیق صاحب! اس بات کو آپ رہنے ہی دیں یہ خدا حافظ۔“ مجھ سے اور نہیں کہا گیا تھا، وہ میرے مربی اور استاد رہ چکے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے جذبات میں کوئی بدتمیزی یا گستاخی ہو جائے۔ میں نے ابھی تک انہیں ان کی لاڈلی بیٹی کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ آج کل حاصل خان کے بیٹے جنید کے ساتھ دوستی لگائے ہوئے تھی، وغیرہ۔ اب شاید یہ بتانے کا بھی کیا فائدہ تھا؟

کالی بھیڑیں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ اچھے بڑے ہر محلے میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے، نیکی کا راستہ بھی کھلا ہے اور بدی کا بھی۔ خیر بھی ہے اور شر بھی۔ یہ اپنے اپنے ایمان کی بات ہے کہ کون اپنے لیے سیدھی راہ

فرار اختیار کر سکتا ہے، بعد میں رضا کارانہ گرفتاری اس کے حق میں جاتی ہے، وغیرہ۔ تاہم آخر میں تو سینی لہجے میں بولے۔

”واہ بھی برخوردار! تم تو واقعی ایک سچے اور اچھے انسان ثابت ہوئے۔“ وہ سناٹے لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”ابھی تم فی الحال یہ سب اپنے تک ہی محدود رکھنا اور ہاں۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے شفیق صاحب کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔۔۔۔۔؟“

میں نے جواب میں کندھے اُچکا کر کہا۔ ”ہنا نہیں، دیے لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ وہ یہ کیس مولن انٹرپرائزز کے حاصل خان کو داپس کر دیں۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ میری بات پر دارنی صاحب نفی میں سر ہلا کر بولے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔

”عن قریب ہار کونسل کے الیکشن ہونے والے ہیں اور مولن انٹرپرائزز کے روج رواں حاصل خان کی ایک لیگل فرم تک بڑی اپروچ ہے، یہ بات شفیق صاحب بھی جانتے ہیں اس لیے وہ حاصل خان کا یہ کیس نہ صرف ضرور لڑیں گے بلکہ، ہر صورت میں جیتنے کے لیے بھی پورا زور صرف کریں گے۔“

دارنی صاحب نے جیسے میری ساتوں میں دھماکا کیا۔ میرے اندر چوہنیاں سی رہ گئیں۔ شفیق صاحب کی دیانت داری، راست بازی اور فرض شناسی کا جو پیکر میں نے اپنے دل میں ابھی تک بنا رکھا تھا، وہ پاش پاش ہونے لگا۔

”ٹھیک ہے سر! اگر یہ سب جاننے کے باوجود کہ ظاہر ایک بے گناہ انسان ہے، شفیق صاحب نے اس کے خلاف یہ کیس لڑنے کی کوشش کی تو میں ان سے فوراً مستعفی ہو جاؤں گا۔“ میں نے بالآخر لمحہ بھر کی ہک دک سی خاموشی کے بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا اور دارنی صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

”مگر تمہارے تو وہ مربی اور استاد ہیں۔ تم تو ایک عرصے سے اُن کے ساتھ۔۔۔۔۔“

”ایسی جموٹی استاد سے میں اکیلا بھلا ہوں۔۔۔۔۔ سر! جس شخص کے قول و فعل میں اس قدر تضاد ہو اور جہاں اپنا مفاد آیا اور سارے آدرش و اصول ٹائیں ٹائیں ٹس بلکہ ٹش۔۔۔۔۔ میں نے زہر پلے لہجے میں کہا تو دارنی صاحب پُرخیال انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے نیچے جھک

چتا ہے اور کون جڑی۔ تاہم یہ طے ہے کہ بڑے کا انجام بُرا اور سچے کا بول بالا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔۔۔۔۔ وہاں سے میں سیدھا اسپیکر جہاں داد کے ہاں پہنچا اور طاہر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ساتھ ہی خود کو دارنی صاحب کا اپرنٹس بتایا، پہلے تو وہ لیت دلتل سے کام لینے لگا مگر پھر مجبوراً وہ مانتو بھی محض ٹھوڑی دیر کے لیے۔۔۔۔۔

طاہر کو الگ تھلک کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ میں اس سے ملا تو وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا، تاہم جب میں نے اپنے بارے میں اور دیگر مختصر مباحث اس کے گوش گزار کی تو وہ مجھ سے امید بھرے نچے میں بولا۔

”م۔۔۔۔۔ بے قصور ہوں، تیمور صاحب! ال۔۔۔۔۔ لیکن میری ضمانت کا کیا ہوا؟ کہیں مجھے پھانسی تو نہیں لگ جائے گی۔“ اس کے لہجے سے خوف مترشح تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”طاہر! میرے پاس وقت کم ہے، بس اتنا جان لو کہ میں اور دارنی صاحب تمہاری ضمانت جلد رہائی کے لیے بھی کوشاں ہیں، اب تم یہ بتاؤ کہ دو عے کے روز متولہ ارم کے ساتھ بیچ دو بیوٹ میں اس شام کیا کرنے گئے تھے؟“

یہ کہتے ہوئے میں نے نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ ”لیکن مجھے سچ سننا ہے، ڈاکٹر اور وکیل سے کوئی بات چسپائی نہیں جاتی، اس میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ بولو۔۔۔۔۔“

وہ بلا جھجک بولا۔ ”میں نے تو اپنی معیتر راجہ سے بھی کچھ نہیں چسپایا تیمور صاحب! بھلا آپ سے کیا چسپاؤں گا۔ ارم میرے گلے کا ہار بننے لگی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے انگوڑ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ۔۔۔۔۔“

”بس، تصدیق ہو گئی۔“ میں نے ہاتھ کھڑا کیا۔ میں راجہ اور اس کے بیان کو ایک ہی انداز میں مننا چاہتا تھا۔ ”یہ بتاؤ اب۔۔۔۔۔ یہ واردات کیسے ہوئی تھی، تین افراد گرے ٹکر کی ٹویوٹا کار میں آئے، آگے کی تفصیل کیا ہے؟“

وہ بتانے لگا۔ ”دو تینوں ہٹ میں داخل ہوئے اور پھر ایک نے پستول نکال کر ارم پر قائر کر دیا، گولی اس کی پیشانی میں بیوست ہو گئی۔ وہ موقع پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ میں دہشت زدہ رہ گیا۔ وہ مجھے ہٹ سے باہر نہ نکلنے کی دھمکی دے کر طے گئے، مجھے زد و کوب بھی کیا مگر میں نے ہٹ کر کے باہر نکل کر انہیں دیکھا، وہ تو آنا قاتا کار میں جا چکے تھے۔“

یہ بات آف دی ریکارڈ تھی۔ کیونکہ طاہر فراز کے خلاف ایف آئی آر میں طریقہ واردات قتل، گلا گھونٹا درج تھا۔

”تم اس قاتل کو پہچانتے ہو؟ میرا مطلب ہے، کبھی تم نے اپنے پاس کے آفس میں یا وہاں کہیں آتے جاتے یا اس سے ملنے ملتے تو اسے نہیں دیکھا تھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ”قاتل کا حلیہ بتاؤ۔۔۔۔۔؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔ پھر اہل نے وہی حلیہ بتایا جو اختر حسین کی بیوی نیلہ نے مجھے بتایا تھا، یعنی لمبا چہرہ، بال چھوٹی آنکھیں اور چہرے سے ٹھنکی درشتی۔

”اگر تم دوبارہ اُسے دیکھو یا اس کی تصویر تمہیں دکھائی جائے تو تم اسے پہچان لو گے؟“

”بالکل، میں اس کی جھلک بھی دیکھ لوں تو اسے ضرور پہچان جاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں پھر چلا آیا۔

ان دنوں عام سیل فونز کا رواج تھا اور اسمارٹ فونز خال خال تھے، میں اتنا مہنگا فون ان دنوں ان فونز نہیں کر سکتا تھا، تاہم۔۔۔۔۔ اب اس کی ضرورت مجھے محسوس ہو رہی تھی، سو میں نے کسی نہ کسی طرح ایک شاپ سے سیکنڈ ہینڈ اور۔۔۔۔۔ ہلکی کیلگری میں ایسا فون خریدی لیا جس سے کم از کم میں کسی کی لائیو ڈیو تو بتا ہی لیتا یا آواز ریکارڈ کر سکتا۔ بہر کیف۔۔۔۔۔ میں اب اصل قاتل کا کھوج لگانے کے لیے عملی طور پر میدان میں اتر آیا تھا۔

یہ اس کے اگلے روز کا ذکر ہے۔ میں اپنی موٹر بائیک پر مون انٹر پرائز کے دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک سگنل کی سرخ بتی پر مجھے، ایک سرخ رنگ کی نئے ماڈل کی چمچاتی سٹی کار نظر آئی۔ اگلی نشستوں پر حاصل خان کا لاڈلا بیٹا، جنید اور۔۔۔۔۔ صبا موجود تھے۔ صبا کو اس کے ساتھ دیکھ کر میرا دماغ گرم ہونے لگا۔ سینے میں آگ سی بجنے لگی۔ صبا، ایڈووکیٹ شفیق شاہ کی لاڈلی اور اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے پہلے ہی دن سے صبا اور جنید کا ملنا جلنا کھٹکتا تھا۔ اس کی وجہ ممکن ہے رقابت بھی رہی ہو، لیکن ان دونوں باپ بیٹوں کا لفظ حوالہ بھی اس کی وجہ تھی۔ تاہم صبا کو تو میں دل و جان سے چاہتا تھا اگرچہ یہ محبت یکطرفہ ہی تھی۔

سگنل کی بتی سبز ہوئی، کار آگے بڑھی اور میں بھی کچھ موج کران کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ دونوں کن تیاریوں کے ساتھ اور کہاں جا رہے

تھے، انہیں فراموش کر چکے تھے اور مجھے یہ قبول نہ تھا۔“
کہتے ہوئے میں نے دانستہ جہد کی طرف دیکھا تھا۔ وہ
گردن موڑے ہماری طرف گھورے جا رہا تھا اور پھر اس
سے نہر ہا گیا اور اٹھ کر ہمارے قریب آ گیا۔
”کیا ہوا صبا؟ کون ہے یہ؟“ اس نے قریب آ کر
پوچھا۔

”کچھ نہیں، بعد میں بتاتی ہوں۔“

وہ دونوں چلے گئے۔ میں بھی تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد
اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ میں اب دوہری سوچوں کا شکار ہو گیا
تھا۔ ایک طرف ارم مرڈر کیس اور دوسری طرف صبا۔ صبا کا
معاملہ اگر صرف مجھے ناپسند کرنا یا میرا اس سے یک طرفہ محبت
کرنا ہوتا تو شاید میرے لیے اتنی فکر کی بات نہ ہوتی۔ تشویش و
پریشانی کی بات میرے لیے یہی تھی کہ صبا۔۔۔ کرمل
لوگوں کو اپنا ہمدرد سمجھے ہوئے تھی اور میں اسے ان کا اصل چہرہ
دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن شاید میں ابھی اس پوزیشن میں نہ تھا،
تاہم میرا دل بے چینی کا شکار تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے دیر ہو
جائے اور صبا کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔

یہ سوچ کر ایک دن میں نے اسے فون کیا۔ اس کا نمبر
میرے پاس بہت پہلے کا سیوا تھا مگر اس نے فون اٹینڈ نہ کیا
بلکہ یہ فون برقی باکس پر لگا دیا۔ میں پھر بھی نچلا نہ بیٹھا اور
اس سے ملنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہا، بالآخر وہ موقع
مجھے شفیق صاحب کے دفتر کے باہر ہی مل گیا ایک دن۔

وہ کار سے اتر کر اندر جا رہی تھی، میں نے راستے ہی
میں اسے آن لیا۔

”کیا اب بد معاشی پر اتر آئے ہو؟“ اس نے مجھے
گھور کے دیکھا اور نفرت سے دانت نکوس کر کہا۔

”میں اپنے لیے نہیں تمہارے لیے، تمہاری بھلائی
کے لیے ایک بات کہنا چاہتا ہوں صبا!“

”تم اور میری بھلائی؟“ اس نے زہریلے طعنے سے
کہا۔ ”جس احسان فراموش نے اپنے محسن کو بھلا دیا ہو وہ
بھلا۔۔۔۔۔“

”یہ وقت بتائے گا کہ میں کتنا غلط اور صحیح ہوں لیکن
ابھی میری بات سن لو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ ڈالی اور
اسے مختصر ترین الفاظ میں یہ باور کرا دیا کہ ارم کا قتل، جو
حاصل خان کی سگی بیٹی اور جنید کی کزن بھی تھی، ان کے منجر
ظاہر فراز نے نہیں بلکہ حاصل خان نے ہی کروایا ہے، کیونکہ
کچھ عرصہ قبل اس نے اپنے بڑے بھائی کو بھی جو اس کا
شریک کاروبار بھی تھا، ایک ٹریفک حادثے میں مروا دیا تھا،

ہیں؟ یہ تعاقب بہ مشکل نصف پون گھنٹا ہی جاری رہا تھا کہ
انہوں نے کار ساحل سمندر کے ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ
کے قریب جا کھڑی کی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ میں نے
بھی بائیک روک لی اور قریب اسٹینڈ میں لگا دی۔ سائڈ لاک
کی اور جب دیکھا تو وہ ایک میز منتخب کر کے بیٹھ چکے ہیں۔
میں نے بھی دانستہ ان کے قریب والی میز سنبھال لی۔ میں
نے ویٹر کو برگر اور کوئلڈ ڈرنک لانے کو کہا اور بظاہر ان سے
لا تعلق سا ہو کے بیٹھ رہا۔ مجھے کوئی پروا نہ تھی کہ اس کی یا صبا
کی مجھ پر نظر پڑ سکتی تھی۔ میرے ذہن میں کچھ چل رہا تھا اور
میں اسی کے مطابق ہی عمل پیرا تھا۔

ذرا ہی دیر میں ویٹر نے میری میز سرورڈی اور میں
مشغول ہو گیا لیکن گاہے بے گاہے دُزدیدہ نظروں سے ان کی
طرف بھی دیکھتا رہا۔ وہ بہت موڈ میں اور خوش نظر آ رہے
تھے۔ میرا دل اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ شاید یہ ایک فطری
رد عمل کے تحت تھا۔

تب ہی اچانک ایک موقع پر صبا کی نگاہ مجھ پر پڑی،
فقط ایک لمحے کے لیے میں نے اس کے ساتھ نظریں چار کیں
اور پھر برگر کھانے اور کوئلڈ ڈرنک پینے میں مصروف ہو گیا۔
ذرا ہی دیر جیتی تھی کہ میرے کانوں سے ایک مترنم سی گھر
چھتی آواز گرائی۔

”اے مسٹر! تم نے بالآخر اپنی اوقات دکھا دی۔۔۔۔۔“
میں نے چونک کے سر اٹھا کر دیکھا۔ صبا کا چہرہ غصے سے لال
بھجھو کا ہو رہا تھا۔ اس کی بات پر میرے دل کو ایک گھونسا لگا
تھا۔

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”تم نوکری کے لیے جوتیاں چننا پھر رہے تھے
اور میرے پاپا نے ہی تمہیں سہارا دیا اور تم نے انہیں اکیلا
چھوڑ دیا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ یہ بات ہے۔“ میں نے ہولے سے کہا۔
”آپ کی یہ غلط فہمی ہے، صبا صاحبہ! میں نے آپ کے پاپا کو
اکیلا نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا۔“ میں اب
اس کے غصے کی وجہ جان گیا تھا۔ لہذا سنجیدگی سے کہا۔

”اے مستعفی! تم نے دیا تھا۔ پاپا نے تمہیں نہیں نکالا تھا۔“
وہ برہمی سے بولی۔

”اے مستعفی! دینے پر آپ کے پاپا کے دہرے معیار کے
اصولوں نے ہی مجھے مجبور کیا تھا۔ جبکہ میں یہ ثابت بھی کر چکا
تھا کہ ظاہر فراز بے قصور ہے، لیکن انہیں اپنا مفاد شاید زیادہ
عزیز تھا، وہ اپنے آدرش اور اصول جو شاید دکھاوے کے

بھتیجی کو بھی اس نے اسی لیے راستے سے ہٹایا ہے تاکہ بلا شرکت غیرے وہ اس کے باپ کے کاروبار پر قبضہ نہ کر سکے۔ یہ ایک گھناؤنی سازش ہے۔ مزید یہ کہ میں بہت جلد..... اصل قاتل کو بے نقاب کر دوں گا۔ ایڈووکیٹ شفیق صاحب سے بھی میرا اسی بات پر تنازع تھا کہ وہ ساری حقیقت چاہتے ہوئے بھی حاصل خان کے حق میں کیس لڑ رہے تھے۔ وغیرہ۔

حسب توقع صبا نے نہایت نفرت سے میری ان باتوں کو جھٹلادیا اور اس پر کہہا کہ ایسا میں رقابت کی وجہ سے کر رہا تھا۔

میرا بار اتر گیا تھا۔ اب میں اپنے کام میں تنہا ہی کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں اب بھیس بدل بدل کر کسی بہانے، مون انٹرپرائزز کے اندر باہر آنے جانے لگا۔ مجھے اسی آدمی کی تلاش تھی، جس کا حلیہ مجھے نہ صرف اختر حسین کی نو بیاہتا بیوی نبیلہ نے بلکہ طاہر نے بھی بتایا تھا اور خود میں بھی اسے اپنے تعاقب میں دیکھ چکا تھا لیکن مجھے ابھی تک کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔

اس روز وارثی صاحب نے مجھے بڑی پریشان کن خبر دی۔ بولے۔ ”بھئی برخوردار! ہمارا کیس دن بہ دن کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ سرتوڑ کوشش کے باوجود طاہر کی ضمانت نہیں ہو پا رہی۔ بات صاف ہے، تمہیں اب ان دونوں چشم دید گواہوں اختر حسین اور نبیلہ کو منظر عام پر لانا ہوگا۔“ ان کی بات سن کر میں پریشان ہو گیا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ میں ابھی تک کرلی بالوں اور لمبے قد کے آدمی کو تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ارم کا اصل قاتل وہی تھا۔ یوں اس مشکوک آدمی کی تلاش کے سلسلے میں، میں پولیس سے بھی مدد لینا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ حاصل خان جیسا ڈان دولت کے بل بوتے پر ہر کسی کو خریدنے کی سکت رکھتا تھا۔

لہذا میں نے وارثی صاحب کو جواب میں کہا۔ ”لیکن..... سر! انہوں نے مجھے اصل حقیقت بتانے سے پہلے وعدہ لیا تھا کہ میں انہیں منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کروں گا اور یوں بھی اس طرح ان غریبوں کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“

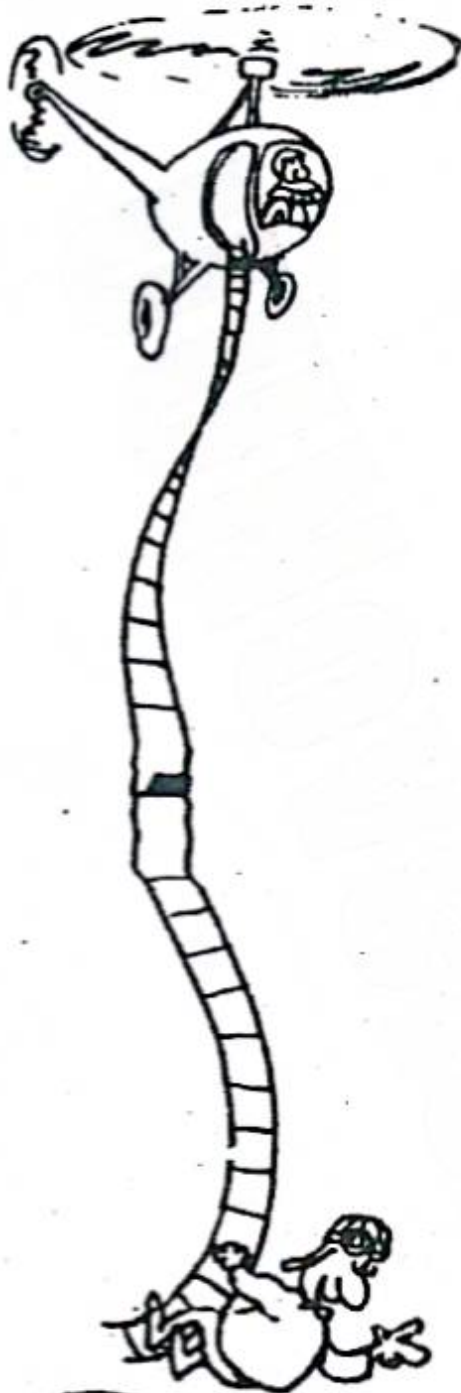
”یہ تو کرنا ہی پڑے گا تمہیں..... اس کے بغیر ہماری دال گھنے والی نہیں ہے۔“ وہ حتی لچے میں بولے۔ ”استغاثہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ شفیق شاہ ہر پیشی پر پیشہ ور گواہ کمزور کر دیتا ہے۔ سارے شواہد طاہر کے خلاف جا رہے ہیں۔“

”اچھا سر.....!“ میں نے سوچنے کے بعد انداز میں کہا۔ ”یہ بات ہے تو میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ بے چارے مشکل سے ہی مانیں گے، ابھی تو انہوں نے اپنی نئی نوکری شادی شدہ زندگی کا آغاز کیا ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ اس نو بیاہتا جوڑے کو ایسے خطرناک حالات کی آگ میں جھونکیں۔“

وارثی صاحب میری تسلی کی غرض سے بولے۔ ”تیور میاں! تم انہیں سمجھاؤ، کہ مقدمہ بالکل اب آخری لمحات میں ہے، جیسا کہ تم نے مجھے بتایا کہ اصل قاتل کا کھوج بھی لگ ہی جائے گا لہذا جیسے ہی وہ دونوں میاں بیوی اپنا بیان عدالت میں ریکارڈ کرائیں گے تو پولیس بھی عدالت کے حکم پر اصل قاتل کو چھاپنے میں چابک دستی سے کام لے گی۔“ میں اگلے ایک گھنٹے میں ایک بار پھر ان دونوں کے سامنے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں پریشان سے ہو گئے۔ میں نے انہیں ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔ وہ دونوں خوف زدہ سے نظر آنے لگے۔ لیکن پھر میرے پیہم اصرار پر بالآخر مان گئے۔ میں نے بد دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں پورے تحفظ کا بھی یقین دلایا۔

میں نے متوقع قاتل کی تلاش پہلے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ شروع کر دی۔ میں ابھی اس کی تلاش سے باپوس نہیں ہوا تھا اور بدستور مون انٹرپرائزز بہانے بھیس بدل کے آتا جاتا رہتا تھا، جانے کیا بات تھی کہ میرا دل کہتا تھا مجھے میرا مطلوبہ آدمی ادھر سے ہی دستیاب ہوگا۔ وہی ہوا..... یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی، اگلی پیشی میں دو روز تھے۔ اختر حسین اور نبیلہ کو بیان کے لیے عدالت میں پیش ہونے میں ابھی دو دن تھے۔ میں نے گرے کلر کی کار کو اس وقت مون انٹرپرائزز کے باہر پارکنگ میں رکھتے دیکھا جب میں ناکام وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا۔ گرے کلر کی کار تو بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن میں چونک ضرور گیا تھا مگر ظاہر کیے بغیر میں چند قدم آگے نکل گیا اور ایک ستون کی آڑ میں ہو کر کار پر نظریں جمادیں۔

اندر سے پہلے ایک ٹمکنے قد کا آدمی برآمد ہوا۔ اس کے بعد ایک لمبا شخص باہر نکلا، اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں جیسے رک رک کر چلنے لگیں۔ یہی میرا مطلوبہ شخص تھا..... جو اختر اور نبیلہ کے بتائے ہوئے حلیے پر پورا اترتا تھا۔ وہ کوئی آدمی گھٹنے بعد لوٹا اور اسی کار میں اپنے ٹمکنے ساتھی کے ساتھ واپس ہوا اور میں اپنی بانیک پر اس کے تعاقب میں لگ گیا۔



القصہ..... وہ وہاں سے ایک رہائشی کالونی میں بنے کنگ ٹاورز نامی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکا اور میں بھی بائیک سے اتر کے پیدل اندر چلا گیا۔
اس کا اپارٹمنٹ دوسرے فلور پر تھا۔ میں نے بہت محتاط ہو کے اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر اس کا اپارٹمنٹ نمبر اور پتا ذہن نشین کر کے واپس ہو لیا۔

میں نے اسی وقت وارثی صاحب سے ملاقات کر کے انہیں قاتل کے بارے میں بتا دیا۔ وہ متوقع کامیابی پر پرجوش نظر آنے لگے اور پھر اس کے اگلے ہی دن وارثی نے عدالت کی طرف سے متعین کردہ تفتیشی افسر رحمان خاں کو، (جن کے بارے میں ان کا خیال تھا وہ ایک فرض شناس اور ایمان دار پولیس آفسر تھا) ہدایت کر دی کہ یہ مشکوک شخص ہے اور اسے فوراً گرفتاری اور سرچ وارنٹ عدالت سے حاصل کر کے عمل کر ڈالے۔ اس متوقع طرز کا نام گرفتاری کے بعد مدثر رضا معلوم ہوا۔ اپنی اچانک گرفتاری پر وہ بہت تلملایا ہوا تھا۔ وارثی صاحب کے یہ قول..... یوں پیشی کے روز اسے اور دونوں چشم دید گواہوں اختر حسین اور نبیلہ کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ یہ دونوں گواہ یقیناً مدثر اور حاصل خان کے لیے ہی نہیں بلکہ استغاثہ وکیل ایڈووکیٹ شفیق شاہ کے لیے بھی بالکل غیر متوقع ثابت ہوئے۔ کیس میں پچھلے مچ گئی اور وارثی صاحب کی درخواست ضمانت عدالت نے منظور کرتے ہوئے تفتیشی افسر انسپکٹر رحمان کے سپرد کیا اور سات روز کے ریمانڈ پر طرز مدثر رضا کو حوالہ دے پولیس کر دیا گیا۔

اب مجھے اور وارثی صاحب کو کیس جیتنے کی پوری امید ہو چلی تھی۔ اگلی پیشی مایوس کن اور ہمارے لیے ”شاکنگ“ ثابت ہوئی۔ تفتیشی افسر رحمان خاں، طرز مدثر سے نہ اقبال جرم کروایا تھا اور نہ ہی آئینہ برآمد ہوا۔ یہی نہیں اس کے بعد والی فوری پیشی پر ایک اور بمیائیک انکشاف ہوا۔ نبیلہ اپنے بیان سے مکر گئی۔ میں حاضرین عدالت کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ مجھے پرتو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ خود وارثی صاحب کا منہ کھلا رہ گیا۔ انہوں نے وٹس باکس میں کھڑی نبیلہ کو گھورتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”تم معزز عدالت سے یہ کون سا مذاق کر رہی ہو بی بی؟ اس سے پہلے تم نے بیان دیا تھا کہ طرز مدثر رضا کو آرام کے ہٹ میں جاتے ہوئے تم نے دیکھا تھا اور اب.....“
”آجیکشن پور آنرز“ اچانک وکیل استغاثہ شفیق شاہ نے اعتراض اٹھایا۔

”آئیگنیشن سسٹم“ جج صاحب نے اعتراض منکھور

کیا تو شفیق صاحب بولے۔

”فاضل وکیل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ معزز گواہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے اور اثر انداز ہو۔ بعض مرتبہ گواہ اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بالآخر جج بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

جج صاحب نے وکیل صفائی کو سرزنش کر ڈالی۔ پھر بارعب لہجے میں نبیلہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”تمہارے بیان بدلنے کی وجہ کیا ہے؟“ جواب میں نبیلہ نے جو کچھ کہا، اس پر نہ صرف میرا بلکہ واریٹی صاحب کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا۔ نبیلہ نے عدالت کو محفل لہجے میں بتایا کہ اس کا شوہر بیمار تھا۔ اس کے علاج کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے، اس لیے اس ضرورت کے پیش نظر، جھوٹی گواہی کے لیے مجبور ہونا پڑا۔“

جج صاحب نے کڑی نظروں سے واریٹی صاحب کی طرف گھور کر تیز لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا قصہ ہے؟“ واریٹی صاحب بے چارے نبیلہ کے اس اچانک کا یا کلب بیان پر پریشان ہو گئے تھے۔ مگر پھر فوراً ہی خود پر قابو پا کر پُر اعتماد اور محسوس لہجے میں بولے۔ ”پورا آئرز۔۔۔۔۔! یہ جھوٹ بول رہی ہے، میں سمجھتا ہوں، گواہ کسی قسم کے دباؤ کے زیر اثر ہے۔“ پھر وہ نبیلہ کی طرف متوجہ ہو کر سخت لہجے میں بولے۔

”بی بی! جانتی ہو تم کہ معزز عدالت میں ایسا بیان دینے پر تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے؟“

”پورا آئرز۔۔۔۔۔! شفیق صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے فاضل دوست وکیل صفائی کی یہ آخری چال بھی ناکام گئی۔ اب عدالت سے درخواست کروں گا، اس بحث میں اُنھے بغیر اب معزز عدالت اپنا فیصلہ سن کر ملزم طاہر کو قریب واقع سزا سنا دے۔“ میں بُت بناتے کارروائی دیکھ رہا تھا۔ میری حالت کانٹو تو بدن میں لہو نہیں، جیسی ہو رہی تھی۔ ادھر اچانک جیسے واریٹی صاحب کے ذہن میں ایک پوائنٹ آیا اور انہوں نے ایک آخری سوال گواہ نبیلہ سے پوچھنے کی جج صاحب سے استدعا کی۔ جج صاحب نے گہمیر آواز میں اجازت دے دی۔

”محترمہ! کیا یہ بتائیں گی معزز عدالت کو کہ بہ قول تمہارے جب، تمہیں ضرورت کے پیش نظر جھوٹی گواہی دینے کے لیے مجبور کیا گیا تو آخر وہ کیا وجہ تھی جس سے تمہیں اصل سچ سے منحرف ہو کر جھوٹ نماج بولنا پڑا؟“

”آئیگنیشن پورا آئرز“ وکیل استیاض نے اعتراض اٹھا دیا۔

”آئیگنیشن اور رول۔“ جج صاحب نے اعتراض

مسترد کر دیا اور واریٹی صاحب کو سلسلہ سوالات جاری رکھنے کو کہا۔ وہ شکریہ کہہ کر دوبارہ گواہ نبیلہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جی محترمہ! اب آپ یہ بتائیں گی کہ جب آپ کی ضرورت بھی پوری ہو گئی تھی تو پھر آپ کو یہ جھوٹ نماج کیوں بولنا پڑا؟“

ان کے سوال پر میں نے خود بھی نبیلہ کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ شدید دباؤ کے زیر اثر تھا۔ وہ نحیف سی آواز میں یہ مشکل بولی۔

”میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی تھی۔“

”کیا ملامت کی تھی؟ کیونکہ ضمیر بھی کسی اہم مگر ناخوش گوار واقعے پر ہی جاگا کرتا ہے عموماً۔ تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا۔“ واریٹی صاحب نے اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ حاضرین عدالت کو جیسے یک دم سانپ سونگھ گیا۔ خود میں دم بہ خود تھا۔ نبیلہ کے جواب سے کا یا پلٹ ہو سکتی تھی۔ واریٹی صاحب نے اپنی ذہانت سے اسے پھنسا لیا تھا۔ نبیلہ کے ہونٹ مرتعش ہوئے، وہ نحیف سی آواز میں بولی۔

”اس لیے کہ۔۔۔۔۔ جب میں نے روپوں کی خاطر پہلے، جھوٹی گواہی دی اور بعد میں انہی روپوں سے جب میں اپنے بیمار شوہر کی دوا خرید کر گھر پہنچی تو۔۔۔۔۔ تو میرا شوہر آخر حسین مرچکا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ میں پھر دم بہ خود ہو رہا۔ واریٹی صاحب کا یہ اہم نکتہ بھی ضائع چلا گیا۔ اُن کا چہرہ شکست کے احساس تلے گہرے سنائے میں ڈوب چکا تھا۔ میں نے بہ غور نبیلہ کا چہرہ دیکھا۔ جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو سچے محسوس ہوئے، اس وقت بانو بیگم اور طاہر کی سنگیتر رابعہ بھی عدالت میں موجود تھیں۔ پھر ذرا دیر بعد جج صاحب نے اپنا آخری فیصلہ دیتے ہوئے بالآخر طاہر کو ارم کے قتل کے سنگین جرم میں سزائے موت سنا دی۔

رابعہ چلا آئیں اور صدمے کے سبب بے ہوش ہو گئی۔ خود میں ایک بے گناہ کو پھانسی کی سزا ملنے دیکھ کر گنگ ہو گیا۔ طاہر تو پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں قاتل نہیں۔۔۔۔۔ جج صاحب۔۔۔۔۔! میں قاتل نہیں ہوں۔ مجھے اللہ کی قسم۔۔۔۔۔ رسول اللہ ﷺ کی قسم۔۔۔۔۔“ مگر جج صاحب اپنے جیمبر میں جاکے تھے۔ پولیس کے اہلکار طاہر کو قابو کیے باہر کھڑی موہاٹل کی طرف ٹھینٹے

دلہن کی شفق کے بجائے موت کی زردی پھیل گئی تھی۔ میری کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

”مم۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس نے انتہائی اور اکتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے کان اس کے قریب کر لیا۔

”اے۔۔۔۔۔ آخر کو اغوا کر لیا گیا تھا۔“ وہ ٹوٹی ہوئی سانسوں کے درمیان پہ مشکل بتانے لگی۔ ”اور مجھے دھکی دی گئی تھی کہ اگر میں نے عدالت میں اپنا۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ پہلا بیان نہ بدلاتو۔۔۔۔۔ میرے۔۔۔۔۔ شوہر کو قتل۔۔۔۔۔ قتل کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے جھوٹ۔۔۔۔۔ یوں پڑا عدالت میں۔۔۔۔۔ پھر بعد میں۔۔۔۔۔ آخر کو چاقو کے وار سے ہلاک۔۔۔۔۔ کر دیا گیا اور۔۔۔۔۔ اور ابھی ذرا دیر پہلے ہی مجھے۔۔۔۔۔ بھی ان۔۔۔۔۔ ظ۔۔۔۔۔ ظالموں نے دھوکے سے زہر دے ڈالا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ نبیلہ۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا لیکن اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی روح نفسِ غصری سے پرواز کر چکی تھی۔ میرا دل تم سے بھر گیا۔ اس بے چاری کے ہاتھوں کی حاک کی مہک بھی نہیں مگنی تھی کہ وہ جان سے ہی چلی گئی تھی۔ کیا بد نصیب نوبیا ہوتا جوڑا تھا کہ جس نے ابھی ایک دوسرے کی سگت میں نئی زندگی کی ابتدا ہی کی تھی، ابھی تو ان کی انگلیں جواں تھیں۔۔۔۔۔ ابھی تو ان کی مسرتوں بھری زندگی کا آغاز ہوا تھا کہ موت کے ظالم اور سفاک شکنجے نے انہیں دبوج لیا تھا۔

میں بگولے کے مانند قلیٹ سے نکلا اور بایک پر بیٹھ کر سیدھا وارثی صاحب کے پاس پہنچا۔ انہیں اس سانحے کی اطلاع دی لیکن انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

میں از حد مایوس تھا۔ غم اور جھنجھلاہٹ کے باعث میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ حاصل خان اور عدو کی بیٹیاں نوج ڈالوں۔ میں تصور میں ان دونوں مردودوں کو کامیابی کا جشن مناتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں بہت بد دل ہونے لگا۔ میں نے دکالت بھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا، ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تھا جو میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑے دے رہا تھا، ابھی تو طاہر کے بے گناہ پھانسی چڑھائے جانے کی اذیت سہتا باقی تھا۔ شاید وہ بھی کچھ چھپائے ہوئے تھا، کیونکہ ارم کے ساتھ ہٹ پر اس کا موجود ہونا اس کی کسی بدعتی کی طرف اشارہ کر رہا تھا، تاہم بے گناہ پھانسی چڑھ

لگے۔ وارثی صاحب نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بالو بیکر اپنی بد نصیب بیٹی کو سنبھالنے لگیں۔ نبیلہ باہر نکلتے ہی غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری رگوں کا سارا خون جیسے کنپٹیوں پر گردش کرنے لگا تھا۔ اصل قاتل صاف فک نکلا تھا اور بے گناہ کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی۔ اندھے قانون کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی تھی۔ مجھے نبیلہ پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی نبیلہ کا شوہر آخر حسین بہ قول اس کے، بیماری کی وجہ سے مرا تھا یا نہیں۔

میں غم و غصے سے بھرا ہوا اس کے قلیٹ پر پہنچا تو اچانک میں بُری طرح ٹٹکا۔ بلڈنگ کے مین گیٹ کے قریب میں نے اسی گرے لکڑی کار کو دیکھا، جو قاتل ٹولے کی تھی اور یہی نہیں جب میں اپنی بایک کو سائڈ اسٹینڈ پر لگانے لگا تو جب تک میں نے دو افراد کو تیزی سے بلڈنگ کے اندر سے نکلتے دیکھا۔ وہ دونوں خاصی غلٹ میں تھے اور ان میں کرلی بالوں والے اس لیے تڑنگے آدنی کو جو قاتل مدثر تھا جسے اتنی جلد یہاں دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ کورٹ سے رہا ہوتے ہی اس نے سیدھا اپنے سانحے کے ساتھ یہاں کا رخ کیوں کیا تھا؟ ممکن تھا نبیلہ کے اصل بیان سے مکر جانے پر حاصل خان کے کہنے پر وہ اسے کسی بڑے انعام سے نوازنے کے لیے آیا ہو۔

لیکن۔۔۔۔۔ پھر اچانک ہی میرے اندر ایک کھٹک اُبھری۔۔۔۔۔ ایک خیال۔۔۔۔۔ ایک وحشت ناک خیال میری چھٹی حس کو پھڑکانے لگا۔ ان کی غلٹ دیکھ کر۔۔۔۔۔ بعد میں میرے اندر یہ احساس اُبھر اُٹھا۔ یہ سب سوچنے کے دوران وہ دونوں کار میں بیٹھ کر جلدی سے رنو چکر ہو گئے اور میں تقریباً تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور۔۔۔۔۔ سیدھا نبیلہ کے قلیٹ کا رخ کیا۔

وہاں پہنچا تو میرا اندر لرز گیا۔ نبیلہ کے قلیٹ کا دروازہ چوہٹ کھلا تھا، میرا تھا ٹٹکا۔۔۔۔۔ دوڑ کر اندر داخل ہوا اور سامنے کا روح فرسا منظر میرا منہ کھنکھناتا۔ نبیلہ قالیں پر لیٹی اپنی گردن پر ہاتھ رکھے اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ میں جلدی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کی باجھوں سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔

میں نے فوراً اس کے بے سندھ سے وجود کو اٹھانا چاہا تاکہ قریبی اسپتال لے جا سکوں مگر نبیلہ نے کپکپاتی آواز میں مجھے منع کر دیا۔ اس کے گناہ چہرے پر اس وقت نوبیا ہوتا

جانا الگ بات تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا اس شہر سے ہی کہیں دور چلا جاؤں جہاں مجھے بے گناہ طاہر کے پھانسی چڑھتے ہوئے دیکھنے چلانے کی ہازمیت تک سنائی نہ دے۔

”کچ کا بول بالا، سانچ کو آج نہیں اور سچائی کی ہمیشہ فتح۔۔۔۔۔۔ یہ سب آج مجھے محض کتابی باتیں معلوم ہونے لگی تھیں۔ سب بے کار ثابت ہوا تھا مگر۔۔۔۔۔۔ یہ دنیا تھی، ایسی دنیا جہاں انہونی بھی ہوئی میں بدل جاتی ہے۔“

☆ ☆ ☆

ایک روز میں وارثی صاحب کے آفس میں بیٹھا سخت بدولی کی کیفیات سے گزر رہا تھا کہ اچانک صبا۔۔۔۔۔۔ وہاں آن پہنچی۔ اس کی غیر متوقع اور وہ بھی وارثی صاحب کے آفس میں آمد پر میں بڑی طرح چونکا بلکہ وارثی صاحب بھی ہٹکا بکا رہ گئے۔ تب ہی میرے چہرے پر غمی کے آثار ابھر آئے۔ ایسا آج پہلی بار ہوا تھا کہ مجھے صبا سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا صبا کا گھنا سا چہرہ بڑی طرح ستا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون دبا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے فون میز پر ہمارے سامنے رکھ دیا اور پھر ایک کرسی پر نڈھال سی ہو کے بیٹھ گئی۔ میں اور وارثی صاحب اب کم صم سے اس کے چہرے کی طرف نکلے جا رہے تھے۔

وہ بولی۔ ”میرے چپانے حاصل خان کے ساتھ جو خفیہ کٹ منٹ کی تھی، اس کی ساری تفصیل ان کی اپنی ہی زبانی اس میں موجود ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے سیل فون کا اسکرین آن کر دیا۔

اس میں ریکارڈ شدہ گفتگو جو باپ بیٹی کے درمیان ہوئی تھی، سنائی دینے لگی۔ جس کے مطابق۔۔۔۔۔۔ حاصل خان نے ہی اپنے بد معاش آدمی مدثر کے ذریعے اپنی بیٹی ارم کا قتل اس وقت کر دیا جب طاہر نے خود ان کی راہ آسان کر دی۔ طاہر کی جس بد نظمی کا راز میرے اندر ابھی تک کھنک رہا تھا، وہ یہی تھا کہ طاہر اپنی معیتر کے ساتھ دھوکا کر رہا تھا۔ جانے کس طرح اس کی ارم سے دوستی ہو گئی۔ وہ خود بھی لالچی ثابت ہوا، اس نے سوچا ارم جو ایک لحاظ سے اس کی باس بھی تھی، اگر اس میں دلچسپی لے رہی ہے تو اسے زندگی کا یہ سنہری موقع گنوا نا نہیں چاہیے؟ لیکن یہی بات اس کے گلے میں انگ گئی تھی۔

حاصل خان کو جب ارم اور طاہر کی اس دوستی کا علم ہوا تو اس نے مدثر کو ساری ”ہدایات“ دے کر موقع کی تاک میں رہنے کا کہہ دیا اور وہ موقع اسے سچ و دوپہ کے ہٹ میں

بالآخر مل گیا۔ جہاں تک ایڈووکیٹ شفیق شاہ کی بات تھی تو انہوں نے حاصل خان سے ہماری رشوت اور بار کونسل کے انکیشن میں جیت کے لالچ میں آکر اس کا ساتھ دیا تھا۔

یہ سب ہوا کیسے تھا، اس کے بارے میں صبانے جو کچھ بتایا، وہ میرے لیے حیران کن اور اس سے زیادہ خوش گوار ثابت ہوا۔ کیس کی جیت کے بعد سوئے اتفاق، صبا، جنید کے ہمراہ اس کے گھر پر ہی شان دار ڈنر پر مدعو بھی اور اسی وقت صبا کے پاپا شفیق شاہ کا فون حاصل خان کو موصول ہوا صبانے کسی طرح جانے انجانے میں اپنے پاپا اور حاصل خان کے درمیان ہونے والی وہ گفتگو سن لی جس میں اس کے پاپا، حاصل خان کو جیت کی مبارک باد دینے کے علاوہ۔۔۔۔۔۔ اسے اپنا ”وعدہ“ یاد دلانے کا بھی کہہ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان گفتگو کچھ اس طرح ہوئی کہ صبا چونک گئی۔

اسے اب سمجھ میں آیا کہ میں نے ان کی نوکری کیوں چھوڑی تھی۔ تب صبانے اس کا کھوج لگانے کا معصم ارادہ کر لیا اور گھر پہنچ کر اس نے باپ سے براہ راست بات کرنے کے بجائے ذرا چالاک دیکھاتے ہوئے خود کو بھی ان کی طرح موقع پرست اور لالچی ظاہر کرتے ہوئے پہلے تو جھوٹ موٹ جنید سے شادی کے بارے میں رائے لی، جس پر شفیق شاہ خوش ہوئے، اس کے بعد انہی کے رنگ میں صبانے کسی طرح باپ کے منہ سے یہ سب اُگھوا لیا، جو اس نے اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا۔

صبانے مجھ سے معافی مانگی کہ اس نے مجھے غلط سمجھ لیا تھا حقیقت وہی تھی جو میں اسے پہلے ہی گوش گزار کر چکا تھا۔

”نہیں صبا! تم غلط نہیں ہو۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ضمیر زندہ ہے اور جن کا ضمیر زندہ ہوتا ہے، وہ بھی غلط نہیں ہو سکتے۔“ میری بات پر اس نے بڑی محبوبیت سے مسکرا کر اپنی گھنیری پٹلیں جھکا دیں۔

القصہ۔۔۔۔۔۔ اس کیس نے ایک دم کا یا پلٹ دی۔ طاہر آزاد تو ہو گیا لیکن۔۔۔۔۔۔ رابعہ کو جب اس کی یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ طاہر نے اسے دھوکا دینے کی کوشش چاہی تھی تو باوجود اس کے معافی مانگنے کے رابعہ نے خود ہی منگنی توڑ ڈالی۔ طاہر کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ بے گناہ پھانسی چڑھنے سے بچ گیا تھا، وہ اب قانون کا تو نہیں رابعہ کا بہر حال مجرم تھا، ایک بے جرم مجرم۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ صبا۔۔۔۔۔۔ وہ اب میری تھی۔ میری بیٹی اور آخری محبت۔۔۔۔۔۔

❖ ❖ ❖



میراث

زویا صفوان

یہ وطن خوابوں کا مریہ... طویل جدوجہد اور لاکھوں جانوں کے نذرانے کے بعد حاصل ہونے والی میراث ہے... جگہ جگہ دل میں حراشیں ڈالتی یادیں ہیں... کہیں دامن سے لپٹے بھولے ہوئے لہجوں کی ناک ہے... نہ جانے کتنے فرعونوں سے الجھے ہوئے لہجوں کی ہے... نہ جانے کتنے موسموں کی گرد ہے... اسی گرد میں دوست دشمن کے چہرے چلے ہیں... بدلتی دنیا کے ساتھ بٹ تلی سازشوں کے راستے بدل رہے ہیں... ایک ایسی ہی داستان جس کا پس منظر کچھ اور تھا اور پھر منظر بدل گیا اور... صدیوں سے دلوں میں پلنے والی نفرت اور وحشت کا خوفناک شاخسانہ... وقت گزرنے کے ساتھ یہ نفرت ختم نہیں ہو رہی تھی... اس کے انداز... رنگ ڈھنگ بدل رہے تھے... نسل در نسل اپنی وحشت کے خواب منتقل کرنے والے سازشی ذہنوں کی رنگین سنگین منصوبہ سازیاں... وراثت میں نفرت کی میراث چھوڑنے والے سفاک دولت مند کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سونے سے پہلے صبح کا منظر نامہ کیا ہوگا... شاید اب کے سر رہی چلا جائے دستار کے ساتھ...

خالد واقعات و حالات کے تناظر میں لکھی گئی ایک کرب ناک حقیقی کہانی

کھانے کی میز پر مکمل خاموشی طاری تھی۔ دو ملازمین بنا آہٹ مستعدی سے برتن میز پر سجا رہے تھے۔ وہ ترجمی نگاہوں سے اپنے مالکان کو دیکھتے ہوئے حتی الامکان چوکی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہیں علم تھا کہ معمولی سی غلطی بھی ان کی شامت اعمال کا سبب بن جائے گی۔ مرکزی کرسی پر بیٹھے رچت کی نگاہیں اپنے قیمتی اور جدید ترین موبائل فون کی چمکتی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ آنکھوں کی سکرٹی اور پچھلی پٹیوں سے اس کا اٹھاک واضح

تھا۔ رجت کی عمر تقریباً سولہ سال تھی۔ اس کی متوازن صحت، مضبوط جسامت اور تازہ دم چہرے کے باعث اصل عمر کے بارے میں اندازہ لگانا دشوار ہی ہوتا تھا۔ رجت سے پہلی بار ملاقات کرنے والے افراد اسے پچاس برس کا ہی سمجھتے تھے۔ رجت کے دائیں جانب رکھی کرسی انجلی کے لیے مخصوص تھی۔ چھبیس سالہ انجلی بھی اس لیے موبائل فون پر ہی نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہوں میں دبا دبا جوش اور اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ انجلی کا سراپا نہایت دلکش اور زہد شکن تھا۔ کمر تک طویل بھورے گھنے بال، ہلکی بھوری آنکھیں، چمک دار جلد اور شفاف رنگت شخصیت کو مزید چمکش بناتے تھے۔ اس کے ہر ایک انداز سے اعتماد اور دبدبہ جھلکتا تھا۔

”پوچھا کہاں ہے؟ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟“ رجت نے فون سے نگاہیں ہٹا کر انجلی کی جانب دیکھا۔

”میری تو ان سے ابھی تک ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“ انجلی نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

”میں نے بھی کافی دیر سے نہیں دیکھا اسے۔ کہاں رہ گئی ہے؟“ رجت کو تشویش ہوئی۔

اس نے گردن ترچھی کرتے ہوئے اپنے بائیں سمت دروازے سے باہر نگاہ دوڑائی اور ایک جانب کھڑے ملازم سے مخاطب ہوا۔

”میڈم کہاں ہیں روشن؟“

”وہ اپنے روم میں ہی ہیں سر!“ ادھیڑ عمر روشن نے بتایا۔

”کال کر لیجئے نا!“ انجلی نے راہ بچھائی۔

رجت نے کھسیا کر تقبیعی انداز میں سر ہلایا اور اپنے موبائل فون سے پوچھا کا نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب ایک مخصوص گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔

”بڑی ہے!“ اس نے ایک بار پھر دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ! میں سمجھ گئی!“ انجلی مسکرائی۔ ”میں اپنے لاڈلے کے ساتھ ویڈیو کال پر بڑی ہوں گی۔“

رجت کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ریگ گئی۔ اسی اثنا میں اسکرین پر پوچھا کا ایک پیغام جھلکانے لگا۔

”میں سمرات کے ساتھ ویڈیو کال پر ہوں۔ آپ کھانا شروع کیجیے۔ دس منٹ تک جوائن کر لوں گی۔“

”لو بھئی! تمہاری می نے تو ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔ کہہ رہی ہیں کھانا شروع کر لو۔“ رجت نے شریک نگاہوں سے

انجلی کی جانب دیکھا۔

”انتظار کر لیتے ہیں۔“ انجلی نے ایک توقف سے کہا۔

رجت نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور پُرسوج انداز میں گویا ہوا۔

”میری آج مارننگ میں سمرات سے بات ہوئی تھی۔ کچھ چپ چاپ سا لگ رہا تھا۔“

”میری بھی دوپہر کے بعد بات ہوئی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے جسے چھپانے کے لیے خاموش ہے۔“ انجلی ہنسی۔

”کیا بات ہو سکتی ہے؟ شاید تمہاری می کو پتا ہو۔“ رجت نے قیاس کیا۔

”لو گرینڈ پا!“ اس نے دثوق سے کہا۔ ”میں کو پتا ہوتا تو مجھے بھی آئیڈیا ہو جاتا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ آپ کی پیاری بیٹی کم از کم مجھ سے کوئی سیکرٹ نہیں رکھ سکتیں۔“

نواہی کی اس بات پر رجت بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”روشن! یہ کھانا لے جاؤ! میڈم کے آتے ہی دوبارہ گرم کر کے لے آنا۔“ رجت نے چند لمحوں بعد حکم دیا۔

روشن نے رشک و مرغوبیت سے اپنے مالک کو دیکھا جو عمر میں اس سے بڑا ہونے کے باوجود کم سن ہی دکھائی دیتا تھا۔ دولت، رتبہ، شان و شوکت اور جوان اولاد جیسے سکھ کا حامل رجت دو بے روشن کے دل و دماغ میں ڈھیروں سوالات پیدا کر دیا کرتا تھا۔ روشن نے ان خیالات و سوالات کو سر سے جھٹکا اور کھانے کے برتن اٹھا کر رسوائی گھر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

عین اسی لمحے پوچھا اپنے کمرے میں بیٹے کے ساتھ رچو گھنگو تھی۔ پوچھا کی عمر چھیالیس برس تھی۔ اس کا بدن فرہنگ اندام اور رنگت میں سبالو لاپن جھلکتا تھا تاہم بہترین لباس، تراشیدہ سنہری بالوں اور نفیس رکھ رکھاؤ کے باعث وہ خاصی دلکش شخصیت کی حامل تھی۔

”ڈونٹ ٹیل می! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”کیا آپ کو اپنے بیٹے پر اعتماد نہیں ہے می؟“ سمرات نے مصنوعی تاسف سے ماں کی جانب دیکھا۔

اس دولت مند گھرانے کا یہ ہونہار سپوت بھی ظاہری دلکشی میں کسی سے کم نہ تھا۔ کسرتی جسم اور رنگت میں ہلکی سی سنولائٹ اس کی شخصیت کو مقناطیسی روپ دیتی تھیں۔ سمرات کی عمر چوبیس برس تھی۔ وہ گزشتہ ایک برس سے بغرض تعلیم مانچسٹر میں مقیم تھا۔

”سو فیصد ہے۔“ اس نے بیجانی انداز میں کہا۔ ”لیکن ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“

سمرات کے ہونٹوں پر غریبہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے چمکتی آنکھوں سے والدہ کی جانب دیکھا اور ڈرامائی انداز میں گویا ہوا۔

”ابھی ایک نیوز اور بھی ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے گھر آ رہا ہوں۔“

پوجا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکنے لگے۔

”انجلی اور گرینڈ پا کو پتا ہے کیا؟“ وہ بیجانی انداز میں کہنے لگی۔

”نہیں! سب سے پہلے آپ کو ہی بتا رہا ہوں لیکن انجلی کو پکا شک ہو گیا ہوگا۔“ سمرات نے دھوک سے کہا۔

”ہاں! اس سے کچھ بھی چھپانا ممکن ہی نہیں ہے۔“ پوجا ہنسی۔

اسی اثنا میں سمرات نے چونک کر اپنے فون کی جانب دیکھا اور غلٹ میں کہنے لگا۔

”مجھے ابھی ارجنٹ ٹکٹا ہے می! رات میں فری ہو کے کال کروں گا۔“

”اوہ! میری جان! اپنا خیال رکھنا! کھانا وقت پر کھا لیتا۔“ پوجا نے انجلی سے اس کی جانب دیکھا۔

”اوہ! آپ بھی کھانا کھا لیجیے۔ گرینڈ پا اور انجلی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ سمرات نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پوجا سرشاری سے ڈائننگ روم کی طرف چل دی۔ اسے اپنے قدم ہوا بردوش محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

روشن کی مستعد نگاہیں دروازے کی جانب مرکوز تھیں۔ وہ پوجا کے قدموں کی آہٹ سنتے ہی کھانا از سر نو چھنے کے لیے متحرک ہو گیا۔

”کہاں رہ گئی تھیں بھئی؟“ رجت نے شکایتی نظروں سے اپنی اکلوتی بیٹی کی جانب دیکھا۔

کم عمری میں تیار زاد سے شادی کے بعد رجت ایک ڈیڑھ برس میں ہی صاحبِ اولاد ہو گیا تھا۔ قدرت کی کرنی ایسی تھی کہ روپا صحتِ مندی کے باوجود اسے دوبارہ اولاد کے سکھ سے نہ نواز سکی۔ تیار کے رعب داب اور کاروبار میں شراکت کے باعث وہ کبھی اس سے بے وفائی کا مرتکب نہ ہو سکا تھا۔ پوجا کی شادی بھی کم عمری میں ہی کر دی گئی تھی۔ راکیش، روپا کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ ان دونوں کی ذہنی ہم

آہنگی اور محبت بے مثال تھی۔

”سمرات سے بات کر رہی تھی ڈیڈی!“ اس نے اپنے بیجان پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

انجلی نے اپنی والدہ کی جانب بغور دیکھا اور پُرسوج انداز میں کہنے لگی۔ ”آئی ایم شیور گرینڈ پا! می کے بچے نے انہیں کوئی بہت بڑی نیوز دی ہے۔“

”رائٹ! تمہاری ماں بھی اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رکھ سکتی۔“ رجت نے نیکیں کھولتے ہوئے کہا۔

”لیٹ می گیس!“ انجلی نے بھی اپنی پلیٹ میں چاول نکال لیے تھے۔ ”مسٹر اسپون کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہوگا۔“

”ہاں!“ پوجا کی آواز کپکانے لگی۔ ”اس نے اپنی کلاس میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔“

”فرسٹ کیوں نہیں؟“ رجت نے تاسف سے کہا۔

”ٹاپ کس نے کیا ہے بائی دادے؟“ انجلی نے دریافت کیا۔

”یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“ پوجا نے سادگی سے بتایا۔

”کیا می آپ بھی؟“ انجلی نے بھی تاسف سے اس کی جانب دیکھا۔

”دوبارہ کال کرے گا تو پوچھ لوں گی۔“ پوجا نے کہا۔

”شاید رجتی نے ٹاپ کیا ہوگا۔“

”رجتی اس کی کلاس فیلو نہیں ہے می!“ انجلی نے نرمی سے ٹوکا۔

”اوہ یس! میں بھول گئی تھی۔“ پوجا نے سخت سے کہا۔

”تمہاری می کا قصور نہیں ہے۔“ رجت نے اپنی مسکراہٹ دہائی۔ ”یہ ایکسٹنٹ میں ایسے ہی کرتی ہے۔ راکیش بھی اس بات پر بہت چڑتا تھا۔ کہتا تھا ایکسٹنٹ میں پوجا کے دماغ کی جتنی گلی ہو جاتی ہے۔“

راکیش کے ذکر پر پوجا کے چہرے پر افسردگی کے رنج جھلکنے لگے۔ آنکھوں میں ایک خلا واضح طور پر محسوس ہوا تھا۔

”اب اگلی بات بھی بتا دیں می!“ انجلی نے پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے شریر نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

پوجا نے ایک گہری سانس لی اور رجت سے مخاطب ہو کے کہنے لگی۔ ”سمرات یہی کہہ رہا تھا کہ اسے پکا ڈاؤٹ ہو گیا ہوگا۔“

”کیوں نہ ہو؟ آخر آل آپ کی بیٹی ستیہ ونجے چیمبل کی ٹاپ اینکر ہے۔“ اس نے اتر کر جواب دیا۔

”کس دن کی فلائٹ سے آرہا ہے وہ؟“ رجت نے معنی خیزی سے استفسار کیا۔

پوجا شدید ہونق دکھائی دینے لگی۔ اسے رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا کہ نانا اور نواسی ایک لمحے میں ہی سب کچھ بھانپ لیں گے۔

”ایسے مت دیکھو مجھے!“ رجت ہنسا۔ ”آئفر آل میں بھی ستیہ وجے چینل کا مالک ہوں۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“

”ڈیٹ اور ٹائم نہیں بتایا اُس نے۔“ پوجا نے اعتراف کیا۔ ”بس اتنا ہی بتایا کہ ایک مہینے کے لیے آئے گا۔“

رجت اور انجلی کے چہرے کھل گئے۔ سمرات کی واپسی ان کے لیے بھی بہت خوش کن خبر تھی۔ ان بھی اہل خانہ کی باہمی محبت اور ذہنی ہم آہنگی مثالی تھی۔ رجت نے اپنے والد اور تایا کی وفات کے بعد ان کی مشترکہ پرنٹنگ پریس کے معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ پرنٹ میڈیا اور کتب بینی تیزی کا شکار ہوئے تو رجت نے ہواؤں کا رخ بھانپتے ہوئے برقی میڈیا کی ناؤ پر سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ستیہ وجے چینل پر سرمایہ کاری کا آغاز کیا۔ راکیش بھی ہر قدم پر اس کا بہترین دست راست ثابت ہوا تھا۔ ان کی مشترکہ کادشوں کے نتیجے میں دھیرے دھیرے چینل بھی پروان چڑھنے لگا لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق مطلوبہ کامیابی تاحال ایک چیلنج تھی۔

مسابقت کی سخت دوڑ کے باعث انہیں اُن تھک محنت و درپیش رہتی تھی۔ رجت نے اس محنت اور دوڑ دھوپ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ افسوس ناک امر بہر حال یہ تھا کہ راکیش اس کا ساتھ تادیر نہیں نبھاسکا تھا۔ سگریٹ و مہ نوشی کی عادت نے اسے عارضۂ قلب میں جتلا کر دیا تھا۔ وہ چھ برس قبل ہی انہیں دائمی جدائی کا زخم دے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ رجت نے بیٹی اور دونوں بچوں کو اپنی محبت و شفقت کے دیہڑ پروں تلے چھپا لیا تھا۔ انجلی نے ”میڈیا سائنسز“ میں اعلیٰ تعلیم کے بعد ستیہ وجے میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ سمرات کا میلان البتہ مختلف تھا۔ وہ گراؤنگ ڈیزائننگ میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ رجت نے اس کی خواہش پر قدغن لگانے کے بجائے اسے بھرپور مالی اور اخلاقی معاونت فراہم کی تھی۔

”ویسے رچی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے می؟“ انجلی نے پلیٹ میں مزید چاول منتقل کیے۔ ”مسٹر

اسپون نے کبھی بات تو کروائی ہوگی اُس سے آپ کی؟“ انجلی کے اس قیاس پر رجت اور پوجا چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

”ہاں! ایک دفعہ بس..... ہیلو ہائے..... ہی..... ہوئی تھی۔“ پوجا نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

انجلی فاتحانہ نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

”لیکن تمہیں کیسے آئیڈیا ہوا؟“ رجت متحسّس ہوا۔

”بات ان فیکٹ یہ ہے۔“ اس نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔ ”مسٹر اسپون کی کلاس میں کئی لڑکیاں ہیں۔ وہ پروفیشنل بھی کئی لڑکیوں کو جانتا ہے۔ گروپ ویڈیو کال میں اکثر اپنے کلاس فیلوز لڑکوں اور ان دونوں ٹائپس کی لڑکیوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ لیکن..... وہ دانستہ طور پر خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا؟“ پوجا مضطرب ہوئی۔

”رچی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کی ٹون ذرا چیخ ہوتی ہے۔ وہ اس کی ریسپیکٹ کرتا ہے۔“

”اور کوئی بھی مرد اسی لڑکی کی ریسپیکٹ کرتا ہے جس کے لیے وہ اپنا شیل فیلکس کر دیتا ہو۔“ رجت نے لقمہ دیا۔

”ڈاؤٹ تو مجھے بھی ہوا تھا۔“ پوجا نے اعتراف کیا۔

”اور مجھے ڈاؤٹ نہیں کنفرم لگتا ہے کہ اس بار وہ کوئی نہ کوئی اسٹیپ ضرور لے گا۔“ انجلی نے اب اپنا کھانا مکمل کر کے بیٹھے کی جانب ہاتھ بڑھا دیے تھے۔

”پہلے ہم تمہاری شادی کریں گے۔ اس کے بعد ہی سمرات کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔“ پوجا کے وجود میں روایتی ماں بیدار ہوئی۔

”او کم آن می!“ وہ بدک مئی۔ ”مجھے ابھی شادی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”میں تمہاری عمر میں ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔“ پوجا نے جتنی ہوئی نظروں سے رجت کی جانب دیکھا۔

”مسٹر اسپون رات کو ویڈیو کال کرے تو مجھے بھی ایڈ کر لیجیے گا۔“ انجلی نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔

”مجھے بھی ایڈ کرنا۔ میں نے شریمان کو ذرا کچھ اینگنز سے جج کرنا ہے۔“ رجت نے بھی ایک پلیٹ میں میٹا منتقل کیا۔

اس مختصر اور خوش حال گھرانے کا۔ چشم و چراغ ایک سال کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ تینوں کی آنکھیں خوشی، خواہوں اور جوش سے جگمگا رہی تھیں۔ ان کیفیات میں بہت جلد ایک تلامخ خیزی جنم لینے والی تھی۔ ان شاداں و فرحاں افراد کو علم ہی

ہوئی۔

”ہاں! تمہیں فون کرنے کے بعد سنیل نے مجھے ہی کال کی تھی۔“ رجت نے بتایا۔

”ڈیم شٹ! ہم صرف دس منٹ لیٹ ہو گئے۔“ اس نے اپنے موبائل پر کوئی پیسٹ کھول لیا تھا۔

پوچھا اس گفتگو میں خود کو سخت ہونے محسوس کر رہی تھی۔

”کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ ہوا کیا ہے؟“ وہ جھنجلائی۔

انجلی نے ایک نگاہ غلط اس کی جانب دوڑائی اور اپنا ہاتھ

آگے بڑھا کر ریوٹ سے دیوار گیر ایل ای ڈی متحرک کر

دی۔ اسکرین روشن ہوتے ہی ٹی وی لاؤنچ میں ایک ہیجان

برپا ہو گیا تھا۔

”جی ہاں نا جرین! ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ دیش کی

راجدھانی میں ایک مندر پر دن و نائے حملہ ہوا ہے۔

سورتوں کے انوسار اس مندر میں کم از کم پچاس لوگ موجود

تھے۔ ان سبھی لوگوں کی گولیاں مار کر ہتھیا کر دی گئی ہے۔“

ایک تیس، بیس سالہ اینکر حلق پھاڑے بتانے لگا۔

”ہے رام!“ پوچھا دہل گئی۔ ”اتنا اتنا چار! یہ۔۔۔۔۔

کب۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔؟“

”ناجرین! اس سے دیش کی راجدھانی کو آنکھ کا

نشانہ بنایا گیا ہے۔ پچاس لوگوں کی دن و نائے ہتھیا کر دی

گئی ہے۔ ان لوگوں میں ناریاں اور بچے بھی شامل تھے۔ اس

ہتھیا کا نڈ کے پیچھے آخر کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ مندر جیسے پوتر

استھان پر آخر کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ہم آپ کو ایسی کبھی

لیے چلتے ہیں۔“

اینکر کے اتنا کہتے ہی اسکرین پر ایک بہت بڑی

معدیگاہ دکھائی دینے لگی۔ اس مندر کے بیرونی سمت مختلف

چلیں بکھری تھیں۔ اندرونی جانب قدم بڑھاتے ہی اپنے ہی

لبو میں لت پت مرد وزن اور بچوں کی جھلک نہایت ہولناک

تھی۔

پوچھا کی آنکھوں سے ہر اس جھلکنے لگا۔ انجلی کی نگاہیں بھی

اسکرین کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے

چہرے پر جوش دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنے موبائل فون پر

فوراً ایک نمبر ملا لیا۔

”ہیلو! شونیا!“ انجلی نے رابطہ ہوتے ہی ہیجانی انداز

میں کہا۔ ”ہاں! امیری بات غور سے سنو۔ مجھے اندر ایک مورتی

میں ہلکا سا کریک دکھائی دیا ہے۔ اس بات کو فوراً ہائی لائٹ

کرو۔ میں سب چینلز کی رپورٹنگ مانیٹر کر رہی ہوں۔ یہ نیوز

ابھی تک کہیں بریک نہیں ہوئی۔“

نہیں تھا کہ سمرات کی واپسی سے قبل ایک طوفان کی آمد نے سب کچھ زیر و زبر کر دینا ہے۔

☆☆☆

اگلی صبح بے حد روشن اور خوش گواری تھی۔ گزشتہ شب آخری

پہر میں ہونے والی بارش کے بعد موسم میں ایک بھرپور رنگ

پیدا ہو چکی تھی۔ پوچھا کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ سمرات

نے حسب سابق نصف شب کے بعد اس سے ویڈیو کال پر

رابطہ کیا تھا۔ بیٹے کی آمد کے متعلق منت نئے منصوبے بناتے

ڈیڑھ گھنٹا بیت جانے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا تھا۔ فون بند ہو

جانے کے بعد بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس جوش و

دولے میں صبح کی پہلی کرن کے بعد ہی نیند مہربان ہوئی تھی۔

پوچھا نے بیدار ہوتے ہی حسب عادت اپنے موبائل

فون کا جائزہ لیا۔ ذہنی رو ایک بار پھر سمرات کی جانب منتقل ہو

گئی تھی۔ اس کی منتشر سوچوں میں ایک نامانوس شور نے خلل

پیدا کر دیا۔

”یہ صبح ہی صبح کیا ہو گیا ہے باہر؟“ وہ بڑبڑائی۔

پوچھا کی یہ اُجھن اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ اس روز

عوامی چھٹی کے باعث رجت کو بھی تاخیر سے ہی بیدار ہونا تھا۔

ویک اینڈز پر انجلی کا پرائم ٹائم شو بھی آن ان نہیں ہوتا تھا لہذا وہ

بھی رات گئے تک اگلے شو کے لیے تحقیقی مواد اکٹھا کرتے

رہنے کے بعد دوپہر کے بعد ہی اپنے کمرے سے برآمد ہوتی

تھی۔ پوچھا اپنے شب ب سری کے مخصوص لباس کی ڈوریاں

درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی آئی۔

”کیا بات ہے؟ از پوری تھنک او کے؟“ اس نے

جھانکی لیے ہوئے رجت اور انجلی کی جانب دیکھا۔

”ریش! گاڑی ریڈی کرو! ہمیں اسی وقت نکلتا

ہے۔“ رجت نے اس کی بات اُن سنی کرتے ہوئے اپنے

موبائل پر ایک نمبر ملا لیا تھا۔

”ڈیم! اٹ! ہمیں اس وقت اسٹوڈیو میں ہونا چاہیے

تھا۔“ انجلی جھنجلائی۔

”تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ رات کو اپنا فون سائلیٹ نہ

کیا کرو۔“ رجت جڑبڑ تھا۔

”سائلیٹ نہیں تھا گرینڈ پا! بس نیند گہری تھی اس لیے

پتا ہی نہیں لگا۔“ اس نے وضاحت دی۔

”یہ تو اور بھی غیر ذمے داری والی بات ہے۔“ وہ ملاستی

لگا ہوں سے لو اسی کو دیکھنے لگا۔ ”ایک جرنلسٹ کو تو نیند میں بھی

اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں۔“

”آپ کو کوئی فون کال آئی تھی کیا؟“ انجلی مضطرب

”او کے میم میں ابھی کیمرا مین کے ساتھ ادھر فوکس کرتی ہوں۔“ شوپتا نے مستعدی سے کہا۔
”رائٹ! تمہیں پتا ہی ہے کہ اب کسی رپورٹنگ کرنی ہے۔“ انجلی نے آگاہ کیا اور رجت کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”ڈونٹ وری گرینڈ پا! ستیہ وجے کی ٹی آر پی کو کوئی نہیں پہنچ پائے گا۔“

رجت نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بیرونی سمت بڑھ گیا۔ انجلی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ پوجا اپنی ہر اس کیفیت پر قابو پاتے سرٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسری جانب سے فون نہ اٹھائے جانے پر اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

”اوہ! ابھی تو وہاں صبح کے سات بجے ہوں گے۔ فون سہولیت پر رکھ کے سو رہا ہوگا۔“ اس نے خود کلامی کی اور اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار بھرتے ہوئے ایک نشستی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”راہدھیا! مجھے بیڈروم میں لا دو۔“ اس نے ملازمہ کو حکم دیتے ہوئے ریوٹ اٹھایا اور دروازہ پر دھک مار کر دیا۔

☆☆☆

سرٹ کی آنکھ حسب عادت دوپہر کو کھلی تھی۔ وہ چھٹی کے روز بھر پور نیند لیتا تھا۔ دیگر ایام میں البتہ وہ اپنے نظام الاوقات پر سختی سے کاربند رہتا تھا۔ اس نے برطانیہ کی معروف اور سخت ترین زندگی میں حیرت انگیز قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ پڑھائی کے دوران معروف شب و روز میں علی الصبح سات بجے بیدار ہوتا تھا۔ اس نے برطانوی نظام تعلیم میں طلبہ کو روزگار حاصل کر لینے کی اجازت سے بھی بھرپور استفادہ کیا تھا۔ اسے اپنی پُرکشش شخصیت اور رواں انگریزی لب و لہجہ کے باعث ایک مقامی سپر مارکیٹ میں ملازمت ملی تھی۔ رجت نے اس اقدام پر خاصی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

”جسمیں جاب کی کیا ضرورت ہے بیٹا؟ اگر منی پر اہم ہے تو مجھے بتاؤ۔ جتنی اماؤنٹ چاہو تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گا۔“

”آئی تو یو گرینڈ پا!“ سرٹ نے محبت سے جواب دیا تھا۔ ”منی یہ کسی ضرورت کے لیے نہیں کر رہا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ یہاں کالائف اسٹائل ہی ایسا ہے۔ انسان آٹومیشلی ایکٹو رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

”کرنے دیں گرینڈ پا!“ انجلی نے لقمہ دیا تھا۔ ”ایک

مہینہ میں ہی اسے نانی یاد آ جائے گی۔“

”میرا بیٹا بہت مضبوط ہے۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھا کر کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔“ پوجا نے حسب عادت اسی کی طرف داری کی تھی۔

اہل خانہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کرتے ہوئے سرٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔ اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور ای میل، ٹیکسٹ، واٹس ایپ میسجز، کالز کا جائزہ لینے لگا۔

اسی اثنا میں فون پر ایک مخصوص نمبر اور تصویر جگمگانے لگی۔ سرٹ نے فوری طور پر ہزنٹن پر انگلی پھیر دی۔
”ہائے سیم! کیسے ہو؟“ دوسری جانب سے رجی کی آواز سنائی دی۔

”فائن! بس ابھی اٹھا ہوں۔“ اس نے جمائی روکتے ہوئے بتایا۔

رجی اور سرٹ کی شناسائی محض آٹھ، نو ماہ پرانی تھی۔ دونوں کی سنجیدہ فطرت، ذہنی میلان اور طرز فکر ناقابل یقین حد تک یکساں تھے۔ اس یکسانیت کے باعث وہ گہری دوستی کے رشتے میں بندھ چکے تھے۔ سرٹ کے دل میں حقیقتاً رجی کے لیے بہت منفرد جذبات تھے۔

”تمہارے گھر سے کوئی کال یا میسج تو آیا ہوگا؟ سب ٹھیک ہیں وہ؟“ رجی نے متانت سے استفسار کیا۔ وہ سرٹ کے اہل خانہ سے غائبانہ طور پر متعارف ہونے کے باعث پوجا کے مذہبی اور سیاسی سے بخوبی واقف تھی۔
”نہیں! می کی کال آئی، لیکن میں سو رہا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”او کے! کال بیک کر لو۔ میں بعد میں بات کرتی ہوں پھر۔“

رجی کے انداز کی سنجیدگی نے سرٹ کو شگفتہ کیا۔ اس نے فوری طور پر پوجا کا نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب بجتی ہوئی گھنٹی اس کے دل میں ہزار ہا خدشات پیدا کر رہی تھی۔

☆☆☆

پوجا بی وی لاؤنج کے ... صوفے پر براجمان نہایت اٹھماک سے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے ستیہ وجے کے علاوہ بھی مختلف نیوز چینلز دیکھنے میں مشغول تھی۔ اس کے اٹھماک میں موبائل فون کی مخصوص گھنٹی نے غلغلہ پیدا کر دیا۔ اسکرین پر بچے کا نام اور تصویر جگمگاتے دیکھ کر اس کے وجود میں پھرتی درا آئی۔

”آج اتنی لیٹ کال کی ہے بیٹا؟“ اس نے رمی علیک

پھیلائے گئے ٹیر کو انٹر میٹ کہوں؟

”اوگاڈ!“ سر اٹ کر ابا۔ ”میری بات غور سے سنیں می! یہاں ایسے میٹرز میں بہت مانیٹرنگ کی جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا شہد بھی ریڈار میں آجائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔“

”لیکن وہ کیوں بھی؟“ پوجا کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی۔

”ان پالیسیز کو میں ابھی فون پر ایکسپلین نہیں کر سکتا۔“ اس نے ہونٹ کچلے۔ ”آپ دوبارہ ایسا کوئی شہد استعمال نہیں کریں گی۔ اوکے!“

پوجا اس قطعیت پر الجھ کر رہ گئی۔

”آئی نو! آپ کو میری باتیں سمجھ نہیں آرہی ہوں گی۔“

فیکٹ یہی ہے کہ جب ہم فرینڈز وغیرہ کہیں باہر جاتے ہیں تو اپنے اپنے موبائل آف کر دیتے ہیں یا سائڈ پر گاڑی میں ہی رکھ دیتے ہیں۔

”ایسا کیوں کرتے ہو؟“ وہ مزید ابھری۔

”یہ موبائل فون ہماری سب باتیں سنتے ہیں می! یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری کوئی بھی پرائیویسی نہیں ہے۔ اپنی ہاڈ یہ باتیں وہاں آکر بتاؤں گا۔ فون پر کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔“

”کب آرہے ہو؟“ پوجا مضطرب ہوئی۔

”ٹکٹ کنفرم ہوتے ہی آپ کو انفارم کر دوں گا می!“

اس نے رساں سے کہا۔

”ہم سب تمہارا بہت شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ محبت سے گویا ہوئی۔

”آئی نو! بس تھوڑا سا انتظار اور۔“ سر اٹ نے دلا سا

دیا اور کسی فوری خیال کے تحت کہنے لگا۔ ”آپ گھر میں اکیلی کیا کر رہی ہیں؟“

”بس خیریں وغیرہ ہی دیکھ رہی ہوں۔“ پوجا نے بتایا۔

”گرینڈ یا کو گھر آ جانا چاہیے تھا۔ اتنا کام کر کے کہیں اپنی صحت خراب نہ کر لیں۔“ اسے تشویش ہوئی۔

”کام اُن کے لیے ٹائک ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ مسئلہ حل

ہونے تک وہ بہت مصروف رہیں گے۔“

سر اٹ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اسے یہی خدشہ

لاحق ہونے لگا تھا مبادا پوجا ایک بار پھر اسی گفتگو کا آغاز کرتے

ہوئے متنازعہ الفاظ کی ادائیگی نہ کرنے لگے۔

”میں ابھی کچھ مصروف ہوں می! فری ہو کر بات کرتا

ہوں۔“

”میں ویٹ کروں گی۔“ پوجا نے گہری سانس لی۔

سلیک کے بعد دریافت کیا۔

”آج دیر سے اٹھا ہوں۔ آپ کی سڈ کال بھی ابھی

ہی دیکھی میں نے۔“ سر اٹ نے بتایا۔

”ہم! صبح پروجیکشن ہی ایسی بن گئی تھی کہ میں تمہیں کال

ملا بیٹھی۔“ پوجا نے گہری سانس لی۔

”کیا بات ہے؟ از ایوری تھنگ اوکے؟ گرینڈ پاتو

ٹھیک ہیں نا؟“ وہ تشویش زدہ ہوا۔

”گھر میں تو سب ٹھیک ہے میری جان! بس آج صبح

یہاں ایک مندر پر ٹیر رسٹ ایک ہوا ہے۔ پچاس لوگ تو آن

دی سپاٹ ہی مارے گئے تھے۔ اس کے بعد امرتسر اور گوا میں

بھی اسی طرح ایک ہوئے۔ سیم ٹائم اور سیم اسٹائل۔ کم از کم

ایک سو بیس لوگ مر چکے ہیں۔ اسپتال میں زخموں کی کنڈیشن

بھی کافی سیریس ہے۔“ پوجا نے بوجھل انداز میں بتایا۔

”اوہ..... مجھے اس بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔“

سر اٹ کو فطری طور پر دکھ ہوا۔

”یہ خبر تو جنگل میں آگ کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

انٹرنیشنل میڈیا بھی کافی کوریج دے رہا ہے۔ سب کا یہی کہنا

ہے کہ یہ ٹیر رسٹ انگیس ہیں۔“ پوجا حسبِ عادت ایک ہی

سانس میں کہتی چلی گئی۔

سر اٹ کے چہرے پر بے چینی دکھائی دینے لگی۔ اس

نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لیے کہا۔

”انجلی اور گرینڈ پاکہاں ہیں؟“

”وہ اسٹوڈیو میں ہیں۔ ایسے سے میں وہ دونوں گھر رہ

سکتے ہیں بھلا؟“ پوجا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”انجلی کا بھی

تمہیں پتا ہی ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلاسٹ

ہوتے ہی وہاں پہنچ جاتی۔ ہے رام! بہت بھیا تک ایک

تھے۔ ہر طرف ڈیڈ ہاڈیز دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کم بخت

ٹیر رسٹس تو اپنی گتہ بھی وہیں چھوڑ گئے تھے۔ تمہارے گرینڈ پا

کہہ رہے تھے کہ کہیں وہ مندر میں کوئی بم نہ پلانٹ کر گئے

ہوں۔ فورسز کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں گے یہ کم بخت

ٹیر رسٹس۔“

سر اٹ کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے

زنج ہو کر کہا۔ ”می پلیز! فار گاڈ سیک! ایسے شہد استعمال نہ

کریں۔“

”کیسے شہد؟“ پوجا کو مزید حیرت ہوئی۔

”یہی جو آپ بار بار کہہ رہی ہیں۔“ وہ جبرز ہوا۔

”عجیب باتیں کرتے ہو!“ پوجا نے منہ بنایا۔ ”اب

ٹیر رسٹس کو ٹیر رسٹس نہ کہوں تو کیا بھگت بولوں؟ ان کے

سراٹ نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور غلٹ میں فون بند کر دیا۔

☆☆☆

پوجا بے گفتگو کے بعد سراٹ دہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ یہ کیفیات ایک جانب ملکی حالات کی بدولت تھیں تو دوسری سمت پوجا کی غیر ذتے دارانہ گفتگو بھی خدشات پیدا کر رہی تھی۔ اس کو کوئی کیفیت کو سر سے جھٹکتے ہوئے سراٹ نے نیوز چینل کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسکرین پر ایک بار پھر رچی کا نمبر جگمگانے لگا۔ سراٹ نے بلا تامل سبز جن پر انگلی پھیر دی۔

”میں تمہیں ہی فون کرنے لگا تھا۔“ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔
”جی جی سے بات ہو گئی؟“ رچی نے متانت سے استفسار کیا۔

”نہیں! می سے بات ہوئی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔
”سب ٹھیک ہے نا وہاں؟“ رچی اپنائیت سے گویا ہوئی۔ ”تم نے ایک دو بار بتایا تھا کہ آئی ریگور مندر جاتی ہیں تو مجھے کافی تشویش ہو رہی تھی۔“

رچی کی اس تشویش و تفتیش میں بناوٹ کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ سراٹ لمحہ بھر کے لیے ایک عجیب سرشاری میں مبتلا ہو گیا۔ وہ بہت خاص لمحہ تھا۔ پسندیدہ عورت کے دل میں اپنی اولین محبت کے لیے یہ اپنائیت محسوس کرنا بہت انوکھی اور پُر جوش کیفیات تھیں۔ سراٹ فطری طور پر اپنی ماں کے قریب تھا۔ ماں اور بیٹے کی اس جلی محبت میں رچی کی آمد اور پوجا کے لیے تشویش اسے بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

”ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔ وہ مندر ہماری ہاؤسنگ سوسائٹی سے کافی دور ہے۔“ سراٹ نے خود کو سنبھالتے ہوئے بتایا۔

”اوہ..... اوکے! لیکن نقصان تو بہت ہوا ہے۔“ رچی تاسف سے کہنے لگی۔

”نہیں! می تو مجھے ساری تفصیل بتانا چاہ رہی تھیں لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ جانتی ہو کیوں؟“
سراٹ کی اس بات پر رچی چونک گئی۔

”ہاں! ٹھیک کیا تم نے۔“ اس نے تائید کی اور ایک توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ”یہ سچویشن ہی ایسی تھی کہ تم نے میرے بارے میں تو نہیں بتایا ہوگا۔“
”نہیں! رنلی سوری! مجھے یہی خدشہ تھا کہ می دوبارہ

کوئی بات شروع نہ کر دیں اس لیے کال وائٹ اپ کرنی پڑی۔“

سراٹ کے اس عذر پر رچی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی۔

”اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ بے کلی محسوس کرنے لگا۔ ”اگر ہم گھر میں کسی کو انفارم کے بغیر بھی چلے جائیں گے تو کوئی ایشو نہیں۔ ہمارے کلچر میں کیسٹس کو بہت دارم ویکم دیا جاتا ہے۔ تمہیں بالکل پریشانی نہیں ہو گی۔“ اس نے رساں سے سمجھایا۔

پچیس سالہ رچی سیر و سیاحت کی دلدادہ تھی۔ وہ ہر ماہ اپنی خواہ سے ایک مخصوص رقم پس انداز کرتی اور سالانہ چھٹیوں پر کسی نہ کسی ملک کی سیاحت کے لیے نکل کھڑی ہوتی۔ اس بار یہ قریعہ فال بھارت کے نام رہا تھا۔ وہ صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت اور تاریخی عمارتیں دیکھنے کی شدید متنبی تھی۔

سراٹ کو اس کی خواہش و عزائم کا علم ہوا تو اس نے بھی اپنے لیے اسی دوران چھٹیاں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ رچی کی خواہش تھی کہ سراٹ اخلاقیات کے پیش نظر اپنے اہل خانہ کو اس کی آمد سے آگاہ کر دے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔

”ایشو تو بہر حال ہو گیا ہے سیم!“ رچی نے ایک توقف سے کہا۔ ”ابھی وہاں کے حالات کی وجہ سے میری مہم بہت اسٹریس میں ہیں۔ وہ مجھے یہ فور کینسل کرنے کا کہہ کر رہی ہیں۔“

ارے! ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ مضطرب ہوا۔ ”میں تمہاری مہم سے خود بات کر لوں گا۔ وہاں لاء اینڈ آرڈر کی ایسی اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے لیکن پھر سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔ فور سز ساری سچویشن ونڈل کر لیتی ہیں۔ تم وہاں پر سو فیصد محفوظ رہو گی۔“

”آل رائٹ! میں تو اس ایڈ ونچر کے لیے تیار ہوں لیکن مہم بس یونہی ذرا.....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں تمہاری مہم کو منالوں گا رچی! سچ پوچھو تو میں یہ سفر تمہارے لیے ہی کر رہا ہوں۔“ سراٹ کا لہجہ از خود ہی بے تاب سرگوشی میں ڈھل گیا۔

رچی لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گئی اور خود کو پُر سکون کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آف کورس! تم میرے لیے ایک نیوٹرل اور بہترین گائڈ ثابت ہو سکتے ہو۔“

”نہیں! آف کورس!“ سراٹ اپنا سر جھٹکتے ہوئے

صیوان

حسب عادت وہ ویڈیو اپنی فیس بک ٹائم لائن پر شیئر کرتے ہوئے سمرات کو ٹیک کی اور انہماک سے عوامی ردعمل کا جائزہ لینے لگی۔ اسے کھانے کا بالکل ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

سمرات طے شدہ وقت پر رچی کے گھر پہنچ گیا تھا۔ گزشتہ ایک برس میں وہ کافی حد تک برطانوی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہاں تاخیر خاصی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ دروازے پر رچی نے ہی اس کا استقبال کیا۔ سمرات چہرے پر مسکراہٹ سجائے اندرونی سمت چلا آیا۔ بمشکل نصف درجن قدم بھرتے ہی ایک کچن اور نشست گاہ بھی جہاں میگز کھانے کے اختتامی مراحل سے نبرد آزما تھی۔ ”ہائے سیم!“ وہ اسے دیکھتے ہی اپنائیت سے مسکرائی۔

digest library.com

”آئی ایم فائن!“ سمرات نے اس روائتی برطانوی جملے کا اسی انداز میں جواب دیا۔ ”یو آر گڈ؟“ میگز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ سمرات اس لمحہ بے حد مضطرب تھا۔ اسے علم تھا کہ اس معاشرے میں اپنے دلی جذبات کو مسکراہٹ کے لبادے میں چھپانے کا فن خاصا عام ہے۔ مقابل خصوصاً نووارد کے لیے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا دشواری ہوتا تھا۔ ”یہ آپ کے لیے میگز!“ سمرات نے ایک خوش رنگ کیک کا دیدہ زیب ڈبا آگے بڑھایا۔ ”اوہ! اس کی کیا ضرورت تھی؟“ میگز نے اسی اپنائیت سے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں رچی کے چھوٹے جڑواں بھائی بھی وہیں چلے آئے۔ جم اور کیلون رچی سے دس برس چھوٹے تھے۔ وہ دونوں کھانا چھنے میں میگز اور رچی کی مدد کرنے لگے۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ سمرات نے ہر ایک شے سے مکمل انصاف کیا۔

”تس دن کی ٹکٹ کروائی ہے سیم؟“ میگز نے از خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

”پرسوں دوپہر کی فلائٹ ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”لیکن اپنی می کو غلط ڈیٹ بتاؤں گا۔ انہیں سر پر اتار دینا چاہتا ہوں۔“

میگز لمحہ بھر کے لیے اضطراب محسوس ہونے لگی۔ سمرات نے اس کی کیفیات بھانپ لی تھیں۔ وہ اپنائیت و اعتماد سے کہنے لگا۔

”آپ اتنا سٹریس کیوں لے رہی ہیں میگز؟“

مسکرایا۔

اسے مغربی معاشرے کی پروردہ رچی کا یہ طرز فکر ہمیشہ ہی بہت متاثر کرتا تھا۔ وہ اپنی حدود و قیود سے آگاہ بھی اور کسی کو بھی اس دائرے میں داخلے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

”تو پھر میں تمہارے گھر کب آؤں؟“ سمرات نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

”آج رات ڈنر ہمارے ساتھ کر لینا۔“ اس نے پیشکش کی۔

”آل رائٹ!“ وہ سرور ہوا۔ ”میں تمہاری ماما کے سب خدشات دور کر دوں گا۔“

رچی نے طمانیت سے سر ہلایا اور الوداعی کلمات کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

پوچھا کھانے کی میز پر بالکل تنہا تھی۔ اس کے وجود پر پڑمرد کی طاری تھی۔ ساعت میں گزشتہ شب ہونے والی گفتگو اور پرمزاج جملے گونج رہے تھے۔ یہ گونج گا ہے بگا ہے احساس تنہائی کو مزید بوجھل بنا دیتی تھی۔

پوچھا نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈالا اور ست روی سے نوالہ بنانے لگی۔ اسی لمحہ ذہن میں کوندنے والے ایک خیال نے یہ عمل موقوف کرنے پر مجبور کر دیا۔

”پتا نہیں انجلی اور ڈیڈی نے کچھ کھایا ہوگا یا نہیں؟“ صبح ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا انہوں نے۔

”اب تو آٹھ نو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو لے ہی لیا ہوگا۔ انجلی ویسے ہی بھوک کی بجلی ہے اور ڈیڈی بھی ڈائننگ کاشیئرس رہتے ہیں۔“ ایک اور خیال نے اسے دلاسا دیا۔

پوچھا نے ایک چھوٹا سا نوالہ منہ میں منتقل کیا اور دھیرے دھیرے چبانے لگی۔ اس نے گرد و پیش میں طاری بوجھل خاموشی سے گھبرا کر اپنا۔۔۔ موبائل فون تھاما اور ”فیس بک ریلیز“ دیکھنے کے پسندیدہ مشغلے میں مصروف ہو گئی۔ فیس بک کسی ہم خیال کیٹی کی طرح اس کے ذوق اور شوق کے مطابق متفرق مواد پیش کرنے لگی۔ اسی دوران ست روی سے کھانے کا مرحلہ بھی رواں تھا۔ نصف درجن سے زائد ریلیز دیکھ لینے کے بعد وہ اپنی نشست پر بے اختیار اچھل پڑی۔ آنکھوں کی چمک میں کئی گنا اضافہ اور سرخ سے تن گیا تھا۔ اسے اسکرین پر انجلی کی ایک ویڈیو دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ویڈیو دو گھنٹے قبل ہی آپ لوڈ کی گئی تھی۔ اس نے بے تابی سے زیریں دائیں کونے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے عوامی ردعمل کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا۔

ویڈیو مکمل دیکھ لینے کے بعد وہ بیجان زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے

”تم نہیں سمجھو گے سیم!“ اس نے افسردہ لگا ہوں سے رہتی کی جانب دیکھ کر اسے جواب دیا۔
”کم آن ماما ایک مینی کی تو بات ہے۔“ رہتی نے بے نیازی سے کہا۔

میگز ہونٹ بھیج کر خاموش ہو گئی۔ سر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے الفاظ جمع کرنے لگا۔ اسے علم تھا کہ روایتی معاشرتی نظام کو نظر رکھتے ہوئے اسے مختصر اور دو ٹوک گفتگو ہی کرنی ہوگی۔

”میں آپ کی کیفیات سمجھ سکتا ہوں۔“ اس نے رمان سے کہا۔ ”آپ کی جگہ میری والدہ بھی ایسے ہی تحفظات کا شکار ہوتیں۔ بہر حال میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ رہتی کی قسم کی پریشانی کا شکار نہیں ہوگی۔ وہ ہوٹل کے بجائے میرے گھر میں رہے گی۔ ہم چار افراد کے لیے وہ گھر بہت بڑا ہے۔ رہتی جس کمرے میں بھی چاہے اسے کر سکتی ہے۔ آؤٹنگ وغیرہ کے لیے ایک گاڑی اور ڈرائیور ہر وقت ریڈی رہیں گے۔ میں اس کا گارنٹین کر سکتا ہوں گا۔ اس کے علاوہ ایک ٹریڈ سیکورٹی گارڈ بھی ہمارے لیے سروس کرے گا۔“

سر اس کے اس جامع منصوبہ پر میگز کے چہرے پر خجالت کی سرخی چھا گئی۔ دونوں بھائی البتہ خاصے حیرت زدہ دکھائی دے رہے تھے۔

”مجھے تمہارے اس خلوص پر اطمینان ہے پیارے!“ میگز نے متانت سے جواب دیا۔ ”لیکن وہاں کے حالات میں آئے روز گڑبڑ ہی رہتی ہے۔“

”ارے نہیں بھئی!“ سر اس بے تاب ہوا۔ ”میرا ملک تو ایشیائی ممالک میں محفوظ ترین ہے۔“
رہتی اس حب الوطنی پر زیر لب ہنس کر رہ گئی۔

”اچھا! ایک بات اور!“ سر اس نے اجتماعی طور پر سب کو مخاطب کیا۔ ”آپ سب کو وہاں سے جو بھی شاپنگ کرنی ہو، اس کی لسٹ مجھے کل شام تک دے دیجیے۔ زچی جس بھی شہر میں وزٹ کرے گی وہاں کی ہر اسٹورل آسٹم کی شاپنگ میرے ذمے ہے۔“

”لیکن سیم! اس فارمیٹی کی کیا ضرورت ہے؟“ رہتی جربز ہوئی۔

میگز، جم اور کیلون بھی مضطرب دکھائی دینے لگے۔
”لو آر کیو ٹنٹس!“ اس نے دو ٹوک کہا۔ ”تم بس پیکنگ مکمل کرو اپنی۔“

”اس قدر برڈن لینے کی کیا ضرورت ہے سیم؟“ میگز نے گھبراہٹ سے کہا۔

”یہ برڈن نہیں ڈنیر! ہمارا کلچر ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے جواب دیا اور ایک فوری خیال کے تحت رہتی سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”تم اپنے لیے زیادہ سامان پیک مت کرنا کیونکہ واپسی پر مچی، انجلی اور گرینڈا نے بھی خاصی کسر نکالنی ہے۔ یہ نہ ہواڑ لائٹسز والے تمہارا کچھ کپڑے ہی نہ کریں۔“
سر اس کی اس اپناہیت اور خلوص پر میگز، جم اور کیلون بے حد متاثر ہوئے۔

”آل رائٹ میگز! میں چلتا ہوں۔ اس زبردست ڈنر کے لیے بہت شکریہ۔ اب پرسوں ملاقات ہوگی۔ میں رہتی کو یہیں سے پک کر لوں گا۔“ اس نے الوداعی انداز میں کہا۔
”مجھے انٹرویو کا راستہ آتا ہے۔ میں خود ہی کیب لے کر پہنچ جاؤں گی۔“ رہتی جربز ہوئی۔ اسے سر اس کا یہ انداز خاصا مضطرب کر رہا تھا۔

”بالکل آتا ہوگا!“ وہ بے نیازی سے گویا ہوا۔ ”لیکن پرسوں سے تم مکمل طور پر میری ذمے داری ہو اس لیے یہ سب تو برداشت کرنا ہوگا۔“

رہتی اور میگز اس لمحے بالکل منگ تھیں۔ مغربی معاشرے کی پروردہ ان خواتین نے کم عمری میں ہی اپنی ذمے داریاں خود اٹھالی تھیں۔ ان کے لیے کسی مرد کا یہ احساس ذمے داری حیران کن تھا۔ ان کی سوچوں اور انجلیوں سے بے خبر سر اس جم اور کیلون سے الوداعی معافہ کرنے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

سر اس اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹا تو خاصا مسرور اور مطمئن تھا۔ وہ ایک ایسی سترہ منزلہ عمارت کے کمرے میں مقیم تھا جو طلبہ کی اقامت گاہ کے طور پر ہی مستعمل ہوتی تھی۔ سر اس نے اپنے سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھنے کا آغاز کیا اور گھنٹا بھر میں اس مرحلے کو بھی عبور کر لیا۔ اہل خانہ کے لیے تحائف اگلے روز لیے جانے تھے۔

سامان کی پیکنگ سے فرصت ملنے ہی وہ ایک بار پھر اپنے فون کا جائزہ لینے لگا۔ اسی اثنا میں پوجا کی جانب سے ٹیک شدہ ایک ویڈیو کی اطلاع نے اسے چونکا دیا۔ سر اس نے ویڈیو دیکھنے کا آغاز کیا تو انجلی کی دیدہ نے ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس کا انہماک مزید بڑھ گیا۔

انجلی دو بے چست سیاہ پتلون اور کوٹ میں لمبوس تھی۔ اس کے بالوں کی ملاحت اور چمک دیدنی تھی۔ پیشہ دارانہ انداز میں کیے گئے میک اپ نے شخصیت کو مزید جاذب نظر بنا دیا تھا۔ وہ ایک جہازی سائز اسکرین کے سامنے کھڑی تھی۔

جہازی سائز اسکرین اب دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ دوسرے حصے پر ایک گوردارہ دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس گوردارہ کی پوزیشن بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ یہاں موجود آنکھ دادیوں کو دہلی سے ان کے ساتھی کی کال آئی جس میں کہا گیا کہ ہم نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے۔ اب تم لوگ آگے بڑھ جاؤ۔ اس کے بعد وہاں بھی یہی ایکشن ریپٹ ہوا۔ پانچ آنکھ دادی پارک سے نکلے اور دھارمک نعرے لگاتے ہوئے گوردارہ میں قائم شریک شروع کر دی۔ وہ ہمارے دیش کے لیے اپنے اس کردہ میں یہ بھی بھول گئے کہ سکھ برادری کو ان پر کتنا مان ہے۔ وہ ان کے دیش سے کتنا پریم کرتے ہیں۔“

انجلی کی دکھ سے یوجیل آواز نہایت پُر اثر تھی۔ اسی اثنا میں جہازی سائز اسکرین تین حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

”اس دوسری درگھٹا کے ٹھیک ایک منٹ بعد ایک اور فون کال کی جاتی ہے۔ اس بار یہ فون جاتا ہے گوا۔ جی ہاں! گوا میں بھی اپنے ساتھیوں کو پیغام دیا جاتا ہے کہ دو وکس مگر دی گئی ہیں۔ اب تم اپنی باری کھیلو! یہ سنتے ہی گوا کے اس چرچ میں بھی کئی بے گناہوں کی لمبی چڑھا دی جاتی ہے۔ ان بے گناہوں کا دوش یہ تھا کہ وہ بہت خوش خوشی ایک شادی میں شریک ہونے آئے تھے۔ یہاں بھی پانچ ہی لوگ چرچ میں گھستے ہیں اور سب سے پہلا قائم قادر پر گرتے ہیں۔ گولی قادر کے سینے سے آر پار ہو جاتی ہے۔ چرچ میں بیٹھے نزدیک لوگوں پر قائم گرتے ہوئے انہیں یہاں بھی کسی صورتی کے سامان کا خیال نہیں تھا۔ وہ سب کو موت کی نیند سلاتے ہیں اور اپنے نعرے لگاتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔“

اسکرین پر تینوں مناظر اب ساکت تھے۔

”جنتا جانتا چاہتی ہے۔ ہم جانتا چاہتے ہیں کہ ان تینوں درگھٹاؤں کے ماسٹر مائنڈ کو کب پکڑا جائے گا؟ ہمارے پڑوسی دیش نے اپنے اور کانفیڈنس میں بہت سے ثبوت چھوڑے ہیں۔ پارک میں ملنے والے یہ کپڑے، جوتے اور سب سے بڑھ کر یہ ہتھیار ہمارے دیش میں نہیں بنائے جاتے۔ یہ سب آتا ہے بارڈر کے اس پار سے۔ جی ہاں لبارڈر کے اس پار سے جہاں ہماری ہر سٹاپ پر ماتم بچھ جاتا ہے اور وہ ہمیں چوٹ پہنچا کر ہماری شکتی توڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان کا انجام بہت نزدیک ہے۔ اسی سلسلے میں ہم نے انٹیرنیشنل فیسر کو بھی لائن پر لیا ہے۔ آئیے ڈراما سے بات کرتے ہیں۔“

انجلی کی توپوں کا رخ اب وزیر داخلہ کی جانب ہو چکا

”آنکھ۔۔۔۔۔ آنکھ۔۔۔۔۔ آنکھ۔۔۔۔۔ آخر ہم سب کب

تک اس آنکھ کے وار سہتے رہیں گے۔ ہمارا دیش ایشیا کی سب سے بڑی اکالونی ہے۔ ہماری فادرن پالیسیز نے انٹرنیشنل لیول پر اپنا لوہا منوایا ہے۔ یورپ، گلف اور افریقہ میں ہماری تجارتی منڈیاں بڑھ رہی ہیں۔ ہمارے سائنس داں چاند پر لینڈ کر چکے ہیں۔ ایک طرف ہم ہر فیلڈ میں سب سے آگے ہیں اور دوسری طرف ہمارے دیش میں آنکھ کا کھیل ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ آخر کون ہے اس آنکھ کے پیچھے؟ جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس آنکھ داد کے پیچھے وہی پڑوسی دیش ہے جسے ہر موڑ پر بھارت کی سٹلا ٹھٹکی ہے۔ وہ کسی بھی موقع پر اپنی دشمنی دکھانے سے نہیں چوکتا۔ آج بھی جو کچھ ہوا ہے وہ ہم سب نے دیکھا ہے۔“

انجلی نے اتنا کہہ کر ایک توقف کیا اور جہازی سائز اسکرین کی جانب رخ موڑ لیا۔

”آپ کے سامنے لکھنئی مگر کا یہ مندر موجود ہے۔ اس مندر کے ایک طرف ریس کورس پارک ہے اور دوسری طرف میوزیم۔ آج صبح دیش کی راجدھانی میں جب بھگت اپنی بھگتی کے لیے مندر پہنچے تو ایک خاموش دشمن بھی کسی ناگ کی طرح ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں کہ مندر میں بھگت اپنی پوجا پاٹ میں مصروف ہی ہوئے تھے کہ پانچ آنکھ دادیوں کا ایک گروپ پارک سے نکلا اور سیدھا مندر میں گھس آیا۔“

اسکرین پر اب پانچ ہتھیار بدست سیاہ پوش افراد کے ہیولے دکھائے جا رہے تھے جو وحشت سے لرز رہے اور کار جاڑہ لیتے ہوئے مندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ انجلی نے ڈرامائی انداز میں اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مندر میں داخل ہوتے ہی ان آنکھ دادیوں نے اپنا دھارمک نعرہ بلند کیا اور معصوم ناگرکوں پر قائم گرتی شروع کر دی۔ یہ اپنے کردہ میں اتنے اندھے اور بہرے ہو چکے تھے کہ انہیں بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں نہ ہی کرن بجگوان کی صورتی پر لگنے والی گولیاں۔ انہوں نے خون کی ہولی کھیلی اور ایک بار پھر اسی پارک میں چھپ گئے۔“

اسکرین پر پانچوں ہیولے ہتھیار لہراتے ہوئے پارک کی جانب بڑھنے لگے۔

”آنکھ اور کردہ کا یہ کھیل یہیں ختم نہیں ہوا۔“ انجلی کے چہرے پر سرخی جھلک اٹھی۔ ”دو منٹ بعد جی ہاں ٹھیک دو منٹ بعد امرتسر میں بھی ایک ایسی ہی درگھٹا سامنے آئی۔“

تھا۔ سمرات ناقابل فہم کیفیات محسوس کرنے لگا۔ اس نے ویڈیو دیکھی بند کر دی۔ اسے دو لاکھ لاکس، پچاس ہزار کنٹینر اور پچاس ہزار شیئرز پر بھی کوئی سنسنی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اضطراب سے اپنی پیشانی مسلی اور پوجا کو فون کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

رجت انجلی اور پوجا کھانے کی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ان دونوں کی واپسی نصف گھنٹے پہلے ہی ہوئی تھی۔ نہادھوکر تازہ دم ہونے کے بعد اب کافی کا دور چل رہا تھا۔

”بہت زبردست پروگرام کیا تم نے!“ پوجا نے توصیفی لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”بالکل! اس فشر کی تو خوب کلاس لی۔“ رجت مظلوظ ہوا۔

”تو پھر مجھے مانتے ہیں کہ نہیں؟“ انجلی نے اتر کر کہا۔

”بالکل مانتا ہوں۔ اسی لیے تمہارا یہ پروگرام فوراً اڈے کر دیا تھا۔ اسکرین والے آئیڈیل نے باقی چینلز کی واٹ لگا دی تھی۔ ریکارڈنگ آری بی ٹی ہے آج۔“ وہ سرور تھا۔

”میں تو لاکس، کنٹینر اور شیئرز دیکھ کر بہت خوش تھی۔“ پوجا نے بتایا۔

”لیکن مجھے تسلی نہیں ہے۔“ انجلی نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

رجت اور پوجا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

”ہماری سوشل میڈیا ٹیم کی رپورٹس وہ اسپارک نہیں دے رہی گریڈ پا!“ انجلی نے قطعیت سے بتایا۔ ”اس ویڈیو کو ابھی اور اوور ل ہونا چاہیے تھا۔“

”رائٹ! میں اس پر ایکشن لیتا ہوں۔ ڈونٹ یو وری!“ رجت نے دلاسا دیا۔

اسی اثنا میں پوجا کے موبائل پر کھنٹی بجنے لگی۔ وہ اسکرین پر دیکھتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی۔

”سمرات کی ویڈیو کال ہے۔ میں نے اسے بھی وہ ویڈیو لیک کی تھی۔“

پوجا نے غلٹ میں کہتے ہوئے اسکرین کا سبز بٹن دبا دیا۔

”آج اتنی دیر کر دی فون کرنے میں؟“ پوجا نے شکوہ کیا۔

”ایک فریڈ کی طرف ڈنر پر گیا ہوا تھا۔ بس وہیں کچھ دیر ہو گئی۔“ سمرات نے سنجیدگی سے بتایا۔

”فریڈ یا پھر کوئی فرینڈ تی؟“ انجلی نے معنی خیزی سے تان لگائی۔

سمرات اس اچانک وار پر گڑبڑا گیا تاہم اعتبار سے کہنے لگا۔

”فریڈ ہی تھا۔“

”انڈیا کب آرہے ہو؟“ رجت نے دریافت کیا۔

پوجا نے اس اثنا میں موبائل فون میز پر موجود ایک آرائشی ٹوکری کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ اب وہ کبھی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہوئے گفتگو کر سکتے تھے۔

”ٹیکسٹ دیکھ میں۔“ اس نے بتایا۔

”ٹکٹ کنفرم کر دالو تو مجھے اس کی پچھ واپس ایپ کر دینا۔ میں تمہاری فلائٹ ٹریکنگ پر لگا لوں گی۔“ انجلی نے فرمائش جڑی۔

سمرات دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے ٹکٹ کنفرم ہو جانے کی بات نہیں کر دی تھی۔

”میں شیڈول“ وہ مسکرایا۔ ”بائی داوے! آپ لوگ گھر کب آئے؟“

”ابھی کچھ سے پہلے ہی۔“ رجت نے بتایا۔ ”آج کا دن بہت بڑی تھا۔ ابھی کچھ دن ایسے ہی بھاگ دوڑ میں گزر رہے۔“

”میں نے تمہیں وہ ویڈیو لیک کی تھی۔“ پوجا نے کہا۔

”اب تک تو دیکھ لی ہوگی۔ انجلی نے کمال ہی کر دیا۔ ٹیرسٹس کی سب مومنٹس کیا زبردست طریقے سے پوائنٹ آؤٹ کیں۔“

سمرات کے ہونٹ بھنج گئے۔ اسے پوجا کی اس بے پروائی پر تازہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے لمحائی توقف کیا اور سرسری سے انداز میں کہنے لگا۔

”نہیں! میں نے ابھی ویڈیو نہیں دیکھی۔“

”وہ نہیں دیکھی تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔“ پوجا نے سٹائیظ نظروں سے بٹنی کی جانب دیکھا۔ ”میں صبح سے ہر چینل کی نیوز ہی فالو کر رہی ہوں لیکن انجلی جیسی رپورٹرنگ کسی ایک نے بھی نہیں کی۔“

”میں! مجھے ایک دوست کی کال آرہی ہے۔ ہم لوگوں نے یہاں ایک ٹرکس ریسٹورنٹ سے ہلکا دھڑائی کرنا ہے۔ پھر بات ہوگی۔ بائے!“ اس نے غلٹ میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

پوجا تشریف نظروں سے اسکرین کی جانب دیکھنے لگی۔

”بہت جھوٹ بولنے لگا ہے یہ سمرات!“ انجلی نے منہ

صیوات

ابھی ہوئی تھی۔ اسے مختلف چینلز کی رپورٹنگ اور انداز بیان دیکھتے ہوئے اہم نکات ذہن نشین کرنے تھے۔ اگلے روز اسے اپنی رپورٹنگ میں مزید دھماکا خیزی پیدا کرنا تھی۔ اس انشپاک میں سوبائل فون کی گھنٹی نے غلٹ پیدا کر دیا۔ اس نے بے نیازی سے فون آن کر لیا۔

دوسری سمت سے آنے والی آواز نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

رجت کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم سے ٹائٹ سوٹ پہنے برآمد ہوا اور اپنی روزمرہ کی دوا بکس نکلتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے سخت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔

”آج بہت بھاگ دوڑ کر لی دو بے جی!“ اس نے خود کلامی کی۔ ”اب عمر کا حساب بھی دیکھنا سیکھو!“

”عمر کا حساب تو دیکھتے ہی رہیں گے۔ ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔“ رجت کے دماغ میں ایک سرسراہٹ ہوئی۔

وہ لمحہ بھر میں ہی سنسن کر رہ گیا۔ یہ مانوس سنسنات دھیرے دھیرے بدن میں ایک آتشیں حدت پیدا کر دیا کرتی تھی۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک نے چونکا دیا۔ انداز پر دستک بھی بے حد مانوس تھا۔

”میں انجلی کم ان!“ اس نے فوراً سے کہا۔ انجلی کا چہرہ جوش و مسرت سے دمک رہا تھا۔ وہ تیر کی طرح رجت کے پاس آئی اور بیچانی انداز میں کہنے لگی۔

”گیس واٹ گرینڈ پا! مجھے ابھی کس کی کال آئی ہے؟“

رجت چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”کس نے رابطہ کیا ہے تم سے؟“

”شیونارائن مہتانے۔“ انجلی نے دھماکا کیا۔

رجت کا منہ حیرت سے نیم وا ہو گیا۔ حکمران جماعت کی ناک کا بال سمجھے جانے والے شیونارائن کی جانب سے رابطہ بہت بڑی خبر تھی۔ بالآخر وہ لمحہ آگیا تھا جس کے لیے

رجت نے اس قدر محنت کی تھی۔ وہ حکمران جماعت کی نظروں میں آگیا تھا۔

”کیا..... کیا..... کہا..... اُس..... نے؟“ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ لمحہ بھر میں یہ خدشہ بھی سرسرا نے لگا تھا

کہ وزیر داخلہ کی طرف سے کوئی اعتراض نہ سامنے آیا ہو۔

”نہیں! منسٹر نے کوئی بات نہیں کی۔“ انجلی نے گویا اس کی سوچ پڑھ لی۔

”تو..... پھر..... کوئی..... آفر؟“ وہ مزید بیچانی زد

بتایا۔

”اب کیا جھوٹ بولا اس نے؟“ پوجا مضطرب ہوئی۔

”اس نے ویڈیو دیکھ لی ہے۔ اس ٹاپک کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔ کسی دوست کی کال نہیں آئی اسے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”ہم!“ رجت نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”اگر اسے کوئی کال آ رہی ہوتی تو اسکرین پر اس کی تصویر پاز ہو جاتی۔“

پوجا کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور وہ سخت سے کہنے لگی۔

”آئی حتمک غلطی میری ہی ہے۔ اس نے مجھے صبح بھی منع کیا تھا کہ فون کالز پر ایسے شہدہ استعمال نہ کروں۔ وہاں کافی مانیٹرنگ ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔“

”وہاں جا کر یہ کچھ زیادہ ہی کیلکولیٹڈ نہیں ہو گیا گرینڈ پا؟“ انجلی نے رجت کو مخاطب کیا۔

”ہم رائٹ! میں بھی اس میں کافی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ اسے اپنے دلش کے سسٹم میں بہت خرابیاں دیکھنے لگی ہیں۔“

”وہ تو یہاں ہر کسی کو ہی دکھتی ہیں۔“ پوجا نے غیر ارادی طور پر حسب عادت بیٹے کا دفاع کیا۔

”ہاں! دکھتی ہیں۔ خیر لیواٹ! جب وہ یہاں آئے گا تم خود ہی سب کچھ دیکھ لو گی۔ ابھی تمہیں کوئی لاجک سمجھ نہیں آئے گی۔“ رجت نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”گرینڈ پا! مجھے تو یہ شک ہے کہ وہ اب پی ایس ڈیٹو اپلائی نہ کر دے وہاں۔“ انجلی نے خدشہ جتایا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ پوجا الجھی۔

”اسٹریٹ کیپٹ ہونے کے بعد دو سال کے لیے وہاں ایسے اور جاب کے لیے ویزا۔“ رجت کی پیشانی بھی پڑھنے لگی تھی۔

”اس بار واپس آئے تو اسے چیمبل جوائن کرنے کے لیے کنوینس کریں بس!“ پوجا مضطرب ہوئی۔

”ہم! ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ رجت کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں لرزے لگیں۔

روشن نے کافی کے سبھی خالی برتن سینے کا آغاز کر دیا تھا۔

☆☆☆

انجلی اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز لیپ ٹاپ میں جاسوسی ڈائجسٹ

ہوا۔

”رائٹ!“ انجلی نے اس کے ہاتھ اپنی گرفت میں لیے۔ ”وہ آج کے پروگرام کو ہی کٹنی نیو کروانا چاہتا ہے۔“

”سک۔۔۔۔۔ کس طرح؟“ رجت نے پہلو بدلا۔ انجلی نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”پبلک اور انٹرنیشنل میڈیا کی طرف سے کچھ شور مچایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ سرحد پار سے پندرہ لوگ دیش میں آتے ہیں۔ ان کے پاس ہتھیار اور پڑوسی دیش کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اس سچویشن میں ہماری سکیورٹی فورسز کہاں سو رہی ہیں؟ انجلی جنس کو کوئی رپورٹ کیوں نہیں ملی؟ وہ آٹھ وادی انکس کے بعد کہاں غائب ہو گئے؟ ہمارے سی سی ٹی وی کیمروں کا سسٹم کیا ہوا؟“

”ہم! یہ پوائنٹس تو میں نے تمہیں صبح ہی بتا دیے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ یہی سب باتیں سامنے آئیں گی۔“ رجت نے جتنی ہوئی نظروں سے نواسی کو دیکھا۔

”مہتا کے پاس انہی پوائنٹس کو اپنی فیور میں استعمال کروانے کا پلان ہے۔“ انجلی نے بتایا اور اپنے موبائل فون سے مخصوص ایپ کھولتے ہوئے ریکارڈنگ چلا دی۔ وہ اپنے پیٹھ کی نزاکت کے پیش نظر ہر فون کال ریکارڈ کیا کرتی تھی۔ مہتا کی تمام تر گفتگو کے بعد رجت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے اس نئے منصوبے کی کامیابی میں کوئی شک نہ تھا۔ اسے یہ بات بھی بخوبی سمجھ آگئی تھی کہ اس منصوبے کے لیے انہی کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ تاہم اگلے ہی پل ایک انڈیش ٹوک زبان پر نکل گیا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ آپ سب کام مجھ پر چھوڑ دیں۔“ انجلی نے اعتماد سے کہا۔

رجت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پرسکون ہو گیا۔

☆☆☆

ایئرپورٹ پر اترتے ہی ٹائلوں میں موسم اور آب و ہوائ کے رجتی کا استقبال کیا۔ فضا میں جس اور آلودگی کا تاثر غالب تھا۔ ”اسے ہمیں لور رجتی اور باہر نکلتے ہوئے اسے لازمی ساتھ رکھنا۔“ سرٹاپ نے ایک فیس ماسک اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

رجتی ممنونیت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ فلائٹ کے دوران سرٹاپ نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ رجتی ہر ایک قدم پر اس کے رکھ رکھاؤ اور احساس ذمہ داری سے متاثر

ہوئی تھی۔ سرٹاپ نے رجتی کے منع کرنے کے باوجود تمام تر سفر میں اس کا ہینڈ کیوری خود سنبھالنے رکھا۔ دوحہ میں قیام کے دوران بھی اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتا رہا۔ دہلی ایئرپورٹ پر لینڈنگ سے قبل اسے گرم پٹریے تبدیل کرنے کا مشورہ بھی دیا اور اب اپنے ہینڈ کیوری سے ایک بہترین دبیز ماسک اسے تھما دیا تھا۔

”تم نہیں پہنو گے کیا؟“ رجتی نے استفسار کیا۔

”ارے نہیں بھی! میں تو ان موسموں اور فضاؤں کا

عادی ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”بلکہ سچ بتاؤں تو میں وہاں گرم مرطوب

موسم اور دھوپ کو ترس ہی گیا تھا۔“

رجتی اس کی بات پر مسکرا کر رہ گئی۔

”تم نے اپنے گھر میں انفارم کیا؟“ اس نے دریافت

کیا۔

”نہیں! بس اپنے چائلڈ ہوڈ فرینڈ کو متیج کر دیا تھا۔ وہ

اپنی گاڑی اور ڈرائیور بھجوا دے گا۔“ سرٹاپ نے بتایا۔

بین الاقوامی آمد کے ٹرمینل سے باہر آتے ہی اسے

ڈرائیور کی جانب سے اٹھایا گیا ایک مخصوص کارڈ دکھائی دے

گیا۔ اس کے قدموں میں برق کوئٹ گئی۔ ڈرائیور نے فوری طور

پر ان کا سامان ڈکی میں رکھا اور سرٹاپ کی رہائش گاہ کی جانب

رواندہ ہو گیا۔

”میں گھر پہنچے ہی تمہارا فون وائی فائی سے کنکٹ کر

دوں گا۔ میگز کو انفارم کر دیتا۔“ سرٹاپ نے دھیمے لہجے میں

کہا۔

”تھینکس! میں یہی سوچ رہی تھی ابھی۔“ رجتی نے

ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا۔

گھر پہنچتے ہی ڈرائیور نے سامان نکالا اور مزید حکم کے

انتظار میں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”تم یہیں رکو! ریفرشمنٹ کے بعد ہی جانا۔“ سرٹاپ

نے حکمانہ کہا اور مرکزی دروازے کے ساتھ کئی مخصوص گھنٹی دبا

دی۔

رجتی سٹائشی نظروں سے اس پُر شکوہ عمارت کا جائزہ

لینے لگی جہاں اس کے اندازے کے مطابق تین اہل خانہ اور

چار ملازمین رہائش پذیر تھے۔ اسی اثنا میں دروازے پر

تعلینات گارڈ نے اسے پہچان کر فوری آمد کا راستہ فراہم کر دیا۔

”یہ سامان اندر پہنچاؤ اور ڈرائیور کو بھی اندر لاکر

ریفرشمنٹ کا بندوبست کرواؤ۔“ سرٹاپ نے سابقہ انداز میں

ہی کہا۔

”واؤ سیم! مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ تم ایک رائل فیملی سے

digest library.com

تھیں تھیں۔

”کیا ہوا سیر؟“ رچی نے سادگی سے استفسار کیا۔ وہ اس کی کیفیت بھانپ نہ سکی تھی۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ سرات پل بھر کے لیے گڑبڑایا اور خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اپنا موبائل فون دیتا مجھے۔ والی فانی کنیکٹ کر دیتا ہوں۔“

رچی نے اپنا فون بلاتل اس کی جانب بڑھا دیا۔ سرات نے والی فانی کا پاسورڈ لگاتے ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سم کارڈ برآمد کر کے اس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ لوکل سم کارڈ ہے۔ میرے نام پر ہی ہے۔ جیسے یہاں آؤنٹ ڈورڈز میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”ٹھیکس ڈیر“ رچی نے ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا۔

”تم میگز سے بات کر کے نیچے چلی آنا۔ می کھانا سرو کروا رہی ہیں۔“ وہ اس کے ہوش رہا سراپا سے نظریں اٹھانے لگا۔

رچی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے سرات کی یہ کیفیات بہت محفوظ کر رہی تھیں۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر پوجا رچی اور سرات کی ذہنی ہم آہنگی محسوس کر کے بہت محفوظ ہو رہی تھی۔ رچی کو مقامی کھانوں سے انصاف کرتے دیکھ کر ایسے انجلی اور رجحان کے قیاس میں بھی صداقت محسوس ہونے لگی تھی۔

”انجلی کا شو کتنے بجے آن اڑ ہوگا؟“ سرات نے استفسار کیا۔

”بس تھوڑی سی دیر میں۔“ پوجا عجلت میں دکھائی دینے لگی۔

وہ دونوں رچی کی موجودگی کے باعث انگریزی میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ لی وی لاونج میں چلے آئے۔

”تم پور تو نہیں ہو جاؤ گی؟“ سرات نے اہتاییت سے کہا۔

”بالکل نہیں! میں ماما کو ویڈیو کال کر کے تمہارا گھر بکھانا چاہتی تھی۔ جیسے برا تو نہیں لگے گا؟“ رچی متذبذب تھی۔

”بڑا کیوں لگے گا؟“ پوجا نے بلاتل جواب دیا۔

”اپنی ماما سے میری بات بھی کروا دیتا۔“

رچی نے ممنونیت سے سر ہلایا اور بالائی منزل کی سمت بڑھ گئی۔ اسی دوران انجلی کے پردگرا م دیڈن ٹروٹھ (پوشیدہ

ج) کی مخصوص ابتدائی موسیقی کو جتنے گئی۔

”ننسا را آپ دیکھ رہے ہیں دیڈن ٹروٹھ۔ اور میں ہوں آپ کی جانی مانی ہوٹ انجلی دو ہے۔“ اس نے ملامت سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

”اپنی انجلی کا وارڈ روم ہمیشہ اسٹائش ہوتا ہے۔“ پوجا سانسٹی انداز میں اس کی سیاہ ویدہ زیب ساڑھی دیکھنے لگی۔ جہازی سائز اسکرین کے سامنے کھڑے ہونے کے باعث اس کا سراپا بہت قیامت خیز دکھائی دے رہا تھا۔

”آج ہم آپ کے سامنے کچھ اہم باتوں کا چرچا کریں گے۔ ہم آپ کو ان سوالوں کے جواب دیں گے جو دیش کے ہر شخص کو کسی نہر لیے سانپ یا بچھو کی طرح ڈس رہے ہیں۔“

انجلی پرجوش انداز میں کہتی اپنے بال مخصوص انداز میں جھٹک رہی تھی۔

”تم دن۔۔۔ جی ہاں در شکو! تین دن گزر چکے ہیں۔ ہمارے دیش میں کھلا گیا آنک کا وہ کھیل کئی سو گھراٹھا گیا ہے لیکن دیشیوں کی کہیں کوئی خبر ہی نہیں۔ انیس زمین کھائی یا آسان نکل گیا۔ اس آنک واد کو پھیلانے کے لیے وہ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں چلے گئے؟ ہماری فورسز کو ان کے بارے میں کچھ بھی جانکاری کیوں نہ ہوئی آج ہم ان سب باتوں کا خلاصہ کریں گے۔“

انجلی نے ایک بار پھر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی جہاں درجن بھر سے زائد نقاب پوش افراد ایک مخصوص ترتیب میں دکھائی دے رہے تھے۔ انجلی پہلو بدلتے ہوئے اسکرین کے قریب تر ہوئی۔ اسی اثنا میں پانچ افراد کے چہرے سے نقاب ہٹ گیا۔

”جی ہاں در شکو! یہ خونی اور قاتل چہرے آپ کے سامنے ہیں۔“ اس کی آواز بلند ہوئی۔ ”الطاف قریشی، فرحان صدیقی، احمد خان، عالمگیر اور رخسانہ قدوسی۔ یہ وہ پانچوں ہتھیارے ہیں جنہوں نے مندر میں ہتھیار کا پڑ کی گئی۔“

پوجا اور سرات مضطربانہ انداز میں اسکرین کی جانب دیکھنے لگے۔ ان افراد کی تصاویر میں کچھ عوامل یکساں تھے۔ ان کی آنکھوں میں وحشت، دکھائی اور چہروں پر ایک سنگی تاثر تھا۔ تین افراد بارش تھے۔ رخسانہ نامی عورت کا چہرہ بھی خاصا درشت تھا۔ انجلی نے اپنے بالوں کو جنبش دیتے ہوئے اسکرین کے دوسرے حصے کا رخ کیا جہاں مزید پانچ نقاب پوش افراد کے عقب میں ابھورنگ گوردوارہ دکھائی دے رہا تھا۔ انجلی کے قریب تر ہوتے ہی ان چہروں کی رونمائی بھی کر دی گئی۔

حیثیات

ہونے کے برابر ایڈمیشن لے پاتے ہیں۔ سو میں سے تین یا چار۔ اور یہ کیا تصویریں ہیں؟“ سرٹھ نے اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ ”صاف نظر آ رہا ہے کہ ان کے چہرے اور نیچر ایک جیسے ہی ہیں۔“

پوچھنے کے لیے کہنے کا ارادہ کیا تھا کہ رہتی حذبذب قدموں سے چلتی وہاں چلی آئی۔

”میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اس نے نرمی سے دریافت کیا۔

”بالکل بھی نہیں! میگز سے بات ہو گئی کیا؟“ سرٹھ اپنی کوفت پس پشت ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

رہتی نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔ اسی اثبات میں دروازے پر کچھ آئیں محسوس ہوئیں۔ رجت اور انجلی اپنی ہی سوچ میں مگن اندر آ رہے تھے۔ سرٹھ پر نظر پڑتے ہی ان کے قدم ساکت ہو گئے۔

”میں کہتی تھی ناگریڈ یا! یہ کچھ پلان کر رہا ہے۔“ انجلی نے جوش سے کہا اور دوڑتی ہوئی سرٹھ سے لپٹ گئی۔

رجت نے بھی باوقار انداز میں اسے اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیا تھا۔ رہتی مسکرا کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے لیے انجلی کی محنتی خیز نظریں ناقابل فہم تھیں۔

☆☆☆

اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ کھانے کی میز کے گرد بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے۔ ان کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ رہتی کی موجودگی کے پیش نظر وہ انگریزی زبان میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔

”تمہاری کلاس میں فرنٹ کون آیا ہے؟“ انجلی کو یاد آیا۔

”شاہ نواز علی۔ بہت ذہین لڑکا ہے۔“ اس نے مختصراً بتایا۔

”پاکستانی؟“ رجت کی بھوسیں تن گئیں۔ ”شیم آن پو!“

سرٹھ رہتی کی موجودگی میں جربز ہو کر رہ گیا۔

”تمہارے پروگرام کا ریسرچ ہیڈ کون ہے؟“ اس نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

”میں اپنا ہر پروگرام خود ہی کرتی ہوں۔“ وہ فخر سے کہنے لگی۔

”ستیرے کو ڈبو نے کا ارادہ ہے کیا؟“ سرٹھ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جس میں میڈیا سائنسز کا کیا پتا؟“ انجلی غوث سے گویا

”در شکو! ان سے ملیے۔ یہ اکرم میاندان، وسیم نیازی، غلام رسول، سعدیہ بیگ اور فاطمہ امجد ہیں۔ ان کے چہرے غور سے دیکھیے۔ یہ امرتسر میں گوردوارہ کو خون سے اشان دینے والے راکشس ہیں۔“

سرٹھ انجلی کے لب و لہجہ اور چہرہ کی نفرت دیکھ کر بالکل ساکت تھا۔

”یہ اپنی انجیو کا کون سا روپ ہے؟“ اس کے ذہن میں سوچ ابھری۔ نکاہیں ہنوز اسکرین پر دکھائی دینے والے چہروں پر مرکوز تھیں۔ ان کی تصاویر بھی انیس بیس کے فرق سے سابقہ تصاویر جیسی ہی تھیں۔

انجلی مزید جوش اور ولولہ سے اسکرین کے آخری حصے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس کی پاٹ دار آواز سرٹھ کی سماعت پر ہتھوڑا زنی کرنے لگی تھی۔

”یہ ہیں اس ٹولے کے باقی ممبر۔ سلیمان اکبر، یوسف شیخ، غلام فاطمہ، اشرف خان اور سبین ہاشمی۔ انہوں نے

چرچ میں ہونے والی اس شادی کا خوشیوں بھرا ماحول ماتم میں بدل دیا تھا۔ یہ ہتھیارے اپنے موبائل فون کے کارن ہی

سامنے آئے ہیں۔ لوکل پولیس نے بہت محنت سے اس بات کو ٹریس کیا ہے کہ ان تینوں علاقوں میں کون کون سے نمبر ایکٹو

تھے۔ یہ بھی لوگ ہندوستانی ناگرک ہیں۔ جی ہاں! آپ نے بالکل ٹھیک سنا۔ یہ ہندوستانی ناگرک ہیں۔ ان سب میں ایک

بات کا من ہے کہ یہ کچھ سے پہلے ہی یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھ کر لوٹے ہیں۔ ہمیں ملنے والی اطلاعات

کے مطابق ان لوگوں کی پڑوسی دیش کے دو یار تھیں سے بہت دوستی تھی۔ ایک بات عمل و شواہ سے کی جاسکتی ہے کہ

انٹرنیشنل یونیورسٹیوں میں پڑوسی دیش کے دو یار بھی بہت پلاننگ کے ساتھ ہمارے دیش باسیوں کے دماغوں میں زہر

گھول رہے ہیں۔ اس سے سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا انٹرنیشنل یونیورسٹیاں پڑوسی دیش کے لیے داخلے کے دروازے بند

کریں گی؟ کیا وہ اس لڑائی میں ہمارا ساتھ دیں گی؟ انہیں ساتھ دینا ہی ہوگا کیونکہ آنکھ کی یہ آگ ان کے دیشوں

کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔“

”واٹ ریش!“ سرٹھ جھنجھلایا۔ ”یہ کیا پکنا بنا تیں کر رہی ہے؟“

”انجیو کسی بھی پروگرام سے پہلے پوری ریسرچ کرتی ہے جیٹا!“ پوچھنے والے نے لفظوں میں کہا۔

”خاک ریسرچ کرتی ہے۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”جس پڑوسی دیش کی یہ بات کر رہی ہے، اس کے اسٹوڈنٹس تو نہ

ہوئی۔ ”فار یور کاسٹ انفارمیشن! اس وقت ستیہ دے کی ٹی آر پی سب سے زیادہ ہے۔“
 ”اس ٹاپک پر بعد میں بھی بات کی جاسکتی ہے۔“
 رجت نے گھڑکا۔

انجلی اس کی نگاہوں کا ماخذ بھانپ گئی اور رچی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

”تم نے کون سی ڈگری لے رکھی ہے؟“

”میں نے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ اب کرنا لوجی بھی پڑھ رہی ہوں۔ اس کے بعد لاء میں ایڈمیشن لینے کا ارادہ ہے۔“ اس نے سادگی سے بتایا۔

رجت اور پوجا سٹائی نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

”ہمارے دلش پر جو انگلیس ہوئے ہیں، اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ویسے؟“ انجلی نے ایک اور سوال داغا۔

”او کم آن انجوا“ سرراٹ کراہا۔ ”اس ٹاپک کو چھوڑ نہیں سکتی ہو کیا؟“

رجی اپنے فون کی جانب متوجہ دکھائی دینے لگی۔

”ایسکویزی! میرے بھائیوں کی کال ہے۔ امید ہے آپ جبراً نہیں منائیں گے۔“ وہ شائستگی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرراٹ نے مسکراتے ہوئے تعجبی انداز میں سر ہلا دیا۔
 رچی بالائی منزل پر اپنے کمرے میں روانہ ہو گئی۔

”کیا ارادے ہیں مسٹراسپون؟“ انجلی نے معنی خیزی سے کھٹکھارایا۔

”ہم صرف اچھے دوست ہیں۔ وہ یہاں تاریخی عمارتیں دیکھنے کے شوق میں آئی ہے بس!“ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

”اس کے ماں باپ کون ہیں؟“ رجت کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

”ماں تو برٹش ہی ہے۔ باپ کے بارے میں کبھی پوچھا نہیں۔ وہاں ایسی پرستل باتوں پر سوال جواب اچھے نہیں سمجھے جاتے۔“ سرراٹ نے کندھے اچکائے۔

”یہ لڑکی مخلوط النسل ہے۔“ اس نے دھوک سے کہا۔

”گرینڈ پا! مجھے ایک فیور چاہیے۔“ سرراٹ نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔ ”مجھے ایک گاڑی اور گارڈ ایور ریڈی چاہئیں۔ میں نے میگز کو دو جن دیا ہے کہ رچی کا ہر آڈٹ ڈور فور مکمل سیکورٹی میں ہی ہوگا۔“

”مجھے بھی تم سے ایک فیور چاہیے۔“ انجلی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”تمہیں ہمارا یہ ٹیلی بزنس جوائن کرنا ہوگا۔ میں نے تمہارے لیے ایک ویلکی پروگرام ڈیزائن کر رکھا ہے تمہیں ایروڈ یونیورسٹیز میں پڑوسی دلش کے اسٹوڈنٹس اور کو بے نقاب کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم ان لوگوں پر بھی کام کریں گے جو وہاں شادیاں کر کے سیٹل ہوتے ہیں۔ انہیں آنکھ وادیوں کے لیے مڈل مین ثابت کرنا ہے۔“

سرراٹ بے یقینی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”انجوا! تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟ نہایت بے کار اور فلاپ آئیڈیا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں کسی بھی یونیورسٹی اور اسٹوڈنٹس کا نام لے کر جھوٹی رپورٹنگ کروں گا اور وہ کوئی ری ایکشن نہیں دیں گے؟ سیرسلی؟ میں تمہیں اتنا اچھا پچھو اور نمان پروڈیوسر نہیں سمجھتا تھا۔“

”اور میں بھی تمہیں اتنا اسٹوڈنٹس سمجھتی تھی۔“ انجلی نے ترکی بہ ترکی کہا۔ وہ اپنے بڑے ہونے کا یونہی فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔ ”تم نے یہ فیملی بزنس جوائن نہیں کرنا تو کیا کرو گے؟ اگر پی ایس ڈبلیو لینے کا سوچ رہے ہو تو یہ بھی بے وقوفی ہے۔“

”دیکھو سرراٹ!“ رجت نے رساں سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم جس ماحول میں رہ کر آئے ہو، اس کے بعد اپنے دلش میں رہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن ایک بات کا تمہیں بھی اندازہ ہے کہ وہاں کی پالیسیز موسم کی طرح چھینچھوٹی ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنا فیملی بزنس سنبھالنے کا سوچو۔“

”واہ گرینڈ پا! یہ فیملی بزنس سنبھال لوں؟“ وہ تلخ ہوا۔
 آپ کا مطلب ہے کہ کسی نہ کسی شو میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھایا کروں۔ پڑوسی دلش کے متعلق جھوٹی خبریں پھیلا دیا کروں۔ کرکٹ سیزن کو جنگ کی طرح ٹریٹ کیا کروں۔ سوشل میڈیا پر دائرل ویڈیوز پر لوگوں کی گالیاں کھایا کروں۔“

”تم کچھ زیادہ ہی ٹیکو ہو رہے ہو۔“ انجلی نے منہ بنایا۔

”نہیں! تم کچھ زیادہ ہی اوور کانفیڈینٹ ہو چکی ہو۔“ سرراٹ نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ ایسی چپ رپورٹنگ پر سرحد پار کتنا مذاق بنتا ہے؟ انٹرنیشنل میڈیا میں کیسی باتیں سنائی جاتی ہیں؟“

”آئی ڈیم کیئر!“ وہ طیش میں آئی۔ ”ہماری سوشل میڈیا ٹیم یہ سب میج کر لیا کرتی ہے۔“

چل دی۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں دیکس کرنی ہیں انجو!“
لیکن یہاں ڈانگ ٹیل پر مناسب نہیں ہے۔ ”رجت نے
اسے مخاطب کیا۔

”اوکے! میں آپ کے روم میں آتی ہوں ابھی۔“ انجلی
کی آنکھوں میں شدید ہنس تھی۔

☆☆☆

”ہو گئی بات جم اور کیلون سے؟“ سمرات نے رچی
سے دریافت کیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے کمرے میں آیا
تھا۔

”ہاں! تمہارا گھر اور لائف اسٹائل دیکھ کر کافی حیران
ہو رہے تھے۔“ رچی نے مسکرا کر جواب دیا۔
سمرات کے ہونٹوں پر بھی پچھلی سی مسکراہٹ رینگ
گئی۔

”کیا بات ہے سیم؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ رچی سے اس
کی چڑمردگی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”ہاں! سب ٹھیک ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔
رچی نے گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور
رسان سے گویا ہوئی۔

”مجھے تمہاری زبان کا ادراک تو نہیں ہے سیم! لیکن
لجوں کا اتار چڑھاؤ اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔“

سمرات خاموش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔
”کہیں میں بن بلائی مہمان بن کر سب کے لیے
پریشانی تو نہیں بن گئی؟“ رچی نے قطعیت سے دریافت کیا۔
”نہیں! بالکل بھی نہیں۔“ وہ مضطرب ہوا۔ ”مہمان
نوازی ہمارے کلچر اور ویلیوز کا حصہ ہے۔ ایسی بات بھی بھول
کر بھی ذہن میں مت لانا۔“

”اوکے! یہ تمہارا پرسنل میٹر ہے۔ میں مزید کچھ نہیں
پوچھوں گی۔“ وہ معاملہ نبھی سے کہنے لگی۔

سمرات نے ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا اور ہلکے
پھلکے انداز میں گویا ہوا۔

”کل صبح تمہیں دہلی کا وزٹ کرنا ہے۔ اپنی تیاری
پوری رکھنا۔“

رچی کے چہرے پر دوبارہ جوش جھلکے لگا۔

☆☆☆

”مجھے اسی بات کا ڈر تھا لیکن ہم یہ پروگرام ضرور کریں
گے۔ سمرات نہ سہی کوئی اور سہی۔“ رجت نے نواہی کی جانب
دیکھا۔

”انجو! جیسے یہ بات کیوں نہیں سمجھ آ رہی کہ اس سے
تمہاری کریئر پیش رفت خراب ہو رہی ہے۔ سرحد پار والے اس
بات کو کیسے ہائی لائٹ کرتے ہیں۔“ سمرات زنج ہوا۔

”میں نے کہا! آئی ڈیم کیئر۔“ اس نے ہر ایک لفظ
چباتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہ پروگرام کرنا ہی ہوگا۔ میں
شیڈول رائٹ مہتا سے کنٹیکٹ کر چکی ہوں۔ ابھی چھ یا سات
پروگرامز بہت ہوں گے۔“

”مجھ سے پوچھ کر نہیں کی تھی یہ کنٹیکٹ۔ میں اس پائل
بن کا حصہ نہیں بنوں گا۔“ سمرات نے اپنا فون اٹھایا اور لمبے
ڈگ بھرتا کمرے میں لوٹ گیا۔
انجلی کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی۔

”دیکھ رہی ہیں آپ اپنے لاڈلے کو؟“ اس نے پوجا کو
مخاطب کیا۔

”ریلیکس انجو!“ رجت نے کہا۔

”یہ بات کسی اور ٹائم پر بھی تو کی جاسکتی تھی۔“ پوجا نے
ملاستی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”آپ کا مطلب ہے میں پہلے اچھا سا مہورت
نکلاؤں۔ اس کے بعد آپ کے لاڈلے سے یہ بات کرتی۔“
اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

پوجا لمحہ بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔

”ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے انجو! وہ ابھی گھر لوٹا
ہے۔ سفر کی تھکان الگ ہے۔ اسے اپنا پوائنٹ آف ویو
سمجھانے کے بجائے اپنی مرضی توہینے سے کیا فائدہ ہوگا؟“
وہ ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔

”اوکم آڈن می! مجھے اس لیکچر کی ضرورت نہیں ہے۔“

آپ کی کوئی ایک سوچ ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو خود پتا نہیں ہوتا
کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ آپ میں کوئی گٹس ہوتے تو آج
ستیرہ بجے میں کسی پوزیشن یا پوسٹ پر ہوتیں۔“ انجلی نے غنی
اور بدلتی نظروں سے ہاں کو مخاطب کیا۔

اس کا فشار خون متوازن ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا

تھا۔ چہرے کے زاویے بے طرح بگڑنے لگے تھے۔ پوجا
حیرت و صدمے سے اپنی عزیز از جان بیٹی کو دیکھنے لگی۔ اس کا

یہ روپ پہلی بار سامنے آیا تھا۔ وہ اپنی شہرت، کامیابیوں اور
احساس برتری کے نشے میں آپے سے باہر ہونے لگی تھی یہ اس

سے بھی زیادہ افسوس ناک صورت حال یہ تھی کہ رجت نے بھی
اسے نوکے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

رجت کی ملاقاتی اور بد اعتماد نگاہوں نے پوجا کو بالکل ہی
گنگ کر دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہم اسے اتنا آپس کیوں دے رہے ہیں؟“ وہ جھنجھلائی۔ ”اسے اپنا یہ ٹیلی بزنس جوائن کر لینے میں ایسا ہی کیا ہے؟“

”یہ سب تمہاری ماں کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔“ اس نے ہونٹ پیچھے۔ ”لیکن خیر! پوجا کا بھی کوئی دوش نہیں۔ وہ اپنی مامتا سے مجبور ہے۔“

”اب آپ بھی ڈیل گیم کھیل رہے ہیں گرینڈ پا!“ انجلی نے متنبہ کیا۔

”نہیں میری جان! اسے ڈیل گیم نہیں ڈیلو می سمجھ لو۔ ہمیں دونوں سائنڈز کی بات سننی اور سمجھنی پڑتی ہے۔“ وہ مسکرایا۔

انجلی سر جھٹک کر رہ گئی۔

”میں نے تمہیں ایک اور ضروری بات کے لیے بلایا تھا۔“ رجت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں سمجھتی ہوں گرینڈ پا!“ اس نے قصبی انداز میں کہا۔ ”آپ یہی کہنا چاہتے ہیں تاکہ مجھے اپنے پروگرام پر مزید محنت کرنی ہوگی۔“

”بالکل!“ وہ ستائی نظروں سے انجلی کو دیکھنے لگا۔ ”یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ دوسرے چینلز پر کیسی کھلبلی مچی ہوگی۔ وہ ان ٹیرسٹس کے پتے ٹھکانے کھود کر پبلک کے سامنے لا دیں گے۔“

”ڈونٹ یووری! میں سب سنبھال لوں گی۔“ انجلی پُر اعتماد تھی۔

”گڈ! مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ میری اس محنت اور خواب کو تم ہی آکاش کی بلند یوں تک پہنچا سکتی ہو۔“ رجت نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ ”مہتا سے کانٹیکٹ میں رہنا۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“ اس نے معنی خیزی سے کہا۔ ”اس سے مہتا کو ہماری ضرورت ہے۔ یہ لوگ ابھی کوئی اور ایک کردار کے پبلک کے سامنے اپنی ناکامی کیسے شوکر سکتے ہیں؟ اس لیے انہی اٹلیس کو کیش کرواتے رہیں گے۔“

رجت کے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ ریگ گئی۔ وہ طاقت اور انتقام کے اس کھیل کی ہر باریکی سے آگاہ تھا۔ ملک میں دانستہ طور پر ایسے حالات پیدا کر دیے جانے کے بعد واویلے اور مظلومیت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس صورتِ حال سے ذاتی فائدہ کس حد تک اٹھایا جاسکتا ہے۔

”سمرات سے اپنا تعلق خراب مت کرو۔ اسے ہم

دونوں مل کر پٹری پر لے آئیں گے۔“

”مئی جب اس کی طرف داری کرتی ہیں تو مجھے.....“ وہ تلملائی۔

انجلی کے دل میں نا حال یہ غلش موجود تھی کہ پوجا نے اس کی بیرون ملک تعلیم کے لیے بالکل ہائی نہیں بھری تھی۔

”کہانی گھر گھر کی۔“ رجت کے لیے اپنا قہقہہ ضبط کرنا دشوار ہونے لگا۔ ”تم میری بہت سمجھ دار بنی ہو۔ مجھے دشواں ہے میری بات کو فالو کرو گی۔“

انجلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

”میں نے اس بات کی مانوس آواز سے چونکا اور محبت سے کہنے لگا۔“

”ڈورلا کڈ نہیں ہے مئی! آجائے۔“

انجلی ہی لمحہ پوجا دودھ کا گلاس اور خشک میوہ جات لیے اس کے پاس چلی آئی۔

”اس سب کی کیا ضرورت تھی مئی؟“ اس نے ماں کا ہاتھ تھما۔

”اتنے کمزور ہو گئے ہو تم! ابھی بھی کھانا ٹھیک طرح نہیں کھایا۔ ویسے ہی اٹھ آئے ہو۔“ پوجا نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے مس کیا۔

سمرات کے چہرے پر بکتھر چھا گیا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں انجلی کی بات بُری لگی ہے۔ تمہیں پتا تو ہے اس کی عادت کا۔ غصے میں ایسے ہی الٹا سیدھا بول جایا کرتی ہے۔“ وہ مامتا سے مجبور ہو کر اپنی آزدگی پس پشت ڈالتے ہوئے بیٹی کا دفاع کرنے لگی۔

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت غلط ٹریک پر چل رہی ہے۔ بلکہ انجلی گرینڈ پانے بھی وہی ٹریک پکڑ لیا ہے۔“

پوجا کی رنگت متغیر ہو گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔

”وہ دونوں اپنے کام کے لیے بہت جذباتی ہیں بس!“

”کم آن مئی! میں بچہ نہیں ہوں۔“ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔ ”مجھے سب دکھائی دے رہا ہے اور سمجھ بھی آرہا ہے کہ ستیرہ بچے کو اس وقت غیٹا لوگوں نے ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ یہ پتا کسی کے نہیں ہوتے۔“

پوجا کے پاس اس حقیقت پسندانہ تجربے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سمرات اپنی ہی رو میں کہنے لگا۔

”آپ کو پتا ہے میں اپنی یونی میں بہت گرو سے بتاتا

رہی کے چہرے پر مختلف رنگ بکھر گئے۔
 ”آئی میں میرے ملک کی خوب صورتی دیکھنے کے لیے پوری زندگی بھی کم ہے۔“ سمرات نے خود کو سنبھالا۔
 ”میں ماما، جم اور کیلون کو ویڈیو کال کر لوں۔ وہ بھی یہ بیٹی دیکھ کر بہت ایکسائٹڈ ہوں گے۔“ رہی نے موضوع گفتگو تبدیل کیا۔
 سمرات نے مسکرا کر تائیدی انداز میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

پوجا کے مزاج پر پوجھل پن طاری تھا۔ اہل خانہ کی مصروفیات کے باعث احساس تنہائی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ پوجا کم گو اور نہایت محتاط طبیعت کی حامل تھی۔ اس کا حلقہ احباب بھی زمانہ طالب علمی سے نہایت محدود تھا۔ راکیش سے شادی کے بعد یہ کم گوئی اپنے اصل ماخذ سے کئی گنا بڑھ گئی۔
 پوجا، راکیش سے شادی کے لیے دلی طور پر راضی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے بچپن کے ہم جماعت آکاش کی محبت میں گرفتار تھی۔ آکاش اور پوجا کا ساتھ یونیورسٹی تک برقرار رہا اور اس کے بعد بالکل روایتی انداز میں رجت دو بے کی ان پستی کا شکار ہو گیا۔ رجت ہزار ہا دلائل کے باوجود ان دونوں کی شادی کے لیے قائل نہ ہوا۔ اس کے پاس ہر دلیل، منطق، التجا اور انتہاء کا ایک ہی جواب تھا۔

”ہمارے پر پوار میں آج تک کسی نے پریم دیواہ نہیں کیا۔ میں اپنے پڑکھوں کی پریم پرائیجمنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم نے کورٹ میرج کا کوئی پلان بنایا تو میں اس آکاش کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ گتے کی موت ماروں گا اُسے۔“

پوجا اپنے باپ کی ہٹ دھرمی سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے محبوب کی سلامتی کے لیے محبت تو قربان کر دی لیکن اپنے دل و دماغ سے بچپن کی اس اولین چاہت کے نقوش بھی نہ مٹا سکے۔ کم گوئی، بیزاری، پڑمردگی، آزدگی اور پوجھل پن اس کی شخصیت پر اس حد تک غالب آچکا تھا کہ کسی بھی سرگرمی میں دل لگ کے ہی نہ دیتا۔ رجت نے اسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کاروباری معاملات سے دور رکھا تھا۔ وہ بیٹی کو خود مختاری اور اعتماد کی سیر می تھا کراکاش تک پہنچنے کا راستہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

راکیش بھی فطرتاً اپنا پسند اور مخصوص نظریات کا حامل شخص تھا۔ اس کے نزدیک بیوی کی کاروباری معاملات میں شرکت شوہر کے مقام و مرتبہ میں تنزلی پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجتاً وہ گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی۔

تھا کہ ستیہ وجے جھیل ہمارا ہے۔ وہاں ہمارے ہی دیش کے لوگ اس بات پر جتنے تھے کہ ستیہ وجے کی اپنی کوئی پالیسی ہی نہیں۔ وہ رولنگ پارٹی کی زبان بولتا ہے بس۔ جگ آکر میں نے اس بارے میں بات کرنی ہی چھوڑ دی۔“

”میں جانتی ہوں پینا رولنگ پارٹی نے چور دروازوں سے سرکار بنائی ہے۔ انہوں نے ستیہ وجے ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی چیئرمینز کو گولے رکھا ہے۔“

”لیکن میں یہ سب نہیں کروں گا۔ میں اپنا کیریئر خود بناؤں گا۔“ وہ پُر عزم تھا۔ ”گوگوں کی اس دلالی میں ہاتھ کالے کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔“

پوجا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

”رہی کو کہاں گھمانے پھرانے کا ارادہ ہے پھر؟“
 سمرات کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ بکھر گئی۔ پوجا نے گہری نگاہوں سے بیٹے کی اس کیفیت کا جائزہ لیا۔

”جسٹ ٹائم پاس ہے یا شادی وادی کا سوچ رکھا ہے؟“ اس نے صاف گوئی سے دریافت کیا۔

”سوچا تو ہے لیکن ابھی اس سے پوچھا نہیں۔“ سمرات نے اعتراف کیا۔

پوجا ایک عجیب اضطراب محسوس کرنے لگی۔ اسے رجت کے مخصوص طرز فکر کا تصور جربز کر رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند روز میں حالات و واقعات میں کئی تغیرات رونما ہوئے۔ ستیہ وجے جھیل پر انجلی کی اس رپورٹنگ کے بعد ملک بھر میں تشویش، غم اور غصے کی لہر پیدا کر دی تھی۔ دیگر جھیل مالکان نے بھی اپنے ’آقاؤں‘ کے زیر اثر انہی خطوط پر کام کا آغاز کر دیا۔ کئی ایک رپورٹرز نے ان حملہ آوروں کے گھر اور رشتے داروں کا ’کھوج‘ بھی لگالیا تھا۔

”انجلی اور رجت کی مصروفیات بھی سواتر ہو چکی تھیں۔ سمرات اور رہی دہلی کی قدامت کھنگالتے دنیا دانیہا سے بے خبر تھے۔“

”تمہارا ملک بہت خوب صورت ہے سیم!“ وہ سحر زدگی سے کہنے لگی۔

”ابھی تو تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔“ اس نے فخر سے جواب دیا۔

”ایک مہینہ تو بہت کم ہوگا۔“ رہی مضطرب تھی۔

”تو ہمیشہ کے لیے یہیں رہ لو۔“ سمرات نے جذبات سے پوجھل آواز میں کہا۔

انجلی کی اس بدلتا ہوا اور سراٹ کی رچی میں دلچسپی نے اس کے ہر ذمہ کو ایک بار پھر ہرا کر دیا۔ اس کے دل میں برسوں سے پوشیدہ خلش و کرب ایک نئی شدت سے اذیت دینے لگی تھی۔

”ارے آنٹی! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔“ اسے اپنے قریب رچی کی آواز سنائی دی۔

پوچھا اپنے خیالات سے چونک کر خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ رچی کو تشویش ہوئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ایسے ہی یہاں بیٹھی تھی۔ تم کھڑی کیوں ہو؟ آؤ! بیٹھو نا۔“ پوچھا نے مسکراتے ہوئے پیشکش کی۔

”آپ گھر میں اکیلی بور ہو جاتی ہوں گی۔ ایسا کرتے ہیں کہ کل ہم سب اکٹھے گھومنے چلیں گے۔“ اس نے تجویز دی۔

”ارے نہیں بھی! تم جوان بچوں میں مجھ بوڑھی کا کیا کام۔ میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب مت کرو۔“ پوچھا کو اس کی یہ اپنالت بہت بھلی محسوس ہوئی۔ دل میں بلا وجہی گداز پیدا ہونے لگا تھا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے اس کیفیت سے نجات کی کوشش کی اور ٹھٹھک کر کہنے لگی۔

”تم ابھی تک کیوں جاگ رہی ہو؟ سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد تھکاوٹ ہو گئی ہوگی۔ سو جاؤ۔ کل پھر باہر جانا ہوگا۔“

”میری طبیعت الٹ ہی دیکھیے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔ ”عام طور پر لوگ تھکاوٹ سے چور ہو کر فوراً سو جاتے ہیں لیکن میری نیند غائب ہو جاتی ہے۔ موبائل فون دیکھ کر بھی بور ہونے لگی تھی۔“

”تو پھر ایک کام ہو سکتا ہے۔“ پوچھا نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ”ڈیڈی کے اسٹڈی روم میں بہت سی بکس پڑی ہیں۔ جو بھی دل چاہے لے آؤ۔“

”رہنمائی؟“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔

”لیکن ان کی نیند ڈسٹرب نہ ہو جائے۔“

”بالکل نہیں ہوگی۔ وہ بھی دیر سے ہی سونے کے عادی ہیں۔“ پوچھا نے بتایا۔

رچی کو رجعت کی مطالعہ گاہ میں بھیجے کا محرک کہیں نہ کہیں سراٹ کے ہنڈبات کا احترام ہی تھا۔ وہ رجعت اور رچی میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی خواہش مند تھی۔

”محبت کی میراث میں ہر بار جدائی اور تڑپ ہی کیوں حصے میں آئے؟ یہ میراث ملن بھی تو ہونی چاہیے۔“ پوچھا کے ذہن میں ایک سوچ نے دستک دی۔

☆☆☆

”جسہیں ہسٹری میں دلچسپی ہے کیا؟“ رجعت نے حیرت سے رچی کی منتخب شدہ کتابوں کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں! بے حد اور بے حساب۔“ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”امیزنگ!“ وہ حیران ہوا۔ ”آج کل کی جزییشن تو کتابوں سے ہی بہت دور ہے، ہسٹری کیا پڑھے گی۔“

رجعت کے اس فقرے میں ایک واضح خلش جھلک رہی تھی۔ اس کے لیے اپنا آبائی کاروبار ترک کرنا آسان امر نہیں تھا۔ عوام میں کتب بینی کی تیزی اور اپنے کاروبار سے دوری آج بھی ایک ذمہ نہاں تھی جس کی نسیں وہ کسی پر بھی آشکار نہیں کر سکتا تھا۔

”میں ای بک سے زیادہ ان کتابوں کو ترجیح دیتی ہوں۔ کتابوں کی خوشبو مجھے بہت پسند ہے۔“ رچی نے سادگی سے جواب دیا۔

رجعت پُر شوق لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”تم کھڑی کیوں ہو؟ اگر نیند نہیں آرہی تو بیس بیٹھ جاؤ کچھ دیر۔“ اس نے پیشکش کی۔

”نیند تو پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”اب ان کتابوں کو دیکھ کر بالکل ہی نہیں آئے گی۔“

رچی کو محبت و جوش سے ان کتابوں پر ہاتھ پھیرتے دیکھ کر رجعت بہت متاثر ہوا۔

”ہسٹری ہی کیوں پسند ہے جسہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔

رچی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور کھوئے کھوئے انداز میں کہنے لگی۔

”ہسٹری میں ایک خوشبو ہے۔ قدیم زمانوں کی خوشبو۔ میری تو دلی خواہش ہے کہ کوئی نامم مشین بناؤں اور مختلف زمانوں کی سیر کروں۔“

”مجھے بھی ساتھ لے جاؤ گی نا؟ پلیز۔“ رجعت کی ذہنی پرواز بھی افق کے پار کہیں بہت دور پہنچ چکی تھی۔ ”مجھے بھی ایک زمانہ کی سیر کرنی ہے۔“

رچی اس بے ساختگی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور شدد و سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کس زمانے کی سیر کرنا چاہو گی؟“ رجعت نے اپنا

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے، اعصابی کمزوری دور کرنے، تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون پر باقاعدہ حکیم صاحب سے گفتگو کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں۔ اپنے دوستوں کو بھی ہماری دوائی کا بتائیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

فون دوپہر 2 بجے تا رات 10 بجے تک کریں۔

0301-6690383

0300-6526061

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

لبوب مقوی اعصاب کے دیگر کافذات ایک جانب رکھ دیے تھے۔ "بہت سے۔ اہرام مصر کی تعمیر دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ دیوہیکل عمارت آخر کیسے بنی ہوگی؟ انھوں نے اور قلو پٹرہ کی غلط فہمی اور رنجش دور کروں گی۔ سیتا سے کہوں گی کہ یہ بارڈر لائن کر اس نہ کرنے۔ اس کے سامنے ایک بہرہ پیا کھڑا ہے۔ وہ اس کے چنگل میں پھنس جائے گی۔ ٹائی ٹینک جہاز کے عملے کو خبردار کروں گی کہ جہاز میں لائف بولس زیادہ تعداد میں رکھو۔ انہیں چچ چچ کر بتاؤں گی کہ سامنے آکس برگ ہے۔ جہاز کا رخ جلدی سے موڑ لو۔" وہ خوابناک سے انداز میں کہتی چلی گئی۔

"سیتا؟" رجت حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ "تمہیں ہمارے مذہب میں انٹرٹ ہے کیا؟"

"میرے ڈیڈ انڈین تھے۔ وہ ہمیں اس بارے میں کافی کچھ بتاتے تھے۔ میں گیارہ سال کی تھی تو ان کا انتقال ہو گیا۔" رچی نے انکشاف کیا۔

رجت کو اپنے اندازے کی توثیق پر فخر محسوس ہونے لگا۔

"انہوں نے تمہیں ہندی نہیں سکھائی کیا؟" وہ تجسس ہوا۔

"بہت کوشش کرتے تھے۔ میں نے کچھ سیکھی بھی تھی لیکن پھر بھول گئی۔" وہ خفت سے کہنے لگی۔

"تمہیں ضرور ہندی سیکھنی چاہیے۔ اپنے ڈیڈ کے لیے۔" رجت نے اسے تحریک دی۔

"رائٹ! میں واپس جا کر کسی لینگوتج کلاس میں ایڈمیشن لے لوں گی۔" وہ مسکرائی۔

"گڈ گرل!" اسے بے حد خوشی ہوئی۔

"آپ کس زمانے کی سیر کرنا چاہیں گے؟" رچی نے تجسس سے دریافت کیا۔

"جب یہاں برٹش راج تھا۔" رجت نے تبصرہ انداز میں کہا۔ "میں انڈین سٹاؤں کا کہ وہ تقسیم کافصلہ کر کے ٹکڑی کر رہے ہیں۔ انہیں ہندوستان آزاد کر کے ہندوؤں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہندو اکثریت میں تھے۔ انہیں یہاں حکومت کرنے کا قانونی حق تھا۔ مسلمانوں کو الگ دیش دینے کی کوئی لاجب نہیں تھی۔"

رجت حیرت و الجھن سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ رجت اس لمحے مکمل طور پر اپنے ماضی کے آسیب میں جکڑا تھا۔

رجت دو بے کالعلق اس خصل سے تھا جس نے اپنے آباؤ اجداد کو متحدہ ہندوستان کی تقسیم، فسادات اور اپنے آبائی علاقے

پاکستان میں شامل ہو جانے کے 'دکھ' کو تاحیات دل کا ناسور بنائے رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں پر اسی طرح حکومت کرنے کے خواہش مند تھے جیسے وہ برصغیر پر قابض رہے تھے۔ نفرت، بغض اور عناد کی یہ میراث بھرپور شدت سے اگلی نسل میں منتقل ہوئی تھی۔ اس نسل نے محض روایت پرستی میں ایک اُن دیکھی سرزمین سے بے تحاشا نفرت کرتے ہوئے اس کی بربادی کے خواب دیکھے تھے۔ یہ نسل اپنے پُرکھوں کو آٹھ آٹھ آنسو روتے دیکھنے کے بعد اس عقیدہ ہو جانے والی سرزمین سے ان آنسوؤں کا تادان وصول کرنا چاہتی تھی۔ رجبت نے بھی اپنی یہ میراث محل اہتمام سے اگلی نسل تک منتقل کی تھی۔

"میرے ڈیڈ بھی یہی کہتے تھے۔" رچی کی آواز نے اسے ان خیالات سے چونکا دیا۔

وہ دونوں کافی دیر تک 'ٹائم مشین' کے سفر پر گفتگو کرتے رہے۔ رجبت اس کی سنجیدگی، دونوں کا انداز اور دھیمے مزاج سے بہت متاثر ہوا تھا۔

"میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔" رچی نے اس کی آنکھوں میں خینک سرنخی دیکھتے ہوئے ندامت سے کہا۔

"مجھے تم سے گفتگو کر کے بہت لطف آیا۔" رجبت نے برملا جواب دیا۔ "میرے اپنے بچوں میں کسی کو بھی ہسٹری میں انٹرسٹ نہیں ہے۔ یہ کتابیں جلدی سے پڑھ لو۔ پھر ہم ان پر بات چیت کریں گے۔"

رچی نے جوش و خوش سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

انجلی صبح کی سیر کے لیے قریبی پارک میں موجود تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلنے کے باعث اس کے بال کمر پر جھول رہے تھے۔ اس کا ذہن موجودہ صورت حال کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے رہا تھا۔

انجلی دو بے ایک موقع شپاس، خود پسند، احساس برتری میں مبتلا اور خوشامد پسند لڑکی تھی۔ اس نے بچپن ہی سے والدین میں ذہنی تفاوت مکمل شدت سے محسوس کیا تھا۔ انجلی اپنے شاندار تعلیمی ریکارڈ اور پُر اعتماد و دیپنگ شخصیت کے باعث راکیش اور رجبت کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس موقع پر راکیش نے بھی نہایت دہرے معیار کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو پیشہ وارانہ امور سے خارج رکھنا چاہتا لیکن بیٹی کے لیے دل اور کاروبار میں شرکت کے سبھی دروازے کھلے تھے۔

ستیرہ بجے کے آغاز نے انجلی کی آنکھوں میں اُن گنت خواب بھر دیے تھے۔ وہ اس چمیل کو نہروں بنانے کی خواہش مند تھی۔ عوام کی بغض شناسی کے باعث اس نے موقع سے

بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دھواں دھار پروگرام کیے تھے۔ ان کامیابیوں کی سرشاری نے اسے نفوت میں مبتلا کر دیا تھا جس کے زیر اثر وہ پہلے سرراٹ اور پھر پوجا سے الجھ پڑی تھی۔ پوجا اپنی تمام تر آرزو کی اور دل آزاری کا کرب پس پشت ڈالنے لگزشتہ شب اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"میں آپ کے روم میں ہی آنے والی تھی۔" وہ سخت سے کہنے لگی۔ "آئیے بیٹھیے۔"

"سرراٹ سے کوئی بات ہوئی تمہاری؟" پوجا نے دریافت کیا۔

"نہیں! میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس سے بات کروں۔ وہ اگر ہمارا پروگرام جوائن نہیں کرنا چاہتا تو اس اد کے الیکشن وہاں کی مختلف یونیز کی انفارمیشن تو دے ہی سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے! کر لیتا بات۔" وہ ایک دو روز میں آکرہ کے لیے نکل جائیں گے۔" پوجا نے آگاہ کیا۔

انجلی ایک نئی سوچ میں مبتلا ہو گئی۔ سیر کے اختتام تک اس نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ مرتب کر لیا تھا۔

☆☆☆

"کہاں کی تیاری ہے؟" انجلی نے گھر لوٹنے کے بعد سرراٹ سے دریافت کیا۔

"آج کچھ شاپنگ مالز وغیرہ دیکھنے پلان ہے۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"صرف گھماتے پھراتے ہی رہو گے یا اسے اپنے دل کی بات بھی بتاؤ گے؟" انجلی کے لبوں پر شریر مسکراہٹ ابھری۔

سرراٹ اپنے جذبات کے یوں طشت از بام ہونے پر حیرت زدہ تھا۔

"حیران مت ہو۔ تمہاری آنکھوں اور چہرے سے یہ کیفیات صاف چھلکتی ہیں۔" وہ ہنسی۔

سرراٹ سے کوئی جواب نہ سن پڑا۔

"دیے اگر تم چاہو تو میں مٹی اور گریڈ پاؤ کو تمہارے لیے کنوینس کر سکتی ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔

"ابھی اس میں بہت وقت ہے انجوا۔" وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"اسٹوڈنٹ لڑکیاں ہمیشہ سہل کا انتظار کرتی ہیں۔ تم بات کرو گے تو وہ رسپانس دے گی نا۔" انجلی نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"سوچتا ہوں اس بارے میں بھی۔" سرراٹ ہنوز متذبذب تھا۔

صیوان

انجلی زمانہ طالب علمی سے ہی اس مقام سے بخوبی واقف تھی۔ پانی پوری کی یہ دکان دو میزوں اور آٹھ کرسیوں پر مشتمل تھی۔ ایک کم عمر لڑکے نے انہیں فی الفور تمام تر لوازمات فراہم کر دیے۔

”باہر سفید رنگ کی گاڑی کھڑی ہے۔ وہاں بھی یہ سب چیزیں پہنچا دو۔“ سرراٹ نے گاڑی کا نمبر بتاتے ہوئے کہا۔ رہتی سائشی نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے لیے یہ تجربہ نہایت اٹوکھا تھا۔ انجلی بھی کھانے سے مکمل انصاف کر رہی تھی۔

”جہیں انڈیا کیسا لگا رہی؟“ انجلی نے یکدم اسے مخاطب کیا۔

”بہت اچھا۔“ وہ بے ساختگی سے کہنے لگی۔

سرراٹ اُلجھ کر بہن کی جانب دیکھنے لگا۔

”یہ کیا سلمان خان اور مویشیش بیل والا سین کری ایٹ کر رہی ہو؟“ وہ ہنسا۔

”شٹ آپ مسٹر اسپون!“ اس نے بھائی کے سوال کو بالکل درخور اعتنائہ سمجھا اور ایک بار پھر رہتی سے مخاطب ہو کر گویا ہوئی۔

”انڈیا والے کیسے لگے جہیں؟“

”اچھے لگے ہیں۔“ رہتی نے سادگی سے بتایا۔ ”یہاں کی ہر ایک چیز بالکل ویسے ہی ہے جیسے ڈیڑی ہمیں بتاتے تھے۔ مجھے یہاں اپنے بڑوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔“

”واٹ؟ تمہارے ڈیڑی انڈین تھے؟“ سرراٹ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ہاں! برٹش بورن انڈین۔“ اس نے تصحیح کی۔

”تم نے بھی بتایا ہی نہیں؟“ سرراٹ کو مزید حیرت ہوئی۔

”تم نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“ رہتی نے برملا کہا۔

”کمال لوگ ہو بھی تم لوگ!“ انجلی نے کھانے سے ہاتھ روک کر ان کی جانب دیکھا۔ ”ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے ہو۔ اکٹھے سفر کیا ہے۔ اتنے دنوں سے گھوم پھر رہے ہو لیکن یہ بات بتائی نہیں۔“

”بس میں نے بھی پرسل سوال کیے ہی نہیں۔“

سرراٹ نے سر کھجایا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری ماسے بھی یہاں آنے سے پہلے ہی ملاقات ہوئی تھی۔“ رہتی نے اس کا دفاع کیا۔

”ویسے آج میری کوئی ریکارڈنگ نہیں ہے۔ اگر مجھے کباب میں ہڈی نہ سمجھو تو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔“

”لیکن تمہیں دیکھتے ہی وہاں سیلفیو لینے والوں نے دھاوا بول دینا ہے۔“ اسے ایک خدشے نے ستایا۔

”ڈونٹ یو وری! میرے پاس اس کا بھی بندوبست موجود رہتا ہے۔“ وہ پُر اعتماد تھی۔

”اد کے اشیو را!“ سرراٹ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

”دہلی سے باہر کا پلان بنا تو می اور گرینڈ پا کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔“ ٹیلی ٹرپ ہی تھی۔

انجلی کی یہ تجویز سرراٹ کے دل کو لگی۔ اس نے جوش سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے اعصاب میں ایک عجیب فرحت اور شہ در محسوس کر رہا تھا۔

دہلی کے جدید مقامات کی سیاحت کرتے شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ انجلی نے رہتی کو مختلف شاپنگ مائز سے کئی تحائف لے کر دیے۔ اسے رہتی کی نرم خوئی، ہسازہ دلی اور سنجیدہ طبیعت نے خاصا متاثر کیا تھا۔

”رہتی کو پانی پوری کھلائی ہے کیا؟“ انجلی کو یک دم خیال آیا۔

”ابھی نہیں!“ سرراٹ نے سر کھجایا۔

”عجیب آدمی ہو تم بھی۔“ انجلی نے ملامت سے اسے دیکھا۔ ”آج میں تمہیں ایک اسپیشل پوائنٹ پر لے چلتی ہوں۔“

وہ سرراٹ کو مکمل طور پر حیران کرنے کے درپے تھی۔ وہ ہمال اُلجھن میں تھا کہ انجلی اسے اپنے مقصد کے لیے گھیرنے کے لیے یہ سب کر رہی ہے یا اس کی بہن کے جذبات مکمل طور پر اٹھ آئے تھے۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ انہیں دہلی کے ایک قدیم بازار میں لے آئی تھی۔

”گاڑی اندر نہیں جا پائے گی۔“ ڈرائیور نے بے بسی ظاہر کی۔

”تو یہیں پارک کر لو۔ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔“

انجلی نے حکم دیا۔

”آئی تمہیں گاڑی کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“

رہتی نے کہا۔ ”اس جگہ بازار میں یہ گن اٹھائے ہمیں خواہ مخواہ سلیمبرٹی بنا دے گا۔“

”آل رائٹ! تم بھی یہیں رہو۔“ سرراٹ نے ہدایت کی۔

وہ تینوں سرشاری سے چلتے ایک جانب بڑھ گئے۔

سکا ہوں۔“ تیسرا شخص انجلی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کی سرخی غالب تھی۔

”ان سارے حرام خوروں نے بہت ہتھیار کاٹ کر لیے ہیں۔ تو پولیس کو فون کر روی!“ تنومند نے دوسرے شخص کو مخاطب کیا۔

”پولیس کیا اکھاڑ لے گی ان کا؟ پولیس میں اتنا دم ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ سارے جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔“ آئند نامی اس تیسرے فرد نے دانت پیسے۔

”یہ دوسری لڑکی کون ہو سکتی ہے؟“ راجیو نے رچی کا بغور جائزہ لیا۔

”انجلی کی ساتھی ہوگی۔ کسی نئے کانڈ کی پلاننگ ہی چل رہی ہوگی۔“ روی نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے نقش ترین الفاظ کا استعمال کیا۔

اسی اثنا میں دکان کا ملازم لڑکا خرماں خرماں چلتا وہاں سے گزرا۔

”اوائے چھوٹے پیکٹ! کہاں مال سپلائی کر کے آیا ہے؟“ راجیو نے دریافت کیا۔

”ان صاحب لوگوں کی گاڑی میں پانی پوری دینے گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”کون کون ہے وہاں؟“ روی نے درستی سے پوچھا۔

”دو لوگ ہیں جی۔“ وہ ان کے تہور دیکھ کر سہم گیا۔ ”وہ

ایک گن ہاتھ میں پکڑ کر نشانہ لینے کی پریکٹس کر رہے تھے۔“

دلچسپ اپنی کم عمری کے باعث ان دونوں کی باہم گفتگو کا متن سمجھنے سے قاصر رہا تھا کہ ڈرائیور اپنی فطری دلچسپی کے

باعث وہ گن ہاتھ میں لیے ایک تصویر بنانا چاہتا تھا تاکہ

بعد ازاں اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر شیخیاں بکھار سکے۔

گارڈ البتہ اسے ہتھیار پکڑنے کے تکنیکی امور سمجھا رہا تھا۔

”نشانہ لینے کی پریکٹس؟“ آئند نے معنی خیزی سے ان کی جانب دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے میرا ٹک ٹھیک تھا۔ یہ حرام خور

وہی آٹک دادی ہیں۔“ راجیو کے ہنسنے پھڑکنے لگے۔ ”میں

پولیس کو فون نہیں کروں گا۔ ہم خود ہی ان سے نمٹ لیتے ہیں۔“

آئند اور روی ترحم آمیزی سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

مندرجہ ذیل عام کے دوران اس کی بڑی بہن، ماں اور

بہوی بھی زندگی کی بازی ہار گئی تھیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے

راجیو درستی سے آگے بڑھ گیا۔ دیگر افراد بھی اس کے عقب

میں ہی تھے۔

”مجھے پھر بھی عجیب ہی لگ رہا ہے۔“ انجلی نے دونوں کو گھورا اور رچی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے کہ تمہیں ہم سب کے بارے میں پتا تھا لیکن اسے تمہاری پہنچ کے بارے میں تفصیل پتا ہی نہیں۔“

”تمہیں اپنے بھائی کی عادت کا پتا ہی ہوگا۔“ رچی نے کندھے اچکائے۔

”وہ بولتا زیادہ ہے اور سنا کم ہے۔“

رچی کے اس تجزیے پر انجلی نے ساختہ مسکرائی۔

”ایسے نکلے شخص کو کوئی سزا تو کئی چاہیے۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

”اس حساب سے تو سزا کی حصار میں بھی ہوں۔ مجھے

سب کو خود ہی بتانا چاہیے تھا۔ مگر پتا نہیں کیوں بھی دھیان ہی

نہیں رہا۔“ رچی نے صاف گوئی سے بتایا۔

”تو تم دونوں کے لیے سزا یہ ہے کہ ایک دوسرے سے

شادی کر لو۔“ انجلی نے کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اطمینان سے دھماکا کیا۔

سمرات اور رچی ہنسنے بنے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

انجلی کو اب اس گفتگو میں لطف آنے لگا۔

”کم آن یار اسپون! اب کیا اسے تمہارے حصے کا

پروپوز بھی میں ہی کروں؟“ اس نے تاسف سے سمرات کی جانب دیکھا۔

رچی اور سمرات کی نگاہیں باہم ملیں۔ ان دونوں کے

بدن میں سسکنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس مسکور کن لمحے میں انہیں

اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ وہ کافی دیر سے چند نظروں کے حصار

میں ہیں۔

☆☆☆

”تو مان نہ مان! یہ لڑکا الطاف قریشی ہی ہے۔“

پینتیس سال کے لگ بھگ اس تنومند آدمی نے کہا۔ اس کی

گہری سانولی رنگت بڑھی ہوئی شیو کے باعث اور بھی سیاہ

دکھائی دے رہی تھی۔

”ہاں! مجھے بھی وہی لگ رہا ہے۔“ دوسرے شخص نے

بغور دیکھتے ہوئے تائید کی۔ ”اس کی ٹی شرٹ دیکھو۔ یونیورسٹی

کالوگو بنا ہوا ہے۔“

تنومند شخص نے سمرات کی یونیورسٹی کی مخصوص شرٹ پر

ایک بار پھر نگاہیں جمالیں۔

یہ سبھی افراد پانی پوری کی اس مخصوص دکان کے مقابل

وال اور چاولوں کے ٹھیلے پر کھڑے تھے۔

”یہ لڑکیاں کون ہو سکتی ہیں؟“ وہ بڑبڑایا۔

”وہ چھین جھری سجد یہ بیگ ہے۔ میں شرط لگا کر کہہ

رہے ہو۔“

راجو، آئندہ اور روٹی نے ایک بار پھر بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ میکی نما طویل لمبا، سر پر بندھے اسکارف اور بڑے شیشوں والی عینک آنکھوں پر سجائے اس طرح دارلڑکی کو مسجد یہ بیگ بکھنے میں خود کو حق بجانب سمجھ رہے تھے۔

سمرات نے غیر محسوس طریقے سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے گارڈ کو یہاں بلانا چاہتا تھا۔ اس کی یہ حرکت راجو سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا دکان سے باہر لے گیا اور چلا کر کہنے لگا۔

”الطاف قریشی! تجھے ایک ایک ہتھیا کا حساب دینا ہو گا۔“

قرب و جوار کے دکاندار بھی یہ نام سنتے ہی سراپہ دکھائی دینے لگے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی تندہ موجزن تھی۔

”بھائیو اور بہنو یہ لوگ وہی آنکھ وادی ہیں جن کی تصویریں ٹی وی پر دکھاتے رہے ہیں۔ ان کے دو ساتھی ہتھیاروں کے ساتھ گاڑی میں موجود ہیں۔ یہ اس دکان میں کسی ہتھیار کاڈ کی پلاننگ کر رہے تھے۔“ اس کی آواز دھاڑ سے مشابہ تھی۔

”رکوا یہ میرا بھائی ہے۔ تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔“ انجلی چلائی اور اپنا مخصوص میڈیا کارڈ نکالنے کے لیے بیگ میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ عقب سے آئندہ کے وارنر نے ذہن گھنٹا دیا۔

”مکر کرتی ہے سالی!“ آئندہ نے دھاتی جگ کے پے در پے دار جاری رکھے۔

انجلی کے حواس حتمل ہو گئے۔ آئندہ اسے لمحہ بھر کے لیے بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

راجو کے حلق سے ہڈیانی چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ روٹی نے پُرموس نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور گھسیٹے ہوئے دکان کے ایک کونے میں لے جانے ہی لگا تھا کہ آئندہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔

”رک جابارا!“ آئندہ نے ٹوکا۔ ”اس کا سے نہیں ہے۔“

باہر ان کے دوسرے آدمیوں کو شک ہو گیا تو ہمیں بھون دیں گے۔ پتا نہیں ان کے پاس اور کتنے ہتھیار ہیں؟ ختم کر اس سالی کو جلدی۔“

روٹی نے پھر پور وحشت سے راجو کو زمین پر گرایا اور اس کی گردن، سینے اور چہرے پر وحشیانہ ضربات رسید کرنے لگا۔ سمرات نے خود کو راجو کے چنگل سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن بازار میں چند ایک مزید افراد بھی اشتعال کی

☆☆☆

سمرات کی سنسنی اب ایک بیٹھے سے جوش میں ڈھل چکی تھی۔ راجو کی آنکھوں میں دکھائی دینے والی مخصوص چمک بھی اس کے جذبات میں مزید کرنے لگی۔ چند لمحے اسی پوچھل خاموشی میں بیت گئے۔

انجلی نے ہونٹ بھیج کر سمرات کی جانب دیکھا اور اس کے پاؤں کو اپنی ایڑی سے دبا دیا۔ اس وقت اس کی تمام تر نفوت، احساس برتری اور پیشہ دارانہ کامیابیوں کا غبار کہیں اُڑ چھو ہو چکا تھا۔ ان لمحات میں وہ صرف ایک بہن تھی۔ ایک ایسی بہن جس کا بھائی اپنی پسندیدہ لڑکی کے سامنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے حذبذب تھا اور وہ اسے مکمل طور پر اخلاقی تعاون فراہم کر کے یہ ”معرکہ“ مکمل کروانا چاہتی تھی۔

سمرات نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انجلی کے چہرے پر اطمینان در آیا۔ راجو بھی نہایت دلچسپی سے سمرات کی جانب دیکھنے لگی۔ سمرات بھرپور اعتماد سے ایک گھٹنا زمین پر رکھتے ہوئے راجو کے سامنے بیٹھ گیا۔

”راجو! اس نکلے، بوٹے اور باتوں کی پٹاری سے شادی کرو گی؟“ اس نے اپنا ہاتھ روایتی انداز میں آگے بڑھایا۔

انجلی کی نگاہیں بھی راجو پر ہی مرکوز تھیں جہاں نیم رضامندی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ راجو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اسی لمحے سمرات کو کمر میں ایک زوردار ٹھوکر نے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

”واٹ دا ہیل! یہ کیا ناں سنس ہے؟“ انجلی نے طیش سے اس سیاہ رُو شخص کی جانب دیکھا۔

”اس کیوٹر کو تم دیکھ لو روٹی!“ وہ سفاکی سے گویا ہوا۔

”ہمارے پاس زیادہ ناں نہیں ہے۔“

روٹی اس کا اشارہ بجانب کر دکان کے مالک کو دبوچ کر ایک کونے میں لے گیا۔ وہ رستہ کی رنگت فق ہو چکی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں اتری سرخی سے خائف دکھائی دے رہا تھا۔

”کون ہو تم لوگ؟ اور یہ کیا حرکت ہے؟“ سمرات نے انہیں گھورا۔

”بتاتے ہیں الطاف میاں! ذرا صبر تو لو۔“ راجو کے جبرے بھیج گئے۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ انجلی یہ نام سنتے ہی مضطرب ہو گئی۔ ”مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔ تم ہمیں غلط سمجھ

زد میں آچکے تھے۔ وہ آن کی آن میں سرٹ پر پل پڑے۔
 ”حرام خور ہو تم لوگ!“
 ”جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔“
 ”تمہارے باقی ساتھیوں کا بھی یہی حال کریں گے۔“

اجڑم کی یہ آوازیں دھیرے دھیرے بلند ہونے لگیں۔
 سرٹ مدد طلب..... لگا ہوں سے ارد گرد دیکھنے لگا لیکن کہیں کوئی راہ نہ تھی۔
 ”یہ لوگ دیش دروہی ہیں۔ جہاں بھی ملیں یہی حال کرو۔ انہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ راجو دھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

اسی لمحہ سرٹ کے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کونسا۔ اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے اپنا ٹراڈز اتار دیا اور ٹی شرٹ سینے تک اٹھا کر پانچے ہوئے کہنے لگا۔

”میں الطاف قریشی نہیں ہوں..... یہ دیکھ لو..... میں الطاف قریشی نہیں ہوں.....“ وہ اپنی بات کے اختتام پر ہلکتے ہوئے رونے لگا تھا۔

”یہ ڈرامے بازیاں ہمیں پتا ہیں۔ تم لوگوں کو شروع سے ہی ان چیزوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔“ بازار میں موجود دیگر افراد کی آنکھیں بھی نفرت اور غصے کے لالہ سے دھک دی تھیں۔

وہ مشتعل اجڑم سرٹ کی کوئی بھی دلیل یا بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان کے طیش، نفرت اور جذبہ انتقام کے نتیجہ میں سرٹ کچھ ہی لمحوں میں ابولہان ہو چکا تھا۔ اس کا خاک و خون سے لتھڑا چہرہ اور دہشت سے ہتھرائی آنکھیں شکوہ کناں انداز میں انہی کی جانب مرکوز ہو گئیں۔

”نکل چل یہاں سے ان کے باقی ساتھیوں میں سے کوئی ادھر آ نکلا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“ آئندے روئی کو شہ کا دیا۔

کچھ ہی لمحوں میں وہ وہاں سے رنو چکر ہو چکے تھے۔

☆☆☆

انہی کے سر سے بہتا لہو دکان کے فرش سے ریت تکا سڑک تک چلا آیا تھا۔ اس کے بدن میں شدید آگ بھڑک پیدا ہو رہی تھی۔ انہی نے تمام تر ہمت جمع کرتے ہوئے گردن دائیں سمت موڑی تو رچی کے غیر فطری انداز میں پڑے جسم کی دید نے مزید لرزش پیدا کر دی۔ اس کا چہرہ بے طرح کٹ پھٹ چکا تھا۔ ٹوٹی ہوئی میز صحنی ناک، ہونٹوں اور مقل سے بہتا خون شکستہ پسلیوں سے نکلنے لہو میں مدغم رہا تھا۔

اگلے ہی لمحہ سماعت میں رچی کی آخری ہنگامی دلدوز آواز نے اپنی جانب بڑھتی موت کا خوف مزید جاں مسل کر دیا۔ اس کی بے تاب نگاہیں سرٹ کو تلاش کر رہی تھیں۔ انہی کے سینے پر بھاری چٹان جیسا وزن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ہولناک تار کی چھانے لگی تھی۔

”وہ..... میرا..... بھائی..... میں..... نے..... جھوٹ..... رپورٹ.....“ اس کی زبان سے شکستہ الفاظ برآمد ہوئے۔ حلق میں جمکین لہو کی کڑواہٹ اس قدر شدید تھی کہ تے محسوس ہونے لگی۔

آٹھن زدہ بدن کے باعث یہ تے سانس کی تالی میں ہی مدغم ہو کر تنفس کی ڈور منقطع کر گئی۔ انہی کی بے نور آنکھوں میں آخری دید سرٹ کے بے لباس لہو رنگ بدن، جھوٹوں اور خون کے ایک مختصر تالاب کی تھی۔

☆☆☆

پوجا بی دی لاؤنج میں کافی اور خشک میوہ جات کی ایک طشتری لیے بیٹھی تھی۔ اس کی توجہ حسب عادت اپنے موبائل پر ہی مرکوز تھی۔ اسے فیس بک ریلز دیکھنے کی لت نے بے طرح اپنے فکرتے میں جکڑ رکھا تھا لیکن اس لمحہ کسی بھی مشغلے میں دل لگ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے ان تینوں کو..... ابھی تک لوٹے ہی نہیں۔“ وہ حد درجہ مضطرب تھی۔

پوجا کے لیے اپنی یہ کیفیت ناقابل فہم تھی۔ دل یکدم ہی شدت سے بھنچا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر موبائل فون کی جانب متوجہ ہو گئی اور اپنی بے تابی سے قطع نظری کے لیے تک ٹاک ویڈیوز دیکھنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ تقریباً نصف گھنٹہ پہلے ایلوڈ کی ٹی ایک مختصر ویڈیو نے اسے چونکا دیا۔ اس کے سامنے ایک مائوس اور عزیز از جان چہرہ تھا جسے دھکیلتے ہوئے سڑک کے درمیان لاکھڑا کیا گیا تھا۔

”الطاف قریشی اچھے ایک ایک ہتھیار کا حساب دینا ہو گا۔“

سرٹ کی دید ہوتے ہی سماعت میں پڑنے والے ان الفاظ نے پوجا کے بدن پر لرزش طاری کر دی۔ اس کے ہاتھ سے کافی کا گم چھوٹ گیا تھا۔

”بھائیو اور بہنو! یہ لوگ وہی آنک وادی ہیں جن کی تصویریں ٹی وی پر دکھاتے رہے ہیں۔ ان کے دو ساتھی ہتھیاروں کے ساتھ گاڑی میں موجود ہیں۔ یہ اس دکان میں کسی ہتھیار کا بیڈ کی پلاننگ کر رہے تھے۔“ اس سفاک آواز نے پوجا کے حواس قفل کر دیے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ کوئی فیک وٹریو ہے۔۔۔۔۔“ پوجا نے اپنے ہونٹ کچلے اور سمرات کا نمبر ملائے گی۔

دوسری جانب سے موبائل بند ہونے کی رینگ رانگ نے اسے مائی بے آب کی طرح تڑپا کر رکھ دیا۔ انجلی کا نمبر ملائے جانے پر بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ رجت کے فون پر کھنٹی بجتے رہنے کے بعد رابطہ از خود منقطع ہو گیا۔ پوجا نے دیوانہ وار ریوٹ تلاش کرتے ہوئے ایل ای ڈی آن کر دی۔

”ناجرین! ابھی ابھی بریکنگ نیوز ملی ہے کہ دہلی کے مجری بازار میں تین آنکھ وادیوں کو ایک بہت بڑے کانڈکی پلاننگ کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہے۔ ان تینوں افراد کا تعلق دہلی میں مندر پر حملہ سے بھی تھا۔ ان میں سے دو ہتھیاروں کی شناخت الطاف قریشی اور سعدیہ بیگ کے نام سے ہو چکی ہے۔ یہ لوگ بازار پر بڑا حملہ کرنے کی پوری تیاری کر چکے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار اور بم بھی موجود تھے۔“

کیمبرے کا رخ اب پانی پوری کی اس دکان کی جانب تھا۔ پوجا کے لیے انجلی کے لہو لہان چہرے اور لباس کی شناخت کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ ساکت نگاہوں سے اسکرین کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے دماغ میں درد کا ایک گولا پھٹا اور تتھنوں سے خون رسنے لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے زمین بوس ہو گئی تھی۔

تیار کردہ ونگ کا سربراہ تھا۔

”جنتا کو کیسے شانت کریں؟ محمدی بازار کے اس واقعے نے انہیں ایک راہ دکھادی ہے۔ وہ شک کی بنیاد پر کسی کو بھی پکڑ کر قانون ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔“ ہری چندر بھی بے بسی کی تصویر بنا تھا۔

”ویری سہیل! ایک ایک اور پلان کرنا ہوگا۔ اس بار ساری فیس داری پڑوسی دیش پر ڈال دیں گے۔ جنتا کا سارا کردہ وہاں ٹرانسفر ہوتے ہی باقی حالات نارمل ہو جائیں گے۔“ یوگیش مشرانے سفاسی سے کہا۔

”ایک اور ایک؟“ گورو ڈیاسے جڑ بڑھا۔ ”یہ سب بہت جلدی نہیں ہے؟ اس سے ہماری انجینئر پر سوال انہیں گے۔“

”یہ کام بس مجھ پر چھوڑ دو۔ کسی پر کوئی سوال نہیں اٹھے گا۔ دو دن میں سب کے ذہنوں کی پھر کیاں گھما دوں گا۔“ یوگیش کا اعتماد دیدنی تھا۔

”اور وہ رجت دو بے؟“ ہری چندر نے دریافت کیا۔

”اسے بھی سیدھا کر لوں گا۔“ وہ انہیں اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

کچھ ہی لمحوں بعد وہاں موجود سبھی افراد پُر سکون ہو چکے تھے۔

digest library.com

اس بڑے سے ہال نما کمرے کے وسط میں ایک مستطیل میز رکھی تھی۔ میز کے گرد رکھی بیش قیمت کرسیوں پر محض چار افراد ہی براجمان تھے۔ یہ چاروں افراد اہم حکومتی عہدیداران تھے۔

”حالات بہت خراب ہونے لگے ہیں۔ جنتا کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ قانون ہاتھ میں لے رہے ہیں۔“ کشنر وجے کشمی بننے بے بسی سے کہا۔

”اس سینیٹر جینل والی اینکر اور انگریز لڑکی کی موت بھی مصیبت بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف جینل جان کو آرہا ہے تو دوسری کی ولایتی ماں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے۔“ گورو ڈیاسے بھی جھنجھلاہٹ کا شکار تھا۔

”وہ رجت دو بے اسپتال میں پڑا بھی چین نہیں لینے دے رہا۔ بہت شور مچایا ہوا ہے اس نے۔“ کشنر نے ہونٹ پیچھے۔ ”بہن اور اس کے دونوں بچوں کے مرنے پر بھی پران نہیں نکلے اس کے۔ بہت ہی ڈھیٹ بڑھا ہے۔“

”ان سب کو ہم خود ہی ہینڈل کر لیں گے۔“ یوگیش مشرا نے سپاٹ انداز میں کہا۔ وہ بھی حکمران جماعت کے مخصوص

☆ ☆ ☆

لیلا دی اسپتال کے باہر میڈیا کی گاڑیوں اور اینکرز کا ہجوم تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں مخصوص مائیک تھامے بیجانی انداز میں ایک ہی بیان مختلف انداز میں دہرا رہے تھے۔

”جی ہاں! ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ یہ وہی اسپتال ہے جہاں رجت دو بے کا علاج چل رہا ہے۔ دو بے کو کل رات دل کا دورہ پڑنے کے بعد یہاں لایا گیا تھا۔ جونا جین ابھی ہمارے ساتھ جڑے ہیں انہیں ہم بتاتے چلیں کہ سرکار کو رجت دو بے کے جینل سترے وجے کے پڑوسی دیش سے گلہ جوڑ کے شبت ملے ہیں۔ رجت دو بے کے دفتر پر چھاپا مارتے ہی پڑوسی دیش سے رابطے کا سارا نیٹ ورک ٹریس کر لیا گیا ہے۔ دو بے کے بارے میں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس نے انجینئر کی تعینات سے بچنے کے لیے یہ سارا ڈھونڈ چایا ہے۔“

”لیکن شانتی! ہمارے سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ محمدی بازار میں مرنے والے آنکھ وادیوں کا تعلق بھی رجت دو بے سے ہی تھا۔ وہ اپنے جینل پر ان کی ہتھیار کا بھرپور احتجاج کر رہا تھا۔“ اسٹوڈیو میں موجود کسی شخص نے دانستہ طور پر سوال کیا۔

”آنکھ اور ہتھیاروں کا یہ مکمل رجت دو بے کی حجت

تلی ہی تیار ہوتا تھا۔ وہ لوگ اسی نیت سے محمدی بازار میں آئے تھے۔ ان کے پاس شاپنگ بگزمیں ہم اور ہتھیار تھے۔ "شانی" نامی اس رپورٹر نے طلق پھاڑتے ہوئے بتایا۔

اسی اثنا میں اندرونی سمت سے ایک ڈاکٹر اپنی ڈیوٹی کے اوقات ختم کر کے باہر آیا ہی تھا کہ میڈیا کے نمائندوں نے اسے اپنے نرخیے میں لے لیا۔

"رجت دو بے کی کیا کنڈیشن ہے؟"

"کیا اس کی بیماری ایک فراڈ ہے؟"

"وہ کوئی اسٹینٹ دینے کے قابل کب ہوگا؟"

"کیا اس کا اب بھی باہر گیس رابطہ ہے؟"

"گیس ایسا تو نہیں کہ پڑوسی دیش کا کوئی ایجنٹ اپنے خلاف اس ثبوت کو ختم کرنے کی کوشش کرے؟"

ان پے در پے سوالات کے نتیجے میں ڈاکٹر سری کانت نے رمان سے ان کی جانب دیکھا اور اعتماد سے کہنے لگا۔

"رجت دو بے کی کنڈیشن سیریس ہے۔ اسے سخت سیکورٹی میں رکھا گیا ہے۔ ہارٹ ایک کے بعد اسے ہیرالازر ایک بھی ہوا ہے۔ اس سے دو بے کی باڈی رائٹ سائڈ سے کھل ہیرالازر ڈے۔"

میڈیا کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے سری کانت نے غلبت میں آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا اور برق رفتاری سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسپتال کی حدود سے باہر آتے ہی اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور ایک مخصوص نمبر پر مختصر پیغام ارسال کر دیا۔

"مشن آل ڈن۔"

☆☆☆

اسپتال میں سائیکس پٹری رجت دو بے کی رنگت سروس سے بھی زیادہ زرد ہو چکی تھی۔ چپکے ہوئے رخساروں پر سفید داڑھی اور حلقوں میں دھنسی آنکھیں ایک ہولناک تاثر دے رہی تھیں۔ احساس بے بسی دزیاں سے آنکھوں میں ہار ہار آنسو اُڑاتے۔

رجت دو بے کو سینے میں شدید تکلیف کے بعد اس اسپتال میں لایا گیا تھا۔ طبی امداد کے بعد اسے اپنی حالت میں بہتری محسوس ہونے لگی تاہم اس کے معالجین کا رویہ پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی غنودگی کے باوجود وہ سخت ترین حفاظتی انتظامات اور عملے کی آنکھوں میں خشک دے چینی کی پرچھائیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کیفیت میں وہ سری کانت نامی ڈاکٹر کی بے چین باڈی لینکونج بھی بھانپ گیا تھا۔ سری کانت نے معنی خیزی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بازو کی کس میں انجکشن کی

سوئی گھونپ دی۔ اس کے بعد رجت دو بے کے بدن میں اینٹھن پیدا ہونے لگی تھی۔ خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارتا ایک نئی اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

رجت کی یہ کیفیت قانچ کے حملے پر متح ہوتی اور اب وہ بستر پر بے حس و حرکت لیٹا سر پٹختے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پارہا تھا۔ زبان کی خشک چڑے کی طرح نالو سے چپک چکی تھی۔

"پوجا، انجلی اور سمرات کا اتم سنگار کس نے کیا ہوگا؟"

اس کے ذہن میں ایک پُر خار سوچ ابھری۔

"رجی کی ڈیڈ باڈی کبھی جا چکی ہوگی یا نہیں؟" رجت کو اس سے آخری ملاقات کے مناظر اور موضوع گفتگو نے تازہ یاد رسید کیا۔

"پترا ہم اس گاؤں میں سونا، قیمتی پتھرے اور سامان چھوڑ کر راتوں رات بھاگے تھے۔" اسے ایک دم اپنی والدہ کی کم گشتہ آواز سنائی دی۔

"ہمارے پُرکھوں کی حوٹلی کو مسجد بنا دیا انہوں نے۔" کسی بزرگ کی صدمے سے چور سسکیاں سماعت لبو لہان کرنے لگیں۔

"ہم نے ان کو کاٹ پیٹ کر واپس بھیجا تھا۔" ایک اور بزرگ کا فخریہ کارنامہ یاد آیا۔

رجت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اپنے بزرگوں کی یہ میراث نبھانے کے لیے تاعمر تن، من، دھن سے کوششیں کی تھیں اور بدلے میں۔

"رجت دو بے اتم اور تمہارا پر یوار یہاں دشمن دیش کے لیے نیٹ ورکنگ کرتا رہا ہے۔ یہ رہے اس کے ثبوت۔" اسے ایک سفاک باز گشت سنائی دی۔

وہ اذیت سے اپنا سر پٹختے لگا۔ اسے دیوار کی ہر ایک اینٹ سے مختلف سرگوشیاں پھونٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ہذیبانی انداز میں چٹخیں مارنے لگا۔

"پوجا، انجلی، سمرات۔" اس کی زبان سے شکستہ الفاظ برآمد ہوئے۔

"مار۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ جیوت۔۔۔۔۔ رکھا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔" رجت کے بدن میں اینٹھن پیدا ہونے لگی۔

حلق میں کانٹوں کی جان لیوا چھین سانس لینے میں دشواری پیدا کرنے لگی۔ اس کا سینہ ایک نئی جکڑن محسوس کر رہا تھا۔

"مار۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ بھگوان۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔ واسطہ۔۔۔۔۔"

'میراث' کی جنگ کا یہ سپاہی اپنے آخری عہد پر شکست کے بعد موت کی بھیک مانگتا ہوا اوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

❖❖❖